سفرنامۂ فرنگ

مسیر طالبی فی بلاد افرنجی

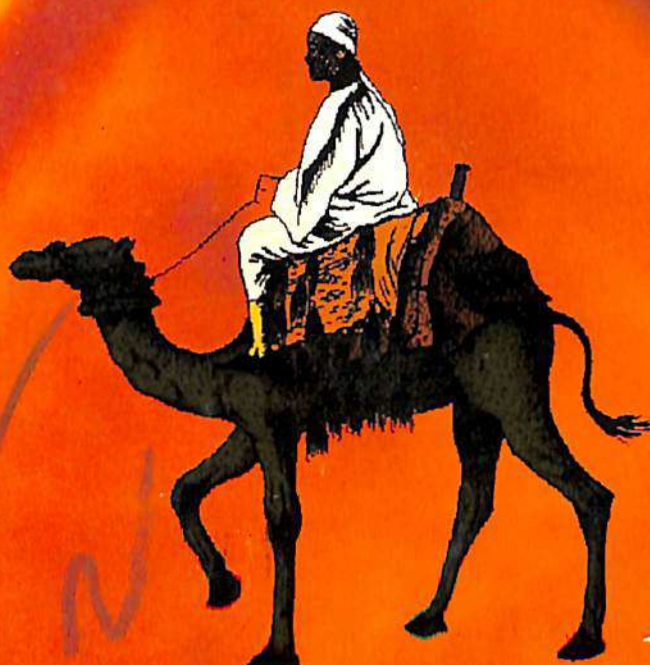

مرزا ابوطالب اصفہانی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

سفرنامۂ فرنگ

ترجمہ

مسیر طالبی فی بلاد افرنجی

مصنف

مرزا ابو طالب اصفہانی

مترجم

ڈاکٹر ثروت علی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک-1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066

Safar Nama Farang Masir-e-Talibi

By : Abu Talib Asfahani

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1984

تیسرا اڈیشن : 1999 تعداد 1100

قیمت : -/87   73|=

سلسلۂ مطبوعات : 458

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

طابع : میکاف پرنٹرس، ترکمان گیٹ، دہلی-110006

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیوروئے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

عنوانات

حصہ اوّل

عنوان	نمبر صفحات
تعارف	15
مسیر طالبی	18
اسباب سفر و ترک وطن	23
آغاز سفر فرنگ	28
جزیرہ ٹرلیا	31
قطب تارے کا نظر سے چھپ جانا	33
خطِ استوا سے پہلی بار عبور	33
اُڑن مچھلیاں	34
قطب جنوبی اور باد تجارت	35
رفتار جہاز، کلکتے سے انگلینڈ تک	35
عجیب پرندے	37
وہیل مچھلی	37
جہاز کی مصیبت	37
ایک سخت طوفان	39
پہاڑوں کے وجود پر انگریزوں کی رائے	42

کیپ خورد کا حال	42
کیپ کے خدمت گذار	43
کیپ ٹاؤن اور اس کی خصوصیات	45
ہلنٹ ریز کی خواتین	47
لطیفہ	48
شہر کیپ ٹاؤن کا موسم بہار	50
کیپ ٹاؤن کے دوستوں کا ذکر	52
سفر انگلستان کا دوبارہ آغاز	53
وہیلر جہاز کا حال	54
جزیرہ سینٹ ہلینا	55
گورنر سینٹ ہلینا کا حال	57
جزیرہ اسنشن کا حال	58
ایک عجیب مرغ	58
دریائی گھوڑا	58
قطب ستارہ اور جدی	59
جزائر میڈیرا اور حالات	60
جزائر آئرلینڈ جانے کا سبب	61
شہر کورک کا حال	62
لطیفہ	65
دین محمد سے ملاقات	65
شہر کلکینی کا حال	66

آئرلینڈ کے حالات	66
آئرلینڈ کی راجدھانی، ڈبلن	68
شہر ڈبلن کی روشنی	70
گاڑیوں کی کثرت	71
پتھر کی تصویروں کا حال	72
اسکوائر اور پارک	72
اطراف ڈبلن	73
عمارت عجیب	74
ڈبلن کی نہریں	75
ڈبلن کی عمارتیں	75
گھوڑدوڑ اور اسٹیبل ہاؤس	80
ایک عجیب نقل	81
دوسری نقل	82
نمائش ہال	83
آئرلینڈ کے باشندے	84
اسکاٹ، انگلش اور آئرش	85
آئرش عورتیں	86
ڈبلن کی سردی اور برف باری	87
انگریزی لباس کی خوبیاں	89
برف پر پھسلنا	90
ڈبلن کے معززین کا حال	91
والٹیرس کا حال	93
شرفائے آئرش کا انداز رہائش	94
کپتان ولیرسن کی باتیں۔	94

پورٹر سازی کا کارخانہ	166
کاغذ کا کارخانہ	167
ہینڈ پمپ	167
چھپائی کا کارخانہ	168
انگلینڈ کے تحائف اور نادر اشیاء	169
جشن شادی میں رسم چراغاں	169
حکایت	171
انگریزوں کا نظام اوقات	172
انگریزی کھانا اور کھانے کا طریقہ	173
سونے جاگنے کے اوقات	173
انگلستان کے لیل و نہار	173
عورتوں مردوں میں تقسیم فرائض	174
دکانداروں اور خریداروں کے تقسیم فرائض	176
انگریزوں کی آزادی کا دستور	177
ڈویل یعنی خانہ جنگی	179
تربیت اولاد	180
انگریزوں کا طرز حکومت اور اقتدار شاہی	183
ملکۂ انگلینڈ کا دربار	184
ولی عہد لندن کے اوصاف	185
ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کا حال	189
لندن کے بشپوں کا ذکر اور پہلا بشپ	192
دوسرا بشپ آف ڈارم	193
انگلستان کی پارلیمنٹ دارالعلوم	193

ہاؤس آف لارڈس، دارالامراء 194
ڈیوک کا ذکر 195
لارڈ میئر کا حال 198
انگریزوں کے فضائل 201
انگریزوں کے رذائل 204
بعض جوابات انگریزوں کو 212
انگلینڈ کی بری رسومات 213
ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ 216
انگریزی عدالت کے طریقے 218
آگ بجھانے کا طریقہ 223
انگلینڈ اور فرانس میں جنگ اور صلح 225
انگلینڈ کے بادشاہ کا قدیم ملک ہنور 228
انگریزوں اور فرانسیسیوں کی بڑی لڑائیاں 230
فرانس اور انگلینڈ کی جنگیں خشکی میں 232
نپولین کا سلطنت حاصل کرنا 234
انگلینڈ اور فرانس میں مصالحت 237

حصہ دوم

سفر سے واپسی کا آغاز 238
پیرس کے حالات 239
پیرس کی مشہور عمارتیں 241
کشتیوں پر حمام 241
قہوہ خانوں اور شراب خانوں کی کثرت 245

فرانس کی خوبیاں 248
پیرس کے دوستوں کا ذکر 250
نپولین کی خواہشِ ملاقات 252
لیئنس (LYONS) کا حال 252
جنرل مارٹن کا مکان 253
مارسیلز کا سفر بذریعہ کشتی 254
فرنگستان کا مشہور پُل 254
مصری خواتین کا حسن اور لباس 256
اٹلی کا سفر، بحرِ روم میں 256
طاعون سے حفاظت 257
شہر جینوا کا حال 258
رومیوں کی موسیقی اور ساز 258
دلاّلی کی رسم 258
جینوا کے دوست 259
لیگہارن کا حال 260
رومیوں کی زیب کاری 261
لیگہارن کے دوستوں کا ذکر 262
کپتان رچرڈسن 262
جزیرۂ مالٹا 263
مالٹا کے انگریز 264
مالٹا کے حالات، پھل اور بت 265
مالٹا کی مجلس 266
ایک طوفان کا مقابلہ 267
شہر سمرنا 268

شہر استنبول	272
شتب ستی کا رواج	275
ترکوں کی ٹوپیاں	276
ترکوں کے کھانے	278
استنبول کی عمارتیں، مسجد ایا صوفیہ	279
مساجد	280
اہل استنبول کے محاسن	282
عدالتی احکامات کی تعمیل میں سختی	283
دوستانِ استنبول	287
استنبول سے بغداد تک کا روزنامچہ	289
اماسیہ کی تاریخ	292
شہر ملاطیہ	294
دریائے فرات عبور کیا	295
دریائے دجلہ کا منبع اور شہر ارغنہ	296
شہر ماردین	298
شہر نصیبین اور مزار مبارک سلمان فارسی	299
حضرت خالد بن ولیدؓ کا مزار مبارک	302
موصل	304
محمد پاشا	304
کرکوک	307
شہر بغداد	310
کاظمین کا ذکر	311

عہدِ خلفاء میں بغداد کی آبادی اور رقبہ	311
سرمن رائی	312
کربلا میں اپنے خاندان سے ملاقات	313
کربلا پر وہابیوں کا حملہ	315
وہابیوں کا حسب و نسب اور عقائد	316
نجف میں سراب	322
عمارت روضۂ نجف	322
ایک بدو کا واقعہ	323
ملا محمود متولی	323
بغداد میں میری حالت	325
قبائل منتفج	327
بمبئی میں نصیرالدین کا قتل	329
مسٹر منشی کی بدسلوکی	331
شہر بصرہ	338
خلیج فارس کا حال	339
بمبئی اور اس کی خصوصیات	341
گورنر ڈنکن اور دوسرے انگریز	344
میر عبداللطیف خاں کا حال	347
مہدی علی خاں مہدی	350
آقا حسن	352
سفر کلکتہ	353

تعارف

مرزا ابوطالب

اٹھارہویں صدی عیسوی ہندوستان کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔اس وقت سارا ملک ایک بڑے انقلابی دور سے گذر رہا تھا۔سلطنت مغلیہ کی شہ رگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی چٹکی میں آچکی تھی۔ ملک وقوم کو فرنگیوں کی غلامی سے بچانے کی کوشش کرنے والے چند مجاہدوں کو اپنوں کی بے وفائی اور غداری کے باعث ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔پایۂ تخت دہلی برباد ہو چکا تھا۔لیکن ملک کے کچھ علاقوں میں اس وقت بھی امن وسکون نظر آرہا تھا۔وہ بھی اس لیے کہ ان علاقوں کے حکمرانوں نے فرنگیوں کی برتری تسلیم کر کے اُن کے دامن میں پناہ حاصل کرلی تھی۔ان میں سب سے ممتاز اودھ کا علاقہ تھا۔

اس پُرآشوب دور میں اودھ کی راجدھانی لکھنؤ سے مرزا ابوطالب کی پُراسرار شخصیت نمایاں ہوئی جس کے حالاتِ زندگی اور اکثر کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔لیکن اس کے باوجود اب تک اس کی تہہ بہ تہہ اور پہلو دار شخصیت کے صحیح خدوخال پر پردہ پڑا ہوا ہے۔محققین اس کا تجزیہ کرتے رہے لیکن کوئی فیصلہ کن نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ابوطالب پہلا ہندوستانی سیاح تھا جس نے یورپ کا سفر کیا اور بعض افریقی ممالک کی سیر کی، یورپ سے ترکی اور مشرقی وسطیٰ کے بعض اہم علاقوں کی سیاحت کرتا ہوا ہندوستان واپس آیا۔

مرزا ابوطالب ۱۷۵۲ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوا، اس کے والد مرزا محمد بیگ اصفہان سے ہندوستان آئے تھے۔ وہ نسلاً ترک تھے اور ان کا آبائی وطن آذربائجان تھا۔ مرزا محمد بیگ نادر شاہ کے حملوں کے زمانے میں ایران چھوڑ کر ہندوستان آئے تھے اور نواب ابوالمنصور صفدر جنگ والیٔ اودھ کے حلقۂ ملازمین میں شامل ہو گئے تھے۔صفدر جنگ کے بعد نواب شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ مقرر ہوئے۔ان سے محمد بیگ کی ان بن ہوگئی اور وہ بال بچوں کو چھوڑ کر بنگال چلے گئے مرزا ابوطالب کی تعلیم و تربیت نواب شجاع الدولہ کے زیر سایہ ہوئی۔اس کے بعد آصف الدولہ نے سرپرستی کی۔سن شعور کو پہونچنے کے بعد اپنے والد کے پاس مرشد آباد چلا گیا۔وہاں ایک امیر

مظفر جنگ کے خاندان میں شادی کرلی اس کے بعد لکھنؤ واپس آیا اور نواب آصف الدولہ کی ملازمت اختیار کی۔ فرائض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا اور نیک نام رہا لیکن کچھ عرصہ بعد درباری سیاست کے باعث ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس میں نائب وزیر اودھ کا ہاتھ تھا۔ جو ابوطالب سے حسد کرتا تھا۔ اس زمانہ میں ابوطالب انگریزوں سے قریب ہوتا گیا۔ کمپنی کے انگریز کارندوں اور افسروں سے اس نے خوب تعلقات بڑھائے اور رفتہ رفتہ وہ انگریزوں کا معتمد علیہ بن گیا۔ آصف الدولہ کی ملازمت سے علیحدہ کیا گیا تو وہ اس کی شکایت لے کر گورنر جنرل کے پاس کلکتہ پہنچا۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ لکھنؤ آیا۔ لیکن حالات موافق نظر نہ آئے اس لیے کلکتہ واپس چلا گیا۔ گورنر جنرل کارنوالس اس کی بے حد قدر و عزت کرتا تھا۔ دونوں میں خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ اس کے خطوط نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں محفوظ ہیں۔ جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گورنر جنرل اور معزز انگریز حکام سے اس کے مراسم کتنے گہرے تھے۔

حالات اور واقعات کی کڑیاں ملانے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابوطالب اپنی غیر معمولی علمی لیاقت فنون سپہ گری میں مہارت اور اپنی خاندانی وجاہت کے پیشِ نظر چاہتا تھا کہ اودھ کی وزارت کا منصب اس کو حاصل ہو جائے۔ اس اُمید کے سہارے اس نے بعض اہم ملکی خدمات انجام دینے میں کافی محنت کی۔ بعض اہم مہموں میں زبردست کامیابی حاصل کی، لیکن خلافِ توقع ان خدمات کی قدر نہیں کی گئی اور درباری امراء اور وزراء نے اس کو نواب وزیر آصف الدولہ کی نظروں میں مشتبہ شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا۔ اُمید و بیم کی اس کشمکش میں وہ حالات کا جائزہ لے کر انگریزوں سے جا ملا۔ اور ایسٹ انڈیا نے اس کو اعتماد میں لے کر اپنا آلۂ کار بنا لیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو کن مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، اور کیا کیا خدمات اس سے لی گئیں۔ تاریخوں اور تذکروں میں اس کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن اس کی شخصیت کا جائزہ کسی نے نہیں لیا۔ ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے ہمارے قیاس کی تصدیق ہوتی ہے۔ خود ابوطالب نے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات مسیر طالبی کے دیباچہ میں اور بعض دوسری تصانیف کے آغاز میں لکھے ہیں۔ ابوطالب نہ صرف انگریزوں کی مدح سرائی کرتا ہے بلکہ وہ ان کی تہذیب و معاشرت اور حسن و اخلاق کی تعریف میں مبالغہ سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح خود انگریز مورخین، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ عہدے داران نے اس کو غیر معمولی شخصیت قرار دیا ہے۔ انگریزوں کی نظر میں اس کی جو قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا

ہے کہ جب وہ انگلستان پہنچا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بادشاہِ انگلستان نے اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا، شاہی محل میں اُس کی دعوت کی، انعام و اکرام سے نوازا۔ وزرا اور پارلیمنٹ کے ممبروں نے اُس کو آنکھوں پر بٹھایا۔ فرانس پہنچا تو نپولین نے اُس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ترکی میں شاہی مہمان ہوا۔ جب استنبول پہنچا تو انگلستان کے سفیر نے جہاز سے اُترتے وقت اپنی طرف سے توپوں کی سلامی دی۔ ان حالات کی تفصیل سفرنامے کے مطالعے سے معلوم ہوگی۔

ابوطالب نے یورپ کا سفر کیوں کیا۔ اس کے متعلق سفرنامے کے دیباچہ میں اس نے تفصیل سے روشنی ڈالی لیکن حالات اور واقعات سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ اس نے اس سفر کرنے کا جو سبب لکھا ہے وہی اصل سبب تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے لکھا ہے کہ وہ کوئی سفارتی عہدہ حاصل کرنے کے لیے انگلستان گیا تھا (بحوالہ امپیریل ہسٹری آف انڈیا)۔ ریونڈ مکھانن لکھتا ہے کہ اس نے ابوطالب کو لندن جاتے وقت مسٹر گرانٹ کے نام ایک خط دیا تھا جس میں سفارش لکھی تھی کہ ابوطالب کو لندن میں قایم ہونے والے میوزیم میں مشرقی نوادرات کے سیکشن کا نگراں بنایا جائے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ ابوطالب اپنے بیٹے کو تعلیم دلانے انگلینڈ جا رہے ہیں۔ یہ بات عجیب ہے کہ ابوطالب نے اپنے سفرنامے میں مذکورہ اسبابِ سفر میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر وہ ملازمت کا خواہاں تھا تو اُس کو آکسفورڈ میں فارسی پروفیسر کی جگہ پیش کی گئی تھی۔ مگر اُس نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔ اس نے اپنے لڑکے اور اس کی تعلیم کا کہیں ذکر تک نہیں کیا۔ اگر وہ لڑکے کو انگلستان ساتھ لے جاتا تو اس طول طویل سفر کے حالات میں کہیں تو اس کا ذکر کرتا۔ مگر اس کے سفرنامے میں اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ لندن میں جس طرح اُس نے وقت گذارا، اگر لڑکا ساتھ ہوتا تو وہ اپنے اخلاقی اور تعلیمی نقطۂ نظر کا لحاظ کر کے ہرگز اس کو اس ماحول میں آزاد نہ چھوڑتا۔ ایسی صورت میں ریونڈ مکھانن کے خط کی روایت کو غلط قرار دیا جائے، یا اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابوطالب نے یہ خط تو حاصل کر لیا تھا مگر اپنے لڑکے کو ساتھ نہیں لے گیا۔ بہر حال ابوطالب کے پُراسرار حالات میں اس کو بھی شمار کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مرزا ابوطالب کا لڑکا مرزا حسن علی فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھا۔ اس نے ۱۸۱۲ء میں ڈاکٹر ولسن کے ساتھ مل کر مسیر طالبی کی طباعت کا انتظام کیا تھا۔ جو ہندوستانی چھاپہ خانہ کلکتہ سے چھپی تھی۔ لگ بھگ اسی زمانہ میں میر حسن علی نام کے ایک صاحب کا لکھنؤ میں قیام تھا جو انگلینڈ سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے

اور ان کی بیوی بھی یورپین تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میر حسن علی سے شاید مرزا حسن علی ہی مراد ہوں، کسی نے مرزا کے بجائے میر لکھدیا ہے۔ تاہم لکھنؤ کے میر حسن علی کے حالات کا علم نہیں ہے۔

مسیر طالبی

ابوطالب سے بیس پچیس سال قبل بنگال کے اعتصام الدین نامی ایک شخص نے پہلی بار انگلستان کی سیاحت کی تھی۔ ان کا سفرنامہ "شگرف نامۂ ولایت" کے نام سے موجود ہے جو بہت مختصر ہے۔ اور اس سے خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ تاہم اس کو پہلا ہندوستانی سیاح کہا جاتا ہے جس نے انگلستان کا سفر کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا پہلا سیاح ابوطالب تھا جس نے انگلستان کے تعلیمی، سماجی سیاسی، اور صنعتی حالات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس نے انگلینڈ کے علاوہ جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، فرانس، اٹلی، یونان، ترکی، اور عراق عرب کی سیاحت بھی کی اور ہر جگہ کے حالات کا جائزہ لیا۔ اس کا سفرنامہ انیسویں صدی کے بہترین سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کو یورپ میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اصل فارسی مسودہ کی طباعت سے قبل اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۱۰ء میں یورپ میں شائع ہوا۔ اس کا خلاصہ ۱۸۱۱ء میں فرانسیسی اور ۱۸۱۴ء میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔ ابوطالب اور اس کے سفرنامہ کا تذکرہ الیٹ اور ڈاؤسن نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ پھر نیز اسٹوری نے اپنی کتاب پرشین لٹریچر میں اس کا حال لکھا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے

ابوطالب نے انگلستان میں دو سال گزارے۔ شاہی دربار سے لے کر عوامی حلقوں تک اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہ ہر قسم کی سرکاری اور نیم سرکاری تقریبات میں شرکت کرتا تھا۔ امیروں کی مجلسوں اور بے تکلف محفلوں میں اس کو عزت کے ساتھ بلایا جاتا تھا۔ کسی ہندوستانی کو یورپ میں ایسی عزت حاصل نہیں ہوئی۔ ابوطالب روزمرہ پیش آنے والے حالات اور واقعات پابندی سے لکھتا رہا اور سفر سے واپسی کے بعد اس نے اپنا سفرنامہ مرتب کیا اور اس کا نام مسیر طالبی فی بلاد افرنجی رکھا۔ اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام ابوطالب کی وفات کے چھ سال بعد فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے کیا تھا۔ تصحیح ڈاکٹر ولیمن کی نگرانی میں مرزا حسن علی اور میر قدرت علی نے کی، ۱۸۱۲ء مطابق ۱۲۲۸ھ ہندوستانی پریس کلکتہ میں اس کی طباعت ہوئی۔ پیش نظر ترجمہ اسی پہلے ایڈیشن سے کیا گیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ زبان آسان اور بامحاورہ ہو اور کوئی لفظ ترجمہ سے رہ نہ جائے۔ اشخاص اور مقامات کے

تمام نام ابوطالب نے فارسی رسم الخط میں لکھے ہیں۔ مرتب کتاب نے اپنے لہجہ اور تلفظ کے مطابق انگریزی ناموں کو فارسی رسم الخط میں لکھتے وقت اکثر انگریزی تلفظ کی پابندی نہیں کی ہے۔
یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ابوطالب نے حسینانِ لندن کے حسن وجمال سے متاثر ہو کر بعض کی مدح میں غزلیں بھی لکھی ہیں جو سفرنامہ میں درج کی ہیں۔ ان کو غیر ضروری سمجھ کر ترجمہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ فارسی داں تو ان غزلوں کے شاعرانہ محاسن کے باعث ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن اردو ترجمہ کی صورت میں ان کے اندر کوئی لطف وخوبی نہیں۔

دیگر تصانیف اور علمی خدمات

مرزا ابوطالب کو عربی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل تھی وہ فارسی کا بلند پایہ ادیب اور صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کے علاوہ وہ سیاست داں، مورخ، ماہر فلسفہ وطب تھا اور فنون سپہ گری میں دستگاہ رکھتا تھا اس کی جو تصانیف موجود ہیں ان سے اس کے علم وفضل کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

(۱) خلاصۃ الافکار (تالیف ۱۷۹۱ء) یہ کتاب ۲۸ حدیقوں پر مشتمل اور تین حصوں میں تقسیم ہے۔ حصہ اول و دوم میں فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس میں ایران کے علاوہ ہندوستان کے فارسی شاعروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد علم اخلاق، موسیقی، عروض وقوافی، حکمت، وغیرہ پر ایک ایک حدیقہ میں اپنے افکار و نظریات پیش کیے ہیں۔ آخری حدیقہ میں اپنے ہم عصر شعراء کا ذکر کیا ہے اس کتاب کا مکمل اور صحیح مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے جو نہایت صاف اور خوش خط لکھا ہوا ہے۔ راقم الحروف نے ابوطالب پر اپنے تحقیقی مقالہ کے سلسلے میں اس نسخہ کا زیروگراف حاصل کیا تھا جو اس وقت پیش نظر ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور دہلی یونیورسٹی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے جو ناقص ہے۔ اب تک اس کی اشاعت نہیں ہو سکی۔

(۲) لب السیر وجہاں نما (تالیف ۱۷۹۳ء) یہ دنیا کی تاریخ ہے جس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر امریکہ کی دریافت تک کے حالات اختصار کے ساتھ لکھے ہیں۔ یہ تاریخ اس نے نواب آصف الدولہ کے نام معنون کی تھی۔ یہ بھی اب تک طبع نہیں ہوئی۔ انڈیا آفس لائبریری لندن میں اس کا مکمل مخطوطہ موجود ہے اور راقم الحروف کے پاس اس کی نقل موجود ہے۔

(۳) معراج التوحید (تالیف ۱۷۹۳ء) یہ علم فلکیات کے موضوع پر ایک دلچسپ

کتاب ہے۔ جس کو ابوطالب نے ایران کے سلطان محمد صفوی کے نام منسوب کیا تھا۔

(۴) تفضیح الغافلین (تالیف ۱۷۹۶ء) یہ عہد آصف الدولہ کے سیاسی، ملکی اور عام حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعے سے مصنف کی ان سرگرمیوں اور خدمات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو اس عہد میں اس نے انجام دی تھیں اور انگریزوں سے اس کے خصوصی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کا ایک انگریز مسٹر ہوی (HAVY) نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جس کا نام "ہسٹری آف آصف الدولہ نواب وزیر اودھ" ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۹۵ء میں گورنمنٹ پریس الٰہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک اچھا فارسی مخطوطہ صولت لائبریری رامپور میں موجود ہے اس کی نقل عابد رضا بیدار نے حاصل کر کے کئی سال قبل شائع کی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ راقم الحروف نے کیا جو مکتبہ صبح ادب دہلی نے شائع کیا تھا۔

(۵) مثنوی سرور افزا۔ یہ مثنوی انگلستان کے دوران قیام لندن کی مدح میں لکھی تھی اس میں ایک ہزار اشعار ہیں۔ اس کا ایک نسخہ اڈنبرا کی لائبریری میں اور دوسرا انڈیا آفس میں موجود ہے۔ راقم السطور نے اس کا زیروگراف حاصل کیا ہے۔

(۶) دیوان مرزا ابوطالب: اس دیوان کا ایک ناقص نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے بعض دوسرے کتب خانوں میں بھی اس کی موجودگی کا علم ہوا ہے۔ یہ دیوان اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۰۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔ بعض اجزاء کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی چھپ چکا ہے۔ مسیر طالبی میں ابوطالب نے اپنی بعض غزلوں کے انگریزی ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ جن کو لندن اور پیرس کے اخبارات و رسائل نے اس زمانہ میں شائع کیا تھا۔

ان کتابوں کے علاوہ، منتخبات مسیر طالبی کے نام سے ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے مسیر طالبی کا خلاصہ بھی شائع ہوا تھا۔ ابوطالب نے ایشیائی خواتین کے حقوق اور ایران کے رسم و رواج پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس کا انگریزی ترجمہ اس کے قیام کے زمانہ ہی میں لندن سے شائع ہو گیا تھا، یہ رسالہ مسٹر چارلس اسٹیوارٹ نے اپنے مسیر طالبی کے انگریزی ترجمہ کے آخر میں بھی شامل کر دیا ہے۔ جو متعدد بار انگلینڈ اور ہندوستان میں چھپ چکا ہے۔ ابوطالب نے خواجہ حافظ شیرازی کا دیوان مرتب کر کے پہلی بار ۱۷۹۱ء میں شائع کرایا تھا۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق حافظ کا یہ سب سے پہلا مطبوعہ دیوان ہے۔

مرزا ابوطالب یورپ کے طویل سفر سے ۴ اگست ۱۸۰۳ء کو واپس کلکتہ پہنچا۔ کچھ آرام کرنے کے بعد اپنے دوست آگسٹس پیپر روک کی مدد سے بندیل کھنڈ کے ایک ضلع کا عامل مقرر ہوا۔ اور اسی منصب پر کام کرنے کے دوران ۱۸۰۶ء میں اس کی وفات ہوئی۔ لکھنؤ میں مدفون ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی بیوی اور خاندان کی پنشن مقرر کردی۔

ڈاکٹر ثروت علی

دہلی دسمبر ۱۹۸۰ء

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خداوندِ عالم کی حمد جو انسان کو ہمت اور اُس کے ارادوں کو استقامت عطا فرمانے والا ہے، اور عرب و عجم کے برگزیدہ، فلکِ اعظم کے سیاح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور ان کے اہلِ بیت و اصحابِ کرام پر درود و سلام کے بعد بحر و بر عالم کا سیاح ابو طالب بن محمد اصفہانی شائقان نکتہ دان کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ مکروہاتِ زمانہ اور گردشِ ایام کے سبب سے چونکہ وطن میں میرا قیام اور سکون دشوار ہو گیا تھا۔ اس لیے میری عمر کا بڑا حصہ دور دراز کے سفروں میں بسر ہوا۔ مجھے خشکی اور تری کے عجائب و غرائب دیکھنے اور بنی نوعِ انسان کے ہر گروہ سے ملنے جلنے کا موقع ملا۔ میرے متخیل دل میں خیال آیا کہ فرنگستان کے واقعات و حالاتِ سفر قلم بند کروں۔ اور اس ملک کی تمام مفید اشیا کا حال تحقیق و تدقیق کر کے اس سفرنامے میں درج کروں، تاکہ ممالکِ فرنگستان کے عجیب و غریب حالات اور مختلف قوموں کے دستور جن سے اہلِ اسلام کو واقفیت نہیں ہے، لوگوں کو معلوم ہوں۔ (بمصداق "کُلُّ جدیدٍ لذیذٌ" ہر نئی چیز ذائقہ دار ہوتی ہے) سننے والوں کے لیے لُطف اور طالبین کے لیے اشتیاق کا باعث ہوں۔ عوام الناس ان لوگوں کے طریقۂ تعلیم و تربیتِ اولاد، آدابِ و تہذیب و تمدّن اور صنعتوں اور ایجادوں سے آگاہ ہوں۔ ان پر اس کا اچھا اثر پڑے۔ اور وہ ان کی تقلید کر کے اُن گوناگوں فوائد سے بہرہ یاب ہوں۔ جو ہرگز قوانینِ اسلام کے خلاف نہیں۔ شاید اس حسنِ نیت کے باعث میرا خاتمہ بالخیر ہو۔ اور میرا ذکرِ خیر عرصہ تک لوگوں کی زبانوں پر رہے۔ لہٰذا میں نے حالاتِ سفر تاریخ وار بطور روزنامچہ لکھنا شروع کیے، اور ۱۲۱۸ھ ہجری میں جب میں اس طویل سفر سے خلافِ اُمید صحیح و سالم کلکتہ پہنچا تو میں نے اپنے مسوّدات کا خلاصہ مرتب کیا۔ اور ان اوراقِ پریشان کو اس کتاب کی لڑی میں پرو دیا اور اس کا نام "مسیر طالبی فی بلاد افرنجی" رکھا۔

ابنائے زمانہ کی پست ہمتی، اخلاق رذیلہ اور غلط طور طریقوں کے باعث جو خاص طور پر مسلمانوں میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ میری ہمت نہیں پڑتی تھی، اس لیے کہ دولت مند غفلت اور غرور کے نشہ میں سرشار ہیں اور بے علمی کے باوجود ہمہ دانی کا دعویٰ کرتے ہیں اور غریب لوگ معاشی دشواریوں کے سبب بے اطمینانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھیں روز پیٹ بھر روٹی حاصل کرنے کی جد و جہد میں سر کھپانے کی فرصت نہیں ملتی، پھر وہ نئی معلومات کی تحصیل اور تازہ تجربات سے استفادہ کس طرح کریں گے۔ حالانکہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں نئی باتوں سے واقفیت کا شوق ودیعت کیا ہے اور اس کو انسان کے لیے سرمایۂ عزت قرار دیا ہے۔ لیکن مجھ کو یقین ہے کہ میری محنت و عرق ریزی کا اتنا نتیجہ بھی نہ نکلے گا جتنا افسانوں اور خیالی مضمونوں کو پڑھ کر نکلتا ہے۔ جن کا مقصد دل بہلانا اور وقت گزارنا ہوتا ہے۔ اگر کسی نے کبھی اس کتاب کے دو چار ورق الٹ پلٹ کر دیکھے بھی تو انگریزی زبان کے اکثر الفاظ دیکھ کر ہی طبیعت میں انتشار پیدا ہوگا۔ اس لیے پڑھنا تو دو کنار کوئی اس کو ہاتھ بھی نہ لگائے گا۔ تاہم جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔ غیر مانوس نام اور غریب الفاظ تحریر کرنے پر مجبور ہوں، جن کو سمجھنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ مگر اس کے بغیر مضمون کچھ کا کچھ ہو جائے گا اور مطلب بھی اچھی طرح واضح نہ ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ مفلسی اور تنگدستی کے باعث اکثر چیزوں کا فائدہ کچھ ناتمام رہا۔ کیونکہ مشینوں کی تصویریں اور کارخانوں کے نقشے تیار نہ ہو سکے، جن سے کتاب پڑھنے والوں کو مدد ملتی لیکن اس مثل کے مطابق "مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ"، ترک کرنا بھی مناسب خیال نہیں سمجھا۔ ناظرین اس مجبوری پر نظر رکھتے ہوئے میرا عذر قبول کریں۔ بعض نامانوس نام اور مشکل مطالب جو تھوڑے غور و فکر سے حل ہو سکتے ہیں، ان سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ اور اس کی وجہ سے کتاب کے مطالب میں گھبراہٹ نہ محسوس کریں۔ کیوں کہ اس میں بلادِ فرنگ کی تمام مفید باتیں درج ہیں۔

اسبابِ سفر و ترکِ وطن

اب پہلے اپنے ان ذاتی حالات پر روشنی ڈالنا مناسب ہے، جن کے باعث میں اس عظیم سفر کے لیے آمادہ ہوا۔ اس کے بعد سفر کا روزنامچہ شروع ہوگا۔ ناظرینِ سفرنامہ سے یہ بات پوشیدہ نہ رہنا چاہیے کہ اس حقیر کے والد بزرگوار حاجی محمد بیگ خان ترک قوم سے تعلق رکھتے تھے اور عباس آباد (اصفہان) کے رہنے والے تھے۔ عہدِ جوانی میں نادر شاہی حملوں سے پریشان ہو کر اصفہان کو خیرباد کہہ کر ہندوستان آ گئے۔ اور وزیر ابوالمنصور خان صفدر جنگ کے رفیقوں میں شامل ہو گئے۔ راجہ نول رائے کے قتل

کے بعد محمد علی خاں صوبۂ اودھ کے نائب مقرر ہوئے تو میرے والد ان کے ساتھ متعین کیے گئے، اور انھیں تقرب اور خصوصیت حاصل ہوئی۔ صفدر جنگ کی وفات کے بعد نواب شجاع الدولہ نے اپنے چچازاد بھائی کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا اور اس کے رفیقوں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے، میرے والد کی گرفتاری کا قصد کیا۔ مگر وہ اس سے پہلے ہی حفظِ ماتقدم پر عمل پیرا ہو کر بنگال کی طرف چلے گئے۔ تھوڑے جواہرات اور اشرفیاں اور چند غلام ان کے ساتھ تھے۔ اپنا سارا مال و اسباب نیز اہل و عیال کو وہ لکھنؤ میں چھوڑ گئے۔ کچھ عرصہ بنگال میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کی اور وہیں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ سنہ وفات ۹ جون ۱۷۶۶ء (مطابق ۱۱۸۰ھ) ہے۔

میرے نانا ابوالحسن بیگ ایک دیندار اور پرہیزگار آدمی تھے۔ برہان الملک کے ہم وطن اور ان کے قدیمی دوستوں میں سے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد اُنھوں نے علائقِ دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی گزار دی۔

مجھ بے سعادت کی ولادت ۸ نومبر ۱۷۵۲ء (مطابق ۱۱۶۶ھ) کے آخر میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ جب والد بنگال ہجرت کر گئے تو نواب شجاع الدولہ نے قومی ہمدردی کے لحاظ سے میرا مکتب کا خرچ مقرر کیا۔ اور میری تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کرتے رہے۔ چار سال بعد والد نے مرشد آباد بلایا۔ اس وقت میری عمر ۱۲ سال تھی اور یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ہی عظیم آباد تک خشکی کے راستے گیا اور وہاں سے بذریعہ کشتی مرشد آباد پہنچا۔ وہاں صرف ڈیڑھ سال والد کی خدمت کی سعادت حاصل رہی۔ اس کے بعد گردشِ زمانہ نے یتیم بنا دیا اور خانہ داری کی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔

نواب خانخاناں بہادر مظفر جنگ کے عزیزوں میں ایک لڑکی مجھ سے منسوب ہوئی تھی۔ اس لیے کئی سال نواب مذکور کی خدمت میں بسر ہوئے۔ سنہ ۱۱۹۵ھ میں جب حکومت نواب آصف الدولہ کے ذمہ آئی تو میں نواب مختار الدولہ ثابت جنگ کے بلانے پر دوسری بار وطن مالوف پہنچا۔ اٹاوہ اور دوآبہ کے کئی درمیانی علاقوں کا انتظام میرے سپرد ہوا۔ بنگال سے واپسی میں دریا کے راستے سفر کیا بکسر تک دریائے گنگا میں اور وہاں سے فیض آباد تک دریائے گھاگرہ میں، یہ سفر بہت تکلیف دہ تھا۔

چونکہ دوآبہ کے متعلق محالوں کا طول کان پور سے الہ آباد شہر تک دو ہفتہ کی راہ ہے۔ اس لیے اس علاقہ کے دورے میں پورے دو سال صرف ہو گئے۔ اس کے بعد مختار الدولہ کا جانشین حیدر بیگ کابلی نائب وزیر مقرر ہوا تھا۔ اور اس نے مجھ سے بعض اختلافات کی بنا پر مجھے میرے عہدے

سے معزول کر دیا۔ اس کے بعد بھی میں ایک سال لکھنؤ میں رہا۔ اس دوران میں محالات گورکھپور کرنل
الگزینڈر کی نگرانی میں دیے گئے۔ کرنل موصوف نے اپنی مدد کے لیے وزیر سے اجازت لے کر مجھے
ساتھ لے لیا۔ یہ علاقہ بھی طول میں پندرہ دن کی راہ ہے۔ پورے تین سال یہاں صرف ہوئے
یہاں برسات میں بھی سفر کرنا پڑتا تھا۔ ہر گاؤں میں میرے واسطے پھوس کے مکان بنائے جاتے
تھے۔ ہر سال خیموں کی تجدید ہوتی تھی۔ اس کے بعد کرنل کے ساتھ معزول ہو کر ایک سال تک لکھنؤ
میں خانہ نشین رہا۔ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقرر کردہ افسروں مسٹر مڈلٹن و مسٹر جانسن
اور حیدر بیگ کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا اور حیدر بیگ نے ان کے ساتھ دغا بازی شروع کی
اس لیے سارے ملکِ اودھ کا انتظام خراب ہو گیا اور ہر سال مال گزاری میں کمی ہونے لگی۔ زمینداروں
نے دور دراز کے محالات کو غارت کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک راجہ بل بہدر سنگھ تھا جو
تمام صوبۂ اودھ کی وراثت اور نواب وزیر سے مقابلہ کا دعویٰ کرتا تھا۔ ایک لاکھ راجپوتوں کی فوج
اس کی ماتحتی میں تھی۔ وہ بہت زیادہ نافرمانی اور سرکشی کرنے لگا۔ کئی بار نواب وزیر اور ایسٹ انڈیا
کمپنی کی فوجیں اس کی سرکوبی کے لیے متعین کی گئیں۔ مگر حیدر بیگ کے مقرر کردہ عملے کے مکر و فریب
کے باعث کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ گورنر ہسٹنگز کے اشارے پر مسٹر مڈلٹن نے مجھ کو اس راجہ کی سرکوبی کی ترغیب
دی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس بدنظمی کا باعث حیدر بیگ ہے۔ اور اس کام میں میرا کوشش کرنا اس کی
مرضی کے خلاف ہوگا۔ اور اس کی عداوت میری خانہ ویرانی کا سبب بنے گی۔ اس لیے میں نے بہت
معذرت کی مگر کمپنی کے ارباب حل و عقد نے اپنی غرض کے پیشِ نظر میرا کوئی عذر قبول نہ کیا اور دشمنوں
کے شر سے محفوظ رکھنے کا وعدہ کر کے یہ خطرناک مہم میرے سپرد کر دی۔ میں نے دو سال تک اس مہم
کو سر انجام دینے کے لیے پورے صوبۂ اودھ کا طول و عرض میں دورہ کیا۔ راجہ مذکور سے کئی لڑائیاں
ہوئیں۔ آخر کار اس خاندان کا یہ صد سالہ دشمن مارا گیا اور ملک اس کے شر سے پاک ہو گیا۔ اور صوبہ
کا انتظام بھی حسبِ دلخواہ عمل میں آیا۔ لیکن اسی کے ساتھ میری تباہی اور خانہ بربادی کے سامان
بھی مہیا ہو گئے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کمپنی کے دو افسر جنھوں نے میری مدد کا وعدہ کیا تھا، معزول
ہو گئے۔ گورنر ہسٹنگز ولایت چلے گئے۔ کلکتہ میں نئے حکام آ گئے۔ میری حمایت و مدد کے تمام
وعدے قصۂ پارینہ ہو گئے۔ ان تغیرات کے دوران حیدر بیگ نے دوزخی پالیسی کے باوجود
حیلہ سازی اور رشوت کی مدد سے اپنے کو سلطنت کا خیر خواہ ثابت کر کے اقتدار حاصل کر لیا۔ اور

چند سال میرے ساتھ بھی ظاہری طور پر اچھا سلوک کرتا رہا۔ اس لیے انگریزی سرکار سے اس کی شکایت کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنی عادت کے مطابق دوستی کے پردے میں دغابازی کے ساتھ مجھ کو پھانسنے کی کوشش کی۔ اور لالچ کا جال بچھا کر مجھے ہم خیال بنانے کی جدوجہد کی۔ لیکن جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو کھل کر مجھے پریشان کرنے لگا۔ مجھے سرکار اودھ سے چھ ہزار روپیہ سالانہ جو وظیفہ ملتا تھا اُس کی ادائیگی میں کوتاہی اور بات بات پر جھگڑے پیدا کرنے لگا۔ لہٰذا میں نے لکھنؤ کے قیام کو دشوار سمجھ کر دوبارہ بنگال کا سفر اختیار کیا۔ ۱۲۰۲ھ میں دریائے گنگا کے راستے کلکتہ پہنچا اور لارڈ کارنوالس گورنر جنرل کو اپنی پریشانی بتائی۔ لارڈ موصوف بہت عزت سے پیش آئے۔ اور مجھ سے مدد کا وعدہ بھی کیا۔ مگر اس زمانے میں وہ دکن جانے والے تھے۔ جہاں سلطان ٹیپو سے جنگ درپیش تھی۔ چار سال تک میرے کام میں تعطل رہا۔ کئی بار اہل و عیال کے ساتھ آمد و رفت اور مکان اور باغ کی تعمیر کے سبب اخراجات بہت زیادہ ہو گئے اور میں قرض سے لد گیا اس سفر میں سب سے زیادہ نقصان مجھے یہ پہنچا، کہ میرا چار سال کا بچہ جو سارے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ کلکتہ کی ناموافق آب و ہوا اور وہاں کے اطبا، کی نادانی کے باعث بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ اس داغ نے سب کے دلوں کو کباب کر دیا۔ اس بچے کی پیاری پیاری باتوں کے سبب پڑوسی بھی اس سے مانوس تھے۔

القصہ جب لارڈ کارنوالس دکن سے لوٹے تو انھوں نے میرے معاملات پر غور کیا۔ انھیں دنوں حیدر بیگ کا انتقال ہوا تھا۔ لہٰذا میرے تعلقات سرکار اودھ سے قائم کرنے کے لیے ۱۲۰۷ھ میں لارڈ موصوف نے مجھے لکھنؤ روانہ کیا۔ اور میری سفارش میں ایک خط نواب وزیر کے نام لکھ دیا جو ان کی لیاقت اور بزرگی کے شایانِ شان تھا۔ اس سفارش کا یہ اثر ہوا کہ وزیر اور ان کے اہلکاروں نے میری خاطر خواہ تعظیم و تکریم کی۔ مقصد حاصل ہونے کی پوری اُمید تھی لیکن میری بد قسمتی کہ لارڈ کارنوالس اسی زمانے میں ولایت چلے گئے۔ اس لیے ان لوگوں کے قول و اقرار بھی سست پڑ گئے اور ٹال مٹول کرنے لگے۔ اسی زمانے میں نواب وزیر اور مسٹر چیری کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ وزیر کی شکایت پر معزول کر دیئے گئے۔ اس واقعہ کے بعد وزیر کے کارکنوں نے اپنی نالائقی کا ثبوت دیا۔ اور اپنے آپ کو مستقل حاکم سمجھ کر میرے پاس پیغام بھیجا کہ اب تم کو مسٹر چیری کے ساتھ لکھنؤ سے باہر جانا چاہیئے۔ میں نے ان سے بہت کچھ کہا کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ میں اگر تمہارے ساتھ رہوں گا تو تمہارے لیے نہایت مناسب ہوگا ضرورت

کے وقت تمہاری رہنمائی کروں گا۔ لیکن میرے اس کہنے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس لیے میں نے خاندان کے کچھ لوگوں کو لکھنؤ میں چھوڑا اور کچھ کو الٰہ آباد پہنچا کر خود بنارس پہنچا وہاں سے ۱۲۱۰ ہجری میں تیسری بار دریائے گنگا کے راستہ کلکتہ پہنچا۔ اس وقت بنگال کے گورنر لارڈ ٹن موٹ عرف سرجان شور تھے انھوں نے میرے حالات سن کر مدد کا وعدہ کیا۔ اس دوران میں نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے جانشین وزیر علی خان کی تخت نشینی کے جھگڑے اور چند دوسرے واقعات پیش آئے۔ لیکن لارڈ موصوف کو اس طرف توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا اور وہ اسی زمانے میں ولایت چلے گئے۔ اس کے بعد تین سال میں نے اور انتظار و پریشانی میں گزارے۔ اس دوران میں جو رفیق اس وقت تک میرے ساتھ تھے۔ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ میری تین اولادیں اور چار کنیزیں جنھوں نے کلکتہ میں میری اور میری اولاد کی خدمت کی تھی۔ مسلسل سفر اور میری جدائی کے غم و تکلیف سے غم زدہ ہو کر دنیا سے کنارہ کش ہو گئیں۔ اور کربلائے معلّٰی اور نجف اشرف میں جا کر بس گئیں۔ میں کلکتہ کے طویل قیام اور لوگوں کی تفرقہ پردازی سے غم زدہ رہتا تھا۔ ایک دن کپتان رچرڈسن جو اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے اور ہندی اور فارسی بخوبی جانتے تھے اور میرے پرانے دوست تھے، وہ انگلستان کے سفر پر آمادہ ہوئے اور مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ اگر تم بھی انگلستان کا ارادہ کرو تو موجودہ الجھن سے نجات ملے گی اور دنیا کے عجائب و غرائب دیکھنے کا موقع ہاتھ آئے گا۔ میں سفر کے دنوں میں تمہیں انگریزی زبان کی تعلیم دینے کی کوشش کروں گا۔ میں نے محض اس خیال سے کہ سفر پُرخطر اور طویل ہے اور عرصہ دراز تک سمندر میں گھومتے رہنے اور مختلف ممالک سے ہو کر گزرنے کے باعث آب و ہوا کی بار بار تبدیلی اور اختلاف کے اثر سے کہیں نہ کہیں موت سے دوچار ہو کر زمانہ کی کشمکش اور دوستوں کے ظلم و جور سے نجات پا جاؤں گا، کپتان مذکور کی بات مان لی اور ان سے سفر میں رفاقت کا اقرار کر لیا۔ دوسرے روز کمپنی کے ایک جہاز "شارلٹ" میں ایک کمرہ کرایہ پر طے کیا۔ مگر اتفاق سے چند دن بعد اس جہاز میں آگ لگ گئی اور وہ جل گیا۔ چونکہ سفر مقدر ہو چکا تھا۔ اس لیے اس تاخیر کے باوجود میرے ارادے میں کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے بعد کپتان رچرڈسن کی کوشش سے ایک دوسرے جہاز "کرسٹام" میں ایک کمرہ کرایہ پر مل گیا۔ اس جہاز کا کپتان ٹاملیمن تھا۔

آغاز سفر فرہنگ

آغاز سفر فرنگ جمعرات یکم ماہِ رمضان المبارک ۱۲۱۳ ہجری مطابق سات فروری ۱۷۹۹ء کو کلکتہ کے دوستوں سے رخصت ہو کر اس کشتی میں سوار ہوا جو کپتان رچرڈسن نے کرایہ پر حاصل کی تھی۔ اس پر سوار ہو کر کھجری کی طرف روانہ ہوا جہاں جہاز لنگر انداز تھا۔ دو دن راستے میں گزرے، تیسرے دن جہاز پر پہنچا اور اپنے کمرے میں قیام کیا۔ یہ جہاز بناوٹ کے اعتبار سے بہت خراب تھا۔ اور اس کی انتظامی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ اس کے کارکن اکثر بنگالی تھے، نہایت کاہل اور کام چور، جہاز کے کمرے بہت چھوٹے، تاریک اور بدبودار تھے۔ خاص طور پر میرا کمرہ جس کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ رچرڈسن کے دوست کپتان ولیم سن نے کپتان رین کے واسطے اس جہاز کی کسی خدمت کے عوض فریب سے جہاز کے چند کمرے بہت معمولی کرایہ پر حاصل کر لیے تھے اور مجھ کو اور دوسرے لوگوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا چونکہ جہاز کا کرایہ کلکتہ میں پیشگی ادا کر دیا گیا تھا۔ اس لیے اس کو واپس لینا ممکن نہ تھا، چار و ناچار اسی پر سفر کرنا پڑا۔ یہ بات بھی طے پا گئی تھی کہ کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں جہاز پر فراہم کر لیا جائے تاکہ راہ میں اس کے لیے کہیں ٹھہرنے کی ضرورت نہ پڑے اور براہ راست جلد انگلستان پہونچ جائیں۔ اس کی وجہ سے دل کو کسی قدر اطمینان حاصل تھا کہ سفر کی مدت کم ہو گی اور یہاں سے روانہ ہونے میں تاخیر بھی نہ ہو گی۔ میرے کمرے کے قریب ایک نہایت نازک مزاج شخص مقیم تھا اس کا نام گرانٹ تھا۔ اور دوسری طرف کپتان رچرڈسن کا کمرہ تھا جس میں وہ مع اہلِ وعیال مقیم تھے ان کی ایک دو برس کی لڑکی بھی تھی جو دن رات رویا کرتی تھی، اس کا رونا جہاز کی ساری تکلیفوں سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ کپتان ولیم سن اور کپتان رین کے کمرے خوب ہوادار تھے ان کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں اس لیے وہ بہت آرام دہ تھے۔

اس جہاز میں جو تکلیفیں اور پریشانیاں اٹھانا پڑیں وہ تو تقدیر میں لکھی تھیں۔ لیکن جلدی سفر

پورا ہونے کی جو امید تھی وہ بھی مایوسی میں بدل گئی۔ اور سفر میں اتنی تاخیر ہوئی کہ صرف کیپ جبش تک ساڑھے پانچ ماہ صرف ہو گئے۔ یعنی انگلستان کا نصف راستہ طے ہوا۔

اس تاخیر کا سبب ایک تو یہ ہوا کہ جہاز کے کپتان نے وعدہ خلافی کی۔ ہم سب کو جہاز پر سوار کر کے خود اپنے بعض معاملات طے کرنے کے لیے کلکتہ میں ٹھہر گیا۔ پندرہ دن تو اس کے انتظار میں گزر گئے۔ اس توقف کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں جس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ رمضان شریف کی سولہ تاریخ کو دن کے آخری حصہ میں کپتان واپس آیا۔ اور راتوں رات جہاز کی روانگی کا انتظام کیا۔ یہ کپتان بہت مغرور اور بد معاملہ شخص تھا۔ اور امریکہ کا رہنے والا تھا۔ بداخلاق اور مردم آزار تھا۔ اس کے عملہ کے ملازمین نہایت کمینہ خصلت اور بات کرنے کے قابل نہ تھے۔ "معلم بزرگ" کے علاوہ کسی کو جہاز چلانے کا تجربہ نہ تھا۔ سترہ رمضان مطابق ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۷۹۹ء کو جمعرات کے دن جہاز نے لنگر گاہ کھجری سے روانہ ہو کر کلکتہ کے سمندر کے دہانہ تک پہنچایا۔ راہ کے خطرناک مقامات سے سلامتی کے ساتھ نکل آئے۔ کیونکہ جہاز کم سے کم ½۴ گز گہرے پانی پر چل رہا تھا۔ اور راستہ میں بعض جگہیں ایسی ملیں کہ اگر چار انگل پانی کم ہوتا تو جہاز زمین میں دھنس جاتا۔ چونکہ جوار بھاٹے میں تین گھنٹے باقی تھے، اس لیے بچنے کی کوئی امید نہ تھی بلکہ اس وقت جہاز پورے طور پر ریت میں دھنس جاتا۔ اس جگہ ٹھہر کر دوسرے دن روانگی کی تیاری کر رہے تھے کہ بلوٹ یعنی رہنمائی کرنے والے جہاز نے وہاں پہنچ کر خبر دی کہ فرانس کے ایک جنگی جہاز نے سمندر کے دہانے پر پہنچ کر چند جہازوں کو گرفتار کر لیا ہے جب تک اس کا قصہ طے نہ ہو، وہاں سے عبور کرنا مشکل ہے۔ مجبوراً ہم سب نے ارادے کے باوجود پیش قدمی روک دی۔ چونکہ بندرگاہ کی طرف واپس جانا بھی خطرناک تھا۔ اس لیے اسی جگہ جہاز لنگر انداز ہو گیا جہاز میں کھانے پینے کی جو چیزیں ہر منزل میں اہل کھجری کی مدد سے مل جاتی تھیں وہ بھی بند ہو گئیں۔ اب جہاز پر پکی ہوئی روٹیاں اور دریائی خوراک نمکین مسکہ بطور غذا مقرر ہوئیں۔ اس جگہ مکھیاں اس کثرت سے تھیں کہ ناک اور کان میں گھس جاتی تھیں، بغیر منہ پر ہاتھ رکھے بات کرنا مشکل تھا۔ اس حالت میں ۱۸ رمضان سے ۶ شوال تک بیس دن انتظار میں گزر گئے۔ انہیں دنوں میں ایک دن بہت سی توپوں کے دغنے کی آوازیں کان میں پڑیں ہمیں یہ گمان ہوا کہ شاید کمپنی کے اس جہاز نے کوئی کارنمایاں کیا ہے جو مدراس سے فرانس کے جہاز کو ہٹانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ کچھ عرصے بعد تین جہاز آتے ہوئے نظر آئے جن کو دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ کمپنی کے تجارتی جہاز جو چین سے کلکتہ آ رہے تھے فرانس کے جنگی جہاز سے

ان کا مقابلہ ہوگیا۔ لڑائی کے بعد ایک جہاز تو گرفتار ہوگیا۔ باقی بھاگ کر یہاں آگئے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک رات کو کمپنی کے ایک تجارتی جہاز میں آگ لگ گئی۔ جو بنگال سے کہیں دوسری جگہ مال لیکر جارہا تھا۔ اس جہاز کا جلنا ہمارے جہاز کے پریشان لوگوں کے لیے ایک تفریح اور تماشا بن گیا! اس جہاز کا عملہ پانی میں کود کر ادھر اُدھر منتشر ہوگیا۔ اور جہاز دریا میں غرق ہوگیا۔

ہمارے جہاز کا کپتان اپنے ملک کو واپس جارہا تھا اور کمپنی کی باز پرس کا اس کو کچھ ڈر نہ تھا وہ کئی دن مسلسل اس جلے ہوئے جہاز پر جاکر ادھ جلے کپڑوں کی گانٹھیں کشتیوں پر لاد کر اپنے جہاز میں اٹھا لایا۔ اور اس حرکت کے نتیجہ میں گرفتار ہوگیا۔ اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

ایک دن چند جہاز دہانے کی طرف سے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک جہاز پر نیچے فرانس کا جھنڈا تھا اور اس کے اوپر انگلستان کا۔ اس کو دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید فرانس کا جہاز گرفتار ہوا ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ فرانس نے تباہ شدہ جہازوں کے قیدیوں کو مسقط کے ایک جہاز پر سوار کرا کے اس طرح سے بھیجا ہے۔ اور باقی پلوٹ یعنی رہنمائی والے جہاز ہیں۔ ماہ رمضان کی آخری تاریخ کو معلوم ہوا کہ کمپنی کے جنگی جہاز نے مدراس سے آکر فرانس کے جہاز کو لڑائی کے بعد گرفتار کر لیا ہے اس خبر کے بعد ہی کپتان کوک جو شدید زخمی ہوگیا تھا کلکتہ گیا اور دو تین روز کے اندر زخموں کی تکلیف سے مر گیا۔

شوال کی تیسری تاریخ کو جنگی جہاز جس کا نام شبق تھا۔ اپنے زخمیوں کے علاج کی غرض سے کلکتہ جانے کے لیے روانہ ہوا اور ہمارے جہاز کے قریب لنگر انداز ہوا۔ اس جہاز نے فرانس کے ٹوٹے ہوئے جہاز کو جو جل: بکتا تھا، رسیوں سے اپنے جہاز کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ فرانس کا یہ جہاز شبق سے بہت بڑا تھا اور اس پر پانچ سو فوجی سپاہی سوار تھے اور شبق میں صرف ڈھائی سو سپاہی تھے اور اس کے باوجود پچیس سپاہیوں سے زیادہ قتل اور زخمی نہیں ہوئے تھے۔ اور فرانس کے دو سو سپاہی قتل اور زخمی ہوئے تھے جن میں کپتان بھی شامل تھا۔ پھر شوال کو پندرہ سلفت مع سپاہیوں کے آئے اور فرانس کے قیدیوں کو بیچ جہاز کے کلکتہ لے گئے۔ یہ منظر دیکھنے والوں کے لیے باعث حیرت ہوا تیرھویں کے دن ہمارے جہاز کو پلوٹ خلیج بنگال میں اس جگہ پہنچا کر رخصت ہوا جہاں سے بحر ہند شروع ہوتا ہے۔

۹ مارچ کو سنیچر کے دن جب آفتاب برج حمل میں داخل ہوا۔ ہوا بہت گرم ہوگئی۔ ۱۰ مارچ کو جمعہ کے دن ہوا موافق ہوئی، جہاز جو جنوب کے رخ پر جا رہا تھا، مشرق کی طرف چلنے لگا۔ اس طرح

دو ہفتہ تاخیر کیا اور سامان ہوگیا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ گزشتہ توقف کی وجہ سے پانی کا ذخیرہ ختم ہوگیا۔ اب جزائر ملاکر کے کسی جزیرے سے پانی حاصل کیا جائے گا۔ یہ جزیرے نکوبار کہلاتے ہیں اور چھوٹے بڑے سب ملاکر ستر جزائر ہیں۔ ان میں سے ایک بڑے جزیرے کی طرف جہاز روانہ ہوا۔ جہاں سب ضروری سامان مل سکتا تھا۔ مگر جہاز وہاں سے ہٹ گیا۔ پھر دوسرے جزیرے کی طرف بڑھ گیا مگر وہاں بھی نہ ٹھہرا اور تیسرے جزیرے کے قریب تین پہر رات گذرنے پر لنگر انداز ہوا۔ مجھے عجائبات سفر میں سے پہلی جو چیز معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جس وقت یہ جزیرہ نظر آنے لگا۔ میں نے چاہا کہ 'دوربین' سے اچھی طرح دیکھوں وہ نظر سے غائب ہوگیا۔ مجھے تعجب ہوا۔ ایک جاننے والے نے بتایا کہ ابھی یہ جزیرہ پستی میں ہے اور "کروبت آب" کی بلندی اس کے اور نظر کے درمیان حائل ہے۔ اور جو چیز تم کو نظر آئی وہ جزیرہ کا عکس تھا۔ جو پانی میں پڑتا ہے۔ چونکہ دوربین سے دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جس چیز کو دیکھا جاتا ہے وہ چیز دوربین کے شیشے کے مقابل ہونا چاہیے۔ تب دوربین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں اس شخص نے اپنی انگوٹھی ایک چینی کے پیالہ میں ڈال کر اس قدر دور رکھی کہ آنکھوں سے غائب ہوگئی پھر اس میں پانی ڈالا۔ پانی ڈالتے ہی انگوٹھی کا عکس پیالہ کے پانی میں پڑا اور وہ نظر آنے لگی۔ یہ دیکھ کر مجھ پر اس قدر وہم غالب آیا کہ مجھے گمان ہوا انگوٹھی پانی کے اوپر آگئی ہے۔ جب نزدیک جاکر دیکھا تو انگوٹھی تہہ میں تھی۔

جزیرۂ ٹرلیسیا یہ جزیرہ جہاں ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا ٹرلیسیا کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا دائرہ تقریباً ۱۱ کوس (۲۲ میل) ہے۔ اور اس کے دوسری جانب جو جزیرے اس سے ملے ہوئے ہیں وہ کجوری کہلاتے ہیں۔ تینوں جزیروں کے آدمی ہمارے جہاز پر آتے جاتے تھے اور نہایت عمدہ ناریل اور اناناس اور کئی قسم کے کیلے اور تر و تازہ خوش ذائقہ لیموں کے علاوہ تازہ موٹے تازے مرغ اور شہد بادنی فروخت کرنے کے لیے لاتے تھے۔ اور یہ چیزیں کپڑوں اور بعض دوسری چیزوں کے عوض دیتے تھے۔ روپیے کے بہت کم فروخت کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے یہاں روپیہ کا مصرف بہت کم تھا۔ اس کے علاوہ لوہے کے آلات مثلاً تلواریں، چاقو، استرے اور چرٹ سے اپنی چیزیں بدل لیتے تھے۔ چرٹ تمباکو کے پتوں سے بنتا ہے۔ جس کو بنگال کے لوگ پیتے ہیں۔ اس جزیرے میں یہ چیزیں نایاب ہیں۔ اس جزیرے میں ناریل کی افراط ہے۔ ایک چرٹ کے بدلے دس بہت بڑے بڑے تازہ ناریل دیتے تھے (جو بنگال میں پیسے کے بیس ملتے ہیں)

ان جزیروں میں دو فصلیں ربیع اور خریف کی ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں آفتاب کا رخ شمالی خطِ استوا کی طرف تھا اور یہاں برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ یہاں کے باشندوں کی صورت چینیوں سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ رنگ گندمی قد دراز اور جسم مضبوط ہوتا ہے۔ داڑھیاں موٹی گھنی ہوتی ہیں۔ لباس میں ایک لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں پہنتے۔ شکار کے سلسلے میں ان کی آبادیوں کے اندر سے گزرنے کا اکثر اتفاق ہوا۔ تو ان کے لڑکے لڑکیاں سب خوبصورت نظر آئے۔ ان کے مکانات گول اور پھونس کے ہوتے ہیں جس شکل کی غلہ رکھنے کی کوٹھیاں ہوتی ہیں۔ دولت مند لوگوں کے مکانات تین تین منزل کے ہوتے ہیں۔ ہر منزل کی چھت بانس سے بناتے ہیں۔ نیچے کی منزل میں بھیڑ بکریاں قاز اور مرغ وغیرہ رکھتے ہیں۔ دوسری منزل مردوں کے رہنے کے لیے اور تیسری عورتوں کے لیے ہوتی ہے۔ یہاں کے باشندوں کا مذہب اسلام ہے۔ عورتیں پردے میں رہتی ہیں۔ غیر آدمیوں سے ہرگز گفتگو نہیں کرتیں ہیں۔ بنگال کی پنوی کی طرح چھوٹی چھوٹی وضع کی کشتیاں اور فرنگی وضع کے جہاز بھی جزیرے میں نظر آئے۔ وہاں کی اچھی آب و ہوا، شفاف نہریں، پُرفضا باغات اور لوگوں کی آزادی و خوشحالی دیکھ کر دل بے اختیار چاہا کہ اس سرزمین پر سکونت اختیار کر لوں۔

انیس تاریخ کو جمعرات کے دن ساڑھے تین ماہ کی ضرورت بھر پینے کا پانی، خشک اور تازہ پھل جمع کر لیے گئے۔ جہاز وہاں سے چلنے والا تھا کہ عجیب حادثہ پیش آیا۔ ہمارے جہاز کے سولہ[16] خلاصی جو کہ بہت معتبر تھے اور جہاز کا سارا کاروبار ان کے سپرد تھا بھاگ کر اس جزیرے کے جنگلوں میں چھپ گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ بھی کپتان کی مار پیٹ اور گالی گلوچ سے تنگ تھے اور رات کی تاریکی میں بھاگ جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس حادثہ کے باعث جہاز کا ایک قدم بھی آگے بڑھنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ اور سفر جاری رکھنے کی امید منقطع ہو گئی تھی۔ لیکن اس دوران میں اس جزیرے کے چند آدمی جہاز پر آئے تو ان کو اس حادثہ کا علم ہوا۔ انھوں نے اپنی بدنامی کے ڈر سے وعدہ کیا کہ وہ بھاگنے والے خلاصیوں کو تلاش کر کے واپس لے آئیں گے۔ کپتان نے بھی نا امیدی کی حالت میں ان سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے بدلے میں ان کو ان عمدہ کپڑوں کے تھانوں میں سے کچھ حصہ دیں گے جن کو وہ کمپنی کے جہاز سے اٹھا لایا تھا۔ وہ لوگ بھاگنے والوں کی تلاش میں چلے گئے۔ چونکہ وہ پہاڑوں اور جنگلوں کے حالات سے خوب واقف تھے، اس لیے ابھی رات زیادہ نہیں گزری تھی کہ ان سب خلاصیوں کو پکڑ کر لے آئے۔ جہاز کے بے مروت کپتان نے ان کے ساتھ

چالبازی سے کام لیا۔ ان کو دھوکہ دینے کے لیے کہہ دیا کہ رات کا وقت ہے صبح ہونے پر اُن کو حسبِ وعدہ کپڑے کے تھان دے گا۔ اور دوسرے دن یکم ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ کو اتوار کے دن مطابق ۱۴ اپریل ۱۷۹۹ء کو ان لوگوں کے جہاز پر آنے سے پہلے ہی جہاز کا لنگر اٹھا دیا۔ اور جنوب کی سمت روانہ ہو گیا۔ انھیں جزیروں میں سے ہم کو دو جزیرے اور ملے۔ سنیچر کے دن ذی قعدہ کی تین تاریخ کو شمالی خطِ استوا کے ساتویں درجے سے گزرے، ہوا بہت گرم تھی۔ دو ہفتے تک نہایت تیز بارش ہوئی۔ ہوا اتنی کم تھی کہ جہاز اس عرصہ میں پانچ چھ کوس سے زیادہ نہیں آگے بڑھ سکا۔ کہا جاتا ہے خطِ استوا کے ادھر اُدھر ہوا ہمیشہ کم ہوتی ہے، اور اس مقام پر ہر جہاز آہستہ چلتا ہے کیونکہ سورج کی تپش کی خاصیت ہے کہ وہ ہوا کو بند کر دیتی ہے۔

قطب تارے کا نظر سے چھپ جانا

۱۲ ذی قعدہ، (۱۸ اپریل) کو منگل کے دن خطِ استوا کے قریب پہونچے۔ اس رات کو ہوا بہت صاف تھی قطب ستارہ اور بنات النعش اور فرقدین قطب کے اوپر اسی فاصلے سے نظر آئے جس طرح کلکتہ سے نظر آتے تھے! ور جدی غبار میں چھپا ہوا معلوم ہوا کیونکہ سمندر کا اُفق کبھی صاف نہیں ہوتا۔ اور جدی خطِ استوا کے چوتھے درجے سے چھپ جاتا ہے اور اس وقت تک نظر نہیں آتا جب تک کیپ کے اس جانب دوبارہ خطِ استوا سے عبور نہ کریں۔ اور پانچویں درجہ شمالی میں نہ پہونچ جائیں۔ ۱۵ ذی قعدہ کو جمعہ کے دن خطِ استوا کے سوتیں درجہ طول میں گزرے۔ ان چند منزلوں میں قسم قسم کے پرندے نظر آئے۔ بعض بگلے کی طرح لمبی اور نیلی دم والے، کچھ قمری سے ملتے جلتے، مگر رنگ میں اس سے کم، مچھلیاں بھی اس جگہ بہت تھیں۔ مگر شست یا کانٹے کے قریب نہیں آتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ان جانوروں کی کثرتِ پیدائش کا سبب حرارتِ آفتاب کی قربت ہے۔ پرندوں کی غذا مچھلیاں ہیں۔ یہ پرندے دن بھر اڑتے ہیں اور رات کو پانی پر بسر اکر لیتے ہیں۔ جب انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو ایک ایک قسم کے ہزاروں گروہ خشکی میں پہنچ کر بچے نکالتے ہیں، ایک پرندہ کبوتر کے برابر تھا، مگر اس کے پر گدھ کے پروں کے برابر تھے۔ رنگ فاختئی تھا، اور رات کو جہاز پر آ کر بیٹھ گیا۔ شب کوری کی وجہ سے اُڑ نہیں سکتا تھا۔ رات بھر اس کو جہاز میں رکھا۔ صبح کو جب چھوڑا تو کئی بار جہاز پر گرا اور بمشکل اُڑ کر جا سکا۔

خطِ استوا سے پہلی بار عبور اور خلاصیوں کی عجیب نقل

اس روز خلاصیوں کے افسر نے ایک نیا تماشا کیا کہ وہ خود دو تین خلاصیوں کے ساتھ ڈراؤنا لباس پہن کر عجیب

سی صورت بنائے جہاز پر نمودار ہوا۔ اس کے لباس سے پانی ٹپک رہا تھا، کرسیوں پر بیٹھ گئے اس کے سب ساتھی ٹاٹ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سب کے منہ پر سیاہی اور سرخ روغن ملا ہوا تھا۔ کمر میں رسیاں بندھی ہوئی جن میں لکڑی کی تلواریں لٹک رہی تھیں۔ لمبی داڑھیاں لگائے اور سن کے بنے ہوئے لمبے بال سر پر، پاؤں میں بڑے بڑے جوتے پہنے، منھ میں بگل اور ہاتھ میں ایک کتاب۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ دریا کا خدا ہے رب البحر ہے۔ جو خطِ استوا پر رہتا ہے اور جو جہاز یہاں پہونچتا ہے۔ اس پر اگر اس شخص کو زبردستی غسل دیتا ہے جس نے پہلے کبھی خطِ استوا سے عبور نہ کیا ہو تاکہ وہ گناہوں سے پاک ہو جائے۔ جہاز کے جوان مسافر ان کی صورتیں دیکھ کر بدحواس ہو گئے اور چاروں طرف بھاگنے لگے۔ بعض چالاک لڑکے سیڑھیوں کے ذریعے جہاز کے مستول پر چڑھ کر چھپ گئے۔ ہر طرف ایک شور و غوغا برپا ہو گیا لیکن اس افسر نے کتاب کھول کر ان تمام لوگوں کے نام پڑھے، جنھوں نے اس سے پہلے خطِ استوا عبور نہ کیا تھا۔ اور ان کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ایک ایک کو کھینچتے ہوئے اس کے سامنے لاتے تھے اور لکڑی کے حوض پر تختہ رکھ کر اس کو بٹھاتے تھے اور آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے تھے اور چاروں طرف سے اس پر پانی ڈالتے اس کے بعد تختہ اس کے نیچے سے کھینچ لیتے وہ پانی بھرے حوض میں گر جاتا اور دو تین غوطے کھا کر نیم جان ہو کر نکل آتا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں نے ایک بوتل برانڈی دیکر صلح کر لی۔ اس کھیل کے ختم ہونے کے بعد وہ لوگ بظاہر پھر سمندر میں چلے گئے۔

اُڑن مچھلیاں

بتاریخ ۱۰ ذی قعدہ جمعرات کے دن اُڑنے والی مچھلیاں نظر آئیں۔ وہ گروہ در گروہ پانی سے تین چار گز بلند ہو کر چار پانچ سو قدم کے فاصلے تک کبھی نیچے کبھی اوپر ہو کر اُڑتی تھیں اور پھر پانی میں چلی جاتی تھیں۔ ان کا پروں کا حرکت دینا صاف نظر آتا تھا۔ ان کو دیکھنے سے پہلے بحری سفر کرنے والوں سے سُنا تھا تو اس وقت خیال ہوتا تھا کہ ان کا اُڑنا تڑپنے کی طرح ہوتا ہوگا جیسے دریا میں مچھلیاں تڑپ کر بلند ہو جاتی ہیں پھر پانی میں گر جاتی ہیں، مگر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ صاف پرندوں کی طرح سے اُڑتی ہیں۔ ان میں سے بعض مچھلیاں جو اُڑنے پر جہاز کے مستول یا بادبان سے ٹکرا کر جہاز پر گر پڑتی تھیں۔ ان کا گوشت کھایا تو نہایت لذیذ تھا۔ اس مقام سے گرم ہوا کی شدت کم ہو کر اتنی رہ گئی تھی جتنی بنگال میں بیساکھ اور بھادوں میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اب ہم شمالی خطِ استوا کے درجۂ ہفتم سے گذر کر درجۂ پنجم میں پہنچ گئے تھے۔ یہ ۱۲ درجہ ہوئے اور آفتاب نے بھی ۱۲ دن میں شمالی استوا کے سات درجے طے کیے تھے۔ اس لیے موسم کی تبدیلی محسوس ہوئی۔

قطب جنوبی اور باد تجارت

اس مقام پر چونکہ ہوا صاف تھی۔ اس لیے میں نے قطب جنوبی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ آخر معلوم ہوا کہ اس طرف کوئی علامت بنات النعش اور فرقدین کی طرح نہیں ہے۔ کچھ جدی کا کیا ذکر ہے۔ سنیچر کے دن ۲۴ ذی قعدہ کو ٹریڈ ونڈ یعنی باد تجارت چلنا شروع ہوئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فرنگی جہاز رانوں نے تجربات سے معلوم کیا ہے کہ جنوبی خط استوا کے دسویں درجہ سے ستائیسویں درجہ تک زمین کے دور میں جو ہوا مشرق اور شمال کے درمیان چلتی ہے وہ سال بھر ایک ہی طرح چلتی رہتی ہے اور فرنگستان سے آنے اور جانے والوں دونوں کو مدد دیتی ہے۔ چونکہ طول میں تقریباً اسی نوے درجہ فرنگستان کے مسافر کیپ کے اس طرف اور اُس طرف اس ہوا کی مدد سے سفر طے کر لیتے تھے اور مسافر ابتدا میں زیادہ تاجر ہی ہوتے تھے۔ اس لیے یہ ہوا انہی سے منسوب ہوئی اور باد تجارت کہلانے لگی۔ درحقیقت اگر ان درجات میں سرزمین افریقہ حائل نہ ہوتی اور کوئی شخص زمین کے دورے کا ارادہ کرتا تو پورے سفر کے ختم ہونے تک یہ ہوا اس کا ساتھ دیتی۔ چنانچہ فرنگستان کے مسافر کیپ سے گزرنے کے بعد جب ستائیسویں درجہ جنوبی استوا میں پہنچتے ہیں تو پھر یہ ہوا ہٹ جاتی ہے اور جہاز کی رفتار عرض میں جاتی ہے۔

رفتار جہاز کلکتہ سے انگلینڈ تک

جہاز بنگال سے جنوبی استوا کے دسویں درجہ تک سمندر کی چٹانوں وغیرہ سے حفاظت اور باد تجارت کے ملنے کے خیال سے جنوب کے رُخ چلتا ہے اور وہاں سے آہستہ آہستہ مغرب کی طرف چل کر کیپ پہنچتا ہے اور کیپ سے گذرنے کے بعد شمال کے رُخ کچھ مغرب کی سمت ہو کر چلتا ہے۔ اور ساڑھے چونتیس درجہ عرض میں طے کرنے کے بعد خط استوا سے عبور کرتا ہے۔ اس کے بعد اکیاون درجہ عرض میں طے کر کے لندن پہنچتا ہے۔ پہلی ذی الحجہ ۱۲۱۳ھ ہجری مطابق ۱۷۹۹ء کو ہمارا جہاز طوفانی سمندر میں پہنچ گیا۔ بلکہ باد تجارت کے چلنے کے دن سے اگرچہ ایک دن میں ایک درجہ اور کبھی اس سے زیادہ طے کیا۔ لیکن سمندر کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ موجیں جہاز کی اونچائی کے برابر اٹھتی تھیں۔ اور روشندانوں یا خانوں اور کبھی سائشی کمروں میں اگر گرتی تھیں اور پانی کے شور سے جہاز کی سطح پر چلنا اور کمرے میں سونا مشکل ہو جاتا تھا۔ ہم اس وقت پندرہ درجہ جنوبی میں ہیں اور آفتاب سے فاصلہ ۱۸ درجہ سے زیادہ نہیں، لیکن پانی بہت ٹھنڈا ہے اور رات کو لحاف اور رضائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سردی کی تکلیف تو بڑھ گئی ہے، لیکن پانی اور مسکہ کی بدمزگی کم ہونے لگی۔ جو جہاز کی مکروہات میں بدترین چیز ہے۔ جیسا کہ کے مہینہ میں جو شمالی ممالک میں گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ اس طرف

انجن کے بیننگ کی طرح سردی کا سامان ہے۔ جمعرات ۲ ذی الحجہ کو جنوبی مارشیس سے اسی نوے کوس کے فاصلے پر اور بارہ ذی الحجہ کو بدھ کے دن جزیرہ میڈگاسکر[1] کے محاذ سے کافی فاصلے سے گزرے۔ یہ جزیرہ مضافات حبش میں ہے۔ حکومت اسلامی اور ملکی زبان عربی ہے۔ اگرچہ سفر کے آغاز سے ہی انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ کے باعث گرفتاری کا خوف اور مارشیس[2] لے جائے جانے کا ڈر رہتا تھا۔ اور جو جہاز بھی دوربین سے نظر آتا یہ خیال کر کے کہ فرانس کا نہ ہو طبیعت خستہ ہو جاتی تھی اور اس جہاز سے بچ کر ہمارا جہاز نکلتا تھا۔ لیکن ان چند منزلوں میں جزیرہ مارشیس کے قریب ہونے کی وجہ سے خوف اور بڑھ جاتا تھا اور رات بھر قتل و غارت گری کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ لیکن یہ وقت خیریت سے گزر گیا اور کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ مخالف ہوا اس قدر تیز و تند تھی کہ کھانا پینا اور تمام کام بند ہو گئے۔ سمندر کی موجیں پہاڑ کی طرح اٹھ کر جہاز پر گرتی تھیں۔ اور ان کے گرنے کے اثر سے جہاز پر کھڑا ہوا آدمی گر پڑتا تھا اور بیٹھے ہوئے آدمی کا سر دیوار سے ٹکرا جاتا تھا۔ میرے ہمسایہ مسٹر گرانٹ اور میری خواب گاہ کے درمیان بجز ایک ٹاٹ کے پردے کے کوئی فاصلہ نہ تھا۔ وہ موٹاپے کے سبب سے جہاز کی حرکت سے بے اختیار میرے اوپر لڑھک پڑتے تھے۔ اور اپنا پورا بوجھ میرے سینے پر ڈال دیتے تھے۔ اتنا تنگ کرنے کے باوجود اگر

---

[1] میڈگاسکر: بہت بڑا اور مشہور جزیرہ ہے عرب اس کو جزیرۃ القمر کہتے تھے۔ یہ جزیرہ افریقہ کے جنوبی مشرقی ساحل پر بحر ہند میں واقع ہے۔ اس کا عرض مشرق سے مغرب کی سمت میں تین سو میل اور طول جنوب سے شمال تک ایک ہزار میل کے لگ بھگ ہے نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ عربی اور افریقی نسل کے لوگ زیادہ آباد ہیں۔ ۱۴۹۷ء میں اس جزیرے پر پرتگالیوں نے قدم جمانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد ۱۶۴۲ء میں فرانسیسیوں نے قبضہ جمایا۔ مگر ۱۶۵۷ء میں وہاں کے باشندوں نے ان کو نکال باہر کیا۔ ۱۸۲۰ء میں عیسائیوں کے تبلیغی مشن نے وہاں کافی اثر ڈالا۔ اب یہ ایک آزاد اور خوش حال ملک ہے (مترجم)

[2] مارشیس: بحر ہند کا بہت مشہور جزیرہ ہے۔ یہ میڈگاسکر سے چار سو پچاس میل مشرق کی سمت واقع ہے۔ ۱۵۹۸ء میں ڈچ قوم نے یہاں اقتدار قائم کیا اور اپنے شہزادے ماریس کے نام پر مارشیس نام رکھا۔ اب یہ ایک آزاد ملک ہے۔ جس میں ہندوستانی نسل کے لوگوں کا اقتدار ہے اور انہیں کی آبادی زیادہ ہے۔ (مترجم)

میرے کمرے میں برتن بھی کھڑکتا تھا تو شور و غل مچاتے تھے کہ تم ہم کو سونے نہیں دیتے۔ جیسا برتاؤ انگریزوں کا عام ہندوستانیوں کے ساتھ ہوتا تھا یہ اس کا نمونہ تھا۔ اس زمانے میں ہر شخص نے اپنے حجرے میں کچھ کھانے پینے کا انتظام کر لیا تھا۔ کیونکہ زینہ چڑھ کر کھانے کی میز پر جا کر بیٹھنا بہت مشکل تھا۔ جہاز کی طرف سے دو ہفتہ سے زیادہ مدت تک ناپ تول کر پانی ملتا رہا۔ دن بدن اس ناپ تول میں زیادتی ہوتی جاتی تھی اگرچہ حالت بہت خطرناک ہے۔ لیکن ہم ان مصیبتوں کے مقابلے میں غرق ہو جانے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

عجیب پرندے

اس مقام پر ایسے پرندے دیکھنے میں آئے جو خود تو چیل کے برابر تھے۔ لیکن ان کے پروں کی لمبائی آٹھ ہاتھ تک تھی۔ بتاریخ ۸ ذی الحجہ جمعرات کے دن افریقہ کا ایک مقام نظر آیا جہاں سے کیپ تین سو کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس مقام پر ٹھہرنے کا ارادہ نہ تھا۔ مگر دوسرے دن تک اس کو دیکھنے سے پریشان حال اور مصیبت زدہ دلوں کو تقویت حاصل ہوئی۔

وھیل مچھلی

کہ ایک مچھلی نظر آئی کہ جس کا سر دو ہاتھیوں کے برابر تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک سوراخ تندور جیسا تھا۔ جب سانس لیتی تھی تو اس سوراخ سے پانی پندرہ گز تک اونچا اٹھتا تھا چونکہ اس فوارہ کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتی ہے۔ اس لیے فرنگی اس کا تعاقب کر کے شکار کرتے ہیں۔ اس کی چربی سے چراغ جلاتے ہیں۔ اس چربی سے بنی ہوئی شمع کافوری شمع سے زیادہ دیرپا ہوتی ہے اور اس میں بدبو بھی نہیں ہوتی۔ اس کے کانٹوں سے گھوڑوں وغیرہ کے لیے چابک بھی بنائے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں چابک کی طرح لچک ہوتی ہے۔ اور ٹوٹتا بھی نہیں ہے کہتے ہیں یہ مچھلی جس کا نام انگریزی زبان میں وہیل ہے۔ کیپ میں بہت ہوتی ہے۔ جن کا طول ساٹھ ہاتھ تک ہوتا ہے۔ اور موٹائی ۶۵ ہاتھ تک ہوتی ہے۔ اس کا شکار کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ جو بڑی ہوتی ہے اس کا شکار نہیں کرتے ہیں کیوں کہ چھوٹی کا شکار ہی بہت خطرناک ہوتا ہے۔

سفر دریا اور جہاز کی مصیبت

۱۲ تاریخ ماہ ذی الحجہ ۱۲۱۳ھ کو جمعہ کے دن سے چاند رات تک سمندر کا جوش اور ہوا کی مخالفت اتنی زیادہ رہی کہ اس سے پہلے کی مصیبتیں راحت معلوم ہونے لگیں۔ جہاز کے تمام حجرے دس دن تک بند رہے نہ دن کو سورج نظر آتا نہ رات کو تارے۔ باد و باران، بجلی کی کڑک اور باد تند، اگرچہ اتنی شدید

تھی کہ مسلسل بجلی جہاز کے ادھر ادھر گرتی تھی اور دن ایسا تاریک ہوگیا تھا کہ رات معلوم ہوتی تھی۔ رات دن شمعیں جلتی رہتی تھیں جہاز کے عرشے پر کسی قدر روشنی تھی۔ لیکن اس میں چلنا ممکن نہ تھا۔ ہوا کے زور سے اڑ کر سمندر میں گرنے کا خوف تھا اور جہاز کے ہچکولوں سے ہاتھ پیر ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے کوئی اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرتا تھا۔ اس طوفان کی وجہ سے سمندر کا پانی جزیرے کے برابر بلند ہو کر سطح جہاز پر گرتا تھا۔ سردی کے موسم میں جسم اور لباس کو تر بتر کر دیتا تھا، لہٰذا سب خوف سے مُردوں کی طرح تنگ و تاریک قبر نما کمروں میں لیٹے رہتے تھے اس کے باوجود جہاز کی حرکت کسی کو ایک جگہ ٹھہرنے نہ دیتی تھی، تمام چیزیں ادھر سے ادھر لڑھکتی پھرتی تھیں۔ سامان اور تختوں کے باہم ٹکرانے سے طرح طرح کی آوازیں کان میں آتی تھیں پاخانوں کی نالیوں سے پانی فوارے کی طرح جوش مارتا تھا۔ کبھی تو اس قدر زیادہ آتا تھا کہ پاخانوں میں بھر جاتا تھا۔ اور وہاں سے جوش مار کر رہائشی کمروں کو بھی ڈبو دیتا تھا۔ ع:

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں ہائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا!

مختصر یہ کہ اگر ان دنوں کی شدت کا حال بیان کیا جائے تو باعث طوالت ہو جائے گا۔ ایسی خطرناک حالت تھی کہ جہاز کے ڈوب جانے کے خوف سے کھانے پینے کو دل نہ چاہتا تھا کیونکہ اگر کھانا کھا لیتے تو پاخانے جانے کی حاجت ہوتی اور پاخانوں کی حالت یہ تھی کہ لوگوں کے جسم نجاست سے لتھڑ جاتے تھے اور جاڑے کی شدت میں کپڑے بھیگ جاتے تھے۔ یکم محرم ۱۲۴۳ ہجری کو دوبارہ زمین نظر آئی۔ اور کیپ کے قریب ہونے کے نشان نظر آئے۔ جمعرات کے دن محرم کی چار تاریخ کو سمندر کی وہ شاخ نظر آئی جو ٹیبل بے کے نام سے مشہور ہے اور شہر کیپ اس کے کنارے آباد ہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ پانی کا ذخیرہ حفاظت نہ ہونے اور پیپوں کی خرابی کے سبب سے ضائع ہوگیا ہے۔ اور اب تھوڑا پانی بچا ہے۔ اس لیے سابق کے طے شدہ منصوبے کے خلاف کپتان کی رائے کیپ میں رکنے کی ہوئی۔ اگرچہ بہت سے تنگدست مسافروں کو زیادہ خرچ بڑھ جانے کے خوف سے وہاں ٹھہرنے میں تامل تھا۔ مگر پانی ختم ہو جانے کی وجہ سے بغیر ٹھہرے چارہ نہ تھا۔ اب یہ طے پایا کہ دن ختم ہو رہا ہے اور رات کے اندھیرے میں چٹانوں کی کثرت کے سبب سے کیپ کے ساحل کی طرف چلتے رہنا خطرناک ہے۔ اس لیے رات کو سمندر ہی میں گشت کرنا چاہیئے اور صبح سویرے کیپ میں داخل ہوں۔ اتفاق سے اس رات ہوا نہایت

موافق تھی۔ اگر چلتے تو صبح تک بے کھٹکے شہر کیپ میں پہنچ جاتے۔ مگر بدقسمتی سے جہاز کا نائب اپنی باری پر سو گیا۔ اور جہاز بائیں کسی نے نہ موڑا۔ صبح تک جہاز جنوب کی سمت اتنی دور تک چلا گیا تھا کہ جب شہر کی طرف لوٹایا گیا تو دن بھر چلنے کے بعد بھی اپنی منزل پر نہ پہنچا۔ اس لیے رات سے دوسرے دن تک گشت لگاتے رہے۔

ایک سخت طوفان اور سمندر اور جہاز کے مکروہات

بتاریخ پانچ محرم ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء بروز جمعہ کیپ میں داخل ہونے کا ارادہ تھا۔ مگر ہوا اور پانی کا ایسا طوفان برپا ہوا کہ تمام اہل جہاز زندگی سے ناامید ہو گئے اور جہاز کیپ سے تقریباً تین سو میل دور جنوب کی طرف چلا گیا۔ جہاز پر بجلی گری، دو آدمی اسی وقت مر گئے۔ ایک ہفتہ بعد تین اور آدمی بجلی سے جل مرے۔ لیکن جہاز کے نچلے حصہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ان چند مصیبتوں کا ذکر کروں جو اس جہاز میں مجھ پر گذریں۔ تاکہ دوسروں کے لیے سبق آموز ہوں۔ مسافروں کو چاہیے کہ انگریزی جہازوں کے علاوہ کسی دوسرے جہاز پر سفر نہ کریں۔ اور سفر کا سامان اچھی طرح رکھیں۔ اگر مالی حالت اچھی نہ ہو تو ایسے سفر کا ارادہ ہرگز نہ کریں۔ سفر کی دوسری تکالیف کے علاوہ اس جہاز پر چار مصیبتیں تھیں۔ ایک تو اس پر روٹی، مسکہ، دوسرے کھانے اور میوہ جات وغیرہ کا نہ ملنا جو ہر جہاز میں ہونا ضروری ہے۔ اور پانی کی بدمزگی یا منہ ہاتھ دھونے کے لیے کھاری پانی ملنا۔ اس کے علاوہ جہاز کی روانگی کا انتظار، ایک ہی جگہ مدتوں پڑے رہنا اور وہ مصیبتیں جو طوفان کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ جہاز کے سوروں اور کتوں کی نجاست اور بدبو، پاخانے میں آنے جانے کی مصیبت۔ دوسری مصیبت جو خاص تنگدست قوموں کے لیے ہے وہ کمروں کی تنگی اور خراب حالت، نوکروں کی کم ہمتی۔ کمروں میں روشن دانوں کا نہ ہونا جس کی وجہ سے ہوا اور روشنی نہیں پہنچتی تھی، پڑوسیوں کی زیادتی۔ چنانچہ میرے ہم سفروں میں سے جو شخص اپنے آرام کی فکر کرتا تھا، وہ میرے لیے تکلیف کا باعث ہوتا تھا۔

تیسری مصیبت خاص طور پر ان لوگوں کے لیے تھی جو یورپین نہیں تھے۔ مثلاً ناخن اپنے ہاتھ سے کاٹنا، حجامت بنوانے کی دشواری، غسل خانوں کا نہ ہونا، ہاتھ نہ دھو سکنے کے باعث چھری کانٹوں سے کھانا کھانا، استنجا نہ کر سکنا کیوں کہ پانی بھرنے کا وقت جہاز کے دھونے کے واسطے صبح کو ہے۔ انگریز اس وقت اپنا منہ ہاتھ اور باورچی خانہ وغیرہ کے برتن دھو کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کو دوسرے وقت کے لیے پانی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مجھ کو پانی کی

زیادہ حاجت رہتی تھی۔ کئی لوٹے موجوں کی شدت سے رسّیاں ٹوٹ جانے کی وجہ سے سمندر میں گر گئے تھے۔ اس لیے مجبور ہو کر پیشاب کے بعد طہارت کرنا چھوڑ دی۔ اور طوفان کے وقت جب پاخانے میں لوٹا لے جانا اور آب دست لینا دشوار تھا۔ ایک ایک ہفتہ تک پاخانے کی طہارت بھی کپڑے اور کاغذ سے کی جاتی جس کی وجہ سے نماز ترک کرنا پڑی۔ اور اسی وجہ سے میں سب سے زیادہ جہاز کے اندر بیمار میں مبتلا رہا۔

چوتھی مصیبت: انگریزی جہازوں کے سوا اس جہاز اور دوسرے جہازوں میں جو تکلیف دہ باتیں ہیں۔ ان میں قلیوں کا شور و غوغا اور لنگر کرنے اور لنگر اُٹھانے کے وقت جہالت کی حرکتیں ہیں۔ اور نمی کی وجہ سے اسباب کا خراب ہونا۔ کیڑوں مکوڑوں کی زیادتی۔ چند دن کے تر بتر پڑے رہنے کی وجہ سے ہوا میں تعفن مچھلی، انڈوں کے ذخیرے اور چلنے پھرنے کے راستے میں پانی بہنا۔ ان میں خلاصیوں اور مزدوروں کا ننگے پاؤں پھسلتے تختوں پر پھرنا اور رات کے وقت انھیں پر بڑا سا گدا ڈال کر سو رہنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاز کی ناقص ساخت کی وجہ سے رہنے کی تکلیف، عملہ کی بدانتظامی اور نافرمانی، فنِ جہازرانی سے اچھی طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے جہاز کا خشکی اور کنارے تک مشکل سے پہنچنا۔ اگر ان سب خرابیوں کو بیان کیا جائے تو بہت طول ہو جائے گا۔ یہ سب مصیبتیں اُٹھاتے ہوئے مجھ کو اپنے مہربان دوست مسٹر ولیم آگسٹن برڈک کی بات ہمیشہ یاد آتی تھی۔ کہ انھوں نے آغازِ سفر میں جب شارٹ نامی جہاز جا رہا تھا تو مجھ سے کہا تھا کہ مجھ کو تمھاری طرف سے کھٹکا ہے کیوں کہ جو شخص بھی انگریزی جہاز کے علاوہ کسی اور جہاز میں سفر کر گیا اس نے بہت ایذا اور تکلیف اُٹھائی۔ اس کے علاوہ انھوں نے تاکید کی تھی کہ خشک غذائیں اور جاڑے کے کپڑے ضرور ساتھ لے جاؤ۔ مگر میں نے اپنی نادانی کے باعث جاڑے کے ان کپڑوں کو جو میرے پاس موجود تھے اور وطن میں ان کو کبھی میں زیادہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ کافی خیال کیا۔ اس مہربان دوست نے میری غفلت کا حال معلوم ہونے پر بیس سیر عمدہ بسکٹ یعنی کلچے جو کیپ تک بالکل خراب نہ ہو سکیں، اور چند جوڑے باناتی کپڑوں اور اونی جرابوں کے میرے ساتھ کر دیے تھے۔ اب میرا گذارہ زیادہ تر انھیں چیزوں پر ہے۔ کیونکہ جس وقت جہاز کے کھانے سے دل اُکتا جاتا ہے۔ وہی بسکٹ پنیر کے ساتھ کھاتا ہوں۔ جاڑے کی اتنی شدت ہے کہ میرے تمام کپڑے مع ان تحفہ میں ملے ہوئے کپڑوں کے سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اگر یہ نہ ہوتے تو معلوم مجھ پر کیا گذرتی۔ یہ اس شفیق دوست کی عنایت تھی جس نے تمام راہ میری مدد کی۔

مختصر یہ کہ محرم کی نویں تاریخ کو منگل کے دن تک سارا وقت طوفان کی کشمکش اور جنوبی سمندر کے جوش و خروش کی حالت میں گذرا۔ اس کے بعد اس کیفیت میں کمی ہوئی۔ لیکن راہ کا پتہ نہ تھا۔ اس کا سبب کارکنوں کی کم علمی تھی۔ اس کے علاوہ سورج اور تاروں کے نظر نہ آنے کے باعث وہ آلہ کام نہیں دیتا تھا۔ جس سے سمت اور درجے معلوم ہوتے ہیں۔ خاص طور پر طول البلد کا درجہ بالکل مبہم تھا۔ اور نہ گائڈ بک جس سے ایسی حالتوں میں کام لیا جاتا تھا، ناقص تھی۔ مطبع نے اتفاق سے اس ماہ کی کیفیتیں جو سمندر میں واقع ہوتی ہیں، اس میں درج نہیں کی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس گائڈ بک کی چار جلدیں جہاز میں موجود تھیں، لیکن سب کی سب ایک ہی مطبع کی چھپی ہوئی تھیں اور سب میں وہی نقص تھا۔ پانی کی کمی کے باعث وہ لوگ جن کو اپنی زندگی عزیز تھی بہت زیادہ مضطرب تھے۔ محرم کی ۱۶ ارتاریخ تک یہی حال رہا۔ سترہ محرم کی صبح کو جب پانی بالکل ختم ہو جانے کی خبر ملی تو لوگوں کی بدحواسی دوگنی ہوگئی لیکن اس وقت خدائے تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوا اور ناامیدی امید سے بدل گئی۔ ہوا یہ کہ اس وقت جہاز بالکل بے ٹھکانے جا رہا تھا۔ جہاز کا ناخدا خیال کر رہا تھا کہ جہاز کیپ سے آگے نکل آیا ہے اور اب سینٹ ہلینا کے آدھے راستے میں ہے اس وقت جہاز کا خانساماں چھت پر کھڑا تھا، وہ بہت ہوشیار شخص تھا اور کئی بار کیپ جا چکا تھا۔ اور اس کے اطراف کو خوب پہچانتا تھا۔ اتفاق سے اس درمیان میں پرندوں کے ایک پنجرے کی کھڑکی کھل گئی۔ دو تین مرغ اُڑ کر سمندر میں جا گرے۔ خانساماں دو تین سیڑھیاں اُتر کر مرغوں کو پانی میں بہتا دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ جہاز کے پیچھے پڑی۔ اور اس نے خشکی کے آثار دیکھے، غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ کیپ کے اطراف میں ہے۔ اس نے بلند آواز سے مایوس مسافروں کو خوش خبری سنائی۔ اسی وقت ناخدا اور کپتان دوربین سے دیکھنے کے لیے اوپر گئے۔ ان کو کیپ کے قریب ہونے کا ثبوت تو نہیں ملا مگر ساحل اور زمین کی موجودگی کا اچھی طرح یقین ہوگیا۔ فوراً جہاز کا رُخ اسی طرف پھیر دیا گیا۔ اسی دن آخر وقت میں کوہ ٹیبل لینڈ[1] اور پہاڑی شگر لینڈ کے نشان نظر آئے جو کیپ کے قریب ہونے کی علامت تھے۔ افسردہ خاطر مسافروں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ٹیبل انگریزی زبان میں میز کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس پہاڑ کی سطح میز کی شکل کی ہے اسی لیے یہ

---

[1] ٹیبل لینڈ کی بلندی تین ہزار پانچ سو پچاسی فٹ ہے۔ کیپ ٹاؤن اسی پہاڑ کے دامن میں آباد ہے۔ (مترجم)

تام رکھا گیا ہے۔ یہ پہاڑ بہت بلند ہے۔ میں نے اپنی عمر میں اتنا بڑا پہاڑ نہیں دیکھا تھا۔ دو شگر، قند کو کہتے ہیں یہ چھوٹی پہاڑی مخروطی ہے اور مصری کے کوزہ کے مثل ہے اسی لیے اسکو شگر کہتے ہیں یہ دونوں پہاڑ ساحلِ افریقہ کے دوسرے تمام پہاڑوں کی طرح درختوں اور ہر قسم کے سبزے سے خالی ہیں اور بہت بلند ہیں معلوم ہوا کہ سمندر کے کنارے کا سب کوہستان ایسا ہی ہے اور کوئی ساحل بغیر کوہستان کے نہیں ہے۔ اور جہاں کوئی پہاڑ ہے وہاں پہلے سے ریگستان ہے پھر سمندر، چاہے وہ پہاڑ سمندر کے کنارے ہو یا زمین کے وسط میں۔

پہاڑوں کے وجود پر انگریزوں کی رائے

جس وقت کہ دریا اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری طرف کا رخ کرتا ہے، تو پہاڑ دریائے گنگا کے کراڑوں کی طرح پانی سے برآمد ہوکر بہت زمانہ گذرنے کے بعد جب ریت سخت ہوکر پتھر بن گئی جب وجود میں آئے فرنگستان کے لوگوں نے کئی دلیلوں سے اپنے اس دعوے کو ثابت کیا ہے۔ اوّل یہ کہ پہاڑ کی صورت جہاں بھی ہے، کراڑوں اور ٹیلوں کی مانند ہے۔ دوسرے یہ کہ جب کبھی کسی پہاڑ کے نیچے سرنگ کھودی گئی یا پتھر نکالے گئے تو اس کے اندر سے مچھلی کے کانٹے اور طرح طرح کی سیپیاں، پانی کی لہروں کے نشانات، انسانوں کی ہڈیاں، کشتیوں کے تختے برآمد ہوئے۔ غرض کہ دریا کی تمام نشانیاں پہاڑ کی تہہ میں پائی گئیں۔ بتاریخ ۱۷ محرم بدھ کے دن میبل بے کے دہانے سے گزر کر کیپ خورد کے شہر میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اس موسم میں جہاز ماہ تک دہنہ مذکور میں داخل ہونا نہایت خطرناک ہے۔ اس لیے کیپ کے حکام اس میں جہازوں کا داخلہ روک دیتے ہیں اور اگر کسی نے ان کے حکم کو نہ مانا تو جب جہاز شہر کے قریب پہنچ جاتا ہے تو اس کو لوٹ جانے کا حکم دیتے ہیں اگر اس پر بھی نہ مانے تو قلعہ کی توپوں سے گولہ باری کرکے اس کو غرق کر دیتے ہیں۔

کیپ خورد کا حال

بتاریخ ۱۸ محرم الحرام ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء، بروز جمعرات کیپ خورد کی طرف روانہ ہوئے اس کو خلیج فارس بھی کہتے ہیں۔

آدھی رات تک چاندنی میں اطمینان سے چلے گئے۔ اس کے بعد سمندری چٹانوں کے خوف سے لنگر ڈال دیا۔ یہ چٹانیں اس مقام پر بکثرت ہیں۔ ۱۹ محرم کو جمعہ کے دن لنگر اٹھا کر پھر دن چڑھے شہر مذکور کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ کیپ ایک سرسبز و شاداب پہاڑ کے دامن میں واقع ہے ساحل کے قریب بہت سے نہایت خوش نما مکانات خاص طور پر اس موسم میں لنگر انداز ہونے والے

جہازوں کے لیے بنے ہوئے ہیں۔ ہر مکان میں نہر جاری ہے۔ اس وقت وہاں سولہ جہاز لنگر ڈالے ہوئے تھے جن میں سے دو شاہی جنگی جہاز بھی تھے۔ جو اس نواح کی حفاظت اور فرانسیسوں کے دفینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مدت سے شہر اور آبادی نظر نہ آئی تھی۔ اس شہر کی وضع اور ساحل اتنا دلکش معلوم ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ تمام عمر کسی شہر کو دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوا تھا جس قدر اس کو دیکھ کر ہوا۔

بتاریخ ۲۰ ماہ محرم سنیچر کے دن تمام ساتھی جہاز سے اُتر کر اس شہر میں مقیم ہو گئے۔ مگر میں اخراجات کی کثرت اور خرچ کی کمی کے باعث اسی گندے جہاز پر ہی ٹھہرا رہا۔ ہاں شہر کی قربت کے سبب سے کھانے پینے کی تکلیف ختم ہو گئی۔ چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ جہاز کے مسافروں نے کپتان ناطل ین کی بد اخلاقی اور کیپ پہنچنے سے قبل اس کے خراب برتاؤ اور جھگڑے کے باعث نیز جہاز کی خرابی اور خستہ حالت کے پیش نظر یہ عہد کر لیا کہ دوبارہ اس جہاز پر سوار نہ ہوں گے اور دوسرا جہاز آنے تک کیپ بزرگ میں ٹھہریں گے۔ اس لیے میں بھی جہاز سے اُتر کر اُسی مکان میں جا ٹھہرا جہاں اور مسافر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پانچ روپیہ یومیہ کرایہ مع کھانے اور ناشتہ کے طے پایا۔ مکان کا مالک نہایت خوش اخلاق شخص تھا۔ اس کا نام مسٹر بارنٹ تھا۔ اس کا بیان تھا کہ وہ دراصل اسکاٹ لینڈ کا باشندہ ہے۔ ہالینڈ والوں میں پرورش پائی اور اُنہیں کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس مکان کی خدمتگار اکثر چست و چالاک عورتیں تھیں۔

کیپ کے خدمتگاروں کا حال

ہم پانچ آدمی تھے۔ ہر ایک کے ساتھ ایک ایک ملازم تھا۔ چار بچے اور ایک دایہ کپتان رچرڈسن کے ساتھ تھی اور پانچ چھ آدمی اور تھے۔ جب ہم اس مکان میں پہنچے تو صاحبِ خانہ اور اس کی بیوی اپنے پانچ ملازموں اور خادماؤں سے کھانے پینے اور بستروں کا انتظام کرا دیتے تھے۔ باورچی خانہ کھانے اور آرام کرنے کے کمرے کی پشت پر واقع تھا۔ کھانے کے وقت اس کا دروازہ کھلتا تھا لیکن کبھی دھوئیں کا اثر یا کوئی شور و غل سنائی نہ دیا۔ اس زمانے میں شہر کیپ مع اطراف و جوانب کے انگریزوں کے قبضے میں تھا اور ان کے پانچ ہزار فوجی مع سرداروں کے وہاں موجود رہتے تھے۔ سب سے بڑا افسر جنرل ڈنڈاس تھا جو مسٹر ڈنڈاس کا بھتیجہ تھا۔ جس کا تعلق بادشاہ لندن کے وزیر سے تھا۔ چونکہ اس زمانے میں کیپ کا گورنر لارڈ میکاٹنی لندن گیا ہوا تھا۔

گورنر کا کام بھی جنرل ڈنڈاس کر رہا تھا۔ کپتان کالنس اپنی رجمنٹ کے ساتھ جنرل موصوف کی جانب سے اس مقام کی حفاظت کے لیے متعین تھا۔ میں اس سے ملاقات کے لیے گیا۔ بہت تواضع اور غریب نوازی کا برتاؤ کیا۔ دوسرے دن ملاقات بازدید کے لیے آئے اور اپنے یہاں بطور مہمان کے مدعو کیا۔ دعوت کے دن نہایت لذیذ کھانے کھلائے۔ زبان کی مغائرت کے باوجود اس جلسے میں مجھے بہت لطف آیا۔ خاص طور پر کپتان بارکر کی خوش طبعی سے جی خوش ہوا جو مدت سے کپتان کالنس کے ساتھ رہتا تھا۔ مسز کالنس کی شیریں گفتاری سے اتنا محظوظ ہوا کہ کبھی اپنے ہم وطن شرفا کی صحبت میں اس کا چوتھائی لطف بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ رخصت کے وقت وہ پہاڑی راستوں کے نشیب و فراز کی وجہ سے شمع ہاتھ میں لے کر دروازے تک ساتھ آئے۔ مسز کالنس نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک یہاں قیام ہے۔ شام کی چائے ان کے ساتھ پیا کروں۔ کپتان لی اور کپتان گوبخ دونوں سرداروں نے اپنی اپنی باری پر اپنے جہازوں میں لے جا کر بہت اچھی طرح مہمان نوازی کی اور جہازوں کو خوب آراستہ کر کے جھنڈیاں لگائی تھیں۔ ناخدا اور تمام افسران جہاز تعظیم کے لیے ٹوپیاں ہاتھوں میں لیے ہوئے زینہ کے برابر صف بستہ کھڑے ہوئے تھے۔ جب میں جہاز پر جا کر بیٹھا تو میرے آنے کی خوشی میں ایک توپ داغی۔ کھانا کھانے اور جہاز کی سیر کرنے کے بعد اسی صورت سے جہاز سے نیچے لائے اور ایک چھوٹی سی کشتی پر سوار کر کے مکان تک پہنچا آئے۔

غرض کہ ۲۷ محرم الحرام تک وہاں قیام رہا۔ مسز بارنٹ ہر روز کھانوں وغیرہ کی مقدار میں اور ہندوستان کی بھٹیاریوں کی طرح جیب کترنے کی گھاتیں کرنے لگی۔ یہ عادت جہازوں اور مسافروں کی آمد و رفت کی وجہ سے اس میں سرایت کر گئی تھی۔ اس نے ہمیں ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کیا۔ دوسرے سے تیسرے میں! پہلے یہ بہانہ کیا کہ یہ کمرہ میرے شرکت دار کا ہے اور مجھے اس کے آنے کا گمان نہ تھا۔ اس لیے تم کو ٹھہرا دیا تھا۔ جب دوسرے کمرے میں اپنا سامان لے گیا تو اس کا شوہر آیا اور اس نے کہا کہ یہ کمرہ بڑا ہے اور چار مسافر جو پہنچے ہیں ان کے ٹھہرنے کا انتظام اس میں کیا جائے گا۔ تم فلاں کمرہ میں جاؤ۔ ابھی وہاں گئے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ وہ آ کر کہنے لگا۔ آج کی رات تم اپنے ساتھیوں میں سے فلاں شخص کے کمرہ میں جا کر سو رہو۔ وہ کیپ گیا ہوا ہے۔ کل تمہارے واسطے مکان کی فکر کی جائے گی۔ مجھ کو اس کی یہ حرکت بہت ناگوار گذری۔ میں نے کہا کہ جب میں مکان کا

کرایہ دیتا ہوں تو کیوں دوسرے کرے میں جاؤں۔ اب اس ایکڑ پچھاڑ کے بعد میں ہرگز دوسرے کرے میں نہ جاؤں گا۔ کہنے لگا کہ اس صورت میں کل کے دن سے تم کو دوگنا کرایہ دینا ہوگا چنانچہ ایک دن اس کمرہ کا کرایہ دوگنا لیا۔ اور جس دن میں کیپ کو جانے لگا تو اس دن سورج نکلنے اور کھانا کھانے سے پہلے مکان چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس نے اور دنوں کی طرح کرایا اور کھانے کا خرچ اس دن کا بھی وصول کر لیا۔ اس کے علاوہ حجام اور دھوبی کی اُجرت، گاڑی کا کرایہ، ملازم کی خوراک اور جس نے بھی اس کی معرفت کام کیا تھا اُس کی اُجرت وہاں کے حساب سے تین گنا زیادہ لکھی اور اس کی عورت بھی بیگانہ محض ہوگئی۔ حالانکہ میں نے اس کو وہاں پہنچنے کے بعد بنگال کے ایک من چاول نہایت عمدہ نذر کیے تھے۔ دو تین دن تک تو اس نے بہت خبرگیری کی اس کے بعد نگاہیں پھیر لیں۔ اس لیے ۲۰ محرم کو اتوار کے دن اس کا مکان چھوڑ دیا۔ اور کیپ ٹاؤن روانہ ہوا۔ جس کوچ پر روانہ ہوا تھا اس میں آٹھ گھوڑے جُتے ہوئے تھے کوچوان کی عقلمندی پر عقل حیران تھی کہ کبھی گاڑی کو دریا کے اندر جہاں کمر کمر پانی تھا، چلاتا تھا اور کبھی ایسے ریتیلے میدان میں جہاں آدمی اور گھوڑا دھنس جائے وہ ہوا کی طرح تیز نکال لے جاتا تھا۔ کبھی پہاڑ کے نشیب و فراز پر کہ جہاں گھوڑے کا سوار مشکل سے چڑھ سکتا نہایت آسانی سے گاڑی ہانکتا تھا۔

کیپ ٹاؤن اور اس کی خصوصیات

جب شہر کیپ ٹاؤن چار پانچ میل رہ گیا تو سڑک نہایت کشادہ اور ہموار نظر آئی۔ اس کے دونوں طرف باغات تھے۔ ایک طرف کسی قدر نشیب میں بہت وسیع ہموار زمین دکھائی دی، جس میں گاؤں کھیت، ہوا چکیاں، اور دوسرے کارخانے ہیں۔ سارا شہر نہایت شاندار اور خوبصورت ہے جس کو دیکھ کر طبیعت بے حد خوشی اور تازگی حاصل ہوئی۔ ولندیزی شرفا اور معزز انگریز سہ پہر کے بعد گھوڑوں اور گاڑیوں پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے نکلتے ہیں۔

کیپ خورد سے یہاں تک راستہ میں چند آتش خانے ان میں سے ایک میں ناشتہ کیا، دوسرے میں دن کا کھانا کھایا جو نہایت لذیذ تھا۔ اس دن شام کے قریب شہر میں داخل ہوا اور مسٹر کلارک نامی انگلینڈ کے ایک باشندے کے مکان پر قیام کیا۔ یہ شخص بہت نیک نام تھا۔ اس کا مکان شہر کے بہترین مکانوں میں شمار ہوتا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی بھی پہلے سے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس شہر کے

دونوں طرف پہاڑی سلسلہ ہے۔ خاص کر ٹیبل کیمپ لینڈ کی سمت بہت بلند ہے۔ اور پہاڑ سے ملی ہوئی ہونے کے سبب سے اکثر وہم ہوتا ہے کہ کہیں پہاڑ گھروں پر نہ گر پڑے۔ بہت سے پہاڑ رنگ برنگے گل بوٹوں اور طرح طرح کے درختوں سے لدے ہوئے ہیں اور جانوروں کی چراگاہیں شہر والوں کے باغات، پانی کے چشمے، جھرنے اور ہواچکیاں بکثرت موجود ہیں۔ ہالینڈ کے لوگ کوہ پیمائی کے اس قدر شوقین ہوتے ہیں کہ ان کی عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ کوہ ٹیبل کے اوپر جاکر کھانا کھاتی ہیں۔ جس کی بلندی پانچ میل ہے۔ اور بعض مقامات پر آدمی رسی پکڑ کر بمشکل چڑھتے ہیں۔ اس کے دوسری جانب سمندر کی کھاڑی ہے۔ یعنی خلیج ٹیبل۔ اس کے کنارے بہت کشادہ اور مضبوط برج بنائے گئے ہیں۔ تاکہ کوئی مخالف جہاز لنگر انداز نہ ہو سکے۔ ایک سمت میدان ہے جس کی حد کوہستان تک ہے۔ جو کیپ خورد اور خلیج ٹیبل کے درمیان حد فاصل ہے۔ اس میدان کے راستوں پر بہت بڑے بڑے برج تعمیر کیے گئے ہیں۔ ہر ایک برج ایک قلعہ کی طرح ہے۔ اور دشمن کو روکنے کا اتنا انتظام کیا گیا ہے کہ جب انگریز اس ملک کو فتح کرنے کے ارادے سے وہاں پہنچے تو ان بندشوں کی وجہ سے اپنی فوج شہر کے کنارے تک نہ لے جا سکے۔ اس لیے کیپ خورد میں اترے اور وہاں سے خشکی کے راستے اس طرف جانے کا قصد کیا۔ اس میدان سے بھی فوج کو لے کر شہر پر حملہ کرنا بہت مشکل تھا۔ اس وقت انھوں نے پہاڑیوں کی خطرناک گھاٹیوں اور پیچیدہ راستوں سے حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس درمیان میں باہم صلح ہو گئی۔

اس شہر کا دور تقریباً چھ میل ہے۔ تمام مکانات پختہ اور پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ سڑکیں کشادہ اور سیدھی ہیں جن پر چوکوں کا فرش ہے۔ پانی کی نالیاں، سڑکوں کے کنارے پتھر سے بنائی گئی ہیں۔ اور بعض وسط میں بھی بہتی ہیں۔ تاکہ شہر کا تمام پانی بہہ کر سمندر میں جا گرے۔ برسات کے زمانے میں کیچڑ بالکل نہیں ہوتا۔ بعض سڑکوں اور نہروں کے کناروں پر دونوں طرف درختوں کی قطاریں ہیں، جن کا سایہ مکانوں پر پڑتا ہے۔ مکانات کے دروازے ایک دوسرے کے مقابل بخط مستقیم نظر آتے ہیں۔ ہر ایک کے سامنے ایک خوبصورت چبوترہ بنا ہوا ہے جس کی چوڑائی ایک گز تک ہوتی ہے۔ موسم گرما میں اس پر صبح و شام نشست ہوتی ہے۔ وہاں کا یہ طریقہ مجھے بہت پسند آیا۔ مکانات کے کمرے شیشہ آلات سے آراستہ نظر آتے ہیں۔ ہر گھر قیمتی گھڑیوں، ہاتھی دانت کی میزوں، منقش پردوں اور کاغذی دیوارگیریوں سے سجا ہوا ہے جو کمرے باہری دروازے کی طرف ہیں وہ زیادہ آراستہ ہوتے ہیں۔

اس شہر کی خوبصورتی دیکھی تو کلکتہ نظر سے گر گیا جو ہندوستان کے شہروں میں سب سے اچھا شہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد لندن تک ہر دوسرے شہر کو دیکھ کر پہلے کو بھول جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ جب آئرلینڈ پہنچا اور شہر کارک کی سیر کی۔ تو شہر کیپ کی کوئی چیز یاد نہ رہی۔ اور جب آئرلینڈ کے دارالسلطنت ڈبلن کو دیکھا تو کارک نظر سے گر گیا اور جب لندن پہنچا تو ڈبلن کی کوئی وقعت دل میں نہ رہی۔

لیکن واپسی کے وقت حالت اس کے برعکس تھی۔ بمبئی تک ہر چیز پہلے سے بدتر نظر آتی تھی۔ جس وقت لندن سے پیرس پہنچا تو باوجود بہت شان و شوکت کے لندن کے مکانات جیسی سادگی اور صفائی، راستوں کی تقسیم، باغات کی خوبصورتی وغیرہ ایک چیز بھی نظر نہ آئی۔ حالانکہ پیرس میں پتھر کی اونچی اونچی عمارتیں بھی ہیں۔ سنہرے کام کی کثرت کے علاوہ بعض اور خوبصورت چیزیں لندن سے زیادہ تھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہشت سے دوزخ میں آگیا ہوں اور جب قدیم روم کے شہر اٹلی پہنچا تو پیرس کی قدر و قیمت زیادہ معلوم ہوئی اور اٹلی نظر میں نہیں سمایا۔ ہاں جب استنبول پہنچا تو اچھا نظر آیا۔ یہ بغداد اور موصل بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جنت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح بنگال میں مرشدآباد اور بصرہ کو دیکھ کر بغداد یاد آتا تھا۔ ہر ایک کا بیان اپنے موقع پر آئے گا۔ مختصر یہ کہ شہر کیپ کے وسط میں ایک میدان ہے۔ نہایت ہموار تقریباً دو میل لمبا چوڑا۔ اس شہر کی فوج وہاں پریڈ کرتی ہے۔ میدان کے دونوں طرف شہر کی عمارتوں کی قطار نہایت خوبصورت نظر آتی ہے۔ میدان کے تیسری طرف سمندر ہے، اور چوتھی طرف ایک قلعہ ہے، جو کلکتہ کے قلعہ سے کچھ چھوٹا ہے۔ دوکانیں اور بازار نہایت کشادہ۔ دکانوں پر ہر قسم کی چیزیں سلیقہ سے سجی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ہلندیز کی خواتین کا حال

ہلندیزی (ہالینڈ کی نسل سے) عورتیں جو ولایتی ہیں، اکثر بے نمک بداخلاق اور بے سلیقہ ہیں۔ لیکن جن عورتوں کی پیدائش کیپ میں ہوئی ہے، ان میں حسنِ فرنگ نظر آیا، اُن کے جسم بھی خوبصورت ہیں۔ ان میں بہت سی روپیہ کمانے کے لیے جسم فروشی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جو پاکباز ہیں اُن میں بھی حیا کی کمی ہے۔ اس شہر کی معزز خواتین میں سے ہر ایک کا کسی نہ کسی انگریز افسر سے تعلق تھا۔ جب کوئی افسران کے گھر آتا ہے تو مالک مکان اپنی بیوی کو اس کے سپرد کر کے خود باہر چلا جاتا ہے جو کچھ رقم انگریز افسر کے پاس ہوتی ہے، وہ عورت اس سے اینٹھ لیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہلندیزی قوم اپنے اقتدار کے زمانہ سے

زیادہ اس زمانہ میں خوشحال اور فارغ البال ہے۔ اس قوم کے مرد نہایت سخت دل اور بے مروت ہیں۔ کسی قسم کی بدنامی سے نہیں ڈرتے ہیں۔ اپنے غلاموں سے اتنا کام کراتے ہیں کہ کسی اور ملک میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کرایا جاتا ہے۔ ان غلاموں میں سے اگر کوئی ہنر سیکھتا ہے تو اس سے مہارت فن کے مطابق ایک سے لے کر چار ڈالر تک وصول کر لیتے ہیں۔ ان کی لڑکیوں میں جو حسین ہوتی ہے اُس کو اپنے مصرف میں لے آتے ہیں اور بدصورت کو فروخت کر دیتے ہیں۔ یا اس کے باپ کی طرح اس سے بھی کچھ رقم یومیہ وصول کرتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی غلام اپنی دستکاری کی بدولت مالدار ہو جاتا ہے اور اپنے کو آزاد کرانا چاہتا ہے تو اس سے بہت زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں۔

میں نے وہاں ایک درزی کو دیکھا جس کے چار بچّے تھے۔ اپنی نصف عمر سے زیادہ مزدوری کر کے اُس نے جو رقم جمع کی تھی۔ اس کو دے کر اپنے کو اور اپنی بیوی کو مالک سے آزاد کرایا۔ لیکن اس کی اولاد اسی طرح مالک کی غلامی میں قید تھی۔ ایک لڑکا فروخت ہو کر کسی اور شہر میں چلا گیا تھا اور ایک جوان بیٹی مالک کی خدمت میں رہتی تھی۔ دو چھوٹے بچّے اگرچہ ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے مگر اُن کی جدائی کا خدشہ بھی ہر وقت لگا رہتا تھا۔

ان کی چھوکریاں مسافروں کی خدمت کرتی تھیں اور ان سے تعلق پیدا کر کے جو روپیہ کماتی تھیں وہ اپنے مالک کو دے دیتی تھیں۔ ان لوگوں کے مکانوں کے سنڈاس میں ایک بہت بڑا برتن رکھا رہتا ہے۔ نجاست اس میں ڈالی جاتی ہے۔ اپنی طبیعت کی گندگی کے باعث وہ برتن جب تک لبالب بھر نہیں جاتا، اس کو صاف نہیں کراتے ہیں۔ اس بے تمیزی سے مجھے اس شہر میں بہت تکلیف پہنچی۔ پاخانے جانا قبر میں جانے سے زیادہ بدتر معلوم ہوتا تھا۔ گرمی کی شدت کے باوجود وہاں حمام اور غسل خانے کا نام بھی نہیں، بلکہ وہ جانتے ہی نہیں کہ غسل کرنا کس کو کہتے ہیں۔ اکثر ناچ کے جلسوں میں ان کی عورتیں اجنبیت اور زبان سے ناواقفیت کے باوجود مجھ سے اس طرح کی رغبت انگیز حرکتیں کرتی تھیں کہ کسی فتنے کے خوف سے میں اٹھ کر دوسری طرف چلا جاتا تھا۔

لطیفہ ایک دن کئی لڑکیاں مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ ان میں سے ایک نے جو بہت حسین اور شوخ تھی۔ میرے ہاتھ سے رومال چھین کر دوسری سہیلیوں کو دینا چاہا۔ وہ قہقہے لگاتی تھیں مگر اس رومال کو کوئی لیتا نہیں تھا۔ اس کا ایک سرا میرے ہاتھ میں تھا میں اس کو چھوڑتا بھی نہیں تھا۔ چونکہ استنبول میں رومال لینا اور دینا عورت اور مرد کے درمیان ایجاب و قبول کی علامت ہے۔ اور میں ایسی جوان حسینوں کو رومال دینے میں پس و پیش کر رہا تھا

اس شوخ حسین لڑکی نے سبب پوچھا، تو میں نے کہا "یہ تیری ہمجولیاں مجھ کو اچھی نہیں لگتیں اس لیے میں ان کو رد مال نہیں دیتا ہوں یہ صرف تمھارے لیے خاص طور پر رکھ چھوڑا ہے اگر قبول کرو تو حاضر ہے۔ یہ سن کر وہ سب ہنسنے لگیں۔ اور وہ لڑکی شرما کر ایک طرف بھاگ گئی۔

القصہ بتاریخ ۱۱ ماہ صفر ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء کو شنبہ کے دن تک تیرہ دن اس گھر میں رہا اور کسی حد تک شہر کیپ اور وہاں کے باشندوں کے حالات سے واقفیت حاصل کی پھر وہاں کے مسلمانوں کی مدد سے ایک اور مکان میں چلا گیا جو سوارک کے مکان سے کفایت میں مل گیا تھا لیکن مکان چھوڑتے وقت مسٹر کلارک نے ہلندیزیوں کی خصلت کے مطابق حساب کتاب میں بہت بے ایمانی کی۔ اس نے دو روپیہ یومیہ کرایہ مکان اور دو روپیہ روز کھانے کا مقرر کیا تھا لیکن مجھ سے کرایہ مکان یہ کہہ کر دوگنا وصول کیا کہ تم مہینہ بھر کیوں نہیں رہے کھانا میں نے چار دن سے زیادہ نہیں کھایا تھا۔ زیادہ تر انگریز افسروں کی دعوتوں میں رہا تھا۔ مگر اس نے کھانے کی رقم بھی پورے دنوں کی طلب کی۔ اسی طرح درزی، دھوبی اور حجام کی اُجرت بھی دوگنی لگائی میں نے اپنے ساتھیوں سے التجا کی کہ اس حساب میں میری مدد کریں۔ مگر کسی نے میری مدد نہیں کی۔ خود کپتان ولیم تسن اس گھر کی ایک لڑکی پر فریفتہ تھا اس لیے اس نے بھی میری مدد نہیں کی بلکہ روپیہ ادا کرنے کی ہدایت کی یہ معلوم ہوا کہ اگر میں نے روپیہ ادا نہ کیا تو کلارک مجھ کو ہلندیزی کی عدالت میں کھینچ بلائے گا مجبوراً اس کی بد دیانتی کے باوجود میں نے روپیہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد اس نے میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی اسی طرح پریشان کیا تب لوگوں کو میری مدد نہ کرنے سے جو نقصان پہنچا اس کا احساس ہوا اور سب بہت پشیمان ہوئے اور ایک ایک دو دو کر کے اس مکان میں آ گئے جس کے اندر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک حرکت اس نے یہ کی کہ کپتان ولیم تسن سے زیادہ رقم حاصل کرنے کی غرض سے اس کنیز کو کسی بہانے سے چھڑا کر کوتوالی پہنچا دیا۔ اس طرح کپتان مذکور کو بھی بہت تکلیفیں اٹھا کر وہ گھر چھوڑنا پڑا۔ اب جو لوگ باقی رہ گئے تھے ان کا کرایہ اس نے دوگنا کر دیا۔ ان بیچاروں کو قبول کرنا پڑا۔ وہ آئندہ ہفتے کسی بہانے سے کرایہ اور بڑھانا چاہتا تھا جس کو وہ لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی وہ گھر چھوڑ دیا۔

ماہ صفر کی ۱۱ تاریخ سے آخر ماہ ربیع الاوّل ۱۲۱۴ھ تک ہم اس گھر میں مقیم رہے۔ اتفاق سے وہ گھر ایک لالچی شخص کے ہاتھ فروخت ہو گیا۔ اس لیے سب مسافر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ مجھ کو ایک دوسرا مکان اور زیادہ کفایت سے مل گیا اور ربیع الثانی کی پہلی تاریخ کو میں وہاں سے نئے مکان

میں اُٹھ آیا۔ اس مکان میں ایک مسلمان رہتا تھا جو ہر کام میں میری مدد کرتا تھا۔ اور حسبِ ضرورت میرا کام کر دیتا۔ اس کی ذات سے مجھ کو بہت آرام ملا۔

شہر کیپ کا موسمِ بہار

اس زمانہ میں وہاں کا موسم سرما اور برسات جو ساتھ ساتھ ہوتے ہیں ختم ہو گئے اور موسم بہار کا آغاز ہوا۔ درختوں نے اپنے کو سبز لباس سے آراستہ کیا۔ اور پھولوں نے شگفتہ ہو کر گلزارِ عالم کو بہشت کا نمونہ بنا دیا۔ سب سے زیادہ لطف چمنستانوں میں محوِ خرام حسینوں کے دیدار سے حاصل ہوا۔ جس طرح کے رنگا رنگ پھول وہاں نظر آئے۔ میں نے اپنی ساری عمر میں کہیں اور نہیں دیکھے۔ اور نہ اس کے بعد ہی نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا حکیم انوری نے یہ دلکش اشعار اسی سرزمین کے لیے کہے تھے۔ ع:

صبا بہ سبزہ بیاراست باغِ دنیا را — نمونہ گشت زمین مرغزارِ عقبیٰ را
نسیم باد از اعجاز زندہ کردن خاک — ببرد آب ہمہ معجزاتِ عیسیٰ را

گلاب کے پودے نہایت موزوں بکثرت دیکھنے میں آئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے تھے، مگر پھول بہت بڑا دیتے ہیں۔ نرگس کئی قسم کی تھی۔ ایک قسم بہت مشہور ہے جس کو تلنہ کہتے ہیں۔ دوسری قسم بجائے زرد کے سفید اور تیسری بجائے سفید کے زرد، چوتھی کا رنگ سرخ اور پانچویں کی کٹوری بنفشئی رنگ کی ہوتی ہے اور اس کو نرگس شہلا کہتے ہیں۔ نرگس کی کٹوریاں اور تمام پھول بہت بڑے اور شاداب ہیں۔ بعض پودوں میں سو شاخیں تک ہوتی ہیں۔ ہر شاخ پھولوں سے لدی ہوئی نظر آئی۔ ایک خاص قسم کا پھول وہاں دیکھنے میں آیا جس کی جڑ مثل نرگس کے پیاز کی طرح ہوتی ہے۔ اور پتے بھی اس سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور پھولوں کی قلمیں اس کے تنے میں نکلتی ہیں۔ یہ سادہ اور ہزاروں مختلف رنگوں میں ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی خوشبو نرگس سے زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ انگریزی میں اس کو ہیاسنتھ کہتے ہیں۔ یہ پھول تمام فرنگستان میں پسندیدہ اور قابلِ وقعت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک خاص قسم کا پھول جو وہاں لالہ کا قائم مقام ہے۔ سادہ بھی ہوتا ہے اور کئی دوسرے رنگوں میں بھی۔ خاص طور پر سرخ، بنفشئی، گلابی، زرد، سفید، نیم رنگ، سبز اور کئی رنگ ایسے بھی نظر آئے جنھوں نے مجھ کو دھوکہ میں ڈال دیا۔ گلدستوں میں بعض ایسے ملے جلے رنگ کے پھول نظر آتے تھے جن کو میں مصنوعی خیال کرتا تھا۔ ایسے مصنوعی پھول فرنگستان میں نہایت خوبصورت بنائے جاتے ہیں۔ جب تک ہاتھ سے چھو نہیں لیتا تھا ان کے اصلی ہونے میں شبہ رہتا تھا۔ ایک اور پھول زرد چنبیلی کی طرح بہت خوبصورت اور ملائم نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک قسم کی گھاس ہے جو اس علاقے کے جنگلوں میں خودرو ہوتی ہے۔ یہاں

خوردبنفشہ بھی بکثرت ہوتا ہے۔ ایک ایسا خوبصورت درخت بھی نظر آیا۔ جو اپنے حسن قامت اور عجیب بناوٹ کے باعث باغوں میں لگاتے ہیں۔ اس کے پتے بید کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ چوڑے اور سبز ہوتے ہیں۔ پتے کے دونوں رُخ اطلس کی طرح سفید اور مخمل کی طرح نرم ہوتے ہیں جس وقت اس پر سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں، تمام درخت مع شاخوں اور پتوں کے چاندی کا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نام سلور ٹری رکھا گیا ہے یعنی چاندی کا درخت۔ غرض یہ کہ یہاں نشوونما کی قوت نباتات میں اس قدر ہے کہ اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

ہر مکان میں ایک چشمہ جاری ہے۔ جس میں پہاڑ کے شگاف سے پانی آتا ہے۔ آج تک اس سے اچھا پانی پینے میں نہیں آیا تھا۔ کہتے ہیں گرمیوں میں جاڑوں سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہاں گوشت گائے اور دُنبے کا استعمال ہوتا ہے۔ بعض دُنبے اتنے موٹے دیکھے جس کی دُم (چکتی) زیادہ وزن کی وجہ سے ہاتھ گاڑی پر رکھ کر چلتے ہیں۔ ان میں اکثر ڈیڑھ من گوشت نکلتا ہے۔ چربی کی کثرت کے باعث کھانوں میں گھی ڈالنے کا معمول نہیں ہے۔ مچھلیاں نہایت عمدہ اور نمکین ہوتی ہیں۔ میوے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر گلابی امرود بہت بڑا ہوتا ہے۔ سیب کشمش لاجواب ہے نارنگی سلہٹ کے سنگترے کی طرح بہت شیریں اور تر و تازہ ہوتی ہے۔ تازہ بادام اور اخروٹ کھانے میں آئے۔ کہتے ہیں گرمیوں میں خربوزے اور تربوز بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے انگوروں کی اسی کثرت ہے کہ اناج کی طرح کھیتوں میں ہوتے ہیں۔ اور اس کی شراب بناکر سارے فرنگستان میں بھیجی جاتی ہے۔ کیپ کے قریب چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے جس کا نام کانسٹینشیا ہے۔
وہاں کا انگور بہت میٹھا ہوتا ہے، اور اس کی شراب سب شرابوں سے اچھی اور بہت قیمتی ہوتی ہے۔ اور تمام یورپ میں مشہور ہے اور تحفہ کے طور پر دی جاتی ہے۔ ترکاریاں بھی کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ گو بھی، گاجر، شلغم بہت بڑے ہوتے ہیں کچے بھی رغبت سے کھائے جاتے ہیں۔ البتہ گیہوں اور چاول اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ تازہ مکہ بہت مشکل سے ملتا ہے۔ وہ بھی امیر لوگوں کو۔ چیزوں کے نرخ بہت گراں ہیں۔ مرغی کے آٹھ انڈے ایک روپیہ میں ملتے ہیں۔ ایک سیر کی روٹیاں ایک روپیہ میں چار عدد، گوشت ڈھائی روپے سیر، قمیض کی دھلائی چار آنے فی قمیض۔

جانوروں میں بڑے بالوں والی بھورے سیلے رنگ کی بلی قابلِ ذکر ہے، مقام مذکور میں اتنا نہ اور طاقتور ہوتا ہے۔ گھوڑا عربی گھوڑے کی طرح بہت تیز اور چالاک ہوتا ہے ... روپے تک قیمت میں فروخت ہوتا ہے اور نہایت فرمانبردار ہوتا ہے۔ شوخی بالکل نہیں کرتا۔ ... گھوڑوں کی طرح تیز اور

چیالاک ہوتا ہے اور گاڑیوں میں جوتا جاتا ہے۔ اس نواح میں شتر مرغ بکثرت ہوتے ہیں۔

کیپ کے دوستوں کا ذکر

اس شہر کے شہری ہلندیزی ہیں۔ رعایا میں ملائی، حبشی، بنگالی اور سورتی زیادہ ہیں۔ ان لوگوں کو ابتدا میں ہلندیزی غلام بنا کر لاتے تھے بعض نے دولت مند ہونے کے بعد قیمت دے کر اپنے کو آزاد کرالیا اور بعض کے مالک مرگئے ہیں. اب بھی نصف سے زیادہ ہلندیزیوں کی غلامی میں ہیں میں نے ان سب کو سچا رحم دل اور پاک اعتقاد مسلمان پایا انہیں لوگوں میں ایک شیخ عبداللہ ابن عبدالعزیز عرب مکہ کا رہنے والا تھا کسی وجہ سے اس ملک میں آگیا. اس نے ایک ملائی عورت سے شادی کرلی اور آرام سے زندگی بسر کر رہا تھا. اس نے کئی بار میری دعوت کی۔ اس کے علاوہ ہر کام میں مدد اور رہنمائی کرتا رہا. اس کی دیکھا دیکھی ملایا کے دوسرے بزرگ بھی میری دعوتیں کرتے رہے۔ خود انگریز افسر میری اس قدر خاطر داری کرتے تھے کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھی۔ کیپ کے قرب وجوار میں جو مقامات قابلِ دید تھے ان سب جگہوں پر مجھ کو لے گئے۔ ان انگریزوں میں ایک جنرل ڈنڈاس ہیں جنھوں نے چھ بار میری دعوت کی. ان کے علاوہ مسٹر رینڈوں نے تین بار کھانے پر بلایا۔ یہ شخص کیپ فتح ہونے سے کئی سال قبل تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا وکیل رہا ہے۔ ایک دولت مند اور ذی عزت شخص ہے۔ ان کے علاوہ مسٹر بارنٹ سررشتہ دار رفاتر نے تین بار دعوت کی اور مسٹر راآس نے ایک بار اور مسٹر بمگارس نے دو بار مدعو کیا۔ یہ ہلندیزی ہے اور اب سے بیس سال پہلے چنسورہ کا گورنر رہ چکا تھا اور انگریزی اقتدار سے قبل کیپ کا گورنر تھا جب انگریزوں نے اس شہر کو صلح کے ساتھ فتح کیا تو اس وقت سے ابھی تک شہر کی کوتوالی عدالت اور انتظامیہ کا کام اسی کے ذمہ رکھا ہے۔ اس کی بیوی حسن وادا چستی وچالاکی، اور خوش اخلاقی میں بہت مشہور ہے۔ چھ سات زبانیں بول سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے افسران میں کرنل ہال، کرنل بلیسی، ونڈر، کپتان بیلی، میجر آری وغیرہ میں سے ہر ایک نے دو مرتبہ دعوت کی۔ مسٹر ... دوم رتبہ دعوت کی۔ یہ بلند مرتبہ شخص انگریزی عدالت کا افسر ہے۔ اس کی خوش ... دیا گلدستوں ... عالی خاندان بیوی نے دو بار مجھ کو محفلِ رقص و سرود میں بلایا۔ اور جن لوگوں نے مجھے اپنے ... پایا ان کے نام یہ ہیں۔ کرنل ہسٹن، جس نے اجیت سنگھ کی لڑائی میں مسٹر ہسٹن کے ہمراہ ... کارنامے انجام دیئے تھے۔ اور کرنل کراڈس، کرنل سنڈس، کپتان ہوکن، مسٹر کیبان (مصور) ڈاکٹر مرسن جس کی بیوی بہت خوش اخلاق اور مہمان نواز

ہے۔ لیڈی بارنٹ جومسٹر بارنٹ کی زوجیت میں ہے اور کیپ کی شہزادی کہلاتی ہے۔ ہر جمعہ کی رات کو اس کے یہاں چار پانچ سو آدمیوں کی محفل ہوتی ہے۔ جس میں ناچ گانا اور گنجفہ ہوتا ہے اور ہر چاندنی رات میں بزم رقص و سرود منعقد ہوتی ہے۔ مجھ کو بھی اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مسٹر گرانٹ آئرلینڈ کی ایک اچھی لڑکی تھی۔ جو اسی زمانے میں مسٹر گرانٹ کے نکاح میں آئی تھی۔ اور حسن و جمال میں بے نظیر تھی۔ اس کی عادتیں ہندوستانی بیویوں جیسی تھیں۔ اس پری چہرہ کی اداؤں سے مجھ کو بہت لطف حاصل ہوا۔ سوا ان چند عورتوں کے جن کا ذکر کیا گیا ہے کوئی مشہور عورت انگریز قوم کی وہاں نہ تھی۔ ان سب نے جن کے نام لکھے گئے ہیں ایک ایک دو دو بار میری دعوت کی۔ یہاں کے چار پانچ ہزار آدمیوں کی دلچسپی اور کاروبار کا دارومدار ہلندیزی عورتوں پر تھا۔

اس شہر میں اتنا کام میرا بھی ہو گیا کہ میرے ہمراہ جو حبشی غلام آیا تھا وہ جہاز کے اوباش لوگوں کی صحبت میں آوارہ ہو گیا تھا۔ اس کو ہٹانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کو پانچ سو ڈالر میں فروخت کر دیا اور ایک قلمی حمائل شریف سو ڈالر ہدیہ کے عوض دے دیا۔ چند تھان کپڑے کے سو ڈالر میں فروخت کر دیئے۔ اس طرح کل سات سو ڈالر مل گئے۔ جو ہندوستان کے چودہ سو روپیہ کے برابر تھے۔ اس طرح اس نقصان کی تلافی ہو گئی جو ہلندیزی میزبانوں نے مجھ کو پہنچایا تھا۔ غرض یہ کہ ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۹۹ء تک جہاز کے انتظار میں ٹھہرنا پڑا۔

دوبارہ سفر انگلینڈ کا آغاز

۲۶ ربیع الثانی ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۹۹ء کو چہارشنبہ کے دن برطانیہ نامی جہاز پر لندن کے لیے سوار ہوا۔ اس کا کرایہ تین گنی یعنی تین سو روپیہ تھا۔ اور اسّی روپیہ متفرق اخراجات کے واسطے لیے گئے۔ میرا وہ چار سو روپیہ جو پہلے جہاز کا نصف کرایہ تھا مارا گیا۔ حالانکہ دوسروں نے وصول کر لیا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کپتان ٹاٹل مین بھی چند روز کے بعد کہ جب موسم سرما ختم ہو گیا تھا اپنے جہاز کو کیپ ٹاؤن میں لایا اور کمپنی کے وکیل نے کپتان ولیم سن کی شکایت پر اس کو ملزم قرار دیا۔ اس کا سبب وہ جلے ہوئے کپڑے اور دوسرا سامان تھا جو اس نے ڈوبے ہوئے جہاز سے خلیج بنگال میں نکالا تھا۔ اس جرم میں اس پر پندرہ ہزار روپیہ بطور تاوان جرمانہ کیا گیا۔ عملہ جہاز کے اکثر افراد منتشر ہو گئے۔ اس موقع پر رفیقانِ سفر نے ٹاٹل مین پر قابو پا کر اس سے کہا کہ یا تو جہاز کا نصف کرایہ واپس کر دے یا ہم کو مقامِ مقصود تک پہنچا دے۔ اس نے دونوں باتوں سے معذوری ظاہر کی۔ لہٰذا ہلندیزی عدالت میں دادخواہی کی گئی۔ میں نے دو باتوں کی وجہ سے مقدمہ میں شرکت نہیں کی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ کپتان ٹاٹل مین نے کہا کہ تو مسافر ہے عدالت

میں نہ جا۔ اگر عدالت دوسروں کو روپیہ دلائے گی تو میں تجھ کو خوشی سے روپیہ دیدوں گا۔ دوسرے ہلینڈیری قوم کی دغابازی کے خیال سے میں نے مقدمہ میں شرکت نہیں کی۔ خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ اسی زمانہ میں کپتان ٹاٹل مین نے ایک ہلینڈیز عورت سے نکاح کیا تھا۔ اور میرے ساتھی بھی روپیہ کی وصولیابی سے مایوس ہو کر روپیہ خرچ کر رہے تھے۔ آخر کار جہاز برطانیہ پر سوار ہونے سے ایک دن پہلے سب رفیقانِ سفر کو روپیہ واپس مل گیا۔ اور کپتان ٹاٹل مین نے مجھ سے وعدہ خلافی کی اور روپیہ نہیں دیا۔ ناچار کپتان ہوگن ایک معزز انگریز تاجر کو میں نے اپنا وکیل بناکر روانہ ہوگیا۔

ڈھائی سال بعد لندن میں اس کا خط ملا کہ میں نے ہلینڈیز کی عدالت سے دوسروں کی طرح تمہارے موافق بھی فیصلہ کرالیا ہے۔ لیکن کپتان ٹاٹل مین کے وکیل نے اس پر عمل درآمد نہیں کیا۔ اس لیے انگریزی عدالت میں اپیل کی گئی۔ وہاں سے دعویٰ خارج ہوگیا۔ ساتھیوں میں سے تین آدمی کیپ میں رہ گئے اور مجھ کو ان کی دل آزاری اور ظلم سے نجات ملی، کپتان رچرڈسن مع بچوں اور رہنے والی ضدی لڑکی کے جہاز پر موجود تھے۔

وھیل جہاز کا حال

یہ جہاز وھیل مچھلی کے شکار کے لیے ہے جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اس مچھلی کا تیل کھینچنا اور لندن لے جانا اس کا کام ہے۔ اس جہاز کے معلم اول کے اسی سفر میں پاؤں کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے کہ جس میں مچھلی کے کانٹے کی رسی الجھ گئی تھی سفر آخرت اختیار کیا تھا۔

اس قسم کا جہاز کسی قدر سامانِ جنگ وغیرہ سے بھی مستحکم ہوتا ہے اور اس کے ملاح بھی جنگی جہازوں کی طرح قانون پر پورے طور سے عمل کرتے ہیں۔ اس وجہ سے برطانیہ نے کیپ پہنچنے کے وقت جو اسپینی جہاز گرفتار کیا تھا۔ اس کو کیپ میں لاکر اسی ہزار روپے میں فروخت کیا اور اس رقم اور سامان کو جہاز کے عملے نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ اسی طرح روانگی کے وقت بھی اکثر جہازوں کا تعاقب کیا۔ لیکن کوئی ہاتھ نہ لگا۔ اس کا کپتان کلاک نامی تھا۔ جو علم جہاز رانی میں بہت ماہر تھا۔

آیرلینڈ تک راستہ میں تین زمینیں ملیں۔ وہ کپتان ہمیشہ پہلے سے خبر کر دیتا تھا کہ فلاں وقت ہم فلاں جگہ پہنچیں گے۔ اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس جہاز کے حجروں میں تنگی کے باوجود اسباب رکھنے کی جگہ بڑی حکمت سے بنائی گئی تھی۔ اور طوفان کی آفتوں سے بچنے کے سامان کیے گئے تھے۔ لنگر اٹھانے اور کھینچنے کی چرخیاں نصب تھیں۔ ملاح گنتی میں تو بہت کم یعنی صرف تیس تھے، مگر

سب ہوشیار اور تجربہ کار تھے۔ اس لیے سارے کام آسانی سے اچھی طرح انجام پاتے تھے۔ پہلے جہاز کی طرح کوئی بے آرامی اس میں نہ تھی۔ جمعہ کے دن ۲۷ ربیع الثانی کو جنوبی خط استوا میں پھر ہم کو باد تجارت ملی۔ روانگی کے دن سے آج تک بھی باد مراد ملتی رہی، ۲۰ درجے ڈھائی دن میں طے ہوئے۔ نویں تاریخ جمادی الاول کو دوپہر کے وقت جزیرہ سینٹ ہلینا میں پہنچ کر جہاز لنگر انداز ہوا۔

دس تاریخ کو گورنر بروک کی میزبانی سے لطف اندوز ہو کر اور اس اطراف کے باغات کی سیر کر کے گیارہ تاریخ کی شام کو جہاز پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔

جزیرہ سینٹ ہلینا[1] کا حال

یہ ایک بلند جزیرہ ۱۶ درجے جنوبی سمت وسط بحر مغرب میں ہے۔ جس کے ادھر ادھر سینکڑوں کوس تک زمین کا اثر نہیں ہے۔ سب کوہستان ہے۔ اور سوائے محاذات شہر کے لنگر گاہ نہیں ہے۔ اس جزیرہ کا دور پچیس میل ہے اور سمندر کی جانب سیاہ جلے ہوئے پتھریلے ٹیلے ہیں۔ لیکن پتھروں کے درمیان سبزہ زار بھی ہیں۔ زرد گلاب جنگلی گلاب کے درخت اور ایک جنگلی میوہ جس کو بلیک بیری کہتے ہیں بہت ہے۔ اس کے اکثر مقامات پر باغات بھی لگے ہوئے ہیں۔ اور جس طرح ممکن ہوا ایک ٹیڑھا میڑھا راستہ بھی بنا لیا ہے جس پر دو گھوڑے برابر برابر چل سکتے ہیں۔ اس لیے گاڑیوں اور چھکڑوں کا اس شہر میں رواج نہیں ہے۔ وہاں کے گورنر اور کرنل رابنسن اور کپتان کے باغات نمونۂ بہشت ہیں۔

جن کی تعریف سے قلم کی زبان عاجز ہے۔ گورنر کا باغ طرح طرح کے پھولوں، انگور کی ٹٹیوں اور حوض و فوارہ کی وجہ سے بہت دلکش ہے۔ انگور کی ٹٹیاں ایسی ہیں کہ ان کے سائے میں آرام کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کرنل کا باغ اتنے پھل دیتا ہے کہ تمام اخراجات نکال کر دس ہزار روپیہ سالانہ بچ جاتا ہے۔ یہاں کبھی کسی نے بجلی کی چمک اور گرج نہ دیکھی نہ سنی۔ یہاں کے بلند مقامات پر دھوئیں کی طرح کی جلی ہوئی بو آتی ہے۔

پانی کے چشمے دو تین سے زیادہ نہیں ہیں۔ باغوں کی شادابی اور جانوروں کا چارہ برسات پر منحصر ہے۔ خشک سالی کے زمانے میں حیوانات گھاس اور پانی کی کمی کے سبب سے ہلاک ہو جاتے

---

[1] یہ جزیرہ بحر اٹلانٹک میں مغربی افریقہ کے ساحل سے تقریباً بارہ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ نپولین بوناپارٹ اسی جزیرہ میں قید کیا گیا تھا۔ (مترجم)

ہیں۔ گوشت، ترکاری اور مکّہ کے سوا کھانے کی تمام چیزیں فرنگستان سے آتی ہیں۔ بھیڑ، مرغ وغیرہ بہت کمیاب ہیں۔ کیپ کے کل میوے بہ اضافہ انناس، کیلے اور خرمے کے یہاں دستیاب ہوتے ہیں۔ گائے کا دودھ چارے کی طاقت کے باعث اس قدر چکنا ہوتا ہے کہ ایک دن میں دو مرتبہ ایک اُنگل موٹی بالائی اُتاری جاتی ہے۔

سینٹ ہلینا کی آبادی نئی ہے۔ انگریزوں نے بنگال کی فتح کے تیس چالیس سال بعد اس کو فتح کیا ہے۔ دو پہاڑوں کے درمیان میں لنگرگاہ کے متصل جہاں زمین کی سطح ہموار پائی وہاں عمارت بنائی ہے۔ اس وجہ سے اس کا طول دو میل اور عرض میں بعض جگہ سو قدم، بعض جگہ بیس قدم ہے۔ یہ سب بظاہر سیلاب کے راستے میں ہے۔ اس پر بھی چند قہوہ خانے ریفریشمنٹ روم اور دوکانیں ہر قسم کی چیزوں سے سجی ہوئی ہیں۔ اور ایک چھوٹا سا میدان سپاہیوں کی قواعد پریڈ کے لیے موجود ہے۔ اس کے دونوں طرف کے پہاڑ اس قدر کرو وہیں کہ پہاڑی بکری کے چلنے سے پتھر لڑھک کر مکان کی چھتوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی انسانوں کی ہلاکت کا بھی باعث بن جاتے ہیں اسی لیے جو شخص پہاڑی بکری کا شکار کر کے عدالت میں لاتا ہے۔ وہ کسی قدر انعام پاتا ہے۔ زیادہ تر مکانات خس پوش اور بعض کھپریل کے ہیں۔ دیواریں پتھر اور چونے کی۔ عام لوگوں کے مکان پہاڑ کے اوپر سے بالکل جانوروں کے گھونسلوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اس شہر کے باشندے اکثر سیاہ اور گندمی رنگ کے ہیں جن کا نسلی تعلق حبشیوں، ہندیوں اور فرنگیوں سے ہے۔ شہر کے آگے سمندر سے متصل ایک خندق اور مورچال بنایا ہے۔ اور دونوں طرف کے پہاڑوں پر سمندر سے لگا ؤمیں بہت دور تک نہایت مضبوط بُرج بنائے ہیں جن میں کا ہر ایک بُرج بجائے خود ایک قلعہ ہے۔ جہاں سے غنیم کے جہاز کو ایک آن میں غرق کیا جا سکتا ہے۔ شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر ایک اونچے پہاڑ پر ایک مضبوط اور شاندار قلعہ تعمیر کیا گیا ہے جس کا صرف ایک راستہ ہے۔ جس سے قلعہ والے آتے جاتے ہیں۔ اس کی دیواریں پتھر کی ہیں۔ دس گز چوڑی اور برج اندر سے خالی ہیں جس قدر عمارت کہ اب تک بن چکی ہے اس کی چھت پتھر کی ہے لکڑی کا مطلق نام نہیں۔ اس کا تعمیر کرنے والا کہتا تھا کہ یہ عمارتیں پہاڑ کی طرح ہمیشہ گرنے سے محفوظ رہیں گی۔ اس جگہ سلح خانہ، غلّہ کا گودام، مکانات۔ اور باورچی خانے اور کھانا کھانے کے کمرے ایسی درستی اور صفائی سے بنائے گئے ہیں اور ان میں ایسی حکمتیں صرف کی ہیں کہ سو آدمیوں کا کام دو تین آدمیوں سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور چار سو آدمیوں کا کھانا ایک دیگ کے اندر تھوڑی آنچ سے پک کر تیار ہو جاتا ہے۔

گورنر سینٹ ہلینا کا حال

یہاں کا گورنر مسٹر بروک ایک جہاں دیدہ وضع دار اور نیک صفات آدمی ہے۔ بارہ سال تک ہندوستان میں بادشاہ شاہ عالم کے پاس رہا اور حشمت الدولہ امیر الملک حشمت جنگ کا خطاب پایا۔ اگرچہ یہاں جہازوں کی آمد و رفت بکثرت ہوتی ہے۔ تقریباً چار سو جہاز ہر سال یہاں آتے ہیں۔ مگر وہ سب کی مہمان داری اور حاجت روائی پر کمر بستہ رہتا ہے اور کسی کو بھی اپنا زیر بارِ احسان بنائے بغیر جانے نہیں دیتا ہے اس کی بیوی جو بنگال میں پیدا ہوئی اور انگلینڈ میں پلی بڑھی ہے حسن اخلاق میں شوہر سے بھی بڑھ گئی ہے۔ گورنر موصوف ہر روز اپنی سواری کے گھوڑوں پر ہم کو سوار کرا کے شہر کے کسی باغ میں بھیجتے تھے جہاں کھانے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو جو دس برس کا تھا مہمان داری کے لیے ساتھ کر دیتا تھا۔ وہ لڑکا بھی باپ کی طرح خوش اطوار اور خدمت گزار تھا جس دن میں نے کرنل رابنسن کے باغ میں کھانا کھایا۔ اس دن کرنل کی بیوی کے اخلاق کریمانہ اور ان کی دو ناکتخدا نوجوان لڑکیوں کا حسن و جمال دیکھ کر بہت محظوظ ہوا۔ جس وقت ان گلرخوں کے ساتھ باغ کی روشوں پر ٹہلتا تھا تو اس وقت وہ باغ اور جنت اور وہ لڑکیاں پریوں اور حوروں کی طرح نظر آتی تھیں۔ لوٹتے وقت کرنل رابنسن جو اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ مجھ کو سواری سے اتار کر مکان میں لے گیا۔ اور دنیا بھر کے وہ عجائب اور نوادر دکھلائے جو اس مکان کے دو تین کمروں میں سجے ہوئے تھے۔ اس نے نہایت بے تکلفی اور سادگی سے پوچھا کہ تم نے میری موٹی بی بی کو کیسا پایا۔ اس کی صورت اور سیرت کو پسند کیا یا نہیں۔ اس مکان کے کمروں میں طرح طرح کی چیزیں، رنگ برنگ کے پتھر، سیپیاں، زمانہ قدیم کے ہتھیار، لباس، بڑے بڑے جانوروں کی کھالیں اور کھوپڑیاں۔ درختوں کی جڑیں جن کی صورتیں اتفاق سے جانوروں کی طرح ہو گئی تھیں سب چیزیں سلیقہ سے چُنی ہوئی تھیں اس کے علاوہ ہندوستانیوں کے چرانے کے بیجوان اور ایک ڈھال بھی تھی جس کی قیمت ہندوستان میں آٹھ آنے ہوتی ہے۔ کرنل موصوف نے بہت بڑی قیمت دے کر خریدی ہے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ ڈھال خاص ٹیپو سلطان کی ہے جو کسی لڑائی میں اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ خلاصہ یہ کہ زیادہ تر دولت اور آمدنی کرنل موصوف کی ایسی چیزوں کے خریدنے اور جمع کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اور اس قدر ان چیزوں کو دیکھنے بھالنے میں مشغول رہتا ہے کہ ایک ایک ماہ تک باغ نہیں جاتا اور ایسی لائق بی بی اور حسین بیٹیوں تک کو نہیں دیکھتا ہے علاوہ ان باتوں کے اس قدر بامذاق اور خوش مزاج ہے کہ اس کی چہل اور ہنسی مذاق کی صحبت مجھ کو بھی ویسا ہی بن جانے پر مجبور کرتی تھی۔ غرض یہ کہ رخصت کے وقت گورنر بروک نے بہت سے

میوے اور ترکاریاں اور کھانے کی بعض اور چیزیں میرے ساتھ کر دیں اور اپنے بیٹے کو دو مصاحبوں کے ساتھ مجھے جہاز پر پہنچانے کے لیے بھیجا۔ لنگر اٹھنے کے وقت تک وہ جہاز پر ہمارے ساتھ رہے۔

جزیرہ اسنیشن کا حال

۱۲ رجمادی الاول کو منگل کے دن جزیرہ اسنیشن سے گزرے جو سینٹ ہلینا کی طرح بحر عرب کے وسط میں ایک پہاڑ کی صورت میں پانی سے برآمد ہو گیا ہے۔ وہ پچھم کی سمت ہم سے ایک کوس کے فاصلے پر تھا۔ اس کے بعد انگلینڈ تک تقریباً ڈیڑھ ماہ کا راستہ ہے کوئی زمین مسافروں کو نظر نہیں آئی۔ اس جزیرے کی چوڑائی ۸ درجے جنوبی ہے۔ اور پانی کے چشمے نہ ہونے کی وجہ سے آباد نہیں ہوا۔ مگر اس کے بعض مقامات پر بارش کا پانی جمع ہوتا ہے۔

اس جزیرے کے عجائبات میں سے یہ ہے کہ پانی اور چارہ کی تنگی کے باوجود یہاں بھیڑ بکری اور دوسرے جانور اور پرندے بہت ہیں۔ بعض جہازوں کے مسافر اور ملّے کے لوگ وہاں ٹھہر کر شکار کرتے ہیں۔ اس جزیرے میں کچھوے بکثرت اور بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ رات کے وقت آدمی جا کر سینکڑوں کو الٹا لیٹا آتے ہیں اور دن میں اٹھا کر جہاز پر لے آتے ہیں۔ آج کے دن اسی سمت سے گزرے۔ پانی سرد تھا اور رات کو رضائی کی ضرورت ہوتی تھی۔

ایک انوکھی چڑیا

سہ شنبہ کے دن ۱۸ رجمادی الاول سنہ ۱۲۱۴ھ کو خط استوا سے شمال کی جانب پہنچے۔ ہوا کی برودت اور پانی کی ٹھنڈک ختم ہوئی اور پانی کے بدمزہ ہونے کی وجہ سے منہ کا مزہ کڑوا ہو گیا تھا اس نواح میں اڑنے والی مچھلیاں اس قدر تھیں کہ اس سے زیادہ کہیں ہونا ممکن نہیں اور ابابیل کی طرح کے پرندے، مگر اس سے زیادہ بڑے اور سیاہ۔ جن کی دم پر ایک سفید گنڈا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نہ کبھی خشکی پر نہیں جاتے ہیں اور سمندر کی گھاس اور منہ کے لعاب سے پانی پر چلتا پھرتا گھر بنا کر اس میں انڈے دیتے ہیں۔ اور بچے نکالتے ہیں۔ مجھے اس کیفیت سے تعجب ہوا۔

دریائی گھوڑے کا ذکر

کپتان کلارک نے جو ایک معتبر آدمی ہے اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات بتائی کہ افریقہ کے ایک ساحل پر ہمارا جہاز لنگر انداز تھا۔ جس وقت ہم ڈونگی میں چند ملّاحوں کے ساتھ سوار ہو کر پانی کی تلاش میں خشکی پر گئے تو تقریباً سو جانور جن کی صورت گھوڑے اور گدھے کے درمیان تھی دریا سے نکل کر چرنے کے واسطے خشکی میں آدھ کوس کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے سُم کے نشانات آدمی کی مٹھی کی طرح تمام ساحل

پر نمایاں تھے۔ میں نے اُن میں سے ایک کو بندوق سے مارا۔ دوسروں نے انتقام کی غرض سے ہم پر حملہ کیا۔ میں اور میرے ساتھی گڑھوں میں چھپ گئے۔ بعض جلدی سے ناؤ پر سوار ہو کر جہاز پر چلے گئے۔ ایک کشتی جو کنارے پر رہ گئی تھی ان جانوروں نے اپنی لاتوں اور دانتوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

۲۲ر جمادی الاوّل کو دوپہر کے قریب ایک جہاز نظر آیا۔ ہم اس کو فرانس کا جہاز سمجھ کر فکرمند ہوئے۔ کیونکہ اب ہم اس سمندر میں تھے جو زنگستان اور امریکہ کے درمیان حدِّ فاصل ہے۔ چونکہ زنگستان کے بادشاہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ مقام مخدوش اور خطرناک ہو گیا ہے۔ جب بھی دو جہازوں میں مقابلہ ہو جاتا ہے تو مغلوب جہاز غالب آنے والے کا قیدی بن جاتا ہے اور چار و ناچار اس کے ملک میں لے جایا جاتا ہے اور بہت سی مصیبتیں اُٹھانے اور لوٹ کھسوٹ کے بعد دو سال میں رہائی ہوتی ہے۔ لیکن اس جہاز کے نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ امریکہ کا جہاز ہے۔ کپتان کلارک نے اس جہاز کے ٹھہرانے اور کارکنوں کے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ بیچارے قیدیوں کی طرح حالت اُمید و بیم میں اپنے اسناد اور روزنامچوں کے ساتھ ہمارے جہاز پر آئے۔ تمام دن ہمارے ساتھ رہے اور شام کو رخصت پائی اور اپنے جہاز پر چلے گئے۔

۲۴ر تاریخ کو شنبہ کے دن بھی ایک جہاز ہمبرگ قوم کا نظر آیا۔ جس پر نمکین گوشت لدا ہوا تھا اور ماریشس جا رہا تھا۔ ہمارے کپتان کے حکم سے ٹھہرا۔ یہ جہاز سہ منزلہ بنا ہوا اور خوبصورت تھا۔ اور معزز لوگ اس پر سوار تھے اپنی اسناد دکھا کر اور چند بکس پنیر کے دیکر آزاد ہوا۔

قطب ستارہ اور جدی کا دوبارہ دکھائی دینا

آج کے دن بنات النعش اور فرقدین دکھائی دیے۔ جو مدت سے نظر نہیں آتے تھے۔ یہ پانچویں درجہ میں دوبارہ نظر آئے۔ اور بارش بھی بنگال اور جزائر ملاکہ کی طرح شروع ہوئی جس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہتے ہیں کہ ان چند درجوں میں تمام سال مینہ برستا ہے۔ چنانچہ کپتان کلارک نے اپنے تجربہ کی بنا پر بارش سے بچاؤ کا سامان مہیا کر لیا تھا۔ حالانکہ بظاہر بارش کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی ۲۴ر تاریخ سے ۲۹ر تاریخ تک تیز ہوا اور مسلسل بارش کے علاوہ پانی کی بدمزگی بہت رہی یکم جمادی الثانی کو سہ شنبہ کے روز تیسری مرتبہ پھر بادِ تجارت تک پہنچے۔ کیونکہ باد مذکور

شمال کی جانب بھی دس ٹا سے ۲۷ درجہ تک مسلسل چلتی ہے۔ آج ایک مچھلی بھی شست کے ذریعے پکڑی گئی اور نہایت عمدہ تازہ گوشت کھانے میں آیا۔ یہ عجیب بات تھی، کیونکہ سمندر میں مچھلیاں کثرت سے ہوتی ہیں اور پانی کی شفافی کی وجہ سے صاف نظر آتی ہیں اور ہمیشہ جہاز کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں لیکن عموماً شست کے چارہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتیں۔

۷ رجمادی الثانی کو سہ شنبہ کے دن چھوٹا انگریزی جہاز ایک جنگی جہاز کے ہمراہ جس پر کمپنی کا نشان بنا ہوا تھا۔ ہمارے برابر سے آدھ کوس کے فاصلے سے گذرے۔ آج تک بادِ تجارت نے وفا کی تھی اور جہاز کی رفتار نہایت تیز تھی۔ ایک گھنٹہ میں دس میل چلتا تھا۔ اس سمندر کا جوش و خروش اگرچہ کیپ کی مانند ہے لیکن جہاز ہمبرگ کے جہاز کی طرح نہیں ہیں۔ پانی کی شکایت دور ہو گئی اور رات کو رضائی کی ضرورت ہونے لگی۔ کیونکہ ہم ساتویں درجہ جنوبی میں آفتاب سے گذر کر اب ۱۶ یا ۱۷ درجہ شمالی میں ہیں۔ اور اس روز سے آفتاب نے سات درجے جنوب کی جانب طے کیے ہیں۔ اس لیے آفتاب سے ۲۴ درجہ کا فاصلہ ہو گیا۔ جنوبی استوا میں جیسا کہ ذکر ہوا ہے ۲۱ درجے کے فاصلے میں اس قدر سردی ہو گئی تھی۔ اس اختلاف جانبین کا سبب کہ شمال میں گرمی اور گھٹن اور ہر فصل میں بارش اور جانب جنوب معتدل اور خشک۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شمال کی سمت زمین کا کم تھا اور جنوب کی طرف جھکا ہے۔

جزیرہ میڈیرا اور جزیرہ خالدات کا حال

بتاریخ ۱۰ رجمادی الثانی سنہ ۱۲۱۴ھ کو محاذات جزائر میڈیرا اور جزائر خالدات سے ہو کر نکلے۔

جہاں سے اسلامی کتابوں میں درجات طول البلد کا آغاز کرتے ہیں اور جس کا عرض البلد ۳۳ ہے۔ یہ جزائر مشرق کی جانب بہت فاصلے پر رہ گئے۔ سنیچر ۱۱ رجمادی الثانی کو بحر روم کے دہانے کے سامنے سے گذرے جو سیدھا مشرق کی طرف جا کر حلب میں ختم ہوا ہے۔ دہانہ مذکور مشرق کی جانب ہم سے کافی فاصلہ پر رہا۔ سہ شنبہ کے دن جمادی الثانی کو جزائر مشرقی امریکہ کے مقابل سے گذرے۔ جن کو انگریزی میں ویسٹ انڈیز west Indies یعنی ہند غربی کہتے ہیں۔ اتنے فاصلے سے ان کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ کل آٹھ جزیرے ہیں اور پرتگیزی قوم کے مسکن ہیں۔ بعض میں انگریزوں کی حکمرانی ہے۔ ان کا عرض البلد ۲۴ درجہ ہے۔ یہاں سے لندن تک اگرچہ گیارہ اور بارہ درجہ سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ لیکن جہاز رانی کی مصلحتوں کی بنا پر جہاز کو بقدر

۲ درجہ طول کے لندن سے امریکہ کے مغرب کی طرف مائل کر دیا تھا چھ سو کوس کا فاصلہ تھا اور جہاز کی رفتار صاف مشرق کی سمت تھی لیکن کسی قدر مائل بہ شمال تھی۔ ۱۵ رجمادی الثانی سے ۲۳ رجمادی الثانی تک سامنے کی ہوا طوفان کی طرح تیز رہی۔ سمندر میں بڑی بڑی موجیں بلند ہوتی تھیں بلکہ کیپ سے اس جانب سے بھی زیادہ طوفان تھا۔ لیکن جہاز کی مضبوطی اور اچھے انتظامات نیز عملہ کی قابلیت اور تجربہ کی وجہ سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی۔ صرف اتنا ہوا کہ کم غذا، اور بے خوابی پر اکتفا کرنا پڑا۔

جزائر آئرلینڈ جانے کا سبب

۲۵ رجمادی الثانی ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء کو شنبہ کے دن ہمارا جہاز انگلش چینل کے دہانے کے مقابل پہنچا۔ جو انگلینڈ اور فرانس کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ ابھی دہانے میں داخل ہونے کو تھے کہ مشرقی ہوا نے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کی۔ اور اس ہوا کے زور پر ہم اتفاقاً آئرلینڈ پہنچ گئے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انگریزی کی اصطلاح میں سمندر کی وہ شاخ جو ایک طرف طویل اور کم عرض ہو اور دوسری طرف سے بحر سمندر میں مل گئی ہو۔ اس کو چینل کہتے ہیں اور جو شاخ شکل میں مدور ہو اور کسی قدر خشکی کی طرف جا کر ٹھہر گئی ہو اس کو خلیج کہتے ہیں۔ اور اگر بحر فارس کی طرح ہو تو گلف اور بحر قلزم اور بحر روم کی طرح ہو تو سی کہتے ہیں۔ چونکہ انگلش چینل کا دہانہ سیدھا مغرب کے رخ واقع ہے اور مغربی ہوا کے بغیر اس میں داخل ہونا مشکل اور خطرناک ہے۔ اس لیے جو جہاز جہاں پہنچتا ہے اگر مغربی ہوا نہیں ہوتی ہے تو چند دن اِدھر اُدھر بیکار پھرتا رہتا ہے چنانچہ ہمارے جہاز پر بھی دو دن ایسے گزرے۔ چونکہ اتنی جلدی ہوا کے بدلنے کا خیال نہ تھا۔ اور دوسری طرف فرانس کے جہازوں کا خوف تھا۔ اس لیے کپتان کلارک نے بھلائی اس میں دیکھی کہ جب تک موافق ہوا نہ چلے اس وقت تک سمندر کی اس شاخ میں جو انگلینڈ اور آئرلینڈ کے درمیان حدِ فاصل ہے، داخل ہو کر سیر و تفریح میں وقت گزاریں۔ اس خیال سے جہاز کا رُخ اس طرف پھیر دیا۔ اس دوران میں ہم ایک دو منزلہ جہاز کے قریب سے گزرے، جو طوفانوں میں ٹوٹ گیا تھا اور بند صندوقوں اور ہوادار چیزوں سے بھرا ہوا تھا اور لکڑی کے پیپوں کی وجہ سے اسی طرح آدھا ڈوبا ہوا تھا۔ جن لوگوں کی زندگی باقی تھی وہ ڈونگیوں میں سوار ہو کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔ کپتان کلارک اپنی کشتی میں بیٹھ کر اس ٹوٹے جہاز پر گیا اور اس کی چھت پر کھڑا ہوا۔ اور اپنے غوطہ خور ملازموں سے اس جہاز کی بہت سی چیزیں نکلوائیں اور اپنے جہاز پر لے آیا۔ اس سامان میں ایک صندوق اعلیٰ قسم کی شرابوں سے بھرا ہوا تھا،

ایک صندوق پھلوں کا تھا جس میں سیب، انار وغیرہ بھرے تھے۔ ہماری خوش قسمتی سے یہ سامان لندن نہیں پہنچ پایا تھا۔ ہم نے خوب لطف اٹھایا۔ اور جہاز کے آتش دان کے قریب بیٹھکر ان چیزوں کو مزے لے لے کر خوب کھایا۔ چونکہ اس خلیج میں ہوا کے انتظار کی مدت بہت طویل ہوگئی۔ اس لیے کپتان نے سوچا کہ اس بے مصرف وقت گذاری سے بہتر ہے کہ شہر "کوڈ کارک" میں چل کر وہاں سیر و تفریح میں وقت گذارا جائے۔

شہر کوڈکارک کا حال

۲۹ر جمادی الثانی کو چہارشنبہ کے دن شہر "کوڈ کارک" کے آثار نظر آنے لگے اور نہایت سرسبز و شاداب چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آیا۔ اس کے بعد کوڈکارک کے دہانے میں داخل ہوئے۔ جس کے دونوں طرف نہایت مضبوط پتھر کے قلعہ بنے ہوئے ہیں تاکہ دشمن کے جہازوں سے شہر محفوظ رہے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک بڑی چٹان نظر آئی جو ایک چھوٹے جزیرے کی طرح تھی۔ اور جس نے دہانے کے دو حصے کر دیے ہیں۔ اس پر ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا ہے۔ اس کے بعد شہر کے کنارے پہنچکر جہاز لنگر انداز ہوا وہاں چھوٹے چھوٹے پچاس جہاز اور ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں تین 'مین آف وار' بھی تھے۔ یہ خلیج حوض کی طرح گول اور کئی شاخوں میں تقسیم ہے۔ اس کا رقبہ سو میل ہے۔ اس کے مشرق میں شہر کو کمان کی شکل میں آباد کیا گیا ہے۔ شہر کے دونوں طرف پہلے قلعہ سے بڑے دو اور قلعے بنے ہوئے ہیں۔ اور ایک طرف ایک میٹھے پانی کے دریا کا منبع ہے جو دریائے گنگا کے برابر ہے۔ یہ دریا کوڈکارک اور جزیرے کے اندر ہو کر بہتا ہے۔ ایک طرف دریا کی گولائی، پہاڑوں کی ہمواری اور صفائی اور قلعہ کی عمارتوں کا دلکش منظر ہے اور دوسری طرف خوبصورت باغات اور جہازوں کے لنگر انداز ہونے کا شاندار منظر، اتنا خوبصورت اور دلچسپ ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ محل وقوع کے لحاظ سے دنیا کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اٹلی کا شہر جینوا ضرور خوبصورت ہے جس کے ایک طرف دریا ہے۔ لیکن یہاں کی طرح خوبصورت گولائی اور عمارتوں اور قلعوں کی خوبصورتی وہاں نہیں ہے۔ یا پھر استنبول خوبصورت ہے لیکن وہ بھی خلیج کے طول و عرض کی وسعت کے سبب سے اتنا دلچسپ نہیں ہے۔ شام کو سیر کے لیے گئے۔ یہ شہر چونکہ جہازوں کی لنگر گاہ ہے اس لیے نہ تو عالیشان عمارتیں ہیں اور نہ صفائی اور رونق، اونچی نیچی جگہوں پر مکان بنائے گئے ہیں۔ کوچے تنگ ہیں۔ جہاں تک شہر کے رقبہ کا تعلق ہے نصف میل سے زیادہ نہیں ہے۔ باقی ایک ایک

دو دو گھر پہاڑ کے دامن میں بنے ہوئے ہیں۔ اگر سمندر اپنے کنارے سے تیس گز آگے زمین کاٹ دے تو شہر کے بہت بڑے حصے کا نشان بھی باقی نہ رہے۔ یہ شہر کی نمود اور سواد شہر کی شان و شوکت سے خالی ہے۔ اور جب تک شہر کے دروازے تک نہ پہنچ جاؤ اس وقت تک نظر نہیں آتا۔ جاڑوں کے آغاز سے موسم بہار تک گلی کوچے خشک نہیں ہوتے۔ وسطِ شہر میں ایک گندی نہر جس میں جہاز مرمّت کے واسطے کھڑے رہتے ہیں کھودی گئی ہے۔ اس کے دونوں کنارے چونے اور پتھر سے پختہ کیے گئے ہیں۔ پانی سیاہ اور بدبودار ہے اس نہر پر مضبوط پتھر کے پل بنائے گئے ہیں۔ جو ایک طرف سے جہازوں کے نکلنے اور آنے کے واسطے کشادہ ہو جاتے ہیں۔ وہاں کی سرائے میں مزیدار کھانے اور لذیز میوے کھانے میں آئے اور دن ڈھلے انہیں گھوڑوں پر اسی راستے سے لوٹ کر جہاز پر آرام کیا۔ شہر کارک میں معلوم ہوا کہ لارڈ کارنوالس جو بادشاہ انگلینڈ کی طرف سے اس جزیرے کا حاکم ہے۔ وہ راجدھانی ڈبلن میں رہتا ہے۔ جو کارک سے چار پانچ روز کی راہ ہے اور میل کوچ (MAIL COACH.) کے ذریعہ یہ فاصلہ طے ہوتا ہے۔ جب کچھ عرصہ پہلے آئرلینڈ والوں نے اپنے بادشاہ سے بغاوت کی تھی اور بہت کشت و خون ہوا تھا۔ اور بہت جھگڑے پیدا ہوئے تھے۔ تو اُس وقت لارڈ موصوف کی شجاعت اور حکمت عملی کی بدولت حالات درست ہو گئے تھے۔ اس لیے طے پایا کہ لارڈ موصوف سے ملاقات کی جائے۔ کیوں کہ آب و ہوا کی خوبی اور سفر کی سہولتوں کے پیش نظر وہاں جانا مشکل نہ تھا۔ اس لیے یہ رائے ہوئی کہ جہاز کو چھوڑ کر یہاں سے براہ خشکی لندن تک سفر کروں۔ آغازِ سفر ہی سے یہ ارادہ تھا کہ انگلینڈ کی سیاحت کے بعد لارڈ کارنوالس سے ملنے جاؤں گا۔ مگر اب اتفاق سے جب اس ملک میں پہنچ گیا ہوں تو پچھلے کام کو پہلے ہی کروں۔ چونکہ ہوا کے خیال سے بیزکوڈ (۱۷۹۵ء) میں ٹھہرنے کا خیال تھا اور اخبار سے معلوم ہوا تھا کہ دو جہاز انگلش چینل میں غرق ہو گئے۔ تو کپتان رچرڈسن نے بھی اس بات کو پسند کیا اور میرے ساتھ خشکی کے راستے مع بال بچوں کے سفر اختیار کیا جس میں خرچ زیادہ تھا۔

ماہ رجب کی دوسری تاریخ کو شنبہ کے دن زیادہ سامان اور ملازموں کو جہاز پر چھوڑ کر ضروری کپڑے اور سامان ساتھ لیا اور دوبارہ کارک روانہ ہوئے۔ اس بار ایک کھلی ہوئی چھوٹی کشتی میں اسی دریائے شیریں کی راہ سے کارک پہنچے اور اسی سرائے میں قیام کیا۔

ذکر کپتان بیکر

انہیں دنوں ایک روز کپتان بیکر میرے آنے کی خبر پا کر ملنے آئے۔ ان سے میری ملاقات غلام محمد خاں روہیلہ کی جنگ میں بمقام موضع ریہ ہوئی

تھی اور وہ کپتان رچرڈسن کے بھی دوست تھے۔ وہ اپنے مکان پر لے گئے جو شہر سے چار میل دور ایک باغ میں دریا کے کنارے واقع تھا۔ ان کے باغ اور خوبصورت مکان، چیزوں کے رکھنے کا سلیقہ خاص کر باورچی خانہ، برتن دھونے کا کمرہ اور برتن رکھنے کی جگہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ باورچی خانہ میں مشینوں کے ذریعہ کام ہوتا تھا۔ ایک مشین کباب کی تھی جو سیخوں کو الٹ پلٹ دیتی تھی۔ گوشت اور پیاز کا قیمہ کرتی تھی، ہاؤن دستہ کوٹتی تھی اور شہر کورن کے ڈاک بنگلہ میں جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ ایک چھوٹا کتا تھا۔ جس کو ایک چرخی میں ڈال دیتے تھے، جو اندر سے خالی تھی۔ کتا گھبرا کر اس کے اندر چلتا تھا۔ اس کے چلنے سے وہ چرخی گھومنے لگتی تھی۔ پندرہ برس سے وہ اس باورچی خانہ میں کام کرتا تھا۔

باورچی خانہ میں ایک گرم پانی کا نل بنا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک حوض تھا۔ تھوڑی محنت میں بہت سے برتن اس کے اندر ڈالنے سے صاف ہو جاتے تھے۔ اس کمرے کی دیواروں میں تختے لگے ہوئے تھے اور تختوں میں برتن کی چھوٹائی بڑائی کے مطابق سوراخ تھے۔ دھونے کے بعد یہ برتن الگ الگ اپنی قسم کے مطابق چن دیا جاتا تھا۔ کپتان بیکر نے اس باغ سے متعلق زمین کو اسی طرح کاشتکاروں پر تقسیم کر دیا ہے کہ بعض سے سال بھر کھانے کا غلّہ اور بعض سے میوے اور ترکاریاں لیتے ہیں۔ اسی طرح چند سے مرغوں کے لیے دانہ حاصل کرتے ہیں۔ مویشیوں کی چرائی، دودھ، مکھن اور گوشت کا خرچ جو باورچی خانہ میں ہوتا ہے وصول کر لیتا ہے۔ اب سوائے کپڑوں اور شراب کے اور کوئی چیز دوسری جگہ سے منگوانا نہیں پڑتی ہے۔ اس کے کارپرداز دس بارہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہ زمین اور باغ اس نے بیس ہزار روپیہ میں خریدا ہے لیکن تھوڑے سے خرچ میں ایسی خوبی سے زندگی بسر کرتا ہے جو بڑے بڑے انگریزوں کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی میں بھی میسّر نہیں۔ اس کے گھر والوں کے علاوہ اس کے ساتھ دو بہنیں اور دو بیٹیاں بھی ہیں۔ ایک حاضر جوابی اور بادہ سنجی میں ممتاز ہے اور دوسری حسن و صورت اور موزونی قامت میں بے نظیر۔ شہر کے بہت سے نوجوان اس کے طلب گار ہیں۔ مگر وہ غرورِ حسن اور خود نمائی میں ایسی سرشار ہے کہ ابھی تک کسی سے رضامند نہیں ہوئی۔ الغرض یہ پری رخسار بھی مع چند ہمسایہ خواتین کے کھانے کی میز پر موجود رہ کر میری مہمان نوازی میں پوری توجہ سے معروف رہتی تھیں اور میں نے چونکہ اس سے قبل ایسا حسن دل آویز نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کے تماشائے حسن و جمال میں ہمہ تن محو ہو کر مرزا بیدل کا یہ شعر گنگناتا تھا ؏

چہ حسنِ نیم رنگ ست ایں چہ مژگان خدنگ ست ایں
مگر کار فرنگ ست ایں، کہ آتش در فرنگ انند

لطیفہ

کھانے کے بعد اس رشک پری نے مجھے چائے بنا کر دی اور اس کی مٹھاس کی کمی و بیشی کے لیے دریافت کیا۔ اور کہا کہ مجھے خیال ہوا کہیں مٹھاس کم نہ ہو۔ میں نے جواب دیا کہ ایسی شیریں خصلت خاتون کے ہاتھوں سے جو چائے بنی ہے اس میں مٹھاس کی کمی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مجھے تو خوف ہے کہ کہیں مٹھاس زیادہ نہ ہو گئی ہو۔ حاضرین مجلس اس گرماگرم فقرے سے بہت لطف اندوز ہوئے اور ہنسنے لگے۔

دین محمد سے ملاقات کا حال

کپتان موصوف کے مکان میں رہنے والوں میں ایک شخص دین محمد بھی ہے جو مرشد آباد کا رہنے والا ہے۔ اس کو کپتان بیکر کے بھائی بچپن میں اپنے ساتھ مرشد آباد سے لے آئے تھے اور اس کی پرورش اپنے گھر دی کی تھی۔ اس کو کارک کے ایک اسکول میں انگریزی زبان کی تعلیم کے لیے داخل کرایا تھا۔ تحصیل علم کے بعد دین محمد کارک کے ایک معزز شخص کی حسین و جمیل لڑکی کو جو اسکول میں پڑھتی تھی لے کر بھاگ گیا اور کسی دوسرے شہر میں جا کر اس سے شادی کر لی اور پھر کارک میں واپس آگیا۔ اب اس سے کئی اولادیں ہیں ایک علیحدہ مکان میں امیروں کی طرح بڑی شان سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اس نے ایک کتاب ہندوستان کے رسم و رواج اپنے حالات میں لکھ کر شائع کرائی ہے۔

ماہ رجب سنہ ۱۲۱۴ھ کی چار تاریخ کو دوشنبہ کے دن میل کوچ پر سوار ہو کر ڈبلن روانہ ہوئے ہر ایک نے تین گنی بطور کرایہ ادا کی۔ یہ رقم تیس روپیہ کے برابر ہوتی ہے۔ اس گاڑی پر سرکاری خطوط بھی جاتے ہیں اور چونکہ بعض راستے صاف نہیں ہیں اس لیے تین گھوڑے سوار ہر جگہ ساتھ رہتے تھے۔ اور جہاں گاڑی کے گھوڑے تبدیل ہوتے تھے وہاں یہ سپاہی بھی بدل جاتے تھے۔ اسی وجہ سے تین پہر رات گذرنے کے بعد جہاں ٹھہرتی تھی ضرورت کی تمام چیزیں وہاں مہیا ہوتی تھیں۔ چونکہ کپتان رچرڈسن کے بچوں کی دائی رہ گئی تھی اور خدمت گذار بھی ہمراہ نہ تھا۔ اس لیے ہر منزل میں دو یا تین دایہ بچوں کی خدمت کے لیے آتی تھیں اور کپتان کی بدخصلت لڑکی کو بھی بخوبی سنبھال لیتی تھیں۔ جو اس کی پہلی دایہ سے بمشکل سنبھلتی تھی۔ دن کے وقت مقام فرمائی (FERMY) میں جو ایک چھوٹا اور دیہاتی شہر ہے دن کا کھانا کھایا گیا اور کلان میل واقع (OLDNMEL) میں رات کا کھانا کھا کر سو رہے۔ ہوٹل کے آدمی کوچبان کے بگل کی آواز سن کر گاڑی کے قریب پہنچنے سے پہلے تیار ہو جاتے تھے اور گاڑی کے پہنچتے ہی کل چیزیں لا کر حاضر کر دیتے تھے۔ اس لیے کھانا کھانے کے سوا کچھ توقف نہ ہوتا تھا۔ سونے کا سامان اور بستر خوابگاہ زمین پر جگہ دستیاب نہ تھا تھیں۔ لیکن کوچبان کی

جلد بازی کے سبب سے اطمینان کے ساتھ خواب و خور نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اگر مسافر ریل گاڑی کے بگل کی آواز سننے کے بعد ایک منٹ بھی دیر لگا کر پہنچے گا تو گاڑی کو نہ پائے گا۔ سامان اور ساتھی روانہ ہو جائیں گے اور یہ دوسرے روز تک شہر کر اسی وقت تک گاڑی کا انتظار کرے گا۔ اور اگر اس میں بھی جگہ نہ ملی تو اگلے دن تک رُکنا پڑے گا۔

شہر کلکنی کا حال

پانچویں تاریخ کو کلکنی KILKENNY میں دن کا کھانا کھایا اور رات قصبہ کارلو ________ میں بسر کی۔ یہ کلکنی اس جزیرے کا مشہور اور عشق خیز مقام ہے۔ صفائی ستھرائی اور اطراف کی دلکشی میں ضرب المثل ہے اور شاعروں کے اشعار میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ اس خوبصورت اور دلچسپ مقام کی سیر کی خاطر اس دن میں نے کھانے کی بھی پرواہ نہیں کی۔ چند بسکٹ جیب میں ڈال کر آتا وقت سیر میں صرف کیا۔ اس شہر کے ایک طرف دریا بہتا ہے اور دریا کے اُس طرف سبزہ زار اور باغات ہیں۔ جو بغیر چہار دیواری کے ہیں اور خوبی میں نمونۂ بہشت ہیں۔ دریا کا پانی سرسبز پہاڑوں کی بلندیوں سے گرتا ہے۔ جو ایک سمت واقع ہیں۔ پتھروں میں ایسے خوبصورت جھرنے تراشے ہیں کہ ان میں پانی کی چادر کا گرنا لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ہوا کی لطافت سے ایسی فرحت حاصل ہوتی ہے کہ طبیعت رقص پر مائل ہو جاتی ہے۔ اس دن تیز ہوا چل رہی تھی اور پانی برس رہا تھا۔ اس ملک کے کھیتوں کی باڑھ پر ایک قسم کے جنگلی درخت لگائے جاتے ہیں۔ جن کے پھل سُرخ اور ہندوستانی کروندے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ میوے بکثرت لدے ہوئے تھے اور ہر دانہ پر مینہ کے قطرے چہل چراغ کی مانند چمک رہے تھے۔ میری حالت ایسی ہو گئی کہ جیسے شراب کے نشہ میں ہوتی ہے اور آخر وقت یعنی سوتے وقت تک یہی کیفیت رہی۔ گنگنانے اور گانے کی دُھن سمائی ہوئی تھی۔ حالت سرخوشی میں بابا فغانی کے یہ اشعار بار بار پڑھتا تھا اور طبیعت کو کسی اور طرف متوجہ کرنے کی بھی تاب نہ تھی۔ اور چُپ رہنے کی بھی طاقت غائب تھی [1]

یک چراغ است دریں بزم کہ در پرتو آن　　　ہر کجای نگرم انجمنے ساختہ اند
در حقیقت نسب کعبہ و بُت خانہ یکے است　　　ایں فضولاں حرم و بر ہمنے ساختہ اند

آئرلینڈ کے حالات

ماہ رجب کی ۶ تاریخ کو چہار شنبہ کے دن تھوڑی رات گذری تھی کہ ڈبلن پہنچے۔ تین دن کے سفر میں سارا راستہ کوہستانی اور اکثر ناہموار تھا۔ پہاڑ کے دامن میں بعض جگہ مسطح میدان ہیں۔ اس ملک کے گاؤں ہندوستانی

دیہاتوں کی طرح گھاس پھوس کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ دس بارہ گھروں سے زیادہ آباد نہیں ہیں۔ ان دیہاتوں کے رہنے والے اس قدر غریب ہیں کہ ان کے مقابلے میں ہندوستان کے دیہاتی خوش حال معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں کی سڑکیں چوڑی ہیں اور پتھر کی چٹانوں سے بنائی جاتی ہیں لیکن کیچڑ یہاں کے راستوں میں موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے بیچارے زیادہ چلنے پھرنے والے لوگ ننگے پاؤں بسر کرتے ہیں۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں تمام دن بھیگے رہنے کی وجہ سے سُرخ قرمزی رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہندو عورتوں کے پاؤں مہاور لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ حالت فقر و فاقہ کی وجہ سے ہے۔ جس میں وہ مبتلا رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غلہ یہاں ہمیشہ گرانی رہتی ہے۔ اور دوسرا سبب اولاد کی کثرت ہے۔ اور جاڑے کی شدت کی وجہ سے زیادہ لباس کی حاجت۔ سُنا ہے بہت سے لوگوں کو عمر بھر گوشت میسر نہیں آتا ہے۔ صرف آلو پر بسر کرتے ہیں۔ گاؤں کے خوشحال لوگوں کے گھروں میں بکریاں، گتے، سور، مرغیاں، اور آدمی سب ایک ہی جگہ پر رہتے ہیں۔ راستہ میں بچے اور بوڑھے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لیے گاڑی کے ساتھ ایک ایک کوس تک دوڑتے ہیں۔ اس راستہ کے تمام پہاڑ اور میدان مزروعہ اور سرسبز ہیں۔ یہاں زیادہ تر گیہوں، شلغم، مٹر، آلو اور جَو کی کاشت ہوتی ہے آلو کی پیداوار اور استعمال زیادہ ہے۔ جس سال آلو کی فصل خراب ہو جاتی ہے۔ غریبوں کو بہت مصیبت اُٹھانا پڑتی ہے۔ یہاں کا آلو اچھا ہوتا ہے اس لیے لندن بھیجا جاتا ہے۔ یہاں کے بازاروں میں امریکہ اور بنگال کے چاول بہت گراں فروخت ہوتے ہیں۔ میں جہاں کہیں مہمانی میں جاتا تھا۔ میزبان تھوڑا سا چاولوں کا خشکہ ہندوستانی کی کھچڑی کی طرح کا پکا کر بطور تحفہ رکھتا تھا۔ ان لوگوں کی خوراک گیہوں کی روٹی انگریزوں کی طرح کے گوشت اور شراب ہے۔ دیہات کے لوگ جَو کی روٹی آب گوشت میں اُبالے آلو استعمال کرتے ہیں۔ جانوروں کو جَو یا اس کا بھوسہ دیتے ہیں۔ جس وقت چراگاہیں برف سے ڈھک جاتی ہیں۔ اس زمانے میں

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا)

۱ـ آئرلینڈ کا ملک انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے مغرب میں واقع ہے جس کو آئرش (نارتھ چینل) اور سینٹ جارج چینل نے ان دونوں جزیروں سے الگ کر دیا ہے۔

۲ اس کا رقبہ طول میں ۳۲۵۰۰ مربع میل ہے طول ۳۰۰ میل اور عرض ۱۷۰ میل ہے۔ اس ملک دارالحکومت ڈبلن ہے جو نہایت خوبصورت اور شاندار ہے اور خوبصورت شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

(مترجم)

جانوروں کو شلغم کھلاتے ہیں۔ جو زمین قابل کاشت نہیں ہے اس کی مٹی گوبر کے اپلوں کی طرح جلانے کے کام آتی ہے۔ اگرچہ اس میں کوئلہ کی طرح تیز آنچ نہیں ہوتی ہے لیکن اپلوں کی آگ سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اور دیر تک رہتی ہے۔ سردی کی شدت کے سبب سے غریبوں کے جھونپڑوں میں بھی آگ کام آتی ہے۔ غریبوں کے گھروں میں بھی آتشدان ضرور ہوتے ہیں۔ ہم لوگ رات کو بہت دیر سے وہاں پہنچے تھے۔ قیام کے لیے کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ مجبوراً بہت زیادہ کرایہ ادا کر کے اس ڈاک بنگلے میں قیام کیا جس میں لارڈ اور ڈیوک ٹھہرتے ہیں۔

سات تاریخ کو جمعرات کے دن مسٹر ایگر MR. EAGER کی رہنمائی میں ایک بیوہ عورت مسز بال (MRS BALL) کے مکان میں قیام کیا۔ یہ مکان انگلش اسٹریٹ پر کالج کے قریب تھا یہ عورت خوش اخلاق تھی اور کئی لڑکوں اور لڑکیوں کی ماں تھی۔ کرایہ مکان ماہوار کے بجائے ہفتہ وار تھا۔ میرے دو نوکروں کا کرایہ ایک گنی ہفتہ طے ہوا۔ یہ بھی کپتان رچرڈسن ادا کرتے تھے۔ ناشتہ اسی گھر میں کرتے تھے۔ گھر کا ملازم ہمارے لیے فرانسیسی روٹی چائے اور مسکہ بہت عمدہ خرید لاتا تھا۔ روزانہ دوپہر کا کھانا سب مل کر ایک ریسٹوران میں کھاتے تھے۔ اور وہاں کے خاص قسم کے کبابوں سے لطف اٹھاتے تھے۔ ناشتہ اور دن کے کھانے کا خرچ فی کس دو روپیہ (ہندوستانی سکہ کے برابر) تھا۔

جب شہر کے عمائدین کو میرے آنے کی خبر ہوئی تو اس قدر دعوت نامے آنے لگے کہ میں حیران رہ گیا کہ کس سے ملوں اور کس سے نہ ملوں۔ جو کوئی دعوت کا ارادہ کرتا پہلے مجھ سے ملنے آتا اور ساتھ میں دعوت کا رقعہ بھی لاتا اگر میں مکان پر موجود نہ ہوتا تو رقعہ چھوڑ جاتا تھا۔

اب کچھ حالات ڈبلن کے بیان کیے جائیں گے۔ جو اس ملک کا بڑا شہر ہے۔

جزائر آئرلینڈ کی راجدھانی ڈبلن کا حال

یہ شہر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اور بارہ میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے بعض مکانات پتھر سے تراشے ہوئے اور ان میں چونا اور مصالحہ کا استعمال نہیں کیا ہے۔ اکثر مکانات اینٹ اور چونے کے بہت صاف ستھرے بنائے گئے ہیں۔ اکثر چار منزل اور کچھ اس سے زیادہ منزلوں کے ہیں۔ اندر سفیدی کے ساتھ منہ اکام بھی ہے۔ سب محلوں اور کوچوں میں مکانوں کی تعداد یکساں ہے۔ ہر مکان میں ایک تہہ خانہ ہوتا ہے جس میں باورچی خانہ بھی ہوتا ہے اور کوئلہ بھرنے اور چینی کے برتن اور کپڑے وغیرہ رکھنے کے کام بھی آتا ہے۔ اس سے اوپر کی منزل میں ناشتہ اور کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ پہلی منزل عورتوں کی نشست گاہ

کے لیے ہوتی ہے۔ اور دوسری منزل سونے کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ تیسری منزل کی چھت کچی ہوتی ہے۔ بارش اور برف سے حفاظت کے خیال سے اس پر کھپریل ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ آرائش نہیں ہوتی ہے۔ اس میں نوکر رہتے ہیں اور غلہ وغیرہ رکھا جاتا ہے۔ کھپریل کے کھپرے نازک پتھر کے ترشے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی لمبائی ایک بالشت اور چوڑائی نصف بالشت ہے۔ مکان کی لکڑی پر سفید روغن کیا جاتا ہے۔ کھڑکیوں میں شیشے ضرور ہوتے ہیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ مڑواں (فولڈنگ) ہوتے ہیں۔ تاکہ کھلنے میں زیادہ جگہ نہ گھیریں۔ دروازوں پر نفیس اطلس یا مشجر کے پردے پڑے ہوتے ہیں بلکہ چھینٹ کے بھی ہوتے ہیں۔ ہر کمرہ میں سنگ مرمر کی بخاری ہوتی ہے۔ اس میں لوہے کا ایک جالی دار آتش دان بہت خوبصورت نصب ہوتا ہے۔ باڑوں میں بالکل گلزار معلوم ہوتا ہے۔ اور گرمی کے موسم میں کاغذ کے پھول بنا کر اس پر لگا دیتے ہیں۔ دیوار گیریاں نقشی حاشیہ دار کاغذوں کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ کمروں میں اونی قالین بچھے ہوئے، کاغذ قالین اور چھینٹ کے رنگوں میں فرق ہوتا ہے۔ کسی جگہ بھی ایک رنگ کے نظر نہیں آئے۔ ہر چیز کا رنگ ہلکا ہے۔ مکان کے اندر آنے جانے کے دروازے چھوٹے اور تنگ ہیں۔ جو کھانا کھانے کے وقت کھلتے ہیں۔ اگر ان پر مالک مکان کا نام اور مکان کا نمبر نہ لکھا ہو تو پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔

دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ دروازے کے باہر ایک کھونٹی میں ڈوری بندھی رہتی ہے جو مکان کے اندر نوکروں کے بیٹھنے کی جگہ ایک گھنٹی سے مربوط ہوتی ہے۔ اس ڈوری کو کھینچنے سے اندر گھنٹی بجتی ہے اور نوکر فوراً دروازہ کھول دیتا ہے۔ اسی طرح مکان کے ہر کمرے سے نوکروں کو بلانے کے لیے گھنٹی کا انتظام ہے۔ تاکہ نوکروں کو معلوم ہو جائے کہ گھنٹی کس کمرے سے بجائی گئی ہے۔ گلیوں کے راستے صاف اور ہموار پتھروں سے بنائے گئے ہیں۔ گاڑی اور گھوڑوں کے چلنے کے لیے ٹھوس پتھروں کی سڑکیں ہیں۔ اکثر محلوں میں راستے کے دونوں طرف اہل حرفہ کی دکانیں ہیں۔ امیر لوگوں کے محلوں میں دکانوں کے بجائے لوہے کے کٹہرے لگے ہوئے ہیں جو یا تو مکان کے سامنے صحن کے گرد ہوتے ہیں یا پشتِ مکان کی جانب۔ پانی کے کنویں اندر نابدان انہیں کٹہروں میں ہوتے ہیں۔ اس کٹہرے میں مکان کے اندر سے آنے کے لیے ایک دروازہ لگا ہوتا ہے جو مقفل رہتا ہے۔ اس دروازے سے حسب ضرورت باورچی خانہ کے ملازم کوڑا کرکٹ لاتے لے جاتے ہیں۔ اہل مکان ان میں آمد و رفت نہیں کرتے صحن کا یہ دروازہ تہہ خانہ میں روشنی بھی پہنچاتا ہے۔ غریبوں کے مکانات میں اس کے بجائے ایک کھڑکی ہوتی ہے جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوتی ہیں۔ تہہ خانے میں ایندھن اور کوئلہ اسی راستے

سے لے جاتے ہیں۔ یہ کھڑکی نیچے کی جانب سے پیدل چلنے والے راستہ سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ ورنہ اس کے ذریعہ اندر روشنی آنا ممکن نہیں ہے۔ تہہ خانے کا راستہ اکثر بالا خانے کی چھت کے زینہ کے نیچے ہوتا ہے۔ اور عموماً پچھلے صحن کے دروازے سے قریب ہوتا ہے۔ غریبوں کے مکان کا صحن چھ سات گز سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ اسی میں پاخانہ وغیرہ بھی بنا لیتے ہیں۔ امیروں کے مکانات میں پائیں باغ بھی ہوتے ہیں۔ دکانیں کافی لمبی چوڑی ہوتی ہیں۔ دن کے وقت دکانوں کے سامنے شیشے کی ٹٹیاں لگا دی جاتی ہیں اور رات کو مضبوط تختے۔ یہ ہر کوچے میں ایک ہی رنگ اور ایک ہی صورت کے ہوتے ہیں۔ رات کو ان میں لوہے کی سلاخیں لگا کر مقفل کر دیتے ہیں۔ دنیا بھر کی چیزیں ایک ہی طریقے پر ترتیب سے لگی رہتی ہیں۔ خرید و فروخت میں ایک دام بتاتے ہیں خریدار چاہے ناواقف اور اجنبی ہو اس کو دھوکہ نہیں دیتے۔ وہاں کی عجیب و غریب چیزوں کا ذکر بے فائدہ ہے اس لیے کہ دنیا بھر میں وہاں کی صنعتیں مشہور ہیں۔ منجملہ ان کے زنانہ سامان کی دکان ملنری (MILLINERY) بہت مشہور ہے۔ نقرہ فروشی، گھڑی سازی، عطاری، حلوائی اور میوہ فروشوں کی دکانیں نہایت زرق برق اور صاف ستھری ہوتی ہیں۔ طرح طرح کے پھل جیسے گلابی امرود، سیب، انگور، کیلا، نارنگی، لیموں وغیرہ بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح خشک میوے بکثرت ہوتے ہیں۔ وہاں کا حلوہ بہت لذیذ ہوتا ہے جو مسکہ میں پکایا جاتا ہے۔ مٹھاس ہلکی ہوتی ہے اور نان تنک میں لپٹا ہوا اور اوپر میوے لگے ہوتے ہیں۔ بعض میں تری بھی ہوتی ہے۔ یہ حلوہ کاغذ کے خوبصورت ڈبوں میں رکھا جاتا ہے۔ اس کی بہت قسمیں ہوتی ہیں[1]۔ انہیں دکانوں میں مختلف قسم کے گوشت اور بکرے اور مرغ کا شوربہ ملتا ہے۔ ان کے علاوہ جَو کی میوہ ملی ہوئی تازہ روغنی روٹی، جو تنور میں پکائی جاتی ہے۔ اس کو پائی (PAI) اور ٹارٹ (TART) کہتے ہیں۔ شوقین لوگ صبح کے ناشتے اور دن کے کھانے کے لیے دکانوں پر جاتے ہیں، اور وہاں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ بعض لوگ گھر پر منگوا کر کھاتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں گھر پر دکان جیسی نہیں تیار ہو سکتی ہیں۔

شہر ڈبلن کی روشنی رات کی روشنی کے لیے حکومت کی طرف سے ہر سڑک اور گلی میں لالٹینوں کی قطاریں بلندی پر لگی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوکاندار

---

[1] مصنف کی مراد کیک سے ہے۔ (مترجم)

خود شیشے کی ٹیوبوں کے پیچھے اس قدر گیس روشن کرتے ہیں کہ دن جیسی روشنی معلوم ہوتی ہے۔ رات کے وقت جب ہم اس شہر میں داخل ہوئے تو جس طرف جاتے تھے روشنی کے دو طولانی خط نظر آتے تھے۔ خاص طور پر عطاروں کی دکانیں جن کے اندر سجاوٹ کے لیے بلوری بوتلوں اور مرتبانوں میں طرح طرح کے رنگ بھرے ہوئے تھے ان کو دیکھ کر بازار میں سراج الدولہ یا آصف الدولہ کے امام باڑہ کی کیفیت نظر آتی تھی۔ یہ روشنی آنکھوں میں اس قدر سمائی کہ اس کے بعد شہر لندن کی روشنیاں دل کو نہ بھائیں۔

دوسری چیز جو سب سے بھلی معلوم ہوئی وہ یہ کہ ہر دکان میں ایک یا دو شیشے کی سیاہ رنگ میں رنگی ہوئی تختیاں (بورڈ) لگی تھیں۔ ان کے درمیان ایک یا دو سطروں میں نہایت خوشخط سونے یا چاندی کے پانی سے لکھی ہوتی تھیں۔ ایک سیاہ تختہ جس پر سنہرے حرفوں سے نام لکھا ہوتا ہے؛ دوکان کی لمبائی کے برابر لمبا اور نصف بالشت چوڑا لٹکا ہوتا ہے اور بالکل ایک دوسرے کی سیدھ میں۔ ان ہموار اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے تختوں کی وجہ سے تمام بازار حاشیہ دار نظر آتا ہے اس شہر میں آدمیوں کی اتنی کثرت ہے کہ گلی کوچے ہر وقت بھرے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ پارکوں اور باغوں میں بھی بھیڑ رہتی ہے۔ چلنے پھرنے میں بھی یہاں کے لوگوں کو ایسی مہارت حاصل ہے کہ اس بھیڑ بھاڑ میں بھی ایک دوسرے کو دھکے نہیں لگتے ہیں۔ کم سن لڑکیاں کاموں کے لیے گھر سے نکل کر واپس پہونچنے کے وقت تک ٹھنڈی ہوا سے لطف لیتی ہوئی اٹھلا اٹھلا کر چلتی ہیں۔ مگر ان کے جسم کی رگڑ شاید ہی کسی کو لگتی ہو۔

گاڑیوں کی کثرت

یہاں گاڑیوں اور بگھیوں کی کثرت ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ لندن میں پہنچنے کے دن سے فرانس کا ملک چھوڑنے تک تین سال مدت میں گاڑیوں کے پہیوں کی آواز، رات دن میں کسی وقت کم نہ ہوتی تھی۔ سوا سونے کے وقت یا سونے کے کمرے میں بیٹھنے کے وقت۔ وہ بھی جب دروازے اور کھڑکیاں بند ہوتی تھیں۔ یہاں دو پہیوں والی ایک ہزار گاڑیاں شہر کا کوڑا کرکٹ اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ اور سات سو کرایہ پر چلنے والی گاڑیاں ہیں جو مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہیں اور شہر سے باہر نہیں جاتی ہیں۔ خوش حال لوگوں کے پاس خاص گاڑیاں ہوتی ہیں۔ شہر کے باہر جانے والی اور سامان ڈھونے والی گاڑیاں الگ ہوتی ہیں۔ کرایہ میلوں کے حساب سے مقرر ہے۔ سڑک پر میلوں کے پتھر نصب ہیں اس لیے کبھی مسافر اور گاڑیبان میں جھگڑے کی نوبت نہیں آتی۔ گاڑیوں کے گھوڑے بہت تندرست اور توانا ہوتے

ہیں۔ اور اسی ملک کے جانور ہیں۔ زمین جوتنے کا کام بھی انہیں سے لیا جاتا ہے۔ گائے صرف مکھن اور دودھ کے لیے پالی جاتی ہے اور بیل گوشت کے لیے۔ بھیڑ بکری بھی پالی جاتی ہیں جن کا گوشت چربی دار اور لذیذ ہوتا ہے۔ مرغیاں تماد کے برابر ہوتی ہیں اور بڑا انڈا دیتی ہیں۔ اس شہر کے چوراہے بہت چوڑے ہیں۔ ان کے وسط میں پانی کا چشمہ ہوتا ہے۔ اس پر ایک چوکور سائبان پتھر کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ چشمے کے چاروں طرف شیر دہاں بنے ہیں۔ جو پانی لینا چاہے وہ پیچ گھما کر برتن نل کے نیچے لگا دے۔ جب برتن بھر جائے تو پیچ گھما کر اس کو بند کر دے۔ اکثر ایسے حوض کے چبوترے پر وسط میں پتھر کا ایک پورا گھوڑا پتھر ہی سے تراشا ہوا ہوتا ہے اور شاہان لندن میں سے کسی کا مجسمہ اس پر نصب ہوتا ہے۔ چبوترے کے کنارے پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی ہوتی ہیں، جن پر رات کو لالٹین روشن کی جاتی ہیں۔ اور دن سے چوگنی رونق ہو جاتی ہے

پتھر کے مجسموں کا حال

پتھر کے مجسے ان فرنگیوں میں اور خاص کر فرانس اور اٹلی میں بہت مستعمل ہیں اور گراں قیمت ہوتے ہیں۔ لندن میں میرے سامنے پتھر کا ایک بت جو کمر تک صرف نصف جسم تراشا ہوا تھا۔ چالیس ہزار روپے میں فروخت ہوا تھا۔ یقیناً یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو قوم اپنے علم و دانش کے باعث ہندستانیوں پر اعتراض کرتی ہے اور ان کے سونے چاندی کے سامان زیبائش اور عورتوں کے زیورات پر ہنستی ہے اور کہتی ہے کہ سرمایہ کو روک کر ملک کو نفع رسانی سے روکتی ہے۔ خود ان کو شیطان نے اس قدر غفلت میں مبتلا کر دیا ہے کہ ایسے بیجا مصارف کرتے ہیں۔ بہرحال یہ مجسمے ہر موقع و مقام پر مختلف صورتوں کے ہیں۔ اس کے علاوہ دروازوں پر دہالنوں کی تصویریں، ناچ گھروں اور تماشہ گاہوں میں عورتوں کی تصاویر مع باجے گاجے کے اور بخاری (آتشدان) پر یونانی دیوتاؤں کے چھوٹے چھوٹے بت مقبروں میں آنے والوں کی صورتیں، باغوں میں دیو، بھیڑیے گیدڑوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے تاکہ جانور دیکھ کر ڈر دیں اور باغ میں نہ آئیں۔

اسکوائر پارک کا حال

شہر کے چوراہوں پر وسط میں ایک چوکور میدان ہوتا ہے جیسے ہندستان میں چوک ہوتا ہے۔ اس کو اسکوائر کہا جاتا ہے۔ بعض کا گھیر نصف میل اور بعض کا چوتھائی میل ہوتا ہے۔ اس کے درمیان میں باغیچہ ہوتا ہے۔ اس میں روشیں بنی ہوتی ہیں جو صبح و شام ٹہلنے کے لیے بہت موزوں ہیں۔ اس کی صورت اس نقشے سے واضح ہو جاتی ہے

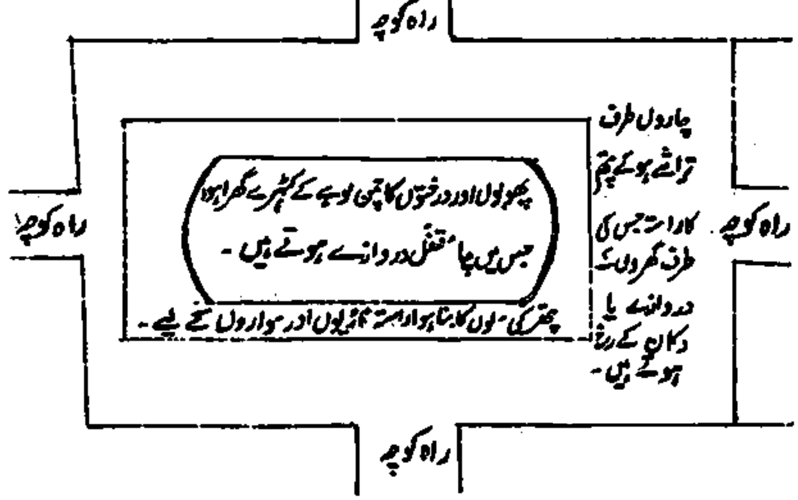

اس اسکوائر سے شہر کی رونق بڑھ گئی ہے۔ صبح و شام لوگ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اُس وقت اکثر سازندے بھی آجاتے ہیں۔ دو تین پیسے کے خرچ میں نہایت عمدہ گانا سننے میں آتا ہے۔ اگر اس سے زیادہ گشت کرنا اور مجمع میں پھرنا مقصود ہوتا ہے تو پارک میں جاتے ہیں۔ پارک ایک مسطح میدان ہوتا ہے جو چہار دیواری سے گھرا رہتا ہے۔ اس کے اندر سبزہ زار اور نہریں ہوتی ہیں جن پر سنگ مرمر یا لوہے کے پل بنے ہوتے ہیں۔ سایہ دار درخت نہایت موقع اور مناسبت سے نصب ہیں وحشی ہرن اور پاڑے بھی اسی میں رہتے ہیں۔ اور بچے دیتے ہیں۔ بندوق سے ان کا شکار بھی ہوتا ہے آرام کرنے کے لیے ایک عمدہ باغ اور کوٹھی بھی بنی ہوتی ہے۔ ہر شہر میں دو تین پارک ہیں۔ جو ہفتہ کے دن شہر کے سب چھوٹوں بڑوں کے لیے تفریح گاہ ہوتے ہیں۔

اطرافِ ڈبلن زمین نہایت صاف مسطح اور پُرفضا ہے۔ لندن سے زیادہ دلکش ہے۔ اس کے قریب چھوٹے چھوٹے شہر اور باغات ہیں۔ جہاں امیر لوگ گرمیوں کے موسم میں آرام سے رہتے ہیں۔ تمام دن ہوا خوری کے لیے گھوڑوں اور گاڑیوں پر آتے جاتے ہیں۔ شہر کے ایک جانب فونکس پارک ہے۔ بلاخوفِ تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ساری عمر ایسی دلکش جگہ نہیں دیکھی۔ اس پارک کے دامن میں وہ دریا بہتا ہے جو شہر ڈبلن کے وسط میں ہو کر گذرتا ہے۔ اس کے دونوں کنارے ہموار ہیں۔ سنگ مرمر کے دو پل اس سبزہ زار میں عجیب لطف دیتے ہیں۔ دریا کے اس

کنارے پر دو بہت خوبصورت شہر آباد ہیں۔ جن کی تمام عمارتیں پتھر سے بنی ہوئی ہیں اور دو سبز پہاڑ کے دامن میں نہایت ہموار واقع ہے۔ جابجا برف کی سفیدی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے۔ اس فرحت انگیز منظر کو دیکھ کر مجھے ان انگریزوں کے خیالات درست معلوم ہوئے جو ہندوستان کی سکونت کو ذلیل خیال کرتے ہیں اور مجھے ماننا پڑا کہ ایسا خیال کرنے میں وہ حق بجانب ہیں۔

دوسرا سمندر کی طرف کا رُخ جہاں ہزاروں جہاز لنگر انداز ہیں۔ وہاں لکڑی کے بڑے بڑے صندوق بنے ہوئے ہیں۔ جس کے اندر دو غسلخانے نہایت کشادہ اور ان کے چار پہیے ہوتے ہیں۔ کنارے پر سینکڑوں کی تعداد میں کھڑے رہتے ہیں، اور پہیوں کے ذریعے ان کو جابجا لے جاتے ہیں۔ موسم گرما میں ڈبلن کے معزز شہری سمندر کے کنارے جا کر ان صندوق نما غسلخانوں کے اندر غسل کرتے ہیں۔

ذکر عمارت عجیب

یہاں کے عجائبات میں ایک برج TOWER OF LIGHT ہے۔ جو سمندر کے کنارے سے تقریباً آدھ کوس کے فاصلے پر عین سمندر کے درمیان بنایا گیا ہے۔ کنارے سے برج تک چالیس گز چوڑی ایک دیوار بنائی ہے۔ برج سے یہ فائدہ ہے کہ رات کے وقت ایک بہت بڑی لالٹین روشن کر کے وہاں لٹکا دی جاتی ہے۔ تاکہ جہاز روشنی کو دیکھ کر سیدھے لنگر گاہ پہنچ جائیں۔ اور خطرناک چٹانوں سے بچ نکلیں جو ان اطراف میں بکثرت موجود ہیں، اس طرح نقصان سے محفوظ رہیں۔ دیوار کا فائدہ یہ ہے کہ روشنی کے منتظم خشکی کی راہ سے پل تک بہ آسانی پہنچ سکیں۔ اور پانی کی طغیانی بھی شہر کی طرف نہ ہو پائے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بند دو ہزاروں گز طویل اور سمندر کی شاخوں پر جو ڈبلن اور اس کے نواح میں پھیلی ہوئی ہیں، بنے ہیں۔ بڑے بڑے فاصلے پر پتھر کے پل تعمیر کیے گئے ہیں۔ اطراف ڈبلن میں دریائے نیہوں کے دو حصے ہو کر سمندر میں گرتے ہیں۔ ایک حصہ جو لکھنؤ کی گومتی ندی کے برابر بڑا ہے۔ وسط شہر میں بہتا ہے۔ اس کے دونوں کنارے دہانوں تک پختہ بنا دیئے گئے ہیں۔ جیسے نہروں کے ہوتے ہیں۔ اس پر جابجا پتھر کے پل بنے ہیں۔ پلوں کے دونوں طرف اور دریا کے کنارے لوہے کے کھمبوں پر لالٹینیں آویزاں ہیں۔ جو رات میں جلائی جاتی ہیں۔ جن کی روشنی آنے جانے والوں کی رہنمائی کرتی ہے اور بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی روشنی ایران اور ہندوستان میں تو کسی بڑے جشن کے موقع پر ہوتی ہے۔ مگر یہاں روز دیکھنے میں آتی ہے۔

ڈبلن کی نہریں

نواح ڈبلن میں متعدد نہریں ہیں، لکڑی، کوئلہ اور دوسری وزنی چیزیں کشتیوں اور نہروں کے ذریعہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جاتے ہیں۔ ایک نئی نہر شہر ڈبلن سے کارک تک نکالی گئی ہے۔ اس کے دونوں جانب نہایت ہموار باغیچے لگائے گئے ہیں اور کناروں پر خوبصورت درخت لگائے گئے ہیں۔ بہت سے پہاڑی چشموں کا پانی بھی نہر میں مل کر سبزہ زار پر غلطاں و رقصاں نظر آتا ہے۔ پہاڑوں کی وجہ سے یہاں چشموں کی کثرت ہے۔ ان کو دیکھ کر آنکھوں کو روشنی اور ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ ہر دو یا تین میل کے فاصلہ پر ایک پل اس طرح کا بنا ہوا ہے کہ اس کے بند کرنے سے نہر کا پانی بھی بند ہو جاتا ہے۔ پل کے نزدیک نہر بتدریج اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ ایک کشتی سے زیادہ ایک وقت میں نہیں گذر سکتی۔ پل کے در بند کر کے جب چاہتے ہیں پانی کو نہر کے کناروں تک اونچا کر لیتے ہیں اور ضرورت کے وقت کھیتوں کو پانی سے بھر لیتے ہیں اور پانی تیزی کے ساتھ کشتی کو آگے بڑھا دیتا ہے۔ یہ نہر ڈبلن کے اس طرف ایک بہت بڑے حوض میں مل جاتی ہے جو پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اور اس کے درمیان مضبوط بندھے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے حوض کی کئی شاخیں ہو گئی ہیں۔ یہاں آس پاس کشتی سازی کا سامان۔ بڑھئی کے اوزار بھی بہت موجود ہیں۔ اور ملاحوں کے مکانات بھی بنے ہوئے ہیں۔ ان نہروں میں آراستہ کشتیاں بنگال کے بجروں کی طرح کھڑی رہتی ہیں۔ جو شخص اس راہ سے جانا چاہتا ہے وہیں سے کرایہ پر کشتی پر سوار ہو جاتا ہے۔ اس طرف جہاں نہر سمندر میں گرتی ہے ایک حوض بنا ہوا ہے جس کا رقبہ آدھ کوس کے قریب ہے۔ اس سے ملحق جہازوں کی مرمت کے لیے بہت سی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس حوض کی بھی کئی شاخیں ہیں بعض سمندر سے مل گئی ہیں اور بعض مسدود ہیں۔ ان سب میں پانی بلند کرنے کے لیے در بند بنائے گئے ہیں۔ ان دروازوں کے تختوں کا طول ایک ہاتھ کے قریب ہے۔ اور ہر در بند پر ایک چرخی لگی ہوتی ہے جس کے ذریعہ دروازے کو گراتے اور اٹھاتے ہیں۔ اس چرخی کی شکل جہاز کا لنگر گرانے اور اٹھانے والی گراری کی سی ہوتی ہے۔

ڈبلن کی عمارتیں

یہاں علاوہ دیگر مشہور عمارتوں کے ایک کالج کی شاندار عمارت ہے جو پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے دروازے بہت شاندار ہیں۔ اس کے وسط میں پانچ طبقے اساتذہ کے لیے بنے ہوئے ہیں اور چاروں طرف طالب علموں کے لیے کشادہ کمرے ہیں۔ ایک بڑے ہال میں کتب خانہ ہے جس کا طول سو گز اور عرض ۲۰ گز ہے بارہ سو

طالب علم بورڈنگ میں موجود ہیں۔ کتب خانہ میں چاروں طرف دیواروں کے ساتھ لکڑی کے تختے نیچے اوپر لگا کر ان پر کتابیں رکھی گئی ہیں، جن کی تعداد چالیس ہزار ہے، مختلف علوم و فنون پر مشتمل ہیں ان کتابوں میں ایک خمسہ نظامی اور شاہنامہ فردوسی کے علاوہ فارسی کی چند اور کتابیں بہت خوشخط اور مطلا ہیں۔ جو کمخواب کے غلافوں میں رکھی ہوئی نظر آئیں۔ دوسرے ہال میں نوادر رکھے ہوئے ہیں۔ جن کا ذکر سینٹ ہلینا میں کرنل رابسن کے مکان کے ساتھ ہوا تھا۔ تمام چیزیں نہایت اچھی ترتیب سے میزوں، طاقچوں اور شیشے کے صندوقچوں میں رکھی ہیں۔ موم جامے میں لپٹی ہوئی ایک حنوط شدہ لاش (ممی)، جو مصر کے اہرام سے ملی تھی، نظر آئی۔ اس کالج کی پشت پر ایک میدان ہے جس میں خوبصورت روشیں اور درختوں کی قطاریں ہیں۔ ان کے درمیان ایک سرسبز و شاداب چمن ہے۔ طالب علم صبح شام اس میں تفریح اور ورزش کے لیے جاتے ہیں انگلینڈ کے طالب علموں کی طرح یہاں کے طلبا کی ٹوپیاں بھی سیاہ مخمل کی چھجے دار ہوتی ہیں۔ چھجے کی سطح پر ڈیڑھ بالشت کی مربع وصلی اس مخمل سے منڈھی ہوئی جڑی ہوتی ہے۔ اور سیاہ ریشم کا پھول بطور طرہ اس میں لٹکا رہتا ہے۔

جب میں کالج پہنچا تو اس کے بڑے افسر پروسٹ جرکی نے مجھ کو تمام کالج کا معائنہ کرایا۔ اس کے بعد بہت معقول قسم کی دعوت بھی دی۔ وہ اور ان کی بیوی نہایت خوش اخلاق ہیں۔ مہمان نوازی میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ کھانے کی میز پر ڈاکٹر براؤن اور آئرلینڈ کے ایک بہت معزز شخص ڈال ہال بہت محبت اور اخلاق سے ملے اور بعد میں بھی کئی دن میرے ساتھ رہے۔ کئی بار اپنے مکان پر بلایا جو کالج سے قریب واقع ہے۔ ڈاکٹر براؤن انسان کے لباس میں فرشتہ نظر آیا۔ اللہ کے فضل سے اس کی بیوی بھی بہت حسین، شوخ طبع اور خوش اخلاق ہے۔ میں نے اس کی تعریف میں ایک غزل لندن سے لکھ کر بھیجی تھی۔ جس میں اس کے حسن صورت اور سیرت دونوں پر روشنی ڈالی تھی۔

دوسری عمارت پارلیمنٹ کی ہے۔ اس میں دو بڑے بڑے ہال ہیں۔ ایک عوام کے نمائندوں کے لیے (دارالعوام) دوسرا ملک کے بادشاہ کے خاص امرا اور مصاحبین کے اجلاس کے واسطے (دارالامرا) جو اس ملک کی حکومت کے واسطے نامزد کیے گئے ہیں۔ اس ایوان میں ٹاٹ جیسے دبیز پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ ان پر مختلف قسم کی چھوٹی بڑی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ کسی پر میدان جنگ کے مناظر ہیں۔ مثلاً توپ چلانے کا منظر، پیادہ اور سوار سپاہیوں کی معرکہ آرائی اور صف بندی

قتل وخونریزی کی حالت، بڑی صفائی سے دکھائی گئی ہے۔ پہلے میں سمجھا کہ یہ تصاویر مصوّر نے قلم سے بنائی ہیں، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کپڑے کی بناوٹ میں ہیں۔ جس طرح کمخواب اور مشروع میں نقش و نگار ہوتے ہیں۔ اس سے قبل میں نے ایسی چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔ اس لیے بہت حیرت ہوئی۔ لیکن لندن میں اس طرح کی چیزیں بکثرت دیکھنے میں آئیں۔ ایوانِ عام کی عمارت کی دیواریں پھولدار کاغذ کے اسی طرح کے کپڑے سے منڈھی ہوئی ہیں۔ ایوانِ خاص میں ایک عورت کی قدِ آدم تصویر ہے۔ جس کے حسن کا مقابلہ اس ایوان کی ساری آرائش بھی نہیں کر سکتی ہے۔

تیسری عمارت کسٹم ہاؤس کی ہے جو متعدد کمروں پر مشتمل ہے۔ تاجروں کا مال وہاں لایا جاتا ہے اور ان پر محصول لیا جاتا ہے۔ ایک عمارت ایکسچینج کی ہے۔ جس کے اندر روزانہ تاجر جمع ہو کر اشیاء کے نرخ طے کرتے ہیں اور تجارتی معاملات میں مشورے کرتے ہیں۔ اس عمارت میں جگہ جگہ میزیں بھی ہوتی ہیں۔ اگر معاملات پر گفتگو ختم ہونے سے قبل کھانے کا وقت آ جائے تو قریب کے آشپزخانوں کے ملازم ہر ایک کی فرمائش کے مطابق کھانے پینے کا سامان میزوں پر لا کر چن دیتے ہیں۔ اس عمارت میں ایک ہوا کی گھڑی بھی نظر آئی۔ جس میں معمولی گھڑیوں کی طرح دو سوئیاں اور بارہ درجے ہیں جن میں چار خط چار سمتوں میں بنے ہیں۔ ہر ایک کے درمیان میں ایک سوئی ہوا کے رُخ کے مطابق مذکورہ خط پر رہتی ہے۔ دوسری ہوا کے درجے بتاتی ہے۔ یہاں کچہری اور محکمۂ عدلیہ کی دوسری عمارتیں بھی ہیں۔ ایک وہ عمارت بھی ہے جہاں پہلے ڈبلن کے امراء و حکام موسم گرما میں جمع ہوتے تھے۔ اور رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ اب شاہی فوج کے افسر اور لارڈ کارنوالس کے متعلقین اس میں قیام پذیر ہیں۔ یہ پانچ مکانات بھی پتھر کے بنے ہوئے ہیں، اور سیشہ آلات، تصویروں اور جھاڑ فانوس سے آراستہ ہیں خاص طور پر درمیانی عمارت جو مدوّر اور ہشت پہل اور پچاس گز بلند اور اتنی ہی کشادہ ہے کہ تین چار ہزار آدمی وہاں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس کی چھت مخروطی ہے۔ گنبد کے درمیان تیس گز کا ایک دائرہ روشنی کے لیے بغیر چھت کا بنایا ہے۔ ہوا اور پانی سے حفاظت کے لیے لوہے کی گنبد نما جالیاں ہیں جن میں شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اس عمارت میں لوہے کے متعدد ستون بھی نصب ہیں جنھوں نے عمارت کو دائرے کی صورت میں دالان اور برآمدے میں تقسیم کر دیا ہے۔ دالان نیچے سے اوپر ایک طبقہ ہے اور دالان کا اگلا حصہ شہ نشینوں اور سیڑھیوں سے مل کر تین درجے کا ہو گیا ہے۔ لوہے کی جالیاں، چھتوں میں کسی جگہ سیدھی اور کسی جگہ صندوق نما لگائی گئی ہیں، جہاں پر

سورج کی روشنی پڑنے کا امکان ہوتا ہے، خاص کر پاخانوں یا ان مکانوں میں جو دُہرے کمرے والے ہیں ان دونوں جزیروں میں بہت مستعمل ہیں اور مفید ہیں۔ ہر محلے میں کئی کئی گرجا گھر موجود ہیں۔ خاص طور پر کرائسٹ چرچ جس کا درمیانی کمرہ لمبائی میں سو گز اور چوڑائی میں تیس گز ہے۔ اس کے دونوں طرف لوگوں کی نشست کے کٹہرے بتدریج اونچے نیچے بنے ہوئے ہیں۔ اس نشست گاہ کے اس طرف :— سہ منزلہ شہ نشین اور کھڑکیاں ہیں۔ ہر شہ نشین میں پانچ چھ آدمی منبر اور واعظ کے سامنے بیٹھ سکتے ہیں۔ ایسے شہ نشین چاروں طرف بنے ہوئے ہیں۔ اس گرجا کی عمارت کو تعمیر ہوئے چھ سو سال ہو چکے ہیں اور یہ ڈبلن کی اولین عمارت ہے۔ مردوں اور عورتوں کے بیٹھنے کے لیے الگ الگ جگہ مقرر ہے۔ باجا بجنے اور وعظ شروع ہونے کے بعد ہر شخص اپنی نشست گاہ میں مقفل کر دیا جاتا ہے تاکہ کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ جا سکے۔ اور کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہو۔ اس گرجا کے ساز اور موسیقی کو خاص طور پر بڑی شہرت حاصل ہے۔ اسی طرح صبح و شام شاہی سازندے مشق کیا کرتے ہیں۔ نہایت عمدہ باجا اور گانا سننے میں آیا۔

پریڈ کی عمارت جہاں فوج مشق کرتی ہے، اس میں دو بہت بڑے احاطے ہیں، اور ہر احاطہ میں ایک مربع میدان پریڈ کے لیے موجود ہے جس کا فرش پتھروں سے بنا ہے۔ اس کے چاروں طرف سپاہیوں کے لیے رہائشی کمرے موجود ہیں۔ ایک احاطہ سواروں کے لیے ہے۔ اس سے ملحق ایک کشادہ اصطبل بڑی کاریگری سے بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پبلک عمارتیں ہیں، جو ملازموں کے علاوہ دوسری چیزوں سے بھی آراستہ ہیں۔ ایک بہت بڑا باورچی خانہ ہے، جہاں ایک وقت میں زیادہ کھانا پک سکتا ہے۔ اس کے اندر میٹھے پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔ اور عبادت کے لیے ایک گرجا بھی بنا ہوا ہے۔ ہر عمارت سے ملحق رفع حاجت کے لیے ایک بیت الخلا بنایا جاتا ہے۔ آدمیوں کی کثرت کے باوجود وہاں گندگی اور بدبو بالکل نہیں ہوتی۔ ان میں سے بعض کا انتظام اوقاف کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور بعض کے لیے دولت مندوں نے سالانہ رقمیں مقرر کر دی ہیں۔ کچھ لوگوں نے اپنی وفات سے قبل اپنا ترکہ ایسے کاموں میں صرف کرنے کی وصیت کر دی ہے۔ ان دونوں جزیروں کے باشندوں کی خصلتیں مجھے بہت پسند آئیں۔ مرنے والا جب دیکھتا ہے کہ اس کے وارث دولت مند ہیں تو وہ اپنے مال کو نیک کاموں کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ یا اس کے لیے وصیت کر دیتا ہے اور کبھی اپنے دوستوں میں تقسیم کر جاتا ہے اور مذہبی پیشواؤں کا حصہ بھی رکھتا ہے۔ اس قوم کے اس کار خیر کو دیکھ کر میری وہ غلط فہمی دور ہو گئی

جو ہندوستان میں اس قوم کے لوگوں کے خصائل دیکھ کر پیدا ہو گئی تھی۔ جہاں ان کو عام طور پر کچھ مست اور لہو و لعب میں مبتلا خیال کیا جاتا ہے۔

اس شہر میں قہوہ خانے، قمار خانے، شراب خانے اور آئینہ سازی کی عمارتیں بہت ہیں جتنی جگہ آڑ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک آن میں ایک اوٹ ادھر سے اور دوسری اُدھر سے کھینچ کر دونوں کو ملا دیتے ہیں۔ وہ ایک دیوار بن جاتی ہے۔ ان پردوں کے نقش و نگار اور دلکشی، تماشا شروع ہونے سے پیشتر ہی آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے اور تماشا گاہ سبا اور لیلیٰ کی طرح خواب و خیال معلوم ہوتا ہے۔ پٹ کے چاروں طرف اسٹیج تک سہ درے بنے ہیں۔ ہر ایک میں چھ کرسیاں بچھ سکتی ہیں اور ہر ایک میں بہت پتلے لوہے کے ستون بنائے گئے ہیں۔ ان میں داخلے کا راستہ پیچھے سے ہے۔ ان سہ دروں کو باکس کہتے ہیں۔ بعض میں پانچ طبقے اور بعض میں سات ہوتے ہیں۔ ہر باکس کے وسط میں ایک بلوری چراغ روشن ہوتا ہے، اور پٹ کی چھت میں سے اسٹیج کی سطح پر اس قدر روشنی کی جاتی ہے کہ رات میں دن معلوم ہوتا ہے۔ عورتیں سوا باکس کے کسی اور جگہ نہیں بیٹھتی ہیں۔ اس لیے اکابرین شہر اکثر ان باکسوں میں اپنی نشست محفوظ کرا لیتے ہیں، اور تماشا گاہ کا مالک یکمشت رقم کی طمع میں دس بارہ سال تک کے لیے دے دیتا ہے، اسٹیج میں دروں کے مقابل اونچی چھت بنائی گئی ہے۔ جہاں سے پریوں کے تخت بادلوں میں اڑتے ہوئے اُترتے ہیں۔ اسٹیج کی سطح پر تہ خانہ ہے جہاں یہ تخت غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ پلے ہاؤس اور اوپرا کا حال ہے۔

تھیٹر میں گھوڑ دوڑ، شہسواری کے کرتب دکھلانے کے باعث اس کا گھر اقرب سو گز کا ہوتا ہے۔ اس مکان کی چھت میں پیتل کے چراغ لٹکے ہوئے ہوتے ہیں جس میں تیل کے ذریعہ موٹی اور سخت بتیاں جلتی ہیں۔ جس وقت اسٹیج پر کھیل کا ہنگامہ گرم ہوتا ہے یہ چہل چراغ بہت اونچے ہو کر چھت کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اور گھوڑ دوڑ کے وقت زمین سے قریب آ جاتے ہیں۔ اس مکان کے ایک مالک کا نام مسٹر ایسلے ہے۔ لندن میں بھی اس کا ایک تماشا خانہ ہے۔ یہ گھر اسی کے نام سے منسوب ہے۔ گرمی کے موسم میں لندن سے یہاں آ کر چند ماہ گزارتا ہے۔ اور ہر دو ماہ بعد نئی نقلیں لوگوں کو دکھاتا ہے۔

گھوڑدوڑ اور اسلے ہاؤس کا تماشا خانہ

پہلے مسٹر اسلے اپنے دس پندرہ جوانوں اور خوبصورت لڑکوں کو صحن میں لاتا ہے، ان کے جسموں پر بانات اور مخمل کا لباس ہوتا ہے جس پر کار چوبی اور زردوزی کے کام کی چمک دمک نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ پھر وہ دو تین سدھائے ہوئے گھوڑے لاتا ہے جن کی کاٹھی زر دوز اور لگام مرصع ہوتی ہے۔ سب باری باری بے رکاب کے ان پر سوار ہوتے ہیں۔ ان میں ایک شخص (جوکر) جو شہسوار ہے دیوانوں جیسا عجیب لباس پہنے ہوئے صحن کے درمیان کھڑا ہوتا ہے اور بظاہر گھوڑے اور اس کی سواری سے اپنے آپ کو خوفزدہ ظاہر کرتا ہے اور اپنے مسخرے پن کی حرکتوں سے سب کو خوب ہنساتا ہے۔ جب اس کو زبردستی گھوڑے پر بٹھا دیا جاتا ہے تو وہ ایسے ہنر دکھاتا ہے کہ محفل دنگ رہ جاتی ہے۔ کبھی وہ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہو کر رقص کرتا ہے اور اپنے مسخرے پن کی حرکتوں سے سب کو خوب ہنساتا ہے۔ کبھی ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر عین دوڑ کی حالت میں اس قدر جھکتا ہے کہ کمان کی طرح گھوڑے کی پیٹھ سے لگ جاتا ہے اور کبھی چار پانچ تیز دھار والی چھریاں اچھال کر گھوڑے کو دوڑاتا ہے اور ایک بھی چھری زمین پر نہیں گرنے دیتا۔ کبھی دوڑتے ہوئے گھوڑے پر کھڑا ہو کر ایک رسی ہاتھ میں لیتا ہے اور جلدی جلدی اس رسی کو دائرہ کی صورت میں گھما کر پاؤں کے نیچے سے نکال کر سر پر لے جاتا ہے۔ اور کبھی ایک رسی صحن میں تان دی جاتی ہے، اور یہ سوار گھوڑا دوڑا کر اس رسی پر سے تڑپ کر دوسری طرف اپنے آپ کو گھوڑے کی پیٹھ پر پہنچا دیتا ہے۔ کبھی دو گھوڑوں کو ایک ساتھ دوڑاتا ہے۔ اور ان پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

ایک بار اس نے مردوں کا لباس پہن کر اس پر سے برقع اوڑھ لیا اور برقع کو ایک آدمی نے اُس کے جسم پر خوب اچھی طرح کس دیا۔ اس حالت میں اس نے گھوڑے پر کھڑے ہو کر اس کو خوب دوڑایا اور بہت سے ہنر دکھائے۔ اور جب برقع سر سے اتارا تو وہ زنانہ لباس میں تھا۔

کبھی دس بیس آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر علم موسیقی کے اصولوں پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھوڑوں سے ناچ کراتے ہیں۔ جس طرح انگریز عورتیں اور مرد محفلوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ناچتے ہیں۔ گھوڑے بھی اسی طرح پاکوبی کرتے ہیں اور آگے پیچھے دائیں بائیں چلتے ہیں مگر ان کی قطار ٹوٹنے نہیں پاتی ہے۔ ان میں سے ایک آدمی کودنے میں بہت مشاق ہے۔ اس نے دس گھوڑے برابر سے کھڑے کر دیے تھے اور خود تھوڑے فاصلے سے دوڑا۔ جب پہلے گھوڑے

کے پاس پہنچا تو اس پر ذرا ہاتھ لگا کر سب گھوڑوں پر سے پھاند گیا۔ ایک بار ایک کاغذ کی گیند کو، جو زمین سے چوبیس گز اونچی چھت سے لٹکائی گئی تھی، اچک کر پاؤں کے انگوٹھے سے گرا دیا اور خود ایک نرم گدے پر آ کر گرا جو نیچے بچھا دیا گیا تھا اور چوٹ کھانے سے محفوظ رہا۔

ایک عجیب نقل کا حال

تمام نقلوں میں سب سے زیادہ جس نقل کو دیکھ کر مجھے خوشی اور حیرت بھی ہوئی، وہ پریوں اور حبشی جادوگر کی نقل ہے جس کو ہرلکن HARLEQUIN کہتے ہیں۔ ایک امیر شخص کی بیٹی جس کا نام کل میں ہے۔ ایک حبشی جادوگر پر عاشق ہو گئی۔ ایک پری اس حال سے واقف ہو گئی۔ اس نے اس لڑکی کے تخت کو جس پر وہ سوتی تھی اٹھایا اور اپنے وطن کی جانب لے گئی۔ پریوں کی ملکہ اس لڑکی کو دیکھنے کے لیے کئی تختوں پر سوار ہو کر آئی اور اس کو جگایا اور ایک حبشی سے عشق کرنے پر اس کو ملامت اور نصیحت کرنے لگی، لڑکی خوفزدہ ہونے کے باوجود جذبۂ عشق سے اس درجہ مغلوب تھی کہ وہاں سے جانے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اس لیے ملکہ نے ایک تخت نشین کو حکم دیا کہ لڑکی کو اس کے وطن پہنچا دے اور وہیں ٹھہر کر اس کے شر کو دفع کرے۔ اور اس لڑکی کے ماں باپ اور اس کے منگیتر کی مدد اور رہنمائی کرے۔ یہ سب عورتیں نازک اور حسین تھیں اور رنگ برنگ کے لباس پہنے ہوئے تھیں جن پر سلمہ ستارے ٹکے ہوئے تھے۔ اور تخت کبھی بادلوں میں سے بغیر کسی رسی وغیرہ کی مدد کے نیچے اترتے تھے، اور کبھی دامن کوہ میں غائب ہو جاتے تھے۔ ایک طرف سبز پہاڑ تھے، دوسری طرف بحر زخار اور ایک سمت کوسوں تک میدان اور سبزہ زار، چاند نکلا ہوا اور ستارے چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔

یہ منظر ایسا دلکش تھا کہ جس کو دیکھ کر اپنے کو پریوں کے قصوں کے ماحول میں پاتا تھا۔ جو قصہ گو بیان کرتے تھے۔ بہر حال لڑکی جب مکان پر آ گئی تو حبشی جادوگر چند بار نئے نئے طریقے اختیار کر کے اس کو اٹھا لے گیا۔ چنانچہ ایک بار جادو کی تلوار ایک بڑے مکان کے ستون پر ماری، جس سے مکان کے در و دیوار ایک خوفناک آواز کے ساتھ گر پڑے اور لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ اور حبشی گھوڑوں کی گاڑی میں بٹھا کر لڑکی کو لے گیا۔

ایک مرتبہ سمندر کا منظر دکھایا گیا۔ جس میں دور سے آتا ہوا ایک جہاز دکھایا گیا۔ جب جہاز نے لنگر ڈال دیا تو حبشی مددگار اور ملازم ایک چھوٹی کشتی پر سوار ہو کر کنارے پر آئے اور لڑکی کو کشتی میں بٹھا کر لے گئے۔

ایک بار اس جادوگر نے مجمع میں ایک ایسا جادو پڑھ کر پھونک دیا کہ سب لوگ ایک دوسرے

سے بیگان ہو کر لات گھونسے چلانے لگے۔ اور حبشی اس درمیان لڑکی کو ڈولی میں بٹھا کر لے گیا۔ یہ سب گھوڑے، کشتی، ڈولا اور آدمی کوئی بھی نقلی نہیں ہوتا اور نہ موم کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ مکان اتنا کشادہ ہے کہ سب اصل چیزیں اس میں لائی جاتی ہیں۔ آخر کار لڑکی کا باپ ایک سخت چوٹ کھا کر بیمار پڑ گیا۔ اور موت اُس کے سرہانے کھڑی ہوئی۔ وہ لڑکی اور جو لوگ اس کے باپ کی عیادت کے لیے آئے تھے موت کو دیکھ کر اِدھر اُدھر چھپنے لگے۔ بھگدڑ میں گھبراہٹ کی وجہ سے بعض لوگوں کے پاؤں فرش یا قالین میں اُلجھ جاتے تھے تو وہ خیال کرتے تھے کہ موت نے ان کو پکڑ لیا ہے۔ اسی لیے خوف سے طرح طرح کی آوازیں نکالتے تھے۔ یہ بات خیال میں رہے کہ انگریزوں کے گمان میں موت کی صورت انسانی ڈھانچہ کی شکل سے ملتی جلتی ہے۔ جب کسی شخص کے لباس اور منہ کو سیاہ کر کے استخوان سفیدی کی جگہوں کو سفید چھوڑتے ہیں تو رات کے وقت سیاہی تو نظر نہیں آتی اوپر سے نیچے تک سفید ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا ہے۔ انگریزوں کا تصور موت اسی شکل کا ہے۔ آخر کار ایک طبیب نے جو اس کے معالجے میں مصروف تھا، دواؤں کے پیالوں اور طبی آلات کے ذریعے سے اس کو بھگا دیا اور باپ نے صحت پا کر ہر لکن کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی اور بارات کا سامان دکھا کر، یہ نقل ختم کر دی گئی۔

دوسری نقل یہ نقل سرنگاپٹم کی فتح کہلاتی ہے۔ اس میں ٹیپو سلطان شہید کی راجدھانی سرنگاپٹم کی فتح دکھائی جاتی ہے۔

پہلے سرنگاپٹم کا لال باغ دکھایا گیا۔ جہاں ٹیپو سلطان اپنے خاندان اور امرا کے ساتھ باغ کی عمارت میں مسند پر بیٹھا ہوا ہے اور رنڈیوں کا ناچ دیکھ رہا ہے۔ ہندوستان کے دستور کے مطابق خدام حشم اپنے خاص لباس میں صف بستہ کھڑے تھے۔ اس درمیان میں ایک فرانسیسی سردار آیا جو سلطان کا ملازم تھا۔ اس نے آکر اطلاع دی کہ انگریزی فوج قریب پہنچ گئی ہے۔ ٹیپو سلطان اسی وقت جنگ کے انتظام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ فوج انگریزوں سے مقابلے کے لیے بھیجدی یہ فوج جس میں سینکڑوں پیادے ہاتھی اور توپ خانہ بالکل اصل لشکر کی طرح کود جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ سب موہوبی تھے۔ اس کے بعد دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا جنگ شروع ہو گئی بہت کوشش کے بعد ٹیپو سلطان کی فوج کو شکست ہوئی۔ اس گروہ کے تمام لوگ جن کی تعداد دو سو کے قریب تھی 'پلے ہاؤس' کے ملازمین تھے، ہر ایک دوسرے پر اصلی توپ اور بندوق کی گولیاں چلاتے تھے۔ خون بہتا تھا، تلوار اور خنجر کے زخم جسموں پر نظر آتے تھے۔ لاشیں میدان میں گرتی تھیں۔ آخر کار قلعہ سرنگاپٹم اس شان کے ساتھ نمایاں ہوا کہ انگریزی فوج اس کا محاصرہ

کیے ہوئے تھی، اور بعض ہندوستانی تلنگوں کے لباس میں اور بعض اپنی خاص وضع میں قلعہ پر توپوں سے گولہ باری کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر برج توپ کی زد سے تباہ ہو گئے تھے اور فوج کے سپاہی ہر طرف سے سیڑھیاں لگا کر برجوں پر چڑھ گئے تھے۔ انگریزوں کی ایک بڑی فوج دروازے کی طرف سے حملہ کرنے لگی۔ ٹیپو سلطان اپنے خاص فوجی دستہ کے ساتھ مقابلہ کے لیے دروازہ سے باہر نکلا۔ کچھ سپاہی شہر پناہ کی خندق کے اس طرف اور کچھ دوسرے مقامات پر دشمن سے مقابلہ کرنے لگے۔ دروازے پر جم کر لڑائی ہوئی اور بڑے بڑے نامی سرداروں کے علاوہ ٹیپو سلطان بھی اسی دروازے پر شہید ہوا۔ وہ اس وقت شاہی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس طرح یہ نقل ختم ہوئی۔

نمائش حال

ایک بڑا ہال ہے، جس کو انگریزی میں ایگزیبیشن کہتے ہیں۔ اس میں نیچے کے درجہ میں اور بالاخانہ پر ہر قسم کی تصاویر دکھائی گئی ہیں۔ آدمیوں کی کھینچی ہوئی نئی اور پرانی تصاویر موجود ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ان کی خوبیاں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کے بعد صاحب خانہ نے ہم کو تہہ خانے میں لے جا کر شہر اور قلعہ کا نقشہ دکھایا۔ جو جبرالٹر کے دامن میں بحر روم کے دہانے پر ملک اندلس میں واقع ہے۔ یہ تہہ خانہ تاریک ہے۔ اس میں سیاہ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک دو کمرے دیکھنے کے بعد ایک ایسے کمرے میں پہنچے جو روشن ہے اور یہ صنعت اس میں بھی موجود ہے۔ گویا ہم بحر روم کے جنوبی ساحل پر تھے۔ اس مقام پر سمندر بہت تنگ ہے۔ پانی کی ہر چیز بالکل اصل کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد فرانس کے چند جہاز بعض برجوں کے نیچے سے گزر کر لنگرگاہ کی طرف بڑھے۔ قلعہ سے ان پر توپیں چلائی گئیں اور انہوں نے قلعہ پر گولہ باری کی۔ یہ جہاز بالکل اصلی جہازوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ جن پر مستول، آگے کے ستون، جھنڈیاں، اور توپیں بھی نظر آتی تھیں۔ جہاز کے چلنے سے پانی کا پھٹنا، چمک اور دھواں، توپوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اور ہر چیز نظر بھی آتی تھی۔ یہ جہاز انگریزی جہازوں کے مقابل لنگر انداز ہوئے اور دونوں میں لڑائی شروع ہوئی۔ پردے توپوں کے گولوں سے پھٹ جاتے تھے اور مستول ٹوٹ ٹوٹ کر مع بادبانوں کے سمندر میں گرتے تھے۔ جہاز والوں کے ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر ہوا میں اڑ رہے تھے۔ آخرکار ایک فرانسیسی جہاز میں آگ لگ گئی اور وہ جل گیا۔ دو غرق ہو گئے، تین گرفتار ہوئے۔ باقی بھاگ گئے، جلے ہوئے اور ڈوبے ہوئے جہازوں کے قریب دس بارہ چھوٹی کشتیاں ڈوبنے والوں کو پانی سے نکالنے کے لیے دوڑ رہی تھیں، بعض ڈوبنے والوں کا تختوں کے سہارے بچنے کی کوشش کرنا

کسی کا ستونوں سے لپٹ کے بیے پٹ کر جان بچانا کچھ آدمیوں کا تیر کر باہر آنا صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب بالکل اصلی معلوم ہو رہا تھا۔ حالانکہ یہ نقل تھی۔ مگر اس تماشے کی حقیقت کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

آئرلینڈ کے باشندے

اب آئرلینڈ کے باشندوں کے کچھ حالات بیان کیے جائیں گے یہاں کے اکثر لوگ رومن کیتھولک ہیں یعنی پوپ کے پیرو ہیں کچھ پروٹسٹنٹ ہیں۔ جن کو خارجی اور فیلسوفی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ انگریزوں جیسی بے اعتدالی اور مذہبی تعصب سے بری ہیں۔ اور غیرت مندی، شجاعت، میزبانی، مسافر نوازی اور کشادہ دلی میں انگریزوں اور اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کے مقابلہ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اندر انگریزوں جیسی متانت تو نہیں ہے لیکن فہم و فراست میں ان سے زیادہ ہیں، جس مکان میں میرا قیام تھا اُس کی مالکہ مسز بال اور اس کے بچے میری ضروریات کو ایماء اشارہ سے ہی سمجھ لیتے تھے۔ ایک دو ہفتہ بعد جب مجھے ٹوٹی پھوٹی انگریزی آگئی تو میں اپنے فارسی اشعار کا ترجمہ ان کے سامنے کرنے لگا۔ غلط زبان بولنے کے باوجود بھی وہ لوگ فارسی کلام کی خوبیوں اور باریکیوں کا تھوڑا بہت اندازہ کر لیتے تھے۔

جب میں نے انگلینڈ جانے کا ارادہ کیا تو وہ لوگ کہنے لگے کہ تم کو انگریزی اچھی طرح نہ آنے کی وجہ سے وہاں بہت تکلیف ہوگی۔ انگریز تمہاری بات سمجھے بغیر تمہارے کام میں مدد نہ کر سکیں گے۔ اور واقعی ہوا بھی یہی۔ کیوں کہ اس کے بعد ایک سال تک انگلینڈ میں رہ کر میں نے ڈبلن کے مقابلے میں سو فیصد زیادہ انگریزی سیکھ لی تھی، لیکن پھر بھی لوگ میرا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھ پاتے تھے۔ اگر کبھی میں راستہ بھول جاتا اور کسی سے راستہ دریافت کرتا تو وہ شخص خیال کرتا کہ میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکوں گا اس لیے وہ میرے ساتھ ہو لیتا اور مجھ کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا تھا۔ ایک رات مجھے دور مقام تک جانا تھا، جس شخص سے میں نے راستہ پوچھا۔ وہ میرے ساتھ ہو لیا اور ایسی جگہ تک پہنچایا کہ جہاں سے بغیر کسی کی رہبری کے میں اپنی منزل تک جا سکتا تھا میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور اس سے لوٹ جانے کو کہا۔ لیکن وہ نہ مانا، پھر کچھ دور ساتھ آیا۔ راستہ بھی کافی باقی تھا، میں نے اس سے اصرار کیا کہ آپ واپس چلے جائیے، میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا۔ بلکہ اس سے یہاں تک کہا کہ اگر وہ نہ لوٹا تو میں بھی آگے جانے کا ارادہ ترک کر دوں گا۔ تب وہ ناچار واپس چلا گیا۔ لیکن ہمدردی کے خیال سے اندھیرے میں خاموشی

سے میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ میں نے اُس کی چال کو محسوس بھی کیا۔ اور جب میں اس مکان پر پہنچ گیا جہاں مجھے جانا تھا تو تھوڑی دیر میں دروازے پر ٹھہرا رہا کہ دوبارہ اس کا شکریہ ادا کروں مگر وہ شخص یہ دیکھ کر کہ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں، وہیں سے لوٹ گیا اور مجھے شکریہ کا موقع بھی نہیں دیا۔

آئرلینڈ کے لوگ دولت مند کم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ آزاد طبع، دوست نواز ہیں۔ خرچ کرنے میں ان کا ہاتھ بہت کھلا ہوا ہے اسی لیے دولت جمع نہیں کر پاتے ہیں۔ انگریزوں کی طرح ان میں غرور نہیں ہوتا، نہ اسکاٹ لینڈ والوں کی طرح روپیہ کمانے اور تحصیل علم کے شائق ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں علم کی کمی اور عہدوں کی بلندی کم ہے۔ ان اچھی صفات کے باوجود شراب نوشی زیادہ کرتے ہیں اور وہسکی نام کی ایک بہت ہی تیز و تند شراب استعمال کرتے ہیں جو خاص طور پر اسی ملک میں تیار کی جاتی ہے۔ ایک رات میں ایک ایسی محفل میں مدعو تھا۔ میزبان نے کھانے کے ساتھ ساتھ شراب کا دور بھی چلا دیا۔ اور طرح طرح کے طریقوں سے مجھے جام شراب پیش کیے جب اس نے دیکھا کہ میں پینے میں کمی کر رہا ہوں تو اس نے پانی پینے کے گلاس میں شراب بھر کر سامنے رکھ دی اور بڑی عاجزی سے پینے کی درخواست کی۔ دسترخوان اُٹھنے کے بعد کبھی بادشاہ اور کبھی ملکہ کے نام پر جام بھر بھر کر دیے گئے اور کبھی حسین لڑکیوں کے نام پر جس سے میں محبت کرتا تھا۔ اس حالت میں آٹھ گھنٹے گزر گئے۔ اس وقت اس نے دوسری قسم کی شرابیں طلب کیں اور نئے گلاس چُنے گئے، چونکہ میں انتہائی مستی میں لڑکھڑانے لگا تھا۔ اس لیے دوڑ کر اُٹھا اور رخصت طلب کی۔ مگر میزبان نے کہا کہ آپ کے جانے سے مجھے رنج ہوگا کچھ دیر اور بیٹھتے تو شراب کا دور چلتا۔ میں نے انگریزوں سے سُنا تھا کہ آئرش کھانے کی میز پر مست ہو کر آپس میں خانہ جنگی کرنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنے دوران قیام میں ان کی کوئی عادت خلاف ادب و متانت نہیں دیکھی۔

اسکاٹ، انگلش اور آئرش کے خاص عادات اور کیریکچر کا حال

انگلینڈ میں ایک خاص قسم کی تصویریں مضحک انداز کی بنائی جاتی ہیں۔ جو ہر شخص کے افعال و عادت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کو کیریکچر کہتے ہیں۔ ان کا رواج وہاں بہت ہے۔ یہ دوکانوں پر فروخت کے لیے اور سڑکوں پر تماشا کے لیے لگی رہتی ہیں۔ یہ صنعت لوگوں

کے عیوب ظاہر کرنے کے لیے اور خاص کر وزیروں اور اہل کاران سلطنت کے دھمکانے کے لیے ایجاد کی گئی ہیں۔ میں نے ان میں تین ایسی تصویریں دیکھیں جو مذکورہ تینوں ملکوں کے لوگوں کے عادات واطوار کی عکاسی کرتی تھیں۔ ہر تصویر کے حصے میں بیس تصویریں تھیں لیکن صورت ایک ہی شخص کی مختلف حالتوں میں دکھائی ہے جو بتدریج اس میں رونما ہوتی گئیں۔ اسکاچ کا باشندہ ترقی کے ارادہ سے جس وقت لندن روانہ ہوا اُس کی حالت نہایت خستہ خراب تھی۔ چونکہ اسکاٹ لینڈ میں خارش کا مرض عام ہے اس لیے وہ شخص راستہ میں میل کے پتھروں اور درختوں سے اپنی پیٹھ رگڑتا ہے اور ایک دو پیسہ کے لیے ایک گاؤں کے خطوط دوڑ کر دوسرے گاؤں لے جاتا ہے۔ چند دن بعد لندن پہنچ کر کسی کا خانسامہ بن گیا۔ نہایت فرمانبرداری سے آقا کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے اور کچھ روپیہ جمع کر لیتا ہے۔ وہی روپیہ اپنے آقا کو سود پر دے کر دولت مند بن جاتا ہے۔ پھر اور ترقی کرتا ہے اور کسی مالدار انگریز کی بیوہ سے چاپلوسی اور خوشامد کر کے شادی کر لیتا ہے اور کچھ ناموری حاصل کرتا ہے۔ اب اس کو سرکاری ملازمت کی فکر ہوتی ہے۔ دفتروں اور کچہریوں سے راہ و رسم بڑھاتا ہے اور ملکی سیاسی معاملات سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور چند درجے ترقی کر کے بادشاہ کا وزیر بن جاتا ہے اور اس ملک پر حکومت کرتا ہے۔

آئرش کی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ ملازمت کے بعد کچھ ترقی کر کے بادشاہ انگلینڈ کی فوج میں داخل ہو جاتا ہے اور ذاتی شجاعت کے باعث بتدریج ترقی کر کے جنرل کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے اور پھر خراب نوشی کی کسی مجلس میں کسی کو بُرا بھلا کہہ کر اور تلخ کر کے اس کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح انگریز فرقے کی صورت ایک موٹے تازے بیل کی بناتے ہیں اور اس کو جان بل کہتے ہیں۔ جس طرح بیل بہت کھاتا ہے اور پھینکتا ہے۔ یہ بھی ہر وقت کھانے پینے میں مصروف رہتے ہیں اور بہت سے فضول کام کرتے ہیں۔ اور جو کھانے پینے سے منع کرتا ہے اُسے سینگ مارتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی بیل کی طرح وحشتناک اور بے رحم و خم ہوتی ہے۔

آئرش عورتیں

آئرش عورتوں میں انگریز عورتوں جیسا حسن صباحت نہیں ہوتا نہ ویسی ادائیں ہوتی ہیں نہ اسکاٹ لینڈ کی عورتوں جیسی زیبائی اور اعتدال ہوتا ہے۔ لیکن ان کا چہرہ دونوں سے زیادہ حسین اور چمکدار ہوتا ہے۔ اور

نازو انداز خوب جانتی ہیں۔

اب کچھ حالات جو اس شہر میں مجھے پیش آئے تحریر کرتا ہوں۔ وہاں پہنچنے کے دوسرے دن میں نے لارڈ کارنواس کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ لارڈ موصوف بہت خوش ہوئے اور ملاقات کا وقت مقرر کر دیا۔ میں ان سے ملا۔ وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور میری دلجوئی کی۔ اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ میرے لیے ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دیا کریں۔ اور اچھی طرح شہر کی سیر کرائیں جب تک میں وہاں رہا ہفتہ میں ایک بار ان سے ملتا تھا۔ ہر دفعہ مزید عنایت و مہربانی سے پیش آتے تھے۔

بتاریخ ۱۲ ماہ رجب ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء بروز شنبہ کپتان رچرڈسن نے لندن جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن میں اتنی جلدی ڈبلن سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی میرا دل بھرا نہ تھا۔ کپتان مذکور کی صحبت میں ہمیشہ ہندی میں گفتگو کرنے کی وجہ سے مجھ کو انگریزی سیکھنے میں رکاوٹ پڑتی تھی۔ اس لیے میں نے ڈبلن ہی میں قیام کر لیا۔ اس تدبیر سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا۔ ڈبلن والوں نے مجھ کو تنہا اور بے یار و مددگار دیکھ کر پہلے سے زیادہ میری مدد کی۔ چنانچہ یہ تھوڑی مدت آرام و فراغت سے گذری۔ سب چھوٹے بڑے ہر جگہ میری مدد کرتے۔ جب میں گھر سے باہر نکلتا تو میرے چاروں طرف ہجوم ہو جاتا اور ہر شخص میرے متعلق کچھ نہ کچھ کہتا۔ کوئی کہتا کہ یہ روس کا فلاں جنرل ہے جس کے آنے کا ہم کو انتظار تھا۔ دوسرا کہتا کوئی جرمنی امیر ہے۔ بعض لوگ مجھے اسپین کا باشندہ سمجھتے تھے اور زیادہ تر ایران کا شاہزادہ کہتے تھے۔ ایک دن میرے چاروں طرف بہت مجمع ہو گیا تھا۔ ایک دوکاندار نے مجھ سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ کچھ دیر میری دوکان میں بیٹھ جاؤ تاکہ تماشائی اپنا راستہ لیں۔ میں دوکان کے اندر جا کر تصویریں دیکھنے لگا۔ جو ہزاروں قسم کی وہاں موجود تھیں۔ تماشائیوں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر اتنا ہجوم کیا کہ دوکان کے شیشے ٹوٹ گئے۔ مگر دوکان کے مالک نے اپنے حسنِ اخلاق اور نرم دلی کے سبب سے کسی کو مورد الزام قرار نہیں دیا۔

ڈبلن کی سردی اور برفباری

دو ہفتے بعد ڈبلن میں برف کی بارش شروع ہو گئی۔ تمام چھتیں اور دیواروں کی منڈیریں سفید ہو گئیں۔ شہر کی گلیاں چاندی کی نہریں معلوم ہوتی تھیں اور باغ کی روشیں پانی کی نہریں نظر آتی تھیں۔ جس کے ارد گرد نہایت

خوشنما سبزہ زار تھا۔ اس سے قبل میں نے ساری عمر میں کبھی ایسا برف نہ دیکھا تھا، اس تماشہ سے اتنا لطف اندوز ہوا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ دو تین روز کے بعد خود بخود تمام باغات صحرا اور پہاڑ حدِ نظر تک سفید دکھائی دیتے تھے اور زمین پر برف ایک گز اونچی جم گئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ برف باری کے ان دنوں میں زیادہ سردی نہیں ہوتی تھی حالانکہ دوسرے دنوں میں اتنی سخت سردی پڑتی تھی کہ کواڑ اور شیشے بند ہونے اور تین تین شال کمبل اوڑھنے کے باوجود ہوا جسم سے تیر کی طرح پار ہو جاتی تھی انگیٹھیوں کی آگ بھی پانی کی طرح ٹھنڈی رہتی ہے۔ اگر کسی قدر نمی دے کر کاغذ ڈال دیا جائے تو بہت دیر تک نہیں چل سکتا جیسا کہ موسم گرما میں ہندوستانی پنکھے جسم کے ایک حصّے کو کسی قدر سرد کر دیتے ہیں اور دوسری جانب گرم رہتا ہے۔ اسی طرح اس ملک کی آگ جسم کے ایک حصّے کو قریب لے جانے کے بعد گرم کرتی ہے اور دوسرے حصّے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ باربار گرمی حاصل کرنے کی غرض سے میرے ہاتھ جل گئے۔ خواہ جتنا بھی ہاتھوں کو آگ کے نزدیک کرتا تھا گرم نہ ہوتے تھے۔ اس گمان میں کہ آگ ابھی دور ہے اتنے قریب لے جاتا تھا کہ جل جاتے تھے۔ اس شدید سردی کے باوجود کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔ اس ملک کا شدید جاڑا اور موسم میرے مزاج کے موافق تھا جسم کو اس قدر طاقت اور طبیعت کو اتنی فرحت حاصل ہوتی تھی کہ چلنے پھرنے میں کاہلی یا سستی کا نشان تک بھی نہیں پاتا تھا۔ ہندوستان میں ڈھاکہ کی ململ کا اکہرا کرتا بدن پر بوجھ معلوم ہوتا تھا اور آدھ میل پیدل چلنے سے تکان ہو جاتی تھی: اب میرا لباس بلا مبالغہ ایک گدھے کے بوجھ کے برابر تھا اس پر بھی جسم میں اس قدر چستی تھی کہ چلنے میں دوڑنے کی طرح قدم اٹھتے تھے۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا کہ چھ سات میل چہل قدمی نہ کرتا ہوں۔ ہندوستان میں دو تین وقت سات آٹھ گھنٹے سونا ضروری تھا۔ ورنہ جسم میں کسل پیدا ہو جاتا تھا۔ ڈبلن میں قیام کے دوران چار گھنٹے سے زیادہ کبھی نہیں سویا وہ بھی رات کے وقت۔ کبھی کاہلی و سستی کا اثر نہیں پایا۔ میرے خیال میں ان دونوں جزیروں کی فضا چند اسباب کی بنا پر وہاں کی تمام نعمتوں اور خوبیوں کی جڑ ہے۔ اوّل عورتوں کا حسن اور مردوں کی جسمانی قوت، دوم زیادہ حرکات و سکنات کی وجہ سے جسم میں چستی اور پھرتی رہتی ہے اور یہی صحت و قوت کا باعث ہے جس کی بدولت سخت محنت و مشقت برداشت کر لیتے ہیں اور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

اپنی مدّت قیام میں اتفاقات سے میں نے اکثر ایسی شدید چوٹیں برداشت کیں کہ ہندوستان میں ان کا دسواں حصّہ بھی مجھ کو بے چین کر دیتا اور یہاں مجھ کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ یہ چوٹ کب

اور کیونکہ تنگی۔ سوم ان لوگوں کی سادہ مزاجی جس کی وجہ سے ان میں خیالات کی یک رنگی اصابت رائے علم و ہنر کی تحصیل کی استعداد اور بہت سی دوسری صفات موجود ہیں۔ ان کے یہاں مردوں اور عورتوں کا سنِ بلوغ بیس سال بعد ہوتا ہے۔ اس وقت تک ایسے خیالات جو علم و ہنر کی تحصیل میں مانع ہوتے ہیں ان میں بالکل نہیں ہوتے اور بالغ ہونے کے بعد بھی یہی حالت رہتی ہے۔ کیونکہ وہ سرد ہوا میں بیکار نہیں بیٹھ سکتے۔ مسلسل کاموں میں مشغول رہتے ہیں جس کی وجہ سے بے فائدہ خیالات کو اپنے پاس بھٹکنے نہیں دیتے۔

میں نے بہت سے پندرہ سولہ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھا ہے کہ جو ہندوستان کے پانچ چھ برس کے بچّوں کی طرح سوائے پڑھنے لکھنے اور کھانے پینے کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رکھتے اور بہت سے بوڑھے ایسے نظر آئے کہ جنھوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں اور نہایت مالدار ہیں۔ تجارت کے طریقوں اور اکثر فنون سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن سادگی اور بے فکری میں ہندوستانی بچّوں اور ان میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔

چہارم ان کے مکانوں کی ساخت اور لباس کی تراش خراش ہے جس کی وجہ سے وہ ہر وقت چست و چالاک رہنا اور پلنگ پر لیٹنے کے بجائے کرسی پر بیٹھنا ان کی عادت ہے۔

انگریزی لباس کی خوبیاں

پانچویں یہ کہ لباس ان کو کارگزار اور پرہیزگار بنا دیتا ہے اور ان کے کاروبار کے اوقات میں زیادہ وسعت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سردی کے سبب سے چونکہ ملبوسات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کے پہننے اور اُتارنے میں کم سے کم ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ اس لیے سونا اور آرام کرنا سوائے رات کے آخری حِصّہ کے اور کسی وقت نہیں ہوتا۔ باقی اوقات کام کرنے یا دوستوں کے ساتھ ملنے جلنے میں بسر کرتے ہیں۔ چونکہ اس تنگ لباس میں عورتوں کے ساتھ مجالست بے لطفی اور پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ اس لیے جو شخص متاہل ہے وہ بھی رات کو سونے کے وقت کے علاوہ عورت کے پاس نہیں جاتا اور جو لوگ مجرّد ہیں وہ عموماً آوارہ اور اوباش عورتوں سے ملنا پسند نہیں کرتے اس لیے بہت ضرورت کے وقت کسی عورت کو تلاش کر لیتے ہیں۔ ورنہ مجبوراً پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کو کھانے کے وقت اور رات کے جلسوں میں عورتوں کی ملاقات اور

ان سے گفتگو کا موقع ملتا ہے۔ اور ان کے حسن و جمال کا تماشا میسر آتا ہے، دل کو سیری اور اطمینان حاصل رہتا ہے۔ اس لیے زیادہ خواہش بھی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ہندوستانیوں کا لباس ڈھیلا ڈھالا اور بے قید ہوتا ہے۔ اس لیے وقت بے وقت سونے اور آرام کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور بغیر خواہش صادق کے عورتوں کے اختلاط سے قوت جسمانی کو ضائع کرتے ہیں۔

برف پر پھسلنا اور دوڑنا

چند روز کے بعد جب ندیاں اور تالابوں کا پانی جم گیا۔ اس وقت وہاں ایک عجیب ہنر دیکھنے میں آیا۔ جس کو اسکیٹنگ کہتے ہیں بغیر دیکھے ہوئے عقل اس کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوہے کا ایک ٹکڑا پیر کے تلوے کے ناپ کا لیتے ہیں۔ جس کا قطر ایک انگلی اور نیچے سے پشت چاقو کی مانند ہوتا ہے اس کو ایک لکڑی کے جوتے میں جو انگریزی جوتے کے تلے کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ دونوں جوتوں کے نیچے باندھ دیتے ہیں۔ اور اپنے جسم کا بوجھ ایک پاؤں پر ڈال کر اس کو پھسلاتے ہیں۔ چونکہ برف مسطح اور پھسلواں ہوتا ہے اور یہ جوتے بھی پھسلنے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ شخص اپنی جگہ سے تیر کی مانند تیز نکل جاتا ہے۔ اور گھوڑے سے بھی جلد راستہ طے کر لیتا ہے۔ اور جب کھڑا ہونا چاہتا ہے تو دوسرے پاؤں کو پہلے پاؤں سے کسی قدر فاصلہ پر رکھ کر دونوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں ان جوتیوں پر کھڑا ہونا مشکل ہوتا ہے اور گر پڑنے اور چوٹ کھانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اکثر گر پڑتے ہیں اور چوٹ کھاتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ اسقدر مہارت ہو جاتی ہے کہ جوتے کی حد سے برف پر حروف تہجی کے نقش کو بناتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ جو شخص اس فن کو اچھی طرح جانتا ہے اگر دو دس آدمی مل کر بھی اس کو پکڑنے کی کوشش کریں تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور وہ شخص اس غول میں جس کو چاہے چھو کر چلا جا سکتا ہے۔ اس کام سے دو فائدے ہیں۔

امیر لوگ تو جاڑوں میں حرارت پیدا کرنے اور سینہ کھولنے کے لیے یہ کام کرتے ہیں اور غریب لوگ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور گاؤں سے شہر میں خرید و فروخت کے لیے آمد و رفت کرتے ہیں۔ ملک ہالینڈ کے متعلق سنا ہے کہ اس طرح لوگ سینکڑوں میل کا سفر طے کر لیتے ہیں۔ بوڑھی عورتیں انڈوں کی ٹوکریاں سر پر رکھ کر اور بچہ کو گود میں لیکر ایک گھنٹہ میں بیس میل کا سفر طے کرتی ہیں اور شہر میں پہونچ کر خرید و فروخت کرتی ہیں۔ پھر شام ہونے

سے پہلے اپنے گاؤں واپس چلی جاتی ہیں۔ الغرض ۲۰ رجب سے ۲۹ شعبان تک ۴۴ دن اس دلکش شہر میں نہایت آرام اور مسرت کے ساتھ بسر ہوئے۔ اگرچہ ان لوگوں کو اور نہ مجھ کو سیری حاصل ہوئی تھی، لیکن مجبوراً جمعرات کی رات کو دوستوں سے رخصت ہوکر شہر ڈبلن سے انگلینڈ کا ارادہ کیا۔ جہاز تک پہنچانے کے لیے ڈاکٹر براؤن، کپتان میلی اور مسٹر بال وغیرہ دس بارہ آدمی ساتھ آئے اور مجھ کو جہاز کے مالک کے سپرد کرکے بہت رنجیدہ واپس ہوئے۔

معززین ڈبلن کا حال

دوسرے سفر کا حال بیان کرنے سے پہلے میں ڈبلن کے ان عمائدین کا ذکر خیر کروں گا جنھوں نے مجھ پر نہایت درجہ عنایت و مہربانی کی۔ ان میں ایک سر جارج شی ہیں۔ وہ اور ان کی بیوی لیڈی شی عقل و فہم، خوش اخلاقی اور اکثر نیک صفات سے آراستہ ہیں۔ سر جارج بہت عرصہ تک ہندوستان میں بمقام فرخ آباد فوج میں بخشی کے عہدے پر فائز رہا۔ اس زمانہ میں وہ ملک آئرلینڈ کے خزانہ کا داروغہ تھا۔ پھر انگلینڈ جاکر خزانہ میں کام کیا اور مجلس وزرا میں شریک ہوکر شہرت حاصل کی۔ یہ شخص لارڈ کارنواس سے بہت خصوصیت رکھتا ہے۔ میری مہمان نوازی میں بہت زیادہ دلچسپی لی اور میرے اور لارڈ موصوف کے درمیان ترجمانی کا فرض بھی انجام دیتا تھا۔

دوسرے لارڈ کارلٹن جو ڈبلن کی عدالت کا افسر اعلیٰ ہے۔ اور اس کی بیوی جنھوں نے دو بار میری دعوت کی۔ ان کا اخلاق ایسا ہے کہ کبھی ان سے کسی کی دل آزاری سرزد نہیں ہوئی۔ ان کے عمدہ مکان اور خوبصورت ساز و سامان سے لطف اندوز ہوا۔ جیسے چاندی کے طلاکار برتن، سنگِ مرمر کے مجسمے، طلائی کرسیاں، اطلس کے پردے، طرح طرح کے ساز اور باجے وغیرہ۔ دو چراغ دان دیکھنے میں آئے جن کے فانوس سفید کپڑے سے منڈھے ہوئے تھے۔ ایک بالشت کے قریب اونچے ان کے تیل کے خزانے سونے کے سیاہ قلم تھے۔ ان کی روشنی بالکل مطلع زہرہ کے مانند نظر آتی تھی۔ ہر فانوس کی روشنی دس چراغوں کے برابر تھی۔ کھانے کی میز پر تمام برتن سونے اور چاندی کے تھے۔ کھانوں اور حلووں کی اتنی قسمیں تھیں کہ نصف سے زیادہ کو چکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

تیسرے ڈیوک لینسٹر جو اکابرین آئرلینڈ میں سے ہیں۔ خوش اخلاق اور نیک معاشر، ان کی لڑکیاں نہایت خوبصورت اور موزوں قامت ہیں۔

اس ڈیوک کا بھائی پہلے بادشاہ سے بغاوت کرنے والوں کا سرغنہ تھا اور سلطنت کا دعویدار تھا۔ انجام کار گرفتار ہوا اور جیل خانہ میں مر گیا۔ لیکن یہ ڈیوک ان جھگڑوں سے علیحدہ رہا۔ اس کا مکان ڈبلن کے شاندار مکانوں میں سے ہے۔ خلاف معمول اس کے مکان میں ایک صحن اور بڑا دروازہ اور ایک دیوان خانہ ہے۔ جس میں بیک وقت پانچ سو آدمی بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں اور سامان آرائش اس قدر ہے کہ دیکھ کر نگاہیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ سنگ مرمر کی تصویریں، پچکاری کی میزیں نہایت خوبصورت، بڑے قرینے سے سجی ہوئی ہیں۔ بعض تصویروں کی قیمت ایک ہزار اشرفیاں ہے۔ اور پانچ سو اشرفیوں کی تو متعدد ہیں۔

چوتھے کرنل ڈومبل COL. WOMBWEL جس کا شمار اس زمانے کے خوبصورت لوگوں میں ہوتا ہے۔ برسہا برس لکھنؤ میں عہدہ بخشی پر فائز رہ چکا ہے اور میرا پرانا دوست ہے۔ مجھ کو اس ملک میں اس کی ملاقات کا خیال بھی نہ تھا۔ اس سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ پرانی ملاقات اور زبانداني کے سبب سے جو خوشی اس سے مل کر ہوئی اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد تو یا میں اس کے مکان میں رہتا یا وہ میرے مکان میں رہتا۔ میری فرورتوں کے خیال سے دن میں کئی بار میرے مکان پر آتا تھا۔ اکثر اس کے گھوڑے اور گاڑی پر نواح ڈبلن کی سیر کی۔ ہر روز تین گھنٹے تک دونوں ساتھ سیر کرتے تھے۔ ہندوستان میں کرنل مذکور کا ایک ہندوستانی عورت سے تعلق تھا۔ جب وہ ولایت واپس ہوا تو وہ عورت بھی ساتھ ہو گئی۔ بنگال آکر جہاز میں سوار ہو گئی۔ مگر سمندر کی موجوں کو دیکھ کر اتنی خوفزدہ ہوئی کہ سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا اور جہاز سے اتر کر ایک چھوٹی کشتی پر ساحل کی طرف واپس ہوئی۔ اتفاق سے ہوا اتنی تیز اور تند چلی کہ اس کی کشتی ڈوب گئی۔ یہ پہلی مصیبت تھی جو کرنل پر پڑی۔ اور جب وہ انگلینڈ پہنچا تو اس کی تین لڑکیوں میں سے دو جو کم عمر تھیں، مر چکی تھیں۔ جن کو اس نے پہلے سے ولایت بھیج دیا تھا ایک جوان تھی اس کی شادی اپنے بھتیجے کے ساتھ کر دی۔ وہ ایک خوش اخلاق، نیک خصلت نوجوان ہے۔ چونکہ کرنل نے طے کر لیا تھا کہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔ اس لیے لڑکی اور داماد اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اور خانہ داری کا انتظام انھیں دونوں کے سپرد تھا۔ اتفاق سے وہ لڑکی بھی چند دن بیمار رہ کر مر گئی۔ کرنل اس غم سے بے حد نڈھال ہو گیا اور بیمار پڑ گیا۔ مدت کے بعد جب اچھا ہوا تو اس میں ایک قسم کا خفقان پیدا ہو گیا۔ باوجود لحیم شحیم ہونے کے اب اتنا دبلا ہو گیا تھا کہ بمشکل سے اس کو پہچان سکا۔ اب وہ آدمیوں کی صحبت سے متنفر ہے اور ہمیشہ

تبدیلی آب وہوا کے لیے سفر میں رہتا ہے۔ ایک مکان شہر نارفولک NOR FOLK میں ڈیوک نار فولک کے مکان کے قریب بہت شاندار بنایا ہے اور ڈیوک کے دوستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

والینٹرس کا حال

والینٹران سپاہیوں کو کہتے ہیں۔ جو بغیر کسی تنخواہ کے اپنی خوشی سے وردی پہنے جنگی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ شرفائے فرنگ جنگ کے زمانے میں ملک کی حفاظت کے لیے بحیثیت والینٹر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں نارفولک کے والینٹرس کی رجمنٹ لارڈ کارلو اس کی امداد کے لیے متعین ہوئی تھی۔ کرنل بھی اس سلسلے میں ڈبلن آیا تھا۔ اس کے بعد میں نے دوبارہ کرنل کو لندن میں دیکھا اور آخری بار فرانس کی راجدھانی پیرس میں اس سے رخصت ہوا۔

والینٹرس میں بھی فوج کی طرح عہدے تقسیم ہوتے ہیں۔ چونکہ اس شہر میں کرنل کا کوئی مکان نہ تھا۔ اس لیے رجمنٹ کے افسروں کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ میری بھی دو بار دعوت اسی ہوٹل میں کی تھی۔ اس رجمنٹ میں تین چار جوان ایسے خوش جمال موزوں قامت نظر آئے جن کی تعریف سے زبان قلم لال ہے۔ اُن کی عمریں اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہ تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نارفولک (NOR FOLK) کا علاقہ حسن کے اعتبار سے تمام انگلینڈ میں ممتاز ہے۔ وہاں نارفولک سے آئی ہوئی ایک ایسی حسین وجمیل لڑکی دیکھی کہ اس جیسی کوئی صورت مجھے لندن میں نظر نہ آئی۔ نارفولک کی ترکاریاں، مرغا، فیل مرغ اور دوسرے پرندے بہت مشہور اور ممتاز ہیں۔

مسز فلیمنگس (FLEMINGS) نے اس قدر مہمان نوازی اور دلجوئی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کیا کہ جو بہت سے لوگ مل کر بھی نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ میں اس کے شوہر مسٹر فلیمنگ سے اکثر ملا ہوں۔ اور مسٹر بروک BROOKE کا دوست ہوں۔ اس لیے اس نے ایک شخص کو میری مدد کے لیے مقرر کر دیا تاکہ وہ لندن کے شرفاء سے میری ملاقاتیں کرا دے۔ خود بھی کئی بار میری دعوت کی اور اپنے دوستوں کے یہاں جب بھی مدعو ہوتی تھی۔ میرے لیے بھی دعوت نامہ منگوا لیتی تھی اور ساتھ لے جاتی تھی۔ دو بار اپنے ساتھ پہلے تماشا خانہ لے گئی جب میں اس کے مکان پر جاتا تو نہایت عزت و تکریم کرتی اور اس کا بیٹا اور تین نہایت خوبصورت لڑکیاں بھی میری مہمانداری میں مصروف رہتی تھیں۔ اس نے مجھ کو سب سے بیش

قیمت جو تحفہ پیش کیا وہ میرے دلی دوست مسٹر برورک BROOKE کی تصویر تھی۔ میں نے یہ تصویر بنگال میں دیکھی تھی اب یہاں اس کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوا۔

دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ یہ خاتون اپنے شوہر اور دو لڑکیوں کے لیے بہت بیقرار رہتی ہے جو ہندوستان میں ہیں۔ مسٹر فلیمنگ کی ایک تصویر کمرے کی دیوار پر لٹکی تھی اور ایک چھوٹی تصویر اس کی کمسن لڑکی زینی کی گردن میں آویزاں تھی۔ وہ باربار مسٹر فلیمنگ کا ذکر کرتی تھی۔ ان کے لگائے ہوئے درخت اور ان کا سامان دکھاتی تھی۔ ہر ہر چیز کو نام لے کر ان سے منسوب کرتی تھی غرض شوہر کا ذکر اس قدر اشتیاق سے کرتی تھی کہ سننے والے کا دل بھر آتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں مسٹر فلیمنگ کو ملامت کی جو ایسی محبت کرنے والی نیک خصلت بیوی سے دور ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے پوچھا کہ مسٹر فلیمنگ کلکتہ میں خوش و خرم ہیں کہ نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جو شخص تم جیسی بیوی سے جدا ہے کیونکر خوش و خرم رہ سکتا ہے۔ یہ جواب اس کو پسند آیا، سن کر مسکرائی۔ لیکن اس کو قبول نہیں کیا اور کہنے لگی کہ تم مجھے تسلی دینے کے لیے کہہ رہے ہو میری لندن سے روانگی کے وقت ایک خط مسز فلیمنگ نے اپنے ایک عزیز کے نام لکھ دیا جو شہر چسٹر میں رہتے تھے۔ اس میں میری مدد اور رہنمائی کی تاکید کی تھی۔

مسز فلیمنگ کے گھر میں میری ملاقات مسٹر اردن" سے ہوئی۔ میرے دوست مسٹر بروک کی بہن اس کے بھائی کے عقد میں تھی۔ اس تعلق سے مجھے اس نے دوبار اپنے گھر بلایا اور میاں بیوی دونوں نے بہت خاطر مدارات کی۔ ان کے گھر کی آرائش اور صفائی مجھے بہت پسند آئی۔

شرفائے آئرش کا انداز رہائش

یہاں پر شرفا آئرش اور انگلش کے طرز معاشرت کا کچھ حال بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ان لوگوں کے یہاں رات کی محفلیں اور دعوتیں ایسے مقررہ مقامات پر منعقد ہوتی ہیں جہاں گاڑیوں کی مسلسل آوازیں حاضرین کے کانوں تک نہیں پہنچتی ہیں۔ محفل نہایت پرسکون ہوتی ہے اور خدمت گار اور ملازمین ایسی احتیاط سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں کہ بعض وقت یہ گمان ہوتا ہے کہ مکان میں کوئی نہیں ہے اور ضرورت کی چیزیں محفل میں، جن اور پریاں لاکر رکھ جاتی ہیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مکان کے سوا شہر میں کوئی اور مکان ہی موجود نہیں ہے

کیوں کہ دروازے اور کھڑکیاں بند ہوتے ہیں۔ ان پر پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ دو تین کمرں کے بعد نشست کا کمرہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی باہر جانا یا اندر آنا چاہتا ہے تو دروازہ کھول کر فوراً بند کر دیتا ہے۔ اگر سو دفعہ بھی آنا جانا ہو تو دروازہ کھلا نہیں چھوڑتے ہیں۔ خدمت گاروں کی آمدورفت صرف کھانے کے وقت ہوتی ہے۔ کھانے کے بعد سب کام اہل محفل خود کرتے ہیں، جیسے صراحیوں میں شراب بھرنا چائے اور کافی بنانا، آتشدان کی خبرگیری وغیرہ۔ اگر کبھی نوکر کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو ایک ریشمی گلدار ڈوری کو کھینچتے ہیں جو آتش دان کے دونوں طرف لگی رہتی ہے اور اندر باہر کمرے اور دالانوں میں لٹکی رہتی ہے۔ ایک مرد ملازموں کے لیے اور ایک کنیزوں کے لیے اس ڈوری کو ہلاتے ہی ملازم فوراً حاضر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ڈوری میں گھنٹی لگی ہوتی ہے جو بجنے لگتی ہے۔ ہلانے والا گھنٹی کی آواز نہیں سُن سکتا مگر ملازم سُن لیتے ہیں۔ بغیر آواز دیے صرف رسی کو ہلا کر نوکروں کو بلانے پر مجھ کو تعجب ہوتا تھا۔ کئی بار تجربہ ہونے کے باوجود نوکر کو حاضر ہوتے دیکھ کر مجھ کو شک ہوتا تھا۔

اہل مجلس میں جب دو شخص گفتگو میں مشغول ہوتے ہیں تو اور لوگ خاموش رہتے ہیں جب تک کہ ان کی گفتگو ختم نہیں ہو جاتی۔ باتیں اکثر آہستہ اور سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ رات کی محفلوں اور کھانے کی دعوتوں میں بغیر اجازت کوئی نہیں آتا۔ وہی آتا ہے جس کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی دوست دوسرے دوست سے ملنے جاتا ہے تو ایک چھوٹا سا کاغذ (وزیٹنگ کارڈ) کو ساتھ لے جاتا ہے جس پر اس کا نام محلّے کا نام اور مکان کا نمبر درج ہوتا ہے وہ ملازم کو دے کر چلا جاتا ہے۔ اگر وہ شخص گھر پر موجود رہتا ہے تو کارڈ پا کر باہر آجاتا ہے اور آنے والے سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

دوسرے مسٹر وہیٹ WHITE جس سے نیلمنگ کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ اس کی سادہ وضع کو دیکھ کر میں ایک معمولی آدمی سمجھا تھا۔ اس نے دوبارہ میری دعوت کی۔ جب اس کے گھر گیا تو دیکھا مکان نہایت شاندار ہے اور بڑی شان و شوکت سے رہتا ہے۔ نہایت فراخ دل اور سخی تھا۔ اس نے نہایت عمدہ قسم کے کھانے، مٹھائیاں، آئس کریم اور پھل کھلائے اس کو خدا نے جو سب سے بڑی دولت دی ہے وہ اس کی خوش اخلاق اور حسین بیوی ہے۔ یہ سرجان کی بیٹی ہے اس کی چھ بہنیں اور ہیں۔ مسز وہیٹ باجا خوب بجاتی ہے۔ اس کی ایک بہن ایسی خوش گلو ہے کہ میں نے انگریزوں میں اس سے بہتر گانے والی نہیں دیکھی۔

ان کے علاوہ لارڈ شنن LORDSHANON اور لارڈ نیوکم LORDNEWCOME
جو شہر کے معزز لوگ ہیں اور جنرل ولنشی GEN VALLANCY جو توپ خانہ کا
افسر ہے۔ اس کو عربی فارسی اور عبرانی زبانیں بھی آتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ آئرش اور
ہندی سے بھی واقف ہے۔

ایک مسز ہمفرس LORD HAMPHERS ہیں جن کا شوہر ہندوستان میں
مرگیا اس کا ایک بیٹا اور ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ اس نے کئی بار میری دعوت کی۔
ڈبلن کی اکثر خواتین سے اس کے گھر میں ملاقات ہوئی۔ اس کا جوان بیٹا بہت ذہین
ہے اور مجھ سے کافی مانوس ہو گیا تھا۔ ایک روز میں اس کے گھر میں بیٹھا تھا کہ ایک
خادمہ کے ہاتھ سے چائے کی سینی چھوٹ کر گر گئی۔ اس کے اندر تقریباً پچاس برتن تھے۔ سب
چکنا چور ہو گئے۔ اس لڑکے نے کچھ خیال نہ کیا اور برابر مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ یہ واقعہ اور
آئرش اخلاق کا جو حال بیان کیا گیا ہے اور جو کچھ میں نے لندن میں دیکھا ہے۔ سب کپتان
ولیم سن کے بیان سے مختلف ہے۔

کپتان ولیم سن کی باتیں

کپتان ولیم سن خلیج بنگال سے کیپ ٹاؤن تک دوران سفر مجھ کو ہر وقت ڈرایا کرتا تھا کہ تمہارے طریقے لندن میں
ناپسندیدہ ہوں گے۔ ایک مرتبہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے میں روٹی کو دسترخوان پر رکھ کر احتیاط سے کاٹ
رہا تھا تو اس نے میری طرف منہ کر کے کہا کہ اگر تم لندن میں اس طرح کرو گے تو انگریز خواتین دسترخوان
کے کٹنے سے بہت رنجیدہ ہوں گی اور دوبارہ تم کو اپنی مجلس میں نہیں بلائیں گی۔ اور اگر کہیں شوربہ
کا قطرہ گوشت کاٹنے میں جہاز کے دسترخوان پر گر جاتا یا ایک برتن کا جھوٹا کھانا غلطی سے
دوسرے برتن میں ڈال دیا تو وہ بہت نفرت ظاہر کیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ جس طرح تم کھانا
کھاتے ہو اس طرح لندن میں کھاؤ گے تو کوئی بھی تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھائے گا۔ حالانکہ لندن
اور ڈبلن میں جہاں بھی میں مہمان ہوتا تھا میزبان مجھ کو معذور رکھتے تھے اور خاص طور پر
درخواست کرتے تھے کہ میں اپنے طریقے کے مطابق ہاتھ سے کھاؤں۔ اور میں نے ہوٹلوں میں
دیکھا کہ ایک بڑا برتن شراب سے بھر کر رکھ دیتے ہیں اور سب باری باری اس میں سے لے کر
پیتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ اور منہ سے اس قدر پرہیز نہیں کرتے۔ ولیم سن یہ بھی کہتا
تھا کہ لندن میں کوئی شخص کسی کی مدد نہیں کرتا۔ ضرورت مند کو آدھا شلنگ بھی نہیں مل سکتا۔

بلکہ بغیر روپیہ لیے ہوئے کوئی راستہ بھی نہیں بتاتا۔ میں رہنمائی کا ذکر تو پہلے کر چکا ہوں، اب رہی امداد تو دونوں شہروں کے آدمی مجھ کو تماشا خانہ لے جاتے اور مجھے اطلاع دیے بغیر میرے لیے چار پانچ شلنگ کا ٹکٹ خرید لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر خوشامد کر کے کتابیں، گھڑی، عینک اور چاقو وغیرہ تحائف مجھ کو پیش کرتے تھے۔ بعض لوگ تو ہزار دو ہزار روپیہ بھی نہایت خوشامد کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ جس کو میں ضرورت نہ ہونے کے باعث واپس کر دیتا تھا۔ کپتان موصوف کا یہ بھی کہنا تھا کہ جیسے تم گزشتہ کاٹنے میں ہماری مدد کے منتظر رہتے ہو، لندن میں بھوک سے مر جاؤ گے۔ لیکن یہاں یہ دیکھا گیا کہ حاضرین اس قسم کی مدد کے آرزومند رہتے تھے۔ بلکہ اس کو ثواب کا کام خیال کر کے انجام دیتے ہیں اور اُلٹے ممنون ہوتے ہیں۔ یہ باتیں میں نے اس لیے تحریر کی ہیں کہ ہندوستانی انگریزوں اور اصل انگریزوں کے اخلاق و عادات کا فرق لوگوں پر واضح ہو جائے۔

اور کپتان ہارورڈ ہیں کہ جو اکثر میرے گھر آ کر میری ضروریات کے متعلق دریافت کرتے تھے۔ مسٹر پرسٹو کے بھانجے مسٹر ٹیف کی بہن کپتان مذکور کی بیوی ہے۔ اسی نے مجھ کو کرنل ماسبل کے متعلق خبر دی تھی۔ اسی طرح مسٹر گرینٹ اور اس کی بیوی نے میرا بہت خیال رکھا۔ یہ دونوں بہت عرصہ تک ہندوستان میں رہے ہیں اور کافی دولت جمع کی۔ اب ڈبلن کے نواح میں بہت سی زمین خرید لی ہے اور زمینداری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اچھے دولت مند ہونے کے باوجود ہندوستانی کاشتکاروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور مسٹر سوٹ جو ڈبلن کی عدالت کے افسر ہیں، ان کی بیوی بہت حسین ہے۔ اس کے جیسے خوبصورت ہونٹ اور دانت میں نے کسی کے نہیں دیکھے چونکہ آئرش اکثر دانتوں کے درد میں مبتلا ہو کر دانت اکھاڑ ڈالتے ہیں۔ تو مسٹر سوٹ جب ہنستے تھے تو ان کے چہرہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا بھی ایک دانت گرا ہوا ہے۔ اور اس ایک دانت کے گرنے سے ان کے سب دندان کا حسن بڑھ گیا تھا۔ اور مسٹر جارج سے تعلقات ہو گئے تھے جو عدالت کے ایک افسر ہیں۔ ان کی بیوی فن موسیقی میں ماہر تھی۔ کئی بار میں اس کے گھر گیا۔ اس نے میرے دل بہلانے کے لیے سازِ چنگ بجا کر مجھے مدہوش کر دیا۔ اس کی دلفریب انگلیاں ایک لمحہ میں سو پردوں کی سیر کرتی تھیں اور سننے والے پر جادو سا کر دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس خاتون کے لڑکے مسٹر پال اور اس کے ماموں مسٹر ایکن دونوں نے مجھے ناشتہ اور کھانے پر مدعو کیا اور ہر طرح میری مدد کی۔ مسٹر پال محکمۂ ڈاک کا افسر ہے اور اپنی ماں سے علیحدہ رہتا ہے۔ نہایت معقول اور باوضع آدمی ہے۔ اور مسز پال ایک خوش جمال خاتون ہے۔ وہ جہاز کہ جس پر میں

بحرآئرلینڈ کا سفر کرنے والا تھا وہ ڈاک کا جہاز تھا اور مسٹر پال کی نگرانی میں چلتا تھا۔ اس کی سفارش کی وجہ سے مجھ کو اس جہاز پر سفر کرنے میں بہت آرام ملا۔

دوسرے احباب میں مسٹر ایگر اور کپتان ریلی اور کپتان ویزتھے۔ ان میں آخرالذکر سولہ سترہ سال کا خوبصورت نوجوان تھا۔ میں نے اس کو "بہشتی جوان" کا لقب دیا تھا۔ ان کے علاوہ مسٹر فٹس مارس FITZMCRE اور مسٹر ہارلی HORLI روز میرے ساتھ رہتے تھے اور مجھے انگریزی زبان سکھلانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر ان کی صفات کی تفصیل لکھوں تو موجب طوالت ہوگا۔ میں نے ان سب کی تعریف میں ایک طویل قطعہ لکھ کر لندن سے ڈبلن بھیجا تھا اور اس کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ بھی۔

الحاصل جیسا کہ پہلے بیان کرچکا ہوں کہ جمعرات کی رات کو ڈبلن سے روانہ ہوا نصف شب کے بعد ڈاک کے جہاز نے لنگر اٹھایا۔ جو سمندر انگلینڈ اور آئرلینڈ کے درمیان میں ہے۔ اکثر اس میں جہاز کا سفر دو تین روز میں بھی طے نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے دوسرے دن صبح کے وقت جب تکیہ سے سر اٹھایا تو اپنے آپ کو جزیرہ ہالی ہیڈ میں پایا۔ جہاز سے اتر کر مسٹر جیکسن کی مہمان سرا میں جاکر ٹھہرا جو اس شہر کی قیام گاہوں میں بہت اعلیٰ شمار کی جاتی ہے۔ جیکسن ایک بدذات شخص تھا۔ اس کی سیرت بھی اس کی صورت کی طرح بہت مکروہ تھی۔ مجھ کو پردیسی خیال کرکے ٹھگنے کی گھات میں لگا رہا۔ میرے آرام کا کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن یہ کوشش کرتا رہا کہ کسی بہانے مجھ کو اپنے گھر میں زیادہ دن روکے رہے۔ اتفاق سے آئرلینڈ کے دو معزز شخص اور ایک خاتون، اس مہمان سرا میں قیام کے لیے آئے۔ جب وہ میرے حال سے کچھ واقف ہوئے تو انھوں نے مسٹر جیکسن کو ملامت کی اور مجھ کو اپنی رہائش گاہ میں لے گئے۔ کھانا بھی مجھ کو اپنے دسترخوان پر کھلایا۔ چونکہ مجھ کو اپنی ضرورت کے باعث جیکسن کے یہاں ٹھہرنا پڑا تھا، اس لیے وہ لوگ دوپہر رات گئے ڈاک کا کرایہ اور میرے دو دن کے کھانے اور شراب کی قیمت ادا کرکے رخصت ہوگئے۔

یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ ہالی ہیڈ ایک جزیرہ ہے۔ کیونکہ اس کی دوسری حد میں بھی ایک کھاری پانی کے سمندر کی شاخ موجود ہے جس کی چوڑائی کلکتے کے دریا[1] کے برابر ہے۔ ہالی ہیڈ ویلز

---

[1] غالباً ہگلی مراد ہے (مترجم)

سے منسوب ہے۔ اور "ویلز" جزیرہ انگلینڈ کا تیسرا حصّہ ہے۔ ایک کو اسکاٹ لینڈ اور دوسرے کو انگلینڈ کہا جاتا ہے اور کل ملا کر برطانیہ اعظمیٰ GREAT BRITAIN کہلاتا ہے۔ ولی عہد لندن، ویلز سے منسوب ہے۔ اس لیے اسے پرنس آف ویلز کا خطاب ملا ہے۔ شہر ہالی ہیڈ بہت چھوٹا اور گندہ مقام ہے۔ چونکہ یہ ڈبلن کی گزرگاہ ہے، اس لیے مشہور ہو گیا ہے۔

الغرض ۲۴ر شعبان کو سنیچر کے دن وہاں سے میل کوچ کے ذریعہ لندن روانہ ہوا۔ بچیس میل سفر کر لینے کے بعد کشتی کے ذریعہ وہ دریا عبور کیا جو ہالی ہیڈ اور ویلز کے درمیان ہے۔ اور شہر بنگار فری میں قیام کیا۔ یہ ہالی ہیڈ سے بڑا اور اس سے اچھا شہر ہے۔ یہاں ناشتہ کیا اور آگے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں شہر بکنومی میں دن کا کھانا کھایا۔ یہ بہت اچھا شہر ہے، مکانات پتھر کے بہت مضبوط بنے ہوئے ہیں۔ شہر کے تین طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں اور لندن کی سمت ایک بڑا دریا ہے، جو گنگا کی طرح چوڑا ہے۔ یہ دریا جہاں سمندر میں جا کر گرتا ہے وہ مقام شہر سے صاف نظر آتا ہے۔ شہر پناہ پتھر کی پرانی وضع پر بنی ہوئی ہے۔ ایک قلعہ بھی ہے جو الہ آباد کے قلعہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ دن کا کھانا اس شہر میں کھایا اور یہاں سے آگے روانہ ہوا۔ آدھی رات کا وقت تھا جب شہر چسٹر پہنچا۔ یہ بنگار فری سے ۶۳ میل دور ہے۔ رات کا باقی حصّہ ایک ہوٹل میں بسر کیا۔ یہ سارا راستہ جو طے کیا پہاڑی ہے اور بہت اونچا ہے۔ کئی بار گاڑی سے اتر کر پیدل چلنا پڑا تھا۔ اسی طرح ویلز میں ہر طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ مگر سب قابلِ زراعت اور چراگاہ کے لائق ہے۔ چونکہ چسٹر کے احباب کو ڈبلن کے اخبارات سے میرے سفر کا حال معلوم ہو گیا تھا اس لیے تین چار روز سے ہر صبح کو مہمان سرا میں مجھے دیکھنے آتے تھے۔ جب میں پہنچا تو تھوڑی دیر بعد صبح سویرے مسٹر فلیمنگ دو تین اور لوگوں کے ساتھ آ کر مجھ سے ملے اور شہر کی سیر کرانے ساتھ لے گئے۔ یہاں کی سیر سے مجھے بہت لطف اندوز ہوا۔

شہر چسٹر کے حالات

چسٹر بہت پرانا شہر ہے کہا جاتا ہے کہ یہ لندن سے دو تین سو سال قبل آباد ہوا تھا۔ کئی شہروں کے مقابلے میں اس کی انفرادیت مسلم ہے۔ فرنگستان کے دوسرے شہروں سے اس کو کچھ مناسبت نہیں۔ اس کی سڑکیں نہایت کشادہ اور صاف ہیں اور سواریوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس پر کوئی پیدل نہیں

چل سکتا۔ کیوں کہ ہر سڑک کے دونوں طرف دالان بنے ہوئے ہیں جو آگے سے کھلے ہوئے ہیں اور ان کی چوڑائی سڑک کے برابر ہے۔ ان میں لکڑی کے ستون لگے ہوئے ہیں۔ ان دالانوں میں قصاب، مچھیرے، سبزی فروش اور معمولی قسم کے کاریگر بیٹھتے ہیں۔ ان کی چھتیں زمین سے تین چار گز بلند ہیں ان پر بھی ایسے ہی دالان بنے ہوئے ہیں۔ ان کی پشت پر متصل کمرے ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجہ کے کاریگر بیٹھتے ہیں جو مختلف قسم کی صنعتوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ رات کو سامان ان کمروں میں بند کر دیتے ہیں۔ اور دن میں ایک کھلے ہوئے کرسی دار چبوترے پر سڑک کی جانب یہ سامان سجا دیتے ہیں جو کمرے اور کمرے کے بیچ میں دوسری چھت کے نیچے پانچ چھ گز چوڑا ایک راستہ پیدل چلنے والوں کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ چلنے والے گھوڑوں اور گاڑیوں کی زد سے محفوظ رہ کر چل سکیں۔ جب ایک سڑک سے دوسری سڑک پر جانا ہوتا ہے تو سیڑھیوں کے ذریعے سے اوپر آتے ہیں اور دوسری طرف سڑک پر نیچے آ جاتے ہیں۔ یہاں انگلینڈ اور آئرلینڈ کے مقابلے میں گھروں کے دروازے بہت بلند اور شاندار ہیں۔ ہر مکان نئی وضع اور ایک خاص طرز سے بنا ہوا ہے۔ ہر مکان کے عقب میں ایک چھوٹی چہار دیواری ہوتی ہے جس میں کاٹھ کباڑ رکھتے ہیں۔ نئے تعمیر شدہ مکانوں میں لکڑی کے بجائے پتھر کے ستون لگے ہوئے ہیں جو پرانے زمانے کے ستونوں سے زیادہ نازک اور خوبصورت ہیں۔ مکانات کے کونوں میں جہاں ٹوٹنے پھوٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے، بجائے اینٹ کے پتھر لگاتے ہیں۔ یہ سلع پتھروں کی افراط کے باعث دونوں جزیروں میں ہے۔ یہاں تک کہ کھیتوں کی مینڈیں بھی پتھروں سے بنائی جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ شہر چسٹر کی سیر کے بعد مسٹر فلیمنگ کے مکان پر گیا جہاں شہر کے عمائدین مجھ سے ملنے کے لیے جمع تھے اور دن کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد محفل رقص و سرود منعقد ہوئی مسٹر فلیمنگ کی بیٹی نے باجا اور اس کے بھائی نے دف بہت اچھا بجایا۔ مسٹر اسپنس کی لڑکیاں خوش گلوئی میں ممتاز تھیں۔ محفل ختم ہوئی تو ہر شخص دوسرے دن اس محفل میں شرکت اور چند دن قیام کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ مگر لندن قریب تھا اور مجھے وہاں پہنچنے کا بہت اشتیاق تھا اس لیے معذرت کر لی اور نصف شب کے قریب وہاں سے رخصت ہو کر لندن روانہ ہوا۔ مسٹر فلیمنگ نے خود میرے ساتھ آ کر گاڑی کا کرایہ طے کیا اور کوچبان سے وعدہ لیا کہ رات کے وقت مجھ کو مقام مرس ہملٹن Morris Hamilton' میں آرام کے لیے اتار دے۔ جو بیس تاریخ کو دوشنبہ کے دن قصبہ اسٹفورڈ ([illegible]) میں ناشتہ کیا جو چسٹر سے ۷۱ میل ہے اور ایک دوسرے

شہر میں دن کا کھانا کھایا۔ اس کا نام یاد نہیں رہا۔ اور آدھی رات کے بعد مرس ہملٹن پہنچا اور اس سعادت مند ترجمان کی مہربانی سے خوب آرام سے سویا۔

دوسرے دن بتاریخ ۲۵ شعبان ۱۲۱۴ھ مطابق ۲۱ جنوری ۱۸۰۰ء

لندن پہنچنے کا حال

کو سہ شنبہ کے دن کلکتہ سے روانگی کے پانچ ماہ کم ایک سال بعد شہر لندن میں داخل ہوا اور مارگریٹ اسٹریٹ میں کپتان رچرڈسن کے مکان پر اترا۔ چونکہ میرا قیام اس کے مکان کی دوسری منزل میں تھا اور مجھ کو اس میں تکلیف تھی۔ اس لیے ایک ہفتہ بعد اسی محلہ میں دوسرا مکان کرایہ پر لے لیا۔ مگر مکان کی مالکن کے لالچ اور فرنچ کمسوٹ کے جھگڑے دیکھ کر ویر اسٹریٹ V[illegible] REET پر ایزن ہوٹل [illegible] HOTEL. میں اٹھ آیا۔ اس ہوٹل کا کھانا بھی اچھا تھا۔ اور خدمت گار بھی بھلے تھے۔ لیکن خرچ بہت زیادہ تھا۔ اس لیے اسی ہوٹل کے قریب دوسرا مکان کرایہ پر حاصل کر لیا اس مکان کا مالک ایک حمامی تھا۔ اس مکان میں چھ کمرے حمام کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ تین زنانہ اور تین مردانہ حمام تھے۔ ان میں سنگ مرمر کے حوض اور کپڑے پہننے اور اتارنے کی جگہیں تھیں۔ حمامی اور اس کی بیوی میری خوب خدمت کرتے۔ غسل کا بھی آرام تھا۔ سات ماہ اس مکان میں بہت آرام سے بسر ہوئے۔ اس کے بعد مالک مکان کے برتاؤ میں کچھ فرق نظر آیا تو دو ماہ بروک اسٹریٹ (BROOK STREET.) کے ایک مکان میں رہا اور ایک ماہ بارکلے اسٹریٹ (BERKLOY STREET) میں بسر ہوا۔ ان دونوں مکانوں کی مالک ایک آئرش خاتون تھی۔ جس کا پیشہ دلالی تھا اور خفیہ طور پر عورتوں کو شہزادوں کے پاس لے جاتی تھی۔ اس کے یہاں میں نے حسن و جمال کا تماشا جی بھر کر دیکھا لیکن اس خاتون کی بدخصلتی کے باعث فکر مند تھا۔ اس لیے راتھ بن پلیس R[illegible] PLACE. میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ یہ کرچہ زیادہ تر اوباش عورتوں کا مسکن ہے اور اس کے قریب جلد میں بیس محلے اسی قسم کے آباد ہیں۔ اس سبب سے بعض دوستوں نے اس مکان میں رہنے سے روکا اور کہا کہ لندن کے معزز لوگ تم سے ملنے کے لیے اس محلے میں نہیں آئیں گے اور تم سے ملنا ترک کر دیں گے۔

چونکہ مجھ کو اس مکان میں بہت آرام تھا میں نے ان لوگوں کے کہنے پر توجہ نہ کی۔ اور اتفاق سے ان لوگوں کا اندیشہ بھی غلط ثابت ہوا۔ اور میں نے چودہ مہینے آرام کے ساتھ اس مکان میں بسر کیے۔ کیوں کہ میری عزت اور بزرگی اکابرین لندن کے دلوں پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو چکی

تھی۔ اس لیے ان لوگوں کے دلوں میں اس محلّے میں قیام کے باوجود میرے بارے میں کسی قسم کی گراہی یا بدچلنی کا خیال بھی نہیں آیا۔ ان لوگوں نے میری سہولت کا خیال کرکے یہاں کے قیام کو معذوری و مجبوری پر محمول کیا چونکہ مجرّدوں کے مکانوں میں عورتوں کے آنے کی رسم یہاں نہیں ہے اس لیے عورتیں دروازہ پر آکر سلام کرلیتیں اور چلی جاتی تھیں۔ آخر کار جب گھر کے مالک نے مہمان نوازی میں کمی اور سستی شروع کی تو میں اس مکان کی سکونت ترک کرکے تین ماہ وارڈ اسٹریٹ WARD STREET اور دو ماہ بروک اسٹریٹ BROOK STREET میں رہا۔ اس آخری مکان کا مالک ایک جرمن تھا جو نہایت شریف اور با اخلاق شخص تھا۔ اس کے یہاں بہت آرام سے رہا۔ یہاں تک کہ فرانس کے راستے ہندوستان واپس ہونے کا ارادہ کرکے لندن سے رخصت ہوا۔ لندن میں میرا قیام دو سال پانچ ماہ اور پندرہ دن رہا۔

لندن کے تفصیلی حالات

لندن پہنچ کر جب راستہ کی تھکن دور ہوئی اور کسی قدر سکون حاصل ہوا تو پہلے میں نے مسٹر ڈنڈاس MR. DUNIDOS وزیر ہند کو خط لکھا اور ان سے ملاقات کی اجازت طلب کی انھوں نے فوراً ملاقات کا وقت مقرر کرکے بلالیا۔ اور نہایت عزّت اور خوش اخلاقی سے ملے اس کے بعد انھوں نے قصبہ ومبلڈن میں جو لندن سے دس میل دور ہے مجھے بلایا اور اپنے باغ میں میری دعوت کی۔ وزیر موصوف کی بیوی جو نہایت خوبصورت ہے اور لندن کی خواتین میں ممتاز ہے۔ میری تواضع میں مصروف رہی۔ دونوں نے تواضع و تکریم اور خاطر داری میں کوئی فروگذاشت نہیں کی۔

بادشاہ و ملکہ انگلینڈ سے ملاقات

دو دن کے بعد وزیر ہند نے بادشاہ و ملکہ انگلینڈ سے میرے متعلق گفتگو کرکے ملاقات کی اجازت حاصل کی۔ میں محل شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اور کوئن شارلٹ نے ازراہِ غریب نوازی دیر تک مجھ سے گفتگو کی اور اس ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا۔ اسی کے ساتھ اس بات کی بھی اجازت دی کہ میں جب چاہوں ان کے پاس ملاقات کے لیے حاضر ہو سکتا ہوں۔ اس کے بعد شہزادوں اور اراکینِ حکومت نے مجھ سے ملاقاتیں کیں اور ہر تقریب میں مجھے مدعو کرنے لگے۔ انگریزوں نے اپنی خاص عادت کے مطابق مسافر نوازی اور نیک نامی کے خیال سے کئی کئی بار مجھے دعوتوں سے نوازا۔ ہر روز میں کسی نئی جگہ ہوتا تھا اور وہاں کے کھانے، شراب اور شعر و نغمہ کی محفلوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

انگریزوں کی طبیعت سے میری موافقت

یہ عجیب بات ہے کہ لندن میں ہر محفل کے اندر لوگ میرے لطیفوں اور چٹکلوں سے لطف اٹھاتے تھے۔ اس ملک کی آب و ہوا کی موافقت اور بے فکری کے علاوہ وہاں کی حسینوں اور مہ وشوں کی دلفریب ادائیں اور ہوش ربا نغمے دل میں ایسا جوش اور اُمنگ پیدا کرتے تھے کہ میں اہلِ عجم کی شاعرانہ نازک خیالیوں کو ان کی انگریزی زبان میں نئے انداز سے پیش کرتا تھا۔ جس کو وہ لوگ نہایت ذوق شوق سے سنتے اور بے حد محظوظ ہوتے تھے۔ اور میرے بیان کیے ہوئے مضامین ایک دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو بتاتا اور اس طرح ہر طرف ان کی شہرت ہو جاتی تھی اور دوسری مجلسوں میں بھی ان کو بیان کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی محفل مجھ سے خالی نہ ہوتی تھی۔ ہر جلسہ کا مجھ کو ایک اہم رُکن سمجھا جاتا تھا۔ جس سے میری ملاقات نہ تھی وہ کسی دوسرے کے ذریعے پہلے مجھ سے ملتے پھر اپنے یہاں کی محفل میں مدعو کرتے۔

شہر لندن کے مکانات اور باغات میں متعدد جلسے ہو چکے تھے۔ اس لیے اب تماشا خانوں کی سیر اور دور دراز قصبات میں ضیافتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سلسلے میں ان مشہور مقامات کی سیر کا موقع ملا جو لندن سے تیس چالیس میل دور ہیں بلکہ بعض اسّی میل دور ہیں۔ شہر میں کوئی تماشا خانہ ہی ایسا تھا جہاں مجھ کو نہ لے گئے ہوں۔ امیروں اور وزیروں کی بیویوں کی طرف سے اوپرا اور تماشا گاہوں کے ٹکٹ میرے پاس اس کثرت سے آتے تھے کہ میں بہت سے نوجوانوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ پھر بھی کچھ بیکار پڑے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کرایہ مکان کے علاوہ مجھ کو کچھ بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔

بعض احباب نے مکان کی پیشکش بھی کی۔ لیکن کرایہ کے مکان جیسی آزادی وہاں نہ ملتی۔ اس لیے میں نے قبول نہیں کیا اور شہر کی تمام حسین لڑکیاں میری منظورِ نظر تھیں۔ ہر ایک میرے ساتھ محبتانہ برتاؤ کرتی اور مجھ کو اپنے حسن کا قدردان خیال کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوا کہ کوئی انگریز اپنے کاروبار میں مصروفیت کے باعث اپنے مزاج کی بے پروائی سے کسی لڑکی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب میں نے اس لڑکی کی تعریف کی تو جیسے گہری نیند والا خواب سے چونک پڑا ہو۔ اور فوراً اس لڑکی سے شادی کر لی۔

اس شہر میں پہنچنے کے بعد میرا مصمم ارادہ تھا کہ سال دو سال لندن میں رہ کر بیکار نہ رہوں اور تماشا بینی میں وقت گزاروں بلکہ انگریزی زبان کی تحصیل میں زیادہ وقت صرف کروں اور دیگر علوم

حاصل کروں اور انگریزوں کو جو شوقین ہوں۔ فارسی زبان کی تعلیم دوں۔ اس خیال سے میں نے وہاں کے ارباب حل و عقد کو مطلع کیا کہ کوئی اسکول ایسا مقرر کر دیں کہ جہاں دو تین انگریز نوجوانوں کو جو کچھ فارسی جانتے ہوں داخل کیا جائے اور میں ان کو فارسی زبان میں ماہر بنا دوں گا۔ اور میں جہاز میں علم نحو کا جو رسالہ اور ایک لغت کی کتاب جو لغت نویسی کو مدنظر رکھ کر لکھی ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ کروں گا۔ میرے چلے جانے کے بعد ان دو تین طالب علموں سے اور بہتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ جس طرح ایک شمع سے سو شمعیں روشن ہوتی ہیں اور فارسی زبان کی تعلیم کی بنیاد اس ملک میں مضبوط ہو جائیگی اور میری یادگار بھی باقی رہے گی۔ یہ رائے ہر خاص و عام کو پسند آئی۔ مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔ لندن کے باشندے فارسی زبان سیکھنے کا بہت شوق رکھتے ہیں اور اپنے لڑکوں کو جعلی استادوں کے پاس بیٹھکر ڈیڑھ گھنٹہ کا معاوضہ ایک گنی بخوشی دیتے ہیں۔ حکومت نے میری تجویز پر عمل اس لیے نہیں کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر تاجرانہ طبیعت رکھتے ہیں اور خرچ میں بہت کفایت کے عادی ہیں عوام کے نفع و نقصان کا ان کو کوئی خیال نہیں اور شاہی وزرا بہت زیادہ مصروفیات اور جنگ فرانس کی وجہ سے اس کام پر توجہ نہ کر سکے۔ آخر میں جب ان کو فرصت ہوئی تو لندن اور آکسفورڈ کے مدرسوں میں فارسی تعلیم کے لیے میرا تقرر کیا اور چھ ہزار روپیہ سالانہ مشاہرہ طے کیا۔ لیکن وقت گذر چکا تھا اور میں وطن واپس ہونے کے لیے تیار تھا۔ میرے تحصیل علم (انگریزی) میں دو امر مانع ہوئے ایک وہاں کے اساتذہ کی عدم مہارت جس کی وجہ سے میں تین مرتبہ تین ایسے استادوں کے پاس گیا جو فارسی اور ہندوستانی زبان جانتے تھے۔ ایک ماہ کوشش کی لیکن یہ کم استعداد استاد انگریزی الفاظ کے فارسی یا ہندی معنی نہیں بتا پاتے تھے جس کی وجہ سے میرا کچھ کام نہ چلا۔ دوسرے یہ کہ مجھے اسلامی ممالک کے علماء اور عوام کی جہالت اور غفلت کا حال بھی معلوم تھا۔ اس لیے اس کام میں محنت کرنا بے سود معلوم ہوا۔ کیوں کہ ایسے لوگوں کو میری محنت کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گی۔ اس لیے میں نے ان جھگڑوں کو چھوڑ کر صرف سیر و تماشہ میں وقت گذارا، اور میرے دن عید اور رات، شب برات کی طرح عیش و آرام میں بسر ہوئے۔ باقی واقعات آئندہ بیان کیے جائیں گے۔

انگریز دوستوں کا ذکر

ان میں پہلا نام مسٹر چارلس کاکریل کا ہے جو ہم غمخوار بھائیوں کی طرح ہر وقت میری خوشنودی کا خیال رکھتا تھا اور لندن کے اخراجات کے لیے روپیہ پیش کرتا تھا اور اس بات کا اصرار کرتا تھا کہ میں لے لوں۔ میں نے لندن کے اکثر تماشا خانوں اور مشہور مقامات کی سیر اسی کی مدد سے کی۔ اسی نے

مجھ کو انگلینڈ کے خاص مقامات دکھائے۔ ان میں ایک سٹیڈلرس ویلز [illegible] کا ہے جہاں ایک مشہور بازی گر رہتا ہے۔ دوسرا سرکس جس کے گھوڑوں کی ہنرمندی اور گھوڑ سواری کے قاعدوں کا ذکر میں نے ایک مثنوی میں کیا ہے۔ ان کے علاوہ فنٹش میگوریا [illegible] PHANT [illegible] اور واکس ہال وغیرہ جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

مسٹر کاکریل کا سالانہ جشن

لندن میں ابھی ایک ہفتہ نہ گذرا تھا کہ مسٹر کاکریل کے مکان پر پر دن کے کھانے میں شریک ہوا۔ جو طرح طرح کی نعمتوں اور پری چہرہ حسینوں سے آراستہ تھی۔ یہ مسٹر کاکریل، کرنل کاکریل کا بھائی ہے۔ جو حکومت ہند میں لارڈ کا نائب سا شریک کار تھا۔ خود مسٹر کاکریل نے بھی مدتوں ہندوستان میں تجارت کی اور مجھ سے ایک سال بعد لندن واپس آیا۔ اور ترک سفر کر کے اطمینان سے لندن میں سکونت اختیار کی ہے۔ اس کا مکان امیرانہ ساز و سامان سے آراستہ ہے اور نہایت فارغ البالی اور عیش کے ساتھ بسر کرتا ہے جو انگریزوں کو ہندوستان میں بھی میسر نہیں۔ اور ہمیشہ لندن کے امیروں اور وزیروں کی دعوتوں میں شریک رہتا ہے۔ اس نے بادشاہ کے یوم ولادت کی شب میں ہر سال ایک جشن منعقد کرنے کا انتظام کیا ہے۔ اس کے مصارف دس ہزار روپیہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ آخری جشن جو میرے وہاں سے رخصت ہونے سے دو روز پہلے منعقد ہوا تھا میں اس میں موجود تھا۔ محفل رقص و سرود کے اختتام پر دسترخوان سپر [illegible] یعنی آدھی رات کے کھانے پر سات سو معزز مرد اور خواتین نے شرکت کی۔ دسترخوان پر حلوے، شرابیں، آئس کریم اور میوے موجود تھے۔ موسم نہ ہونے کے باوجود بہت سے تازہ پھل موجود تھے۔ جو حکمت عملی سے ہاٹ ہاؤس [illegible] یعنی مکانات گرم سیر میں پیدا کیے جاتے ہیں اور بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ لیکن کاکریل کے ملازم گرم شوربا، مرغ اور کباب ہر ایک کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مسٹر کاکریل کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ مگر اس کا ایک بھائی ہے جس کی گیارہ اولادیں ہیں اور بیوی نہایت ہوشیار ہے۔ اور یہ اولادیں بہت خوبصورت اور خوش اخلاق ہیں۔ خاص طور پر این کاکریل جو موزوں قامت اور بہت حسین ہے اور لندن کی حسینوں میں شمار کی جاتی ہے۔ میں نے اس کے لب و دندان، سیاہی چشم اور زلف رسا کی تعریف میں ایک غزل لکھی تھی۔ اسی طرح مسٹر کاکریل کی ایک بہن ہے۔ جو مسٹر ملا آیا کی بیوی ہے اور متعدد اولادیں ہیں۔ جن کے حسن و سیرت و صورت کے بیان سے زبان قلم قاصر ہے۔ چھوٹی لڑکی

سر ایڈورڈ گرنٹن کے نکاح میں ہے اور اس وقت جزیرہ لنکا میں مقیم ہے۔ میں نے اس کے حسن کی تعریف میں بھی ایک غزل لکھی ہے۔

ذکر سفرِ آکسفورڈ

مسٹر کارل کی دیگر عنایات کے علاوہ ایک یہ ہے کہ وہ موسم گرما کے سفر میں مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ شرفائے لندن موسم گرما میں چار ماہ کے لیے آرام اور سیر کے لیے لندن سے باہر چلے جاتے ہیں۔ ہم لوگ ایک کھلی ہوئی خوبصورت گھوڑا گاڑی پر سوار ہوئے ان مقامات کو دیکھا جن کے نہ دیکھنے کا مجھے افسوس تھا۔ یہ سفر میں نے جمادی الاول ۱۲۱۵ھ مطابق ستمبر ۱۸۰۰ء سے شروع کیا۔ اور اس دن سلاطین انگلینڈ کے تاریخی شہر ونڈسر WINDSOR میں قیام کیا۔ ونڈسر کے دونوں پارک، مکانات، شاہی گرجا گھر جو قلعہ میں واقع ہے اچھی طرح دیکھا۔ اس قلعہ میں متعدد دیوان خانے موجود ہیں ہر ایک گذشتہ بادشاہوں کے نام سے منسوب ہے۔ ہر مکان میں اس بادشاہ کا تاج و تخت، ہتھیار اور اس کا استعمالی سامان بہت خوبصورتی سے رکھا ہوا ہے۔ ان میں ایک ایوان بادشاہ ہنری ہشتم کا ہے جس میں بیس حسین عورتوں کی تصویریں نظر آئیں جو اس بادشاہ کی منظورِ نظر تھیں اور وہ زندگی میں اس مرقع کو اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا۔ دوسرے دن وزیر اعظم اڈنگٹن کے باغ میں دن کا کھانا کھایا۔ یہ باغ پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ اس باغ کے انجیر نہایت شاداب اور لذیذ ہوتے ہیں۔ اس میں ہندوستان، امریکہ، چین وغیرہ کے پھلدار درختوں کے پودے بڑے گملوں میں نظر آئے جو ابھی بار آور نہیں ہوئے تھے۔ موسم سرما میں ان کو شیشے کے گھروں میں رکھا جاتا ہے۔ آم کے چند پھل دار درخت بھی موجود تھے۔

جمعرات کے دن قصبہ "انگ" میں مسٹر گولڈنگ GOLDING کے باغ میں دن کا کھانا کھا کر آرام کیا۔ موصوف ہندوستان میں ایک افسر اعلیٰ ہیں۔ ان کا باغ بھی پھلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی لڑکیوں کا گانا بجانا سننے میں خوب وقت کٹا۔ جمعہ کے دن دوپہر کے وقت آکسفورڈ پہنچے اور "اسٹار" STAR نامی مہمان سرا میں قیام کیا۔ آکسفورڈ ایک مشہور شہر اور دارالعلم ہے۔ UNIVERSITY اس کی تمام عمارتیں سرخ پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور اکثر مندروں کی وضع پر بنی ہیں۔ سڑکیں کشادہ ہیں۔ ان کے کنارے درختوں کی نہایت موزوں قطاریں ہیں۔ دکانیں نہایت شاندار ہیں۔ ہر طرف سے لوگ یہاں تحصیل علم کے لیے آتے ہیں۔ اس شہر میں تئیس بڑے کالج ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ کتب خانہ بھی ہے اور ایک بڑا کتب خانہ ہے جس میں ایک لاکھ کتابیں ہر علم اور زبان کی موجود ہیں۔ ان میں دس ہزار کتابیں عربی، فارسی اور اسلامی علوم کی ہیں۔ جو آئندہ زمانہ

یں نفع حاصل کرنے کے خیال سے رکھی ہوئی ہیں۔ ان تیئس[۲۳] مدرسوں میں سے ہر ایک کو کالج اور سب کو ملا کر یونیورسٹی کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک رسدگاہ ہے جس کو آبزرویٹری OBSERVATORY کہتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر انگریزوں کی اس مہارت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کو فلسفہ اور حکمت میں حاصل ہے۔ صدہا قسم کے آلاتِ رسد عجیب و غریب قسم کی دوربینیں موجود ہیں۔ آدمی زینوں پر چڑھ کر ان کے ذریعے سے ستاروں اور سیاروں کو دیکھ سکتا ہے۔ ایک عمارت علم تشریح الاعضا کی تعلیم اور اس کے سامان کے لیے علیحدہ ہے جس کو اناٹمی ANOUTMEY کہتے ہیں۔ اس کا بڑا معلّم (پروفیسر) سرفزگرگ پیک نامی ایک مردِ معقول ہے۔ اس کے ایک شاگرد مسٹر دان ٹامس نے مجھے اس شعبہ کی اچھی طرح سیر کرائی۔ وہاں کے عجائبات سے مجھ کو ایسی دلچسپی ہوئی کہ اگر مجھے اس علم کی تحصیل کی کچھ بھی استعداد ہوتی تو وہاں سے ہرگز واپس نہ آتا۔ اس عمارت میں ایک بڑا کمرہ صرف استخوان بندی کی تشریح کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے اندر انسانوں، گھوڑوں، بندروں، مچھلیوں اور تمام مشہور جانوروں اور پرندوں کے ڈھانچے ایک خاص ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک اور کمرہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی رگوں اور پٹھوں کے لیے وقف ہے، بعض رگوں کو زرد موم اور بعض میں سرخ غذا کے رنگ کے موافق بھر دیا ہے۔ یہاں میں نے ایک بہت بڑا پٹھا دیکھا جس کا ایک سرا آدمی کے سر سے جڑا ہوا اور باقی ریڑھ کی ہڈی سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کی ایک شاخ داہنے ہاتھ کی انگلیوں تک اور دوسری بائیں ہاتھ کی انگلیوں تک تھی۔ ایک شاخ داہنے پاؤں کی انگلیوں تک اور دوسری شاخ بائیں پاؤں کی انگلیوں تک پھیلی تھی۔ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں بدن میں جابجا پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ پٹھا کھنکھجورے سے بہت مشابہ تھا۔ اس طرح ایک اور کمرے میں انسانی اعضا علیحدہ علیحدہ رکھے تھے اور ان میں موم بھرا ہوا تھا۔ جو چیز پورے جسم سے ظاہر نہیں ہو سکتی ان کو دیکھ کر معلوم ہو جاتی ہے۔ ایک کمرہ میں انسانی اعضا کے ٹکڑے تیزاب سے بھرے مرتبانوں میں رکھے گئے ہیں تاکہ علم تشریح کی تعلیم میں طلبا کو سمجھنے اور اساتذہ کو سمجھانے میں آسانی ہو۔ میں نے اس کمرہ میں دو جڑواں بچّے دیکھے دونوں کے سر اوپر کی طرف اور ایک کے پاؤں دوسرے کے پاؤں میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس شکل کی وجہ سے ولادت کے وقت زچّہ ہلاک ہو گئی تھی۔ آپریشن کے ذریعے بچّے نکالے گئے تو وہ بھی مُردہ تھے۔ اس لیے رحم کو بچّوں سمیت نکال کر تیزاب سے بھرے مرتبان میں رکھا گیا۔

اس عمارت کے تہ خانے میں چند نعشیں دیکھیں جن کو کاریگر محفوظ رکھنے کے لیے درست کر رہے

تھے۔ ان کے پاس ایک موم بتی جل رہی تھی۔ اس کا موم مُردوں کے گوشت اور ہڈیوں سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور کمرے میں لے گئے۔ جہاں بیماروں کے وہ اعضا رکھے ہوئے تھے جو ان کی موت کا سبب بنے ان اعضا پر اس بیماری کا اثر اور نشان نمایاں تھا۔ ان میں مرضِ آتشک میں مبتلا ہو کر مرنے والوں کے سر اور ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں رکھی تھیں جن میں سینکڑوں سوراخ ہو گئے تھے اور بعض حصے بالکل گل گئے تھے۔ ایک آدمی کا پتہ دیکھا جس میں پتھریاں پیدا ہو گئی تھیں اور اس وجہ سے وہ مر گیا تھا۔ ایک پتھر دیکھا جو بطخ کے انڈے کے برابر تھا۔ اور ایک پندرہ سالہ لڑکے کے مثانہ سے آپریشن کے ذریعہ نکالا گیا تھا اور وہ مریض لڑکا زندہ رہا۔ اسی طرح سل و دق کے مرض میں مبتلا ہو کر مرنے والوں کے پھیپھڑے اور جگر بکثرت رکھے تھے۔

میں نے وہاں کے ڈاکٹروں سے جسم کے اعضا اور ان کے افعال کے متعلق جو معلومات حاصل کیں ان کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ جگر صفرا تولید کرتا ہے اور وہ صفرا پتہ میں گرتا ہے جو اس کے نیچے چپٹا ہوا ہے۔ پھیپھڑہ کا کام تنفس اور تازہ ہوا کو کھینچنا ہے اور دل خون کی تولید کے لیے ہے۔ اور گردہ حفظِ فضلات کے لیے اور سیدھی آنتیں فضلہ کو دفع کرنے کے واسطے۔ صفرا پتہ سے معدہ میں جا کر غذا کو ترش آب بناتا ہے اور وہ ترش آب بارہ آنتوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور فضلہ خودوں میں ٹھہرتا ہے اور ایک صاف شدہ ایک عضو میں داخل ہوتا ہے جو پردہ کی مانند آنتوں کے نیچے لٹکا ہوا ہے اس پردہ اور بارہ آنتوں کے درمیان دو رگیں ہیں۔ غذا اس پردہ کی قوت جاذبہ سے خون بن کر ان رگوں میں آتی ہے۔ پھر یہ خون ان رگوں کے ذریعہ جو ریڑھ کی ہڈی سے ملی ہوتی ہیں دل کے نصف حصہ تک جاتا ہے۔ اس وقت اس کا رنگ سرد اور مائل بہ سیاہی ہوتا ہے اور بہت ہی گدلا ہوتا ہے اس کے بعد وہ پھیپھڑے میں آ کر اس کی حرکت اور ہوا کا باعث ہوتا ہے۔ اور پھیپھڑے کی حرکت خون کی صفائی کا سبب بنتی ہے۔ اور خراب ہوا سانس کے ذریعہ باہر جاتی ہے۔ وہاں سے خون رگوں کے ذریعہ تمام بدن کو غذا پہونچاتا ہے۔ اور پھر اسی قسم کی دوسری رگوں کے ذریعہ دل کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔ اب جو خون رہ جاتا ہے وہ سُرخ و شفاف اور خالص ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ سنیچر اور اتوار کا دن ان تماشوں اور مسٹر فلپاٹ کی مہمانی میں گذرا۔ یہ اس شہر کے مشہور طالب علموں میں ہے اور نہایت آزاد خوش اور نیک خو ہے۔ چونکہ یہ زمانہ تعطیلات کا تھا اساتذہ اور طلبا باغات کی سیر کے لیے چلے گئے تھے۔ میں دوشنبہ کے دن وہاں سے روانہ ہو کر قصبہ وڈ اسٹاک میں مسٹر طونی کے مکان پر اُترا۔ جو اس قصبہ کے شرفا میں ممتاز

ہے۔ یہاں سے بلینم پارک [illegible] کی سیر کے لیے گیا۔

بلینہم پارک

بلاشبہ اور بغیر سخن سازی کے کہہ سکتا ہوں کہ روئے زمین پر اس پارک جیسا مقام نہیں نظر آئے گا۔ لندن اور ونسٹرو وغیرہ کی خوبصورتی اس کو دیکھ کر نظروں سے محو ہو گئی۔ اس پارک کا دائرہ چودہ میل ہے اور اس کی عمارات کا رقبہ ایک میل ہے۔ اس میں متعدد نہریں جاری ہیں۔ خاص طور پر ایک چھوٹا دریا جس پر نہایت شاندار پل بنے ہوئے ہیں۔ اس کے متصل ستر گز اونچا پتھر کا مینار بنا ہوا ہے جس کا قطر چو گز ہے۔ اس کے نیچے اس عمارت کے بانی ڈیوک بالبرہ کا مجسمہ نصب ہے جو سنگِ مرمر کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ ڈیوک مذکور ملکہ انگلینڈ ر QUEEN ANNEY. کا سپہ سالار تھا۔ اس نے بڑے بڑے دشمنوں کو انگلینڈ سے نکالا تھا اور کئی بڑی لڑائیوں میں فتح حاصل کی تھی۔ جس کے صلہ میں اس پارک کی زمین اور پچاس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کی جاگیر اس کی درستی کے لیے حکومت کی طرف سے ملی تھی۔ اس باغ کے درختوں کی ترتیب اور صف بندی اس جنگ کے نقشے کے مطابق ہے جو ڈیوک مذکور نے دشمنوں کے مقابلہ میں لڑی تھی۔ اس عمارت کے اندر ڈیوک کی لڑائیوں کے رنگا رنگ نقشے ٹنگے ہوئے ہیں جو کپڑوں پر ریشم سے کاڑھے ہوئے ہیں اور ایسے خوبصورت ہیں کہ نگاہیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ گاڑی پر بیٹھ کر اس پارک کا طواف کرنے کے بعد مسٹر طونی MR NTONY کے دسترخوان پر دن کا کھانا کھایا۔

اتفاق سے یہاں مسز کاک سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے دیدار سے نہایت مسرت ہوئی۔

یہ میرے دوست مسٹر پرنگل کی سالی ہے۔ جو میرا بہت پُرانا دوست ہے اور لکھنؤ میں میرے مکان کی نگرانی وہی کرتا ہے۔ ہفتہ کے روز اس سنجیدہ اطوار خاتون کے شوہر کرنل کاک نے اپنے باغ میں میری دعوت کی اور بدھ کے دن مسٹر اسٹرٹمن نے جو ایک خوش اطوار نوجوان ہے اپنے باغ میں مجھے کھانے پر مدعو کیا۔

انگریزوں کا طریقہ شکار

چونکہ مسٹر اسٹرٹن کی ملکیت میں دس بارہ ہزار بیگہ زمین ہے۔ اس لیے وہ اکثر شکار میں مشغول رہتا ہے۔ اس کے پاس شکار کا سامان بکثرت ہے جس میں بندوقیں، شکاری کتے تیز رفتار اور شائستہ گھوڑے شکاری لباس سب شامل ہیں۔ وہ مجھ کو صبح سویرے کرنل کاک کے گھر سے شکار کے لیے ساتھ لے گیا۔ کبھی پیادہ پا اور کبھی گھوڑے پر بیٹھ کر شکار کھیلتے رہے۔ کھیتوں اور میدانوں میں تین پہر پھرتے رہے اور بیس تیتر اور پانچ خرگوش بندوق سے شکار کیے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک میں اپنی املاک کے

علاوہ دوسری جگہ شکار کی ممانعت ہے یہاں تک کہ اگر کوئی دوسرے کی چراگاہ میں ایک خرگوش بھی شکار کرے تو جج اس کو پھانسی کی سزا دے دیں گے۔ انگریزوں کے شکار کے طریقے دو ہیں۔ اور دونوں میں کتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک تو بندوق سے جب کتوں کی ناک میں خرگوش یا تیتر یا کسی اور پرندے کی بو محسوس ہوتی ہے تو وہ چار طرف سے حلقہ باندھ کر چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں اور شکار کی بو سونگھتے رہتے ہیں۔ اس وقت شکاری باخبر ہو کر نشانہ باندھتا ہے اور شکار کی حرکت پر بندوق چلا دیتا ہے۔ اکثر ایک فیر میں دو تین تیتر گر جاتے ہیں۔ ان کتوں کا ہنر مجھ کو پسند آیا۔ میرے خیال میں یہ شکار کا سب سے اچھا طریقہ ہے بنا گیا ہے کہ بعض کتے اس قدر ہوشیار ہوتے ہیں کہ کھیت کی دیوار پھاندتے وقت اپنی قوتِ شامہ سے شکار کی قربت معلوم کر لیتے ہیں اور اس خوف سے کہ شکار بھاگ نہ جائے بجائے آواز نکالنے دیوار پر لوٹ پوٹ کر شکاری کو مطلع کرتے ہیں۔[1]

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ سکھائے ہوئے کتے خرگوش، لومڑی، گیدڑ یا دوسرے جانوروں کے پیچھے دوڑتے ہیں اور سوار ان کے پیچھے ہوتے ہیں۔ اگر شکار ایک میل سے زیادہ فاصلے پر بھی کسی جھیل میں تیر گیا ہو تو اس کی بو محسوس کر کے کتے بھی پانی میں تیر کر اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اگر شکار کسی سوراخ میں گھس جاتا ہے تو چھوٹے کتے اندر جا کر اس کو نکال لاتے ہیں اور اگر سوراخ تنگ ہے تو اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیتے ہیں اور جب سوار شکاری پہونچ جاتے ہیں تو سوراخ کو کھود کر جانور کو نکال لیتے ہیں۔ شکاریوں کے گھوڑے بھی چار پانچ گز چوڑی خندق اور قدِ آدم دیوار بے تکلف پھاند جاتے ہیں۔ اسی طرح گڑھے کیچڑ اور پانی وغیرہ میں بھی ان کے قدم اور رفتار میں کوئی لغزش نہیں پیدا ہوتی ہے۔

شکار سے واپسی کے بعد کھانے کی میز پر بیٹھے۔ وہ محبوبۂ دلنواز یعنی مسز کاک بھی موجود تھی۔ اس دعوت میں بکرے کے گوشت کے ایسے لذیز کباب کھانے میں آئے کہ ان کی لذت ساری عمر یاد رہے گی۔ لندن کے امیروں کے یہاں دعوتیں کھانے کے باوجود ایسا عمدہ گوشت میں نے کسی کے یہاں نہیں کھایا تھا۔ کئی قسم کا شکاری گوشت اور میوے بھی دسترخوان پر موجود تھے۔

جمعرات کے دن قصبہ چپنگ نارٹن میں ناشتہ کیا اور قصبہ اسٹو STOWE میں ایک معزز شخص کے گھروں کا کھانا کھایا اور اس کے بعد مسٹر کاکریل کے باغ میں آرام کیا جو سیزن کٹ میں واقع ہے۔ کرنل کاکریل نے اس باغ میں ایک پاکیزہ عمارت بنائی

---

[1] مصنف پوائنٹر کتوں کا ذکر کر رہا ہے۔ (مترجم)

ہے جو اس کے مرنے کے بعد مسز کاکریل نے باقی ورثا سے خرید کر اپنے لیے مخصوص کرلی ہے۔ یہ معدوذ نہایت آرام اور دلچسپی میں بسر ہوئے۔

مسٹر ہسٹنگ کے باغ کا حال

اتوار کے دن گورنر بنگال مسٹر ہسٹنگ MR.WARREN HASTINGS کے باغ میں مدعو کیا گیا۔ چونکہ لندن میں یہ طے پاچکا تھا کہ جب اس کے وہاں پہنچوں گا تو ایک ہفتہ قیام ہوگا۔ اس لیے اس نے ایفائے عہد کا حوالہ دے کر اپنا مہمان بنایا۔ اس باغ میں میوہ جات بکثرت ہیں اور مسٹر ہسٹنگ کے یہاں قسم قسم کے کھانوں کی لذت و خوبی بیان کرنا دشوار ہے خاص طور پر گوشت، پنیر، بالائی اور مسکہ بہت نفیس ہوتا ہے۔ خاص طور پر ڈیری کی صفائی اور پاکیزگی قابل تعریف ہے۔ ڈیری ایک بڑے ایوان کو کہا جاتا ہے جو ہر باغ میں دودھ کے کارخانہ کے واسطے مخصوص ہوتا ہے۔ اس ڈیری میں چاروں طرف شیشہ کی ٹٹیاں اور مچھلی کے جال کی طرح سنہری جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ عمارت سنگ مرمر کی ہے اس میں سنگ مرمر کے حوض بنے ہوئے ہیں۔ جن میں دودھ بھر دیا جاتا ہے اور اس سے مسکہ، بالائی اور پنیر تیار کیا جاتا ہے۔ اور سنگ مرمر کی چوکیاں مسز ہسٹنگ کی نشست کے لیے نہایت خوبصورت بنائی گئی ہیں۔ وہ ہر روز وہاں کی سیر کے لیے آتی ہے۔ اور کچھ وقت اس شغل میں صرف کرتی ہے۔ اس باغ کی عمارت کا نقشہ خود مسٹر ہسٹنگ نے تیار کیا تھا۔ اس میں بلوری جھاڑ فانوس، قد آدم آئینے بیش قیمت قالین اور تمام خوبصورت سامان سجایا گیا ہے۔ اس کی مجموعی ہیئت ایسی خوشنما اور دلچسپ ہے کہ سیر کرنے والوں کو پریوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں کے رہنے والے بغیر کھانے پیئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس لیے کہیں کوڑے کرکٹ کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ باغ کی ایک سمت پہاڑی سلسلے سے ملی ہوئی ہے اور ایک پتلا راستہ (پگڈنڈی) وہاں سے پہاڑ پر جانے کے واسطے بنایا گیا ہے۔ اور اس کے بعض مقامات جو قابل سیر تھے ان میں زمین صاف و ہموار کرکے بیٹھنے کی جگہیں نکالی ہیں۔ اس کوہستان کے تمام چشمے آپس میں مل کر ایک بڑے حوض میں گرتے ہیں۔ جس کے چاروں طرف پھلواری لگی ہوئی ہے۔ اس حوض سے دو نہریں نکل کر باغ کو سیراب کرتی ہیں۔ ان پر پل کے خوشنما پل باندھے ہیں۔ عمارت میں جہاں ضرورت ہوتی ہے پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔ مسٹر ہسٹنگ تین چار ماہ لندن میں باقی زمانہ اس مکان جنت نشان میں فراغت کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ ان کی تمام ضروریات لباس اور شراب کے سوا اس باغ کی آمدنی

سے پوری ہوتی ہیں۔

میں جمعرات کو گاڈ مان وہاں ٹھہرا۔ اس نے حق مہمان داری حد سے زیادہ ادا کیا۔ اور میرے قیام لندن کے اخراجات اپنے سر لینے کے لیے بہت اصرار کر رہا تھا۔ چونکہ مجھ کو ضرورت نہ تھی اس لیے معذرت کر کے رخصت ہوا۔ مسٹر کاکریل کی خواہش تھی کہ وہاں سے قصبہ "سیزن کٹ" میں جا کر چند دن اس کے ساتھ رہوں۔ تاکہ وہ اپنی جائیداد کے کاموں سے فارغ ہو کر مجھ کو شہر باتھ BATH اور کیمبرج اور ہیمپشائر HAMPSHIRE وغیرہ انگلینڈ کے مشہور مقامات کی سیر کرائے۔ لیکن ایک لندنی گل عذار کا خار محبت دل کو بے چین کر رہا تھا اور اب زیادہ صبر ممکن نہ تھا اس لیے واپس لندن روانہ ہوا۔

شہر ہنلی کا ذکر

جمعہ کے دن لندن جاتے ہوئے راستہ میں شہر ہنلی HENLY پڑا جو انگلینڈ کے اچھے شہروں میں سے ایک ہے۔ دریائے ٹیمز جو لندن کے نیچے ہے یہاں بھی دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہے اور اس پر سفید پتھر کا پل بنا ہوا ہے۔ جہاں تک نگاہ جاتی ہے دریا کے دونوں طرف پہاڑ کے دامن میں سبزہ زار اور درختوں کی موزوں قطاریں عجب لطف دکھاتی ہیں۔ یہاں کی ہوا بھی نشاط انگیز ہے۔ لندن پہونچ کر جب اس پری رخسار سے ملاقات ہوئی تو اس سفر کے نقوش لوح دل سے محو ہو گئے اور اس پری وش کی تعریف میں غزل لکھی۔

دوسری مہربانی مسٹر کاکریل نے یہ کی کہ وطن کی واپسی کے وقت چونکہ خشکی کا سفر اور خطرناک راستوں کا سامنا تھا اس لیے میں نے چاہا کہ اپنا سامان لوگوں میں تقسیم کر دوں تاکہ سفر میں دشواری نہ ہو مگر اس نے مجھے منع کر دیا اور کہا کہ یہ سب سامان ہندوستان پہنچانے کا میں ذمہ دار ہوں۔ اس نے یہ سب چیزیں مجھ سے لے کر نہایت مضبوط صندوق میں بند کر کے ہندوستان روانہ کر دیں اور وہ سب چیزیں میرے پاس بغیر کسی نقصان کے کلکتہ پہونچ گئیں۔

دوسری مہربان مسز پلوڈن Mrs Plowden ہے جس کا شوہر مسٹر پلوڈن ہندوستان میں فوج کا افسر تھا۔ اور کچھ عرصہ دربار وزیر کا ممبر بھی رہا۔ اور اب لندن میں ایک عمدہ مکان بنوا کر آرام سے رہتا ہے۔ اور ہمیشہ آنے جانے والوں کی دعوت کرتا ہے۔ اس کا دسترخوان بھی مہمانوں سے خالی نہیں رہتا۔ کمپنی کے ڈائریکٹر اس کی ایمان داری کی وجہ سے اس کو ڈائریکٹری کا منصب دینا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسز پلوڈن کو جو دولت و عزت دی ہے اس میں سب سے بڑی دولت

اس کی گیارہ اولادیں ہیں۔ ان میں اکثر خوش گفتار، خوبصورت اور میل محبت سے رہنے والی ہیں۔ ان میں مجھ کو منجھلے لڑکے ولیم پلوڈن اور منجھلی لڑکی امی پلوڈن سے بہت محبت تھی۔ دوسرے لڑکے اور لڑکیاں بھی ہنرمند ہیں۔ بعض گانے بجانے اور رقص و سرود میں بہت ماہر ہیں۔

اسی طرح مسز پلوڈن کی ایک بہن اڈمرل ہملٹن کی بیوی ہے۔ جس کو خدا نے دو لڑکے اور ایک خوبصورت جوان لڑکی عطا کی ہے۔ جس کے دیدار سے طبیعت کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ ذہانت اور ہوشیاری میں مسز ہملٹن اور خانہ داری کی لیاقت میں مسز پلوڈن کی سی کوئی عورت میری نظر سے نہیں گذری ہے۔ میں زیادہ تر مسز پلوڈن کے دسترخوانِ احسان کا مہمان ہوتا تھا۔ جہاں اس ملک کے علاوہ ہندوستان کے لذیذ کھانے بھی ملتے تھے۔ اس کے ذریعے سے بعض تماشا خانوں کی سیر کی۔ خاص طور پر واکسال بہت پسند آیا۔ خاتون موصوف کثیر الاحباب اور شب نشینی کے جلسوں کی عادی ہے اس لیے معززین کی بیویاں بعد طعام اس کے یہاں اکثر جمع ہوتی ہیں۔ اور محفل ساز و آہنگ گرم ہوتی ہے۔ اور ہفتہ میں دو ایک مرتبہ محفلِ رقص بھی منعقد ہوتی ہیں۔ اس لیے حسن و جمال کا تماشا اور گانے بجانے کا لطف سب سے زیادہ مجھے اسی کے مکان میں حاصل ہوا۔ علاوہ اور خواتین کے جنھوں نے میرے دل پر قبضہ کیا ایک مسٹر ہیڈ بھی ہے ——— جس کی تعریف میں ایک غزل بھی میں نے لکھی ہے۔

.. دوسری خاتون جس نے مجھے مسحور کیا وہ مسز السٹرزہ [illegible] تھی۔ اس کا حال بھی ایک غزل میں بیان کیا ہے۔ یہ مسز السٹرزہ اڈمرل ہملٹن کی بھتیجی اور کرنل السٹرزہ کی بیوی ہے جو اسکندریہ اور مصر فتح کرنے والی فوجوں کا ایک افسر تھا۔ اس خاتون کا گانا ان سب گانے والیوں سے بہتر تھا جن کو میں نے قدیم روم اور فرنگستان میں سُنا۔

اسی کے ساتھ مادام کیلہ اور مادام بانٹی [illegible] اور مسز بلینگٹن کا گانا بھی سُنا۔ یہ سب لندن کے تھیٹروں کی مشہور گانے والیاں ہیں۔ قدیم روم کے گانے والوں میں ممتاز ہیں اور موسیقی کا مخزن ہے۔ اور اس ہنر میں ساری دنیا پر فوقیت رکھتا ہے۔ ان سب نے اسی ملک میں یہ فن حاصل کیا ہے۔ لیکن ان سب کا گانا مسز السٹرزہ کی خوش گلوئی کے مقابلہ میں چکی کی گڑگڑاہٹ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے راگ، راگنیوں کا انداز ہندوستانی موسیقی سے بہت مشابہ ہے۔ مسز السٹرزہ کے بعد مسز ہیڈ مذکور کا نمبر ہے۔ ان کا ثالث نظر نہیں آیا۔

محفلِ سماع حسنِ اتفاق سے یہ دونوں نادرہ روزگار گانے والیاں جس صورت میں

بھی دلکش ہیں۔ ایک رات ایک خاص مجلس میں موجود تھیں اور ان کے ساتھ ان کی بہت سی گانے والی سہیلیاں بھی جمع تھیں۔ گانا شروع ہوا تو اس قدر کیف و وجد پیدا ہوا کہ بہشت کے نغمات میں بھی اتنی تاثیر نہ ہوگی۔

مسٹر ہیڈ اپنی ماں کے پاس اور مسٹر چین اپنے باپ کے پاس لندن سے اسّی میل کے فاصلہ پر رہتا ہے۔ وہ اس زمانہ میں سیر و تفریح کے لیے لندن آیا تھا اور ڈیڑھ ماہ تک مسز پلوڈن کے یہاں مقیم رہا۔ اور اب واپس جانے والا تھا۔ اور میں بھی کنگ جارج KING GORGE سے رخصت ہو کر عازم ہندوستان تھا۔ اس موقع پر مسز پلوڈن نے کہا کہ میں ان دو رخصت ہونے والوں کی ایک یادگار الوداعی تقریب کروں گی جس میں سرود و ساز کی محفل بھی شامل ہے۔ تمام مشہور گویوں کو بلاؤں گی تاکہ اس جلسۂ سماع کی لذت اور لطف فلاں شخص کو (یعنی مجھ کو) ہمیشہ یاد رہے۔ چونکہ مسٹر ہیڈ کا آغاز شباب تھا اور محبت بھری طبیعت پائی تھی۔ جو بالکل اس شعر کے مصداق ہے۔

أين العرائس لم ينكحن صاحبا
ازواجهن سكارى الحب من ازل

(ترجمہ) کہاں ہیں وہ صاحب جمال لڑکیاں جو ہوشیاروں سے نکاح نہیں کرتیں۔ یعنی دردمندانِ عشق کے علاوہ کسی کی مصاحب نہیں ہوتی ہیں۔ اور ان کے شوہر روزِ ازل سے سرمست بادۂ محبت تھے۔

اور مسز پلوڈن اور اس کی بیٹیاں نہایت رقیق القلب ہیں ان پر اس شعر کا مفہوم صادق آتا ہے۔

حل الصبابة في دار وضعت بها
في الحي بالغزلان والغزل

ترجمہ: "جس گھر میں میری پرورش ہوئی وہ محل محبت اور منزل عشق تھا جس وقت سے کہ میرا معدہ چھڑایا گیا میں شوخ چشم غزالوں میں پلا اور بڑھا اور کلمات عشق و محبت سے مانوس ہوا۔"

وہ اس ڈیڑھ ماہ کی مدت میں ساتھ رہ کر محبت سے وقت گذارتی رہیں۔ آدھی رات کے بعد مفارقت کا وعدہ تھا۔ وہ بہت دردناک اور عاشقانہ غزلیں زبان پر لاتی تھیں۔ اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر فرقت کا زمانہ یاد کرتیں اور پھول جیسے رخساروں پر حسرت کے آنسو بہاتی تھیں۔ اس سبب

سے ان کی آوازوں میں ایسا درد پیدا ہوگیا تھا کہ اس سے قبل کبھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ ساری محفل بیتاب ہوگئی۔ لوگ مشکل سے آنسو ضبط کر رہے تھے۔ آدھی رات کے بعد جیسے ہی مسز ہیلڈ کی گاڑی کی آواز آئی۔ اس کی سہیلیوں کی آہ و زاری نے قیامت بپا کردی۔ یہ حالت دیکھ کر تو کسی سے ضبط نہ ہوسکا، در و دیوار سے رونے کا شور بلند ہوا۔ اور ہر طرف سے الوداع کی آوازیں آنے لگیں۔ اہل محفل کے اس سوز و گداز نے ملازموں کو بھی متاثر کردیا۔ ایک ایسا غمناک سماں تھا کہ اس کی پوری کیفیت لکھی نہیں جاسکتی۔

تا قیامت گر نویسم ایں کلام — صد قیامت بگذرد ویں ناتمام

تیسرے مسز سارہ شین اس کی ولادت بندرگاہ سورت ہندوستان میں ہوئی تھی۔ جہاں اس کا باپ افسر اعلیٰ تھا۔ نہایت خوبصورت اور میری منظور نظر تھی۔ مسز پلوڈن کا لڑکا مسٹر ٹریور اس کے عشق میں مبتلا تھا۔

چوتھے مس ہوزی اس کا باپ عرصہ تک انگریزوں کی طرف سے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہا تھا۔ جب لکھنؤ سے اپنے وطن واپس آرہا تھا تو اس کا جہاز جرسی کے قریب ایک پہاڑ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور وہ اپنے ساتھیوں سمیت ہلاک ہوگیا تھا۔ مس ہوزی نے لاوارث ہونے کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کی زیر نگرانی پرورش پائی اس کے حسن کا شہرہ دور دور تک تھا۔

ایک روز مسٹر شکاف کے باغ میں جو لندن سے بارہ میل دور ہے۔ میری دعوت تھی۔ کھانے کے بعد سب باغ کی سیر کرنے لگے۔ گرمی کا موسم تھا۔ ایک بلند درخت کے سائے میں سب بیٹھ گئے۔ قہوہ کی میز درمیان میں لگی ہوئی تھی مسٹر شکاف نے میری طرف دیکھ کر مجھے واقف کرنے کے لیے کہا کہ یہ درخت ان درختوں میں سے ہے جو زمین پر پھیلتے ہیں اور کبھی اونچے نہیں ہوتے۔ اس کا بلند ہونا باعث تعجب ہے۔ میں نے کہا۔ یہ کوئی تعجب کی بات ہے۔ اگر میں بھی ان لوگوں کی طرح مس ہوزی کے ہم نشینوں میں ہوتا تو اس درخت سے زیادہ بلند ہوجاتا۔ سب حاضرین اس فقرے پر خوب ہنسے اور میرے اس چٹکلے کو پسند کیا۔ پانچویں مس ٹیلر۔ یہ مسٹر ٹیلر کی لڑکی ہے۔ اس کی ماں ہندوستانی تھی۔ اور یہ مدتوں لکھنؤ میں رہی۔ نہایت حسین اور خوش اخلاق ہے۔ باجا خوب بجاتی ہے۔ لیکن ماں کی جدائی سے بہت غمگین رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے تپ دق میں مبتلا ہوکر آغاز جوانی ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئی اور اس صدمہ کا مجھ پر

چھٹے میں پیش پیں۔ ایسی حسین ہے کہ میں نے اس کی تعریف میں ایک غزل لکھ ڈالی۔

لطیفہ

مس پشی نے آخر کار ایک بوڑھے شخص کے ساتھ اس کی دولت کے لالچ میں شادی کرلی۔ وہ کمسن دوشیزائیں جن کو ان کے ساتھ میری محبت کا علم تھا۔ اس کی اس حرکت پر پیچ و تاب کھاتی تھیں۔ ایک محفل میں وہ سب میرے پاس دوڑتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں "مبارک باشد" آپ کی محبوبہ پشی کی شادی ہوگئی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں اس کے شوہر کی تعریف کروں! میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے برجستہ جواب دیا کہ میں نے اس کو سلیقہ مندی سے محروم پاکر مدت ہوئی اپنے معشوقوں کی فہرست سے خارج کردیا تھا۔ اس جواب پر وہ سب کھلکھلاکر ہنس پڑیں۔

ساتویں مس میری چیپلن جس کا باپ مسٹر بلوڈن کے ہمسایہ میں رہتا ہے۔ اس نے مجھ کو اکثر رات کی صحبتوں میں مدعو کیا۔ اس کی ایک اور لڑکی بھی ہے۔ وہ حسن و جمال میں چھوٹی بہن سے بڑھ کر ہے۔ لیکن میرے خیال میں مس میری جیسا حسن و نزاکت ناز و ادا اس میں نہیں ہے۔ میں نے اس کے حسن کی تعریف میں ایک غزل بھی لکھی ہے۔

آٹھویں مس رکش۔ یہ مس جانسن کی نواسی ہے۔ جس سے کلکتہ میں میری اچھی خاصی شناسائی تھی۔ یہ لندن کے ایک وزیر لارڈ ڈکسری کی قریبی رشتہ دار ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ ایک شاندار مکان میں امیرزادیوں کی طرح رہتی ہے۔ مس رکش اور اس کی ماں نے اپنے مکان میں میری دعوت کی اور عالی حوصلہ لوگوں کی طرح فراخدلی کے ساتھ کھانے پینے کا انتظام کیا۔ دسترخوان پر ہر چیز موجود تھی۔

نویں فرازی۔ یہ موسیقاروں کا استاد ہے اور اٹلی کا رہنے والا ہے۔ اس کی لکھی ہوئی نظمیں عام محفلوں اور اوپیرا میں گائی جاتی ہیں۔ شطرنج کا بھی شوقین ہے۔ میرے ساتھ اکثر کھیلتا تھا۔ ایک بار شطرنج کی تین بساطیں الگ الگ بچھا کر تین آدمیوں کو بٹھا دیا اور خود دیوار کی طرف منہ کرکے بیٹھ گیا اور ایک آدمی کو جو روم کا رہنے والا تھا۔ چالیں بتا رہا تھا۔ وہ اس کے حکم کے مطابق تینوں سے کھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ سب کو مات دے دی۔

مختصر یہ کہ جس قدر ارباب سوز وساز اور حسین مسز پلوڈن کے گھر دیکھنے میں آئے۔ ان کی تفصیل لکھنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ یہاں مس کریہم اور مس برسٹو سے بھی ملاقات ہوئی۔ مجھ سے میری شناسائی ہندوستان میں بمقام کلکتہ ہوئی تھی۔ اور دونوں کلکتہ کی خوبصورت عورتوں میں شمار کی جاتی تھیں۔ اس مکان میں حسینانِ زمانہ کی کثرت دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ شاید میری طرح مس پلوڈن بھی نظارۂ حسن وجمال کی شائق ہیں۔ اور اپنے مکان میں سوائے حسینوں کے کسی کو آنے نہیں دیتی ہیں۔ بہرحال جس رات کہ میں نے لندن کو چھوڑا اس رات میں مسز پلوڈن کے ساتھ کھانا کھایا۔ کیوں کہ اس نے پہلے سے وعدہ لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ رخصت ہونے کے دن کچھ وقت اس کے ساتھ گذارے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے اپنی یادگار کے طور پر کچھ تحائف بھی مجھے دیئے اور یہ تحائف اپنے ہر بچے کے ہاتھ سے دلائے۔ یہاں تک کہ اپنے چار سالہ بچے چارلس کے ہاتھ سے بھی تحفہ پیش کرایا مگر اسی کو میں نے قبول کیا۔ باقی کے لیے معذرت کر دی کیوں کہ خشکی کے راستے سے سفر میں زیادہ سامان ساتھ لے جانا مشکل ہوگا۔ میرا مقصد یہ بھی تھا کہ اس پر زیادہ بار بھی نہ پڑے۔ مگر اس سیر چشم خاتون نے وہ سب چیزیں اپنے بیٹے مسٹر پلوڈن کے پاس بھیجدیں اور جب میں کلکتہ پہنچا تو یہ چیزیں اس نے میرے پاس پہنچا دیں۔

دسویں سر جان سنکلر جو اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا ہے۔ اور چھوٹے امراء میں شمار ہوتا ہے۔ یہ شخص ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ بعض شاہی خدمات بھی انجام دیتا ہے۔ انگلینڈ کے دانشوروں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے لندن پہونچنے کے فوراً بعد ایک رقعہ بھیج کر ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اور اس کے بعد مجھ سے ملنے آیا۔ کئی بار میری دعوت کی۔ اکثر تماشا گاہوں میں مجھ کو ساتھ لے جاتا تھا۔ لندن سے دس دس میل کے فاصلے تک دعوتوں میں مجھ کو ساتھ لے جاتا تھا تاکہ اچھی طرح ہر جگہ کی سیر کر سکوں

اسکولوں کا حال

سر جان سنکلر ایک دن مجھے اپنے ساتھ ڈاکٹر مول Dr Mool کے اسکول میں لے گیا جو قصبہ سن بری میں لندن سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں اس کا بیٹا بھی پڑھتا تھا۔ چودہ پندرہ برس کی عمر کا یہ لڑکا نہایت ذہین علم ودانش میں آراستہ انتہائی وجیہہ تھا۔

اسکول میں بچوں کی پڑھائی کا طریقہ، کھیل کود کے قاعدے، شام کو سبزہ زار پر دوڑ دھوپ

قوانین کی پابندی کا لحاظ۔ یہ سب چیزیں مجھ کو بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ کھانے کے وقت سر جان سنکلر موصوف نے اپنے بیٹے اور اس کے تقریباً ساٹھ دوستوں کی دعوت کی جو سب معزز لوگوں کی اولاد میں سے تھے۔ میں بھی کھانے کی میز پر موجود تھا۔ ان بچوں کی باتوں اور ان کے سوالات سے اتنی خوشی ہوئی کہ جو کسی تماشا خانہ میں جا کر نہیں ہوئی بلکہ ان کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کیوں کہ ہر بچے کو اخلاق و عادات اور رکھ رکھاؤ کا بہت خیال تھا۔ اپنی عزت و وقار اور حفظ مراتب کے لحاظ پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ اسی وقت ان کی خوبیوں کا ایک ثبوت مل گیا۔ تین بچوں نے کم سنی کے باعث سبق یاد کرنے میں کچھ سستی کی۔ استاد نے ان کو بطور سزا سبق یاد کر لینے کے وقت تک سب سے نیچے بٹھا دیا تھا۔ اس بات کا ان پر اتنا اثر تھا کہ چھٹی کے بعد کھیل کود کے وقت اور دعوت کے وقت بھی وہ رنجیدہ تھے۔ یہاں کے سب لڑکے آپس میں تفریح کے وقت بھی ایک دوسرے سے علمی سوالات کرتے رہتے ہیں۔

جب ہم لندن واپس آئے تو ایک پہر رات گذر چکی تھی۔ سر جان سنکلر کا مکان راستہ میں تھا اور میرا مکان وہاں سے دو میل دور تھا۔ میں نے چاہا کہ گاڑی سے اتر کر پیادہ گھر تک چلا جاؤں مگر اس نے نہ مانا۔ پھر میں نے کہا کہ تم اپنے مکان پر اتر جاؤ میں گاڑی پر چلا جاؤنگا۔ مگر یہ بات بھی اس نے قبول نہ کی اور خود ساتھ لے جا کر مجھے گھر پہنچایا۔ راستہ میں اس سے پوچھا کہ آپ نے ساتھ آنے اور سواری پر پہونچانے کے لیے اتنا اصرار کیوں کیا تو اس نے جواب دیا کہ دنیا حادثات کی جگہ ہے۔ اگر خدانخواستہ راستہ میں تم کو کوئی حادثہ پیش آجاتا تو مجھ کو عمر بھر اپنی کاہلی پر افسوس کرنا پڑتا۔ اور اتنا سارا راستہ تمہارے ساتھ طے کرنا کوئی دشوار بات نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے عمر بھر کے افسوس و ندامت میں مبتلا ہو جاؤں۔

سر جان کو علم زراعت اور فلاحت میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ طرح طرح کے زرعی تجربات کرنا اس کا خاص مشغلہ ہے اور علم زراعت سے دلچسپی رکھنے والوں کی مجلس کا ممبر ہے۔ اس کے جلسے ہوا کرتے ہیں اس کے مکان پر مجھے بہت سے عمائدین سے ملاقات کا موقع ملا۔ ان میں لارڈ ڈفنسل ایک معمر اور تجربہ کار شخص ہیں۔ ان کے یہاں کی دعوت میں اکثر شریک ہوا اور خاص طور پر روٹیاں کئی قسم کی اتنی عمدہ کھائیں کہ قیام لندن میں کہیں ایسی روٹیاں نہیں ملیں۔

دوسرے سر جان میکفرسن دو ایک سال بنگال کے گورنر بھی رہ چکے

ہیں اور اب پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ ان کا مکان لندن سے دو میل دور برمنگھم گروو میں ہے۔ مکان بہت عالی شان ہے۔ وہ امرا شاہی سے ملتا جلتا رہتا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اکثر اس کے گھر آتے ہیں۔ اس کے یہاں مجھ کو لندن کے شاہزادوں کے ساتھ بھی کھانا کھانے کا موقع ملا، اور کھانے کے بعد محفل رقص و سرود سے بھی لطف اندوز ہوا۔

میرے مسٹر ڈینار جو گروو نذن کے مشہور پل کی تعمیر کے نگراں تھے۔ وہ اس عجوبہ روزگار پل کی سیر کے لیے لے گیا۔ اس پل کا آئندہ ذکر کیا جائے گا۔

ایک اور خاتون لیڈی بارل جو مشہور امیر مسٹر جان بارل کی بیوی ہیں، انھوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ان کا خاندان قدیم زمانے سے معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس خاندان میں دو عورتیں ڈچس بھی ہیں یعنی ڈیوکس کی بیویاں۔ یہ عورتوں کا اعلیٰ خطاب ہے ایک ڈچس شمپلن Duchess of Northland زوجہ ڈیوک شمپلن دوسری ڈچس پورٹ لینڈ زوجہ ڈیوک پورٹ لینڈ جس کا حال ڈیوک کے بیان میں لکھا جائے گا۔ لیڈی بارل نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد ایک خوبصورت اور باکمال پادری مسٹر کلیو Mr. Close سے شادی کرلی جو اس کے شوہر کا مصاحب اور بیٹے کا اتالیق بھی تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے کل خاندان نے اس سے ملنا ترک کر دیا، یہاں تک کہ اس کے بیٹوں نے بھی اس سے ملنا ترک کر دیا۔ اس نے بھی ان کی کچھ پرواہ نہ کی اور اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ نہایت فراغت سے بسر کرتی ہے۔ اور برابر معزز عورتوں اور مردوں کی دعوتیں اور گانے بجانے کے جلسے منعقد کرتی رہتی ہے۔ وہاں پہنچنے کے ابتدائی دنوں میں میری خبر پاکر اس نے مسٹر کلیو کو میرے پاس بھیج کر ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس وقت سے رخصت ہونے کے زمانے تک وہی برتاؤ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ موسم گرما میں لندن سے تیس میل دور باغ و بیلن اور رچمنڈ Richmond میں مجھ کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی اور ایک ایک ہفتہ مہمان رکھتی تھی۔ اس لیڈی کو لذیذ کھانے پکانے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ اس کا باورچی اس ملک کے کھانوں کے علاوہ ایرانی کھانے بھی خوب پکاتا تھا۔ جیسے قورمہ، پلاؤ خشکہ، کباب وغیرہ۔ اس لیڈی کی وجہ سے حسن و جمال کے نظاروں کے ساتھ ساتھ لندن کے مشہور مقامات کی سیر اور تماشا گاہیں دیکھنے کا خوب موقع ملا۔ لیڈی بارل کو جو دولت بیدار نصیب ہوئی ہے وہ اس کی بیٹی مس بارکل ہے۔ ایسی خوبصورت کہ چشم فلک نے بھی نہ دیکھی ہوگی اور فرشتوں کے کانوں نے بھی اس کا جیسا دلکش نغمہ نہ سنا ہوگا۔ حسن رنگ

کے ساتھ بتانِ ہند کی ادائیں بھی اس میں موجود ہیں۔ یہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھی اور خاص و عام میں میری معشوقہ مشہور تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ معشوقانہ برتاؤ کرتی تھی۔ اگر کسی محفل میں کوئی ایسی خاتون آجاتی جس کو میری منظورِ نظر کہا جاتا تو وہ بہت افسردہ ہوجاتی تھی۔ ایک مرتبہ سرجان بارل کے باغ ویڈن میں جو جنت نظیر تھا۔ اس کی ماں نے مجھ کو مدعو کیا۔ تین چار دن بعد جب میں نے لندن واپس ہونے کا ارادہ کیا تو مس بارل نے اصرار کیا اور چوتھے دن مسٹر کلیو نے ٹھہرایا۔ صبح کو میں نے جانے کا پختہ ارادہ کرلیا تو مس بارل نے درخواست کی کہ ایک دن میرے کہنے سے اور ٹھہرو۔ میں نے جواب دیا کہ ایک بار تمھاری خوشی کردی اب نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ سنتے ہی اس کی نرگسی آنکھوں میں آنسو جاری ہوگئے۔ اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ مجھ کو یقین ہے کہ فلاں (ایک حسین لڑکی کا نام لیا جو میری منظورِ نظر تھی) تم سے کہتی تو تم اس کا کہنا کبھی نہیں ٹالتے۔ اس حالت کے دیکھنے سے میرا دل پانی پانی ہوگیا۔ اور میں نے بے قرار ہوکر کہا۔ اب یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک تم خود رخصت نہ کروگی۔

القصہ لیڈی بارل کے ساتھ جو مقامات دیکھنے کا موقع ملا تھا ان میں لندن کا ایک مشہور مکان سین ہاؤس SAIN HOUSE ہے جو ڈیوک شمپلن کی ملکیت ہے اور بادشاہ کا باغ اور لارڈ لنس ڈاؤن LORD LANL DOUN کا مکان اور کتب خانہ جو اس شہر میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے باغات ویڈن کے نواح میں دیکھنے کو ملے۔ جن لوگوں سے لیڈی کلیو کے ذریعہ ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک مسٹر گرہم MR. GRAHAM ہے۔ جو شہر لندن کی عدالت سے تعلق رکھتا ہے اور بہت معزز ہے۔ اس نے میری بہت دلداری کی۔ دعوتیں کیں۔ اس کے دوستوں کے یہاں ناچ کی جو محفلیں ہوتی تھیں ان میں بھی مجھ کو لے جاتا تھا۔ مسٹر گرہم کی ایک بیٹی ہے جو باپ کی طرح خوش اخلاق شیریں زبان، ظریف طبع ہے۔ مسٹر گرہم کے مکان پر سر فرگ ایڈن سے ملاقات ہوئی جو عدالت کے اعلیٰ افسران میں سے ہے۔ بہت ہوشیار اور نہایت لائق مانے جاتے ہیں۔ نہایت خوش اخلاق اور نیک اطوار ہیں۔ مس ہالنڈ جس کا ذکر کیپ ٹاؤن کے حالات میں ہوچکا ہے۔ وہ سر فرگ کی بہن ہیں، اور مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ اس لیے انھوں نے بہت گرم جوشی سے ملاقات کی اور کئی بار دعوتیں کیں۔ اس کی بیوی لیڈی ایڈن بہت خوبصورت اور شیریں زبان ہے۔ اس کا شمار لندن کی منتخب عورتوں میں کیا جاتا ہے۔ میں نے اس کی توصیف ایک غزل

ہو گئی ہے۔

دوسرے جنرل واکسن جو گذشتہ لڑائیوں میں امریکی فوجوں کا افسر رہ چکا ہے۔ میرے کاموں میں مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ تیسرے مسٹر ٹکل، یہ ایک فوجی ڈاکٹر ہے بہت مالدار، ساتھ ہی خوش اخلاق اور متواضع۔ اگر کبھی راہ میں مل جاتا تھا تو مزاج پرسی میں بے حد مبالغہ کرتا اسی لیے اکثر میں اس کو آتا دیکھ کر کترا کر نکل جاتا تھا۔ کھانے میں اتنا تکلف کرتا کہ میں اس کی دعوت اکثر حیلہ بہانہ کر کے ٹال دیتا تھا۔

چوتھے مسٹر چارلس ٹالبٹ Mr clrles tallot جو فہم و فراست میں ممتاز تھا۔ نہایت کشادہ دل اور بلند ہمت، اس نے لندن اور ویڈن کے درمیان ایک نہایت پُرفضا باغ تیار کیا ہے۔ جس میں امیروں کی طرح آرام و آسائش سے سیر کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے باغ میں میری دعوت کی اور نہایت لذیذ پھل کھلائے۔

پانچویں مسٹر لاک Mr. lock یہ عدالت کا ایک معزز عہدیدار ہے۔ اس نے بھی ویڈن کے اطراف میں ایک باغ اور ایک کشادہ عمارت نہایت خوبصورت تعمیر کرائی ہے۔ اس کی بیوی مسز لاک انگریز خواتین میں بہت مشہور اور کہاوتیں کہنے اور فن رقص و سرود میں بے نظیر ہے۔ اس لیے میں نے اس کی مدح میں ایک غزل بھی لکھی ہے۔

چھٹے مسٹر ایڈرج Mr. Edridge مشہور مصور ہے۔ وہ مشہور وزیر مسٹر پٹ اور گورنر بنگال لارڈ ولزلی کا دوست ہے۔ سیاہ قلم تصاویر کھینچتا ہے۔ بعض جگہ رنگ بھی بھرتا ہے۔ جیسے چہرے اور ٹوپی وغیرہ پر۔ اس صنعت میں یہاں کوئی اس کا مقابل نہیں ہے۔ اس نے میری تصویر بھی کھینچی جس میں میری حرکات بھی ظاہر تھیں۔ میں اس کی تصویر کو دوسرے مصوروں کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہوں۔ جنھوں نے لندن میں میری تصویریں بنائی تھیں۔ خاص طور پر مسٹر ڈیوس Mr. Dav is مسٹر نارتھ کٹ Mr. Northt مسٹر جیسٹ jesst مسٹر ورمنٹ [illegible] مسٹر ردلی Mr. Redley ان سب نے بغیر کسی معاوضہ کے میری تصویریں بنائی تھیں۔ اس ملک کے لوگ جو ہم لوگوں کے ہم خیال نہیں ہیں مسٹر نارتھ کٹ کے کام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ اس شہر کے مصوروں میں بہت مشہور ہے۔ ساتھ ہی عقلمند اور نیک بھی ہے۔ اس کی خوراک بہت کم ہے۔ اس کی ہنرمندی میں نے چند تصویروں میں دیکھی جن کی تفصیل بیان کروں تو مبالغہ کیا جائے گا۔

غرض یہ کہ لیڈی بارکل کی خوبیاں احاطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ اس کے حسن دل آویز کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی ہے۔[1]

چون مس بارکل بخوبی کس ندیده   خدا از دست خویشش آفریده

اس کے علاوہ چند غزلیں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ ایک رباعی میں مس بارل اور ڈیوک شمپکن کے باغ کی تعریف کی ہے۔ وہی باغ ہے جس کی زیب و زینت اور نقش و نگار دیکھنے کے لیے بادشاہ اور شاہزادے بھی آتے ہیں۔ اس سیر میں مس بارل بھی ساتھ تھی اور مجھ سے یہ ممکن نہ تھا کہ اس کے حسن کا نظارہ کرنے کے بجائے باغ کی خوبصورتی دیکھوں۔ یہ بات اس کی بھی سمجھ میں آگئی اور وہ کوئی بہانہ کر کے اپنے گھر چلی گئی اور مجھ کو مسٹر کلیو کی ہمراہ وہاں چھوڑ دیا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں اچھی طرح سیر کر سکوں اور فراغت کے بعد مسٹر مسز کلیو کے ساتھ شہر واپس آکر اس کے اور لیڈی بارکل کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ مگر اس گلِ رعنا کے چلے جانے کے بعد مجھے تفریح کا خیال نہ رہا اور سیر بھی اچھی طرح نہ ہو سکی۔

دوسری لیڈی آلفرڈ Alfred Lady زبانِ قلم اس کی تعریف سے عاجز ہے۔ شرافت اور نجابت کے آثار اس کی پیشانی پر آفتاب کی طرح روشن۔ عقل و ادب اس کی ہر حرکت سے نمایاں تھا۔ نہایت رقیق القلب اور خدا پرست ہے۔ کسی مظلوم کا حال یا کسی عاشق کے رنج و ملال کا حال سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود نہایت تیز طبیعت اور سخن فہم ہے۔ بہت کوشش سے میرے اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کرتی اور اس سے خوب لطف اٹھاتی تھی۔ دوستوں کی خوشنودی میں بہت سرگرم رہتی ہے۔ ایک دن مجھ کو ایک تماشا خانہ میں جو اس کے گھر کے قریب کھلا تھا اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کی تصویروں میں بجائے رنگ کے بکری کی باریک جھلی چپکا کر اعضار کی بلندی و پستی نمایاں کی گئی تھی۔ جو قلم کے کام اور ریشم کی کڑھائی سے بنائی گئی تھیں اور عجیب صنعت دکھائی تھی۔ اس سے قبل میں نے جو تصویریں دیکھی تھیں ان سے بہت بہتر تھیں۔ تماشا خانہ کے مالک نے ٹکٹ خریدتے وقت لیڈی الفرڈ کے ہاتھ میں اجازت نامہ دے دیا اور ٹکٹ کی قیمت واپس کر دی۔ جب میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو بتایا گیا کہ یہاں تماشا خانوں میں یہ معمول ہے کہ جو شخص چالیس مرتبہ دیکھنے آتا ہے اس کو اجازت نامہ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ مفت میں تماشا دیکھ سکتا ہے۔ اور لیڈی الفرڈ دوستوں کو تماشہ دکھانے کے لیے اتنی بار آچکی تھی کہ یہ مقررہ تعداد

پورا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے ساتھ جو مقامات دیکھے ان میں رنگہ Raneiagh کا تماشا خانہ، چلسی Chelsea میں سپاہیوں کی رہائشی عمارت، شہر برٹش Burgess میں یوریس میوزیم، اور وہ عمارت جس میں یونان کے پرانے شہروں کے نقشے پتلی لکڑیوں پر بنے ہوئے (جن کو ہندی میں شولہ کہتے ہیں) ہیں۔ یہ سب پہلی بار اسی کے ساتھ دیکھے۔ اس کا شوہر سرولیم الفرڈ شاہی فوج میں کرنل اور ممبر پارلیمنٹ ہے۔ شہر کے مشاہیر اور معززین میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض دست کاریوں میں بھی اُسے مہارت حاصل ہے خاص طور پر مصوری میں۔

خدا تعالیٰ نے لیڈی الفرڈ کو دو پری جمال لڑکیاں بھی دی ہیں۔ ایک کا نام بسی Bessy دوسری کا جنی Jenny جن کی عمریں سولہ اور سترہ سال ہیں۔ ان کے حسن کو دیکھ کر روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی پاک طینتی رنگ روپ کی صفائی اور رخساروں کی تابندگی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فرشتوں کی جنس سے ہیں۔ میرے حال پر دونوں مہربان تھیں۔ ان کے رقص و سرود کا وہ لطف اُٹھایا کہ جس کا مزہ تمام عمر نہیں بھلا سکتا۔ عیش و نشاط کی یہ محفلیں انہیں کے گھر میں ہوتی تھیں۔ رخصت ہوتے وقت مجھ کو بہت سے تحائف دیئے اور خیریت کے خطوط لکھنے کی تاکید کی۔ ان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ زیادہ بات نہ کر سکیں۔

دوسرے کرنل سمس Colonel Symes، جو شاہی ملازمین میں بہت معزز ہے۔ مدتوں ہندوستان کے صوبہ آوا میں سفیر رہا۔ اور سفر ہندوستان کے واقعات پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس زمانہ کی خاص مخفی باتیں بھی لکھی ہیں۔ یہ کتاب عوام و خواص میں بہت مقبول ہوئی۔ مجھ پر بہت مہربان تھا اور ہر طرح کی مدد کرتا تھا۔ جب میں بادشاہ کے حضور میں جاتا تو وہ ترجمانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ مجھ کو تماشا گاہوں میں لے جاتا تھا۔ مشاہیر لندن سے ملاقاتیں کراتا تھا۔ اخراجات کے سلسلے میں کئی بار دو تین ہزار روپیہ اصرار کر کے دینا چاہا جو میں نے ضرورت نہ ہونے کے باعث نہیں لیا۔ جب وہ ہندوستان جانے لگا تو مجھ کو بھی آمادہ کیا کہ ساتھ چلوں۔ میں اس کی محبت کے باعث آمادہ ہو گیا۔ حالانکہ ابھی اچھی طرح لندن کی سیر سے دل نہیں بھرا تھا۔ اس نے جہاز پر میرے لیے کمرہ طے کر لیا۔ جس دن لندن سے ساحل سمندر کی طرف روانگی طے ہوئی تھی، اُس دن لارڈ پلہم Lord Pelham وزیر نے مجھ کو منع کیا اور تمام دوستوں نے مل کر مجھ کو روکا اور اس کو جانے دیا۔ اگرچہ تین سو روپیہ جہاز کے مصارف ملاح کو دے چکا تھا اور اسی قدر روپیہ کرنل سمس نے میرے لیے خرچ کیا تھا۔ اس نقصان کو گوارہ

کرکے ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ کرنل مس کی وجہ سے جو لوگ مجھ سے آشنا ہوئے تھے
ان میں سے ایک لارڈ ہملٹن تھا۔ جو جزیرہ آئرلینڈ میں لارڈ کارنوالس
کا نائب ہے۔ اور اب بھی اسی عہدہ پر فائز ہے۔ اس نے دوبار نہایت پر تکلف دعوت کی اس
کی بیوی لیڈی گرنسٹن نہایت خوش اخلاق اور مہمان نواز ہے۔ دوسرا شخص سر جمز ارل Sir
james earle شاہی طبیب ہے۔ نہایت گرمجوشی اور خوش اخلاقی سے پیش آیا کئی بار اپنے
مکان پر میری ضیافت کا اہتمام کیا۔ کئی دن نواطراف لندن کے باغات کی سیر کرائی۔ اس کی
بیوی لیڈی ارل Earle نے بھی بہت دلجوئی کی۔ اس کے مکان میں بہت سے
اسباب حسن و جمال اور گلہائے بہار نظر آئے۔ ان میں سے ایک مس مرین Miss Maran ہے
جس کے گلزار جمال کو دیکھ کر گلستان جناں بھی شرمندہ ہو۔ اس قامت زیبا کے سامنے
سرو خیاباں بھی شرمائے۔ جس دن سے اس رشک قمر کو دیکھا ہے۔ اس کی صورت زیبا نگاہوں
سے محو نہیں ہوئی۔ اس کے دلربایانہ ناز و انداز اب تک دل میں جاگزیں ہیں۔ اس کی
تعریف میں ایک غزل بھی لکھی۔

دوسری لیڈی شارلٹ lady Sharlette جو روز رمز کی دولہن ہے جو نفنن
طبع اور احباب کی دلجوئی کے لیے ہر دوشنبہ کو اپنے مکان پر ایک محفل ساز و نوا منعقد
کراتی تھی اور اس کے اخراجات خود برداشت کرتی تھی۔ شہر کے شرفاء اور معززین جو گانے
بجانے کے شوقین تھے۔ وہاں جمع ہوتے تھے۔ لیڈی شارلٹ قہوہ، چائے اور حلوا جات
سے سب کی خاطر کرتی ہے اور خود ہر ایک کی تواضع میں لگی رہتی ہے۔ یہ محفل کبھی نصف شب
اور کبھی آخری شب میں ختم ہوتی تھی۔ سر جمز ارل بھی اس محفل میں شریک ہوتا تھا جو خود اس
فن کا ماہر اور شائق تھا۔

تیسرے سر جوزف بنک Sir joseph Bank یہ عمائدین لندن میں بحیثیت فلسفی اور
عالم بہت ممتاز ہے۔ مشہور سیاح کپتان کوک captain cooke کے ساتھیوں میں ہے
اس کے ساتھ تمام کرۂ ارض کا طواف کرچکا ہے اور ہر ملک کی جڑی بوٹیوں اور ان کے خواص
سے خوب واقف ہے۔

ہر یکشنبہ کی رات میں اس کے یہاں شہر کے فلاسفر طبیب اور دوسرے اہل علم جمع
ہوتے ہیں۔ اور اپنے اپنے پیشہ اور ہنر کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ پارٹیاں بنا کر بیٹھتے ہیں

اور اپنی اپنی معلومات اور تجربات ایک دوسرے سے بیان کرتے ہیں۔ بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ ہر جنٹلمن ہر پارٹی میں جا کر اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے کچھ کچھ وقفہ سے چائے قہوہ اور حلوے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس محفل میں شرکت کی وجہ سے میرا تعارف لندن کے بہت سے ماہرین سے ہو گیا اور ان کے یہاں آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوا۔

چوتھے مسٹر سپین۔ یہ شاہی جہازوں کے عملے کا معزز افسر ہے اور شہر قلیم [illegible] میں ایک عالی شان باغ اور مکان بنوایا ہے۔ اسی میں رہتا ہے۔ یہ مقام لندن سے دس میل دور ہے۔ مجھ کو اپنے باغ میں لے گیا اور اچھی دعوت کی۔ لیڈی سپین اور اس کی بیٹیاں دسترخوان پر خوب لوازم مہمانداری بجا لائیں اور مجھ کو رقص کی مجلسوں میں بھی شریک کیا جہاں سو دو سو محذرات اور مرد تہذیب جمع ہو کر شطرنج و گنجفہ کھیلتے ہیں اور مالک مکان سب کی خاطر تواضع کرتا ہے۔

پانچویں مسٹر ولکن، جو مدتوں ہندوستان میں رہا ہے۔ کسی قدر فارسی بھی جانتا ہے اور کمپنی کی سرکار میں تاریخ نویسی کی خدمت انجام دیتا ہے۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں میں بھی شامل ہے۔ اکثر میرے مکان پر آتا تھا اور فارسی دانی کی شہرت کی وجہ سے بعض ان جلسوں میں بھی بلایا جاتا تھا جہاں مجھے مدعو کیا جاتا۔ مگر بہت خود پسند اور سودائی شخص ہے اس لیے اس سے دوستی برقرار نہ رہ سکی۔

چھٹے۔ سر جان ہارس اور کرنل مارس [illegible] دونوں ہندوستان میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ اور اپنے دوستوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وجہ سے وہاں نیک نام تھے۔ ہندوستان سے واپسی کے بعد اسکاٹ لینڈ کے دارالسلطنت [6] میں مقیم ہو گئے ہیں لندن میں بہت کم آتے جاتے ہیں۔ اس لیے ان سے زیادہ ربط ضبط نہ بڑھ سکا۔

ساتویں مسٹر ڈبرٹ Mr. Debrett یہ ایک کتاب فروش تاجر ہے۔ لیکن مرجع خلائق ہے اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایک وزیر مسٹر پیٹ کا مخالف اور ان پر معترض ہے اور ان کے مخالفوں کا طرفدار ہے۔ اس لیے وزیر مذکور کے حمایتی اس سے رابطہ نہیں رکھتے ہیں۔ اور وزیر کے مخالفین اس کے یہاں آمد و رفت رکھتے ہیں۔ بعض شاہی امرا بھی ان میں شامل ہیں۔ اس کی دکان پر لوگوں کا اجماع رہتا ہے۔ مسٹر ڈبرٹ بہت مہمان نواز اور خوش اخلاق ہے۔ اس کی بیوی ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ آنے جانے والوں کے ساتھ شوہر سے بھی زیادہ اچھا برتاؤ کرتی ہے۔ اس نے کئی بار میری دعوت کی اور کھانے کے بعد اپنے ساتھ

تماشا خانوں میں لے گئی اور مہربان بہنوں کی طرح میری دلجوئی کرتی رہی۔ یہ تعلق میری واپسی تک قائم رہا۔ میں نے اس کے ساتھ گرین وچ Greenwich Hospital کی عمارت دیکھی۔ جس کو انگلینڈ کے بادشاہ نے اپنے واسطے بنوایا تھا۔ اور بعد میں جہازی سپاہیوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ اب اس میں ڈھائی ہزار بوڑھے اور اپاہج رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے جوہریوں اور گھڑی سازوں کی کوٹھیاں دکھائیں۔ لیڈی وربٹ کی ایک بارہ سالہ لڑکی سوفیا بہت حسین ہے اور باجا خوب بجاتی ہے۔ مجھ سے بہت مانوس تھی اور اپنے کھیل تماشوں سے میرا دل خوش رکھتی تھی۔

دوسرے مسٹر سیول Mr. Sewell۔ یہ بھی ایک کتب فروش ہے۔ شہر کے اندر ایک مشہور دوکان کا مالک ہے۔ اس کو انگلینڈ میں فارسی زبان کو رواج دینے کا بہت شوق ہے۔ اس لیے میرے آنے کی خبر سن کر بلاواسطہ میرے مکان پر آیا اور دو بار میری دعوت کی، اور اپنے باغ کی سیر کرائی۔ جو لندن سے دس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی مدد سے میں نے لندن اور اس کے اطراف میں بہت سے مقامات کی سیر کی۔ ان مقامات میں ایک زیچ کی عمارت ہے observatory جو کرنل الگزنڈر البرٹ Col. Alexander Aubert کے باغ میں واقع ہے۔ کرنل موصوف علم ہیئت اور فلاحت میں ماہر اور دانشمند شخص ہے۔ اس نے باغ میں میری پرتکلف دعوت کی، انگور، زردآلو، شفتالو نہایت شیریں کھانے کو ملے جو اس وقت تک میں نے لندن میں نہیں کھائے تھے۔ پھر اس عمارت میں جس کو آبزرویٹری کہتے ہیں لے گیا۔ انواع و اقسام کے آلات رصد کھائے اور ان کو کام میں لانے کے طریقے نہایت شرح و بسط سے سمجھائے۔ ایک دوسری عمارت دکھائی جس کا تعلق کیمسٹری سے ہے اور دوائیں تیار کرنے کا کارخانہ جس کو لندن کے ایک مشہور ڈاکٹر نے شہر سے آٹھ میل دور اپنے باغ میں قائم کیا ہے۔ اس ڈاکٹر نے میری دعوت کی اور ہر قسم کی ادویات تیار کرنے کے طریقے، دوائیں کوٹنے اور پکانے کی بھٹیاں اور سونے چاندی اور جواہرات کو قطرہ تیزاب سے گلانے کا طریقہ دکھایا۔ کرہ کے اندر بجلی چمکا دینا۔ ہوا کا پانی اور پانی کا ہوا بنا دینا۔ پارے کو مارنا اور زندہ کرنا۔ ہر دوا کے اجزا علیحدہ کر کے پھر جمع کر دینا اور طرح طرح کے حیرت انگیز تجربات دکھائے جو مجھے ایک شعبدے کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اتنی چیزیں دیکھنے میں آئیں کہ سب کا یاد رہنا بھی دشوار ہے۔

فری میسن کا حال دوسرا جو مقام اس نے دکھایا وہ اسپا گارڈن تھا۔ یہ باغ قرتہ

فری میسن سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کو ناواقف لوگ "فراموشان" کہتے ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ عجیب و غریب واقعات بیان کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو بغیر کسی ظاہری نشان کے پہچان لیتے ہیں۔ اور اپنا راز افشا نہ کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ چاہے جان کا خوف ہی کیوں نہ ہو۔ ان کی باتیں سن کر آدمی بھونچکا رہ جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ لندن کے بادشاہ نے اس گروہ کی کثرت سے خوفزدہ ہو کر اپنے ولی عہد کو حکم دیا کہ وہ اس فرقے کا حال معلوم کرنے کے لیے اس میں شامل ہو جائے۔ شاہزادہ بادشاہ کے حکم کے مطابق اس مکان میں گیا اور واپس آ کر اور تو کچھ نہ بتایا صرف اتنا کہا کہ اس گروہ سے حکومت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

مجھ کو جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ میسن MASSON انگریزی میں معمار کو کہتے ہیں اور فری میسن معنی میں "آزاد" یعنی "معمارانِ آزاد" کا مذہب۔ جب حضرت سلیمانؑ نے مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر شروع کی تو ہر جگہ کے معمار طلب کیے تھے۔ خاص طور پر ممالکِ فرنگ کے معماروں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس جماعت نے ایک جگہ جمع ہونے کے بعد اپنے وقار اور عزت کی حفاظت کے لیے یہ مذہب ایجاد کیا تاکہ ان کے یکجا ہونے کی ایک یادگار بھی باقی رہے۔ اور اس میں شامل ہو کر اپنے آپ کو دنیا کے اور لوگوں کے مقابلہ میں معزز اور محترم ثابت کریں۔ اس کا اثر ان کے پرانے عقیدے پر کچھ نہ پڑے گا۔ چند علامتیں آنکھوں اور انگلیوں کے ذریعہ ظاہر کرنا سکھا دیتے ہیں۔ وہ شخص جب کسی اجنبی کو دیکھتا ہے تو یہی حرکات ظاہر کرتا ہے۔ اگر وہ اجنبی بھی فری میسن ہے تو پہچان کو اس اشارے کا جواب مقررہ اشارے سے دیتا ہے اور اس طرح اپنے کو پہچنواتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس گروہ کے غریبوں اور مفلسوں کی یہ لوگ آپس میں جان و مال سے مدد کرتے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا ہے۔ آپس میں سب بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں۔

جس رات کہ میں "اسپا گارڈن" SPA GARDEN میں گیا۔ اسی رات کو شاہزادہ پرنس آف ویلز کے یومِ ولادت کی خوشی منائی جا رہی تھی۔ اور سارا باغ آتش بازی اور چراغاں سے جگمگا رہا تھا جس سے آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔ جوشِ مسرت میں سب مست ہو رہے تھے۔ اس تقریب پر ہزاروں روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ کیونکہ ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ شاہزادہ اس کا بھائی ہے۔ جو شخص اس مذہب میں داخل ہوتا ہے وہ ہرگز ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آخرکار ایک دن سب ہی اسی مذہب میں داخل ہو جائیں گے۔ جو شخص فری میسن ہونے کے لیے اس باغ میں واقع خاص مکان میں داخل ہوتا ہے۔ اس کو

اندرونی کمرے میں لے کر وہ اشارات سکھائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ہدایت کرتے ہیں اور سختی سے منع کرتے ہیں کہ اس مذہب کی عزت کی خاطر وہ اشارے کسی کو نہ بتائے۔ اور ہمیشہ بری حرکتوں سے پرہیز کرے۔ پھر اس شخص کے اپنے مذہب میں داخلے کی خوشی میں دعوت کرتے ہیں بشرطیکہ وہ کوئی معزز شخص ہو۔ اگر معمولی آدمی ہے تو پھر شراب کے دو تین جام پی کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ شاہزادے اور دوسرے اکابرین کے بھائی بن جانے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وقت ضرورت ان کو امداد و اعانت حاصل ہوگی۔ اس لیے بہت خوش ہوتے ہیں اس جماعت کے لوگ اپنا راز کسی پر ظاہر نہیں کرتے بعض جو حقیقت حال سے واقف ہوتے ہیں اس شرم سے کچھ نہیں بتاتے کہ کچھ ہو تو بیان کریں۔ جو سبک مزاج صاف صاف باتیں ظاہر کر دیتے ہیں ان کو لوگ جھوٹا سمجھتے ہیں۔ مجھ سے بھی سب نے بہت اصرار کیا کہ میں بھی ان کا ہم مسلک بن جاؤں۔ مگر میں نے معذرت کر لی لیکن سلطان روم کا ایلچی اسماعیل آفندی اور اس کا ساتھی یوسف آفندی جو میرے ساتھ سیر کے لیے آئے تھے۔ یوسف آفندی فری میسن کے کمرے میں داخل ہوا۔ باغ کے وسط میں ایک برج تھا جو فانوسوں اور بلوری جھاڑوں سے بھرا ہوا تھا جس کو گانے کا شوق ہوتا وہ اس برج کے اندر جا کر نغمہ سرائی کرتا ہے اور شہزادے کے سازندے جو اس فن میں کامل ہیں۔ اس شخص کے ساتھ باجا بجاتے ہیں۔ وہاں سوائے فری میسن کے کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ باغ میں ہر درخت کے نیچے دس دس، بیس بیس آدمی، شراب و کباب کی محفل جمائے ہوتے تھے۔ اس رات کو میں نے حسن و جمال کے ایسے نظارے دیکھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ پریوں کے دیس میں آ گیا ہوں۔ میرے گرد تماشائیوں کا ہجوم ہو گیا۔ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ میں چند منٹ ان کی پارٹی میں شراب و کباب سے لطف اندوز ہوں۔ میں نے ان کی خوشی کی خاطر قبول کر لیا۔ جس محفل میں جاتا اس میں بہت ہی خوبصورت عورت کے ہاتھ سے جام ملتا تھا۔ اور جب زیادہ پی جانے کے بعد دوسری جگہ عذر کرتا تو پلانے والی خوش جمال خاتون ایسے ناز و انداز سے اصرار کرتی کہ مجبوراً پینا پڑتا۔ یہاں تک کہ اس رات میں مجھے سو سے زیادہ ساغر پیش کیے گئے۔

بہر حال مسٹر سول MR SEWELL کے ذریعہ میری ملاقات بہت سے لوگوں سے ہوئی ان میں سے ایک مسٹر گرگری ہے۔ جو لکھنؤ میں موجود ہے۔ اس کے باپ اور بھائی بہت خوش خلاق ہیں۔ میری خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ دوسرے مسٹر ڈلی فوٹوگرافر جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس نے کئی بار میری دعوت کی تصویر کھینچی۔ اس کی بیوی نہایت خوش ذوق، عفت مآب اور عالی ظرف

ہے۔ اسی لیے اس کو عزت اور شہرت حاصل ہے۔

تیسرے مسٹر شولیر۔ یہ ایک متمول آدمی ہے اور شہزادے کے مصاحبوں میں سے ہے۔ اس کی بیوی نہایت خلیق ہے اور بیٹیاں بہت خوبصورت ہیں۔ کئی بار میری دعوت کی۔ کبھی میں تنہائی سے گھبراتا تھا تو اس کے مکان پر جاکر اپنا وقت ہنسی دل لگی میں گنواتا تھا۔

چوتھے مسٹر اسمتھ SMITH یہ بھی شہر کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ دو بار اپنے مکان پر میری دعوت کی۔

پانچویں مسٹر روسیو ROISSEAU یہ ایک پریس کا مالک ہے۔ یہ کوئی معزز شخص تو نہیں ہے۔ لیکن مجھ سے بڑی محبت سے ملتا تھا اور میری تفریح کے لیے کافی رقم خرچ کرتا۔ اپنی کتابوں کے دیباچہ میں میرا نام بطور یادگار تحریر کرتا تھا۔

چھٹے لیڈی ویلفرڈ کانسٹیبل Lady Welforde یہ اسکاچ قوم کی ایک سن رسیدہ ضعیف خاتون تھی، لیکن طبیعت جوانوں جیسی پائی تھی اور جوانوں کی طرح ہی ہنسی خوشی رہتی تھی۔ نہایت عالی ہمت کشادہ دل خاتون تھی۔ ہر ہفتہ مجلس رقص منعقد کرتی اور سب کو خوب کھلاتی پلاتی تھی۔ جب اس نے میرے آنے کی خبر سنی تو بعض معزز لوگوں کے ذریعہ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اس کے یہاں گیا اور اس سے مل کر بہت محظوظ ہوا۔ موصوفہ کو ذائقہ شناسی میں کمال حاصل ہے۔ اس لیے اس کے یہاں کھانوں کی لذت سے بہت لطف اٹھایا۔ اس خاتون کا ایک مکان شہر اڈنبرا میں واقع ہے۔ موسم گرما میں جب وہاں جانے لگی تو مجھ سے کہا کہ میرے ہمراہ چلو اور میرے مکان پر قیام کرنا۔ دس بیس دن کے بعد لندن واپس چلے آنا۔ میں نے معذرت کی مگر وہ نہ مانی۔ جس روز جانے لگی گاڑی پر سوار ہوکر میرے مکان پر آئی اور زبردستی مجھ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ میں نے قسم کھاکر وعدہ کیا کہ دو ماہ بعد وہاں آکر تمہارے مکان میں ٹھہروں گا۔ اس وعدہ سے مطمئن ہوکر رخصت ہوگئی۔ مگر افسوس یہ اس کی آخری ملاقات تھی۔ کیونکہ دو ماہ بعد جب میں اس کے یہاں جانے کا ارادہ کر رہا تھا اس کی خبر وفات ملی مجھ کو بہت رنج ہوا۔ وہ مرحومہ خاتون اسکاٹ لینڈ کی فطری طبع اور بے وفائی کی عادت سے کوسوں دور تھی۔ واضح ہو کہ انگلینڈ میں میرے اسکاچ دوست انگریزوں سے زیادہ تھے۔ ان میں سے ایک مسٹر جارج جانسن [illegible] تھے جو لکھنؤ میں بخشی گیری کے عہدہ پر مامور تھے۔ اور دس بارہ سال تک میرا ان کا ساتھ رہا۔ دوسرے مسٹر بلین (MR. BLANE) جس سے کرنل ہالی کے

ساٹھ تیس برس پہلے ملاقات ہوئی تھی اور میری وجہ سے اس نے فارسی زبان میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی تھی۔ یہ دونوں متمول اور بااثر تھے۔ اور کپتان رچرڈسن کا ہندوستان سے انگلینڈ تک میرا ساتھ رہا۔ وہ بھی اسکاچ ہے۔ مجھ کو ان لوگوں سے بہت توقعات تھیں کہ یہ انگلینڈ کی سیر و سیاحت میں میری رہنمائی کریں گے۔ مسٹر بلین نے اگرچہ کھانے کی کئی بار دعوت کی لیکن مسٹر جانسن نے اس میں بھی مضائقہ کیا۔ میں نے اسکاٹ لینڈ کے لوگوں میں اثباتِ حقوق کے باوصف صفت اعانت و ہمدردی نہیں دیکھی بجز اس خاتون مرحومہ کے۔

ساتویں کرنل براتوٹ Colonel Barnet جس کا باپ مدراس کی تمام افواج کا جنرل ہے۔ اور یہ خود بھی نظام علی خان آصف جاہ اور بعض دکھنی امراء کے پاس مدتوں رہا ہے۔ اہلِ اسلام کی صحبت پسند کرتا ہے۔ علم کا شائق اور نہایت ہوشمند ہے۔ اس کو مجھ سے ملاقات کا شوق تھا۔ کئی بار نہایت پُرتکلف دعوتیں کیں۔ اور اس کی بدولت مجھ کو کئی مشہور مقامات کی سیر کا موقع ملا۔ ان مقامات میں سے ایک شہر لندن کا شاہی قلعہ ہے۔ دوسرا برٹش میوزیم یعنی سرکاری عجائب خانہ، اس کے اندر تقریباً سو بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ہر کمرہ خاص قسم کے عجائبات کے لیے مخصوص ہے یا کسی خاص مقام کی عجیب و غریب چیزوں کے لیے۔ اس کے اندر حیوانی، نباتی اور حجری عجائبات اس قدر دیکھنے میں آئے کہ سوائے ایک چیز کے کچھ یاد نہ رہا۔ اور وہ دو سینگ تھے۔ جیسے دو سالہ مینڈھے کے ہوتے ہیں۔ یہ سینگ ایک عورت کے سر پر پیدا ہوئے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے سر سے علیحدہ کر کے اس کی تصویر کے ساتھ یہاں رکھے گئے ہیں۔

برٹش میوزیم کی عمارت شہر کے کنارے ایک سمت پر واقع ہے۔ اس کی دیوار کے نیچے چار میل کا مسطح سبزہ زار ہے۔ میدان کے ختم پر تین پہاڑ ہیں جو سرسبز و شاداب ہیں۔ ہر پہاڑ پر ایک شہر نہایت خوبصورت آباد ہے۔ ان میں سے ایک کا نام ہائی گیٹ ہے۔ اس کی ہیئت اتنی خوشنما ہے کہ عجائب خانہ کی سیر میں خلل ڈالتی ہے اور نہیں چاہتی کہ دیکھنے والا اس کے سوا کسی اور مقام پر نظر ڈالے۔

کرنل مذکور کو اس کی بی بی کی شکل میں ایک بے مثال دولت حاصل ہوئی ہے۔ وہ حقیقیہ ہے۔ اس کے حسن و جمال کے نظارے کے لیے اگر دس لاکھ روپیہ صرف کیا جاتا تب بھی کم تھا حالانکہ وہ خود دس لاکھ کا سامان اپنے جہیز میں لائی ہے۔ مگر اس شہرہ کے ساتھ کرنل موصوف

اس کے باپ کے نام کا اپنے نام کے ساتھ اضافہ کرے اور وہ خود شوہر کے باپ کا نام اختیار کرے اس لیے کرنل نے اپنا پرانا نام برنٹن بدل کر پرائیوٹ کر دیا جو اس کے خسر کا نام ہے۔ اور اس رشکِ قمر خاتون نے بھی اپنا نام مسز برنٹن قرار دیا۔ اس نے فرطِ الفت سے شوہر کی تصویر گلے میں حمائل کی ہے اور سینہ سے لگائے رکھتی ہے۔

آٹھویں مسز گارڈن Mrs Gordon ایک پاکیزہ سیرت ضعیف اور بوڑھی خاتون ہے لیکن بہت خوش طبع اور زندہ دل۔ احباب کی ضیافت کا اس کو بہت شوق ہے۔ ہمیشہ لذیذ کھانے تیار کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ اس کا پوتا مسٹر گارڈن ایک خوبصورت جوان ہے اور تحصیلِ علم کا شوقین ہے۔ ہر صبح کو میرے پاس آکر ایک گھنٹہ فارسی پڑھتا تھا۔ اس لیے مسز گارڈن مجھ کو بیٹا کہتی تھیں اور مسٹر گارڈن کی بہن مجھ کو بھائی کہتی تھیں۔ اور عزیزوں کی طرح برتاؤ کرتی تھیں۔ جب میں ان کے یہاں جاتا۔ چائے، قہوہ اور حلوہ جات سے تواضع کرتیں اور ساز و سرود سے دل بہلاتی تھیں۔

مسز گارڈن بہت خوبصورت تو نہیں لیکن عادات و اطوار اور حسنِ اخلاق اور سیر چشمی کے باعث ان کے سامنے حسینوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ ساز و چنگ خوب بجاتی ہیں۔ اس کا ایک چچازاد بھائی کپتان لسک Captain Losack نہایت معزز اور بہادر ہے جو بحریہ میں ایک بڑا افسر ہے۔ ایک بار اس نے فرانس کے قلعہ کے نیچے ایک جہاز پر حملہ کیا اور اس کو گرفتار کر کے لندن لے آیا تھا۔ جس طرح رزم میں ماہر ہے ویسے ہی بزم میں بھی کامل ہے۔ چنانچہ گانا گانے میں اس سے بہتر اور خوش گلو کوئی مرد میں نے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ مسز گارڈن کے باجے کے ساتھ آواز ملا کر گاتا تھا اور نصف شب تک یہی شغل رہتا تھا۔ اس لیے مجھ کو اس گھر میں اور جگہوں کے مقابلے میں زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔

اس مکان میں جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی ان میں ایک جنرل منی General Monly تھے۔ نہایت آزاد منش اور فرانسیسی زبان کے ماہر۔ ان کے ساتھ میں اکثر شطرنج کھیلتا تھا۔

دوسری مس املیا لیٹورا Amlia latoza جس کے حسن و جمال کی تعریف سے زبانِ قلم عاجز ہے۔ مسٹر گارڈن اس شمع رو کا پروانہ ہے۔ میں نے اس کی تعریف میں ایک غزل لکھی تھی اس کا مقطع مسٹر گارڈن کے نام ہے۔

تیسرے مسٹر ہلّی Hallemy جو لندن سے چھ میل دور قصبہ بیوملی میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہیں۔ بہت دوست نواز اور خوش اخلاق شخص ہے۔ اس نے کئی بار اپنے باغ میں لے جاکر میری ضیافت کی۔ اور نہایت اچھے کھانے کھلائے خاص طور پر مسکا اور بالائی جو ہر جگہ سے زیادہ اچھی ہے۔ اس شخص کا ایک بھائی تجارت اور مہاجنی کرتا ہے۔ ایک غیر منکوحہ حسین عورت اس کے پاس رہتی ہے۔

جہاز سازی کا کارخانہ

مسز گارڈن کے ہمراہ اطراف لندن کے بعض تماشا خانوں اور مشہور مقامات کی سیر بھی خوب کی۔ جیسے اسٹرانمی Astronomy یعنی وہ مکان جس میں آفتاب کے گرد ستاروں کی گردش ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا مفصل بیان آگے آئے گا۔ قصبہ ولوچ جس میں جہاز سازی کا کارخانہ ہے۔ اس کی سیر کی۔ وہاں کرنل پیچ Col Peach نام کا ایک شخص مسز گارڈن کا شناسا تھا۔ اس نے میری پُر تکلف دعوت کی اور پورا کارخانہ دکھایا۔ لندن کے تماشا خانوں میں اکثر مسز گارڈن کے ہمراہ جانا ہوتا تھا کیونکہ مسز موصوف کی بڑھی بی بی مذہب کی سخت پابند تھیں۔ وہ نمائشوں اور گانا بجانا کرنے والوں سے پرہیز کرتی تھیں۔

زین مکفرسن Mr. Macpherson یہ گورنر بنگال سر جان مکفرسن کا بیٹا ہے۔ باذوق جوان ہے۔ نہایت نیک خصلت۔ جب میں لندن پہنچا تو یہ خود مجھ سے ملنے آیا اور میری دعوت کی اور کئی بار لندن کے عجائبات کی سیر کرانے ساتھ لے گیا۔ خاص طور پر ڈوری لین" جو تمام تماشا خانوں سے بڑا ہے۔ اور سب سے بڑے گرجا گھر سینٹ پال SAINT PAUL اور ویسٹ منسٹر ایبے Westminster Abbey کی سیر کرائی۔ اور غیرہا اس بھی لے گیا۔

دسویں لارڈ مکارنی Lord Macartney ایک بہت بڑا امیر تومند اور حسین و جمیل شخص ہے۔ ابتدائے جوانی میں روس کا سفیر مقرر ہوا تھا اور اپنے حسن کے باعث ملکہ کا منظور نظر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد عرصہ تک مدراس کا گورنر رہا۔ پھر بنگال کا گورنر نامزد ہو گیا مگر اس نے منظور نہیں کیا اور لندن چلا آیا۔ اس کے بعد چین میں سفیر مقرر ہوا۔ جہاں بہت نیک نامی کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ اس سے میری ملاقات لارڈ اسپنسر کے مکان پر ہوئی۔ اس نے مجھے اپنے یہاں مدعو کیا۔ کبھی کبھی ازراہ مسافر نوازی میرے مکان پر بھی آیا۔ میں نے ہر چند منع کیا کہ آپ زحمت نہ فرمایا کریں۔ مگر اس نے اپنی وضع داری قائم رکھی۔

گیارھویں لارڈ ہرڈوک Lord Hardwicke یہ بھی ایک معزز شخص ہے جو لارڈ
چیمبر لین... ٹویک کے ہم رتبہ ہے۔ یہ لارڈ کارنوالس کے بعد آئرلینڈ کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ چونکہ لیڈی
این بارنٹ کی بہن اس کی بیوی ہے اور لیڈی موصوفہ نے کیپ ٹاؤن سے اپنے خط میں میرے
لیے سفارش لکھی تھی اس لیے وہ مجھ سے ملنے آیا اور کئی بار میری دعوت کی۔ میاں بیوی دونوں
نے خاطر داری میں کوئی کمی نہیں کی۔ موسم گرما میں اس کی بیوی کی دوسری بہن۔ لیڈی مارگٹ فورڈیز
نے مجھ کو لارڈ موصوف کے باغ میں لے جاکر کئی روز مہمان رکھا۔ لارڈ موصوف جب آئرلینڈ کے
حکمران نامزد ہوئے تو انھوں نے بہت چاہا کہ میں دوبارہ ان کے ساتھ آئرلینڈ جاکر ایک ماہ
وہاں رہوں۔ مگر میں نے معذرت کرلی اور جانے پر تیار نہ ہوا۔ اس کے مکان پر مسز مونٹیگو
Mrs. Montagu سے میرا تعارف کرایا۔ جو نہایت گرم جوشی سے پیش آئی۔ اس
نے مجھ کو اپنے مکان واقع پورٹ مین اسکوائر میں مدعو کیا۔ اس کا مکان نہایت خوبصورت ہے
اس بیوہ کی گیارہ اولادیں ہیں۔ مگر اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ لیڈی
موصوف کی ماں بھی موجود ہے۔ اس کا یہ دستور ہے کہ سال میں ایک بار دس بارہ سال کے غریب
و مزدور لڑکوں کی دعوت کرتی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ اس کے خاندان کا ایک لڑکا گم ہوگیا
تھا جس کو ایک غریب لڑکے نے پہچان کر گھر پہنچا دیا تھا۔ اس وقت سے اسی تاریخ پر دعوت
ہوتا ہے اور ہزاروں لڑکوں کی پُرتکلف ضیافت کی جاتی ہے۔

بارھویں مسٹر ہوپ۔ یہ ایک مشہور اور مالدار تاجر ہیں۔ روس اور ہالینڈ میں کاروبار کرتے
ہیں۔ اس کے باوجود کہ فرانس کے انقلاب میں اس کا نصف سرمایہ غارت ہوگیا تب بھی وہ لندن
کے بڑے جنرل مرچنٹ میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیڈی بارنٹ نے اس کو بھی میرے متعلق کچھ لکھا تھا
اس لیے مسز جورنٹ ینگ کے مکان پر اس نے خود ہی مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ اس کے بعد میری
شاندار دعوت کی۔ اتنے اقسام کی شرابیں فراہم کیں کہ اب ان کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ اس کا
ملازم اہل محفل کی تعداد کے لحاظ سے بلوریں ساغر ایک طلائی کشتی میں رکھ کر لاتا۔ پہلے میرے
سامنے پیش کرتا پھر اس شراب کا نام بتاتا اور دوسرے لوگوں کو دیتا وہ ہمیشہ ملاقات بازدید کے واسطے
میرے مکان پر آتا تھا۔

تیرھویں مسٹر سر ولیم اوزلی Sir William Ouseley۔ یہ فوجی افسر تھا۔ فارسی
زبان کا بے حد شائق۔ اس نے بلا استاد کے اپنی ذہانت اور طباعی کے باعث فارسی کتابیں اور

تواعد فارسی جو انگریزی میں موجود تھیں۔ ان کی مدد سے فارسی میں اچھی لیاقت پیدا کر لی اور اس کی اتنی استعداد ہو گئی کہ وہ فارسی کی تاریخی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے لگا۔ البتہ فارسی میں اچھی طرح بات چیت کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ لندن کے لوگ اس کی فارسی دانی کے قائل ہیں۔ اس لیے اس کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کو بہت رغبت سے خریدتے ہیں اور مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ شخص میرے آنے کی خبر سن کر ملنے آیا۔ اس نے کئی بار مجھکو دن کے کھانے پر بلایا۔ لیڈی اوزلی بھی انگلینڈ کی حسین و جمیل عورتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور ناز و انداز اور صباحت و ملاحت میں شہرۂ آفاق ہیں۔ مسٹر ولیم کا ایک کم سن لڑکا بھی ہے، نہایت مہذب اور سعید۔ جس کا نام انھوں نے فارسی زبان سے انتہائی رغبت کے باعث "خاقان" رکھا ہے۔ یہ لڑکا بھی اپنے نام کی مناسبت کے سبب سے میرے ساتھ بہت مانوس تھا۔ جب تک میں اس مجلس میں رہتا وہ لڑکا میرے پاس سے ہٹتا بھی نہیں تھا۔

چودھویں مسٹر چارلس ڈیرس بوٹل Mr. Charles Dayers Botel یہ چھوٹے درجے کے شاہی امیروں میں ہے۔ عرصہ تک ہندوستان میں رہا ہے۔ یہاں بھی وہ میرے پاس آتا جاتا تھا۔ فارسی زبان میں اچھی مہارت رکھتا ہے۔ یہاں پہلی بار میں نے اس کو شاہی دربار میں دیکھا۔ بادشاہ نے مجھ سے گفتگو کے وقت اس کو ترجمان مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے ملنے آیا اور اپنے مکان پر میری دعوت کی۔ کھانے کے بعد اس کی سلیقہ مند لڑکیوں نے ارگن باجا بجایا جس سے مجھ کو بے حد لطف حاصل ہوا۔

پندرھویں ڈاکٹر کرشنڈ Dr. Kirshord پہلی بار میں نے ان کو سر جوزف بینک کے یہاں دیکھا تھا۔ وہ خود بھی ہر ہفتہ اپنے مکان پر ایک جلسہ کرتا تھا۔ اس میں مجھ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ کئی بار میں وہاں گیا۔ یہ ایک سودائی مزاج اور ہوسناک شخص ہے۔ لیکن میری رہنمائی بہت کرتا تھا۔ اس کے ذریعہ چند اور لوگوں سے بھی تعارف ہوا جن میں سے ایک مسٹر ہمنٹا ہے جس نے قصبہ پڈنٹن Pudentun کے پڈنٹن ہاؤس PudenTun House میں میری پرتکلف دعوت کی اور یہ دعوت بعض ارباب حسن و جمال کی موجودگی کے باعث بہت پرتکلف رہی۔ ڈاکٹر موصوف نے بھی کئی بار دعوت کی۔ ایک بار اس کا بیٹا جو انڈیا ہاؤس میں منشی ہے اور مسٹر ڈنڈاس کا ماتحت ہے اور اپنے آپ کو باپ سے زیادہ معزز سمجھتا ہے۔ مجھ سے کھانے کی میز پر کہنے لگا کہ ہندوستانی بے رحمی اور قساوت قلبی میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا بعض ایرانی بھی اس صفت میں بدنام ہیں۔ میری اصل و نسل بھی وہیں کی ہے۔ لیکن ہندوستانیوں

کے متعلق لوگوں کا خیال اس کے برعکس ہے۔ کہنے لگا تم کو معلوم نہیں کہ اورنگ زیب نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ کیا کیا۔ اور اسی طرح اورنگ زیب کے بیٹوں نے آپس میں خونریزی کی۔ میں نے جواب دیا کہ بادشاہوں کے طریقے اور ملک کے قاعدے اور ہیں۔ ان پر سب باشندوں کو مورد الزام قرار نہیں دینا چاہیے۔ اگر تمہارے ملک میں ولی عہد کی موجودگی میں دوسرے شاہزادوں کو سلطنت سے محروم کرنے کا قانون نہ ہوتا تو ہندوستان سے بڑھ کر یہاں فساد برپا ہوتے۔ وہ پھر لگا کہ وہاں کے ڈاکوؤں کی نسبت کیا کہتے ہو، جن کا حال کلکتہ اخبار میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ میں نے کہا وہ بھی اس ملک کے ڈکیتوں سے زیادہ سخت اور منہ زور نہیں ہیں۔ اگر میں بھی انہیں پر سب انگریزوں کا حال قیاس کر لوں تو تجھ کو بھی ان میں شامل کرنا پڑے گا۔ اس بات سے لاجواب ہو کر ایک اور بات نکال دی جو بے اصل تھی اور صرف کج بحثی اور مباحثہ پر مبنی تھی۔ میں نے اس جھنجھٹ کو ختم کرنے کی غرض سے کہا کہ اب میں قبول کرتا ہوں کہ جو برائیاں تو نے بیان کیں وہ بے شک اس ملک میں بہت ہیں۔ کیونکہ تم پر صرف سر رشتہ محرومی میں رہ کر ان باتوں کا اثر ہو گیا ہے کہ تم اس شخص کی بات نہیں مانتے جس کا تجربہ تم سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اور بے خانماں مہمان کے ساتھ بحث کرتے ہو۔ حاضرین جلسہ ہنسنے لگے اور سب نے اس کو برا بھلا کہا۔

سولہویں، سر چارلس ریچ۔ یہ نہایت عقلمند اور مشہور آدمی ہے۔ انگلستان کے مالدار لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لندن سے ستر میل دور اس نے ہیمپشائر میں ایک لاجواب باغ لگوایا ہے۔ اور یہاں میرے پرانے دوست مسٹر ٹیس کے ذریعے سے مجھ سے ملنے آیا اور چند مرتبہ میری دعوت کی۔ اس کی بیوی لیڈی ریچ لندن کی مشہور عورتوں میں سے ہے۔ خدا نے اس کو دو پری پیکر لڑکیاں عطا کی ہیں۔ دونوں میری خاطر داری میں مصروف رہتی تھیں۔ ان کے حسن و جمال نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔

"سترہویں": مسٹر بروس .Mr. Bros. یہ لندن کے عمائدین میں شمار ہوتا ہے استنبول میں انگلینڈ کے سفیر لارڈ الگن کا بھائی ہے۔ اس کی ماں لیڈی بروس ولی عہد کی لڑکی شہزادی شارلٹ کی اتالیق ہے۔ چونکہ اس شہزادی کے علاوہ ولی عہد کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس لیے اس ملک کے قانون وراثت کی رو سے وہ لندن کے تخت شاہی کی وارث ہوگی۔ اس لیے لندن کے لوگ لیڈی بروس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ مسٹر بروس ہندوستان میں عرصہ تک رہا ہے۔ اور فارسی زبان سے خوب واقف ہے۔ جب میں لندن پہنچا تو بغیر کسی توسط کے مجھ سے ملنے آیا اور

ہمیشہ نہایت اخلاق و مہربانی سے پیش آتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد وہ اپنے بھائی سے ملنے کے لیے استنبول کے راستے سے ہندوستان جانے لگا تو مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں ابھی سیر و سیاحت سے سیر نہیں ہوا تھا اس لیے معذرت کر لی۔

اٹھارویں مارکوئس ٹونز ہینڈ MARQUESTONS HAND یہ لارڈ کارنوالس سے پہلے آئرلینڈ کا گورنر تھا۔ ایک معمر اور جہاں دیدہ شخص ہے۔ دیانت داری شہرۂ آفاق ہے۔ باوجود مدّت دراز تک بڑے عہدوں پر فائز رہنے کے دولت مند نہیں ہے اور اوسط درجہ کی زندگی بسر کرتا ہے۔

انیسویں "کرنل توبل" یہ بادشاہ کا ذاتی ملازم ہے۔ نہایت خوش اخلاق اور وضع دار آدمی ہے لندن سے سترہ میل دور ڈنبرا کے راستے میں اس کا ایک بہت خوبصورت باغ ہے۔ اس کے اندر شاندار کوٹھی ہے۔ وہ لندن میں مسٹر جانسن کے مکان پر صرف مجھ کو صرف دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ اس کے بعد برابر مجھ سے ملتا رہا اور تماشا خانوں میں ساتھ لے جاتا تھا۔

بیسویں "جنرل مارگن" GENERL MARGEN یہ ہندوستانی فوج کے بڑے افسروں میں سے تھا جس زمانہ میں زبان شاہ نے لاہور پہنچ کر مشرقی ہندوستان کا عزم کیا اس وقت جنرل موصوف اس فوج کا افسر مقرر ہوا جو شاہ ابدالی سے لڑنے کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ یہ بہت نرم دل نیک کردار اور باخوش اخلاق آدمی ہے۔ لندن میں اس کا شاندار مکان ہے جس میں وہ اپنی بیوی مسز مارگن کے ساتھ آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی بیوی لندن کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے کئی بار میری دعوت کی۔ اور ہمیشہ ملاقات بازدید کے لیے آتا تھا۔ اللہ نے اس کو ایک حسین لڑکی دی ہے جو حسن و جمال موزونی قامت، جامہ زیبی اور شیریں زبانی میں ممتاز ہے۔ میں نے جن تیس چالیس مہ جبینوں کو منتخب زمانہ قرار دیا ہے ان میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے ستاروں میں ماہ کامل۔ اس کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں شہر لندن کی تعریف ہے اور اس مہ جبین کا ذکر بھی ہے۔

اکیسویں مسٹر بٹ لف BUT LIFE یہ لندن کا مشہور سوداگر ہے اور مہاجنی بھی کرتا ہے۔ نہایت سلیقہ مند، تیز فہم شخص ہے۔ ولی عہد لندن کا مصاحب خاص ہے۔ مجھ سے وہ مسٹر بلین کے مکان پر بڑے تپاک سے ملا۔ اس کے بعد میرے مکان پر آکر مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور دھوم دھام سے میری دعوت کی۔ اکثر تماشا خانوں کی سیر کرائی۔ خاص طور پر ولی عہد کا محل اچھی طرح

دکھایا جس میں کتب خانہ، اسلحہ خانہ، شاہزادی شارلٹ کے کھیلنے کی جگہ، ولی عہد کی بیگم کی رہائش گاہ وغیرہ، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شاہزادہ نے صرف ہماری سیر کی وجہ سے مکان چھوڑ دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ دو تین جگہ کھانے کی میزیں سجادی جائیں تاکہ جہاں رغبت ہو وہاں اطمینان کے ساتھ کھانا کھالیں۔

بائیسویں کرنل مکنزی CAL. MECANZEY یہ مدّت دراز تک ہندوستان میں رہا ہے۔ فارسی دان ہے۔ مجھ سے ملاقات کی اور برابر آمد و رفت جاری رکھی۔ کئی بار پرتکلّف دعوتیں کیں۔

تیئیسویں مسٹر مکڈانلڈ M. ME ADANLDANDA یہ میرے پیارے دوست اور قدیم کرم فرما کرنل مکڈانلڈ کا لڑکا ہے صورت و سیرت اور تمام حرکات و سکنات میں اپنے باپ سے مشابہ ہے ہندوستان میں پیدا ہوا اور بچپن میں ہی لندن آکر اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائی فن طب میں مہارت حاصل کی اور اپنے مکان کے نیچے ادویات کی دوکان کھول لی ہے۔ اس کاروبار میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔ وہ برابر میرے پاس آتا رہتا تھا اور ہر کام میں میرا معاون تھا اکثر دعوتیں بھی کرتا تھا میں ضرورت کے وقت ہر دوا اس کے دواخانہ سے منگوالیا کرتا تھا۔ وہ نہ تو مجھ سے معالجہ کی فیس لیتا نہ دوا کی قیمت۔ مجھ سے کہتا تھا کرنل میکڈانلڈ نے دو ہزار کی ہنڈی اس لیے بھیجی ہے کہ تم کو ضرورت کے وقت دیدوں۔ بہت اصرار کرتا تھا کہ میں لے لوں۔

چوبیسویں مسٹر کرسٹیانا MR. CRESTIANA کرنل میکڈانلڈ کا بہنوئی اور بڑا مالدار شخص ہے۔ ولی عہد انگلستان کے مصاحبین میں ہے شہزادے کے لیے لباس جواہرات اور ضرورت کی چیزیں فراہم کرتا ہے۔ اس کے مکان پر اور لوگوں کا سامان بھی نیلام ہوتا ہے۔ ایک دن مجھ کو اپنے مکان پر سامان دکھانے کے لیے لے گئے۔ اور چیزوں کے علاوہ چھ لاکھ روپیہ کی تصویریں تھیں۔ دو روز بعد جب میں گیا تو ایک بھی نہ تھی سب فروخت ہو چکی تھیں۔ کرنل میکڈانلڈ کی مجھ سے دوستی کا حال سن کر بہت خلوص سے پیش آیا۔ دعوت بھی کی چونکہ اس کی بیوی بہت مغرور ہے اس لیے آمد و رفت قائم نہیں رہی۔ اور میکڈانلڈ بھی اسی وجہ سے پھوپی کے پاس بہت کم جاتا ہے۔

پچیسویں مسٹر ڈوسی MR. DUSY جو عدالت کے حاکم ہیں۔ ان سے سر جوزف بنک کے یہاں تعارف ہوا۔ پھر وہ ملنے کے لیے میرے یہاں آئے مجھ کو اپنے مکان پر لے گئے یہاں میں نے ایرانی و ہندوستانی مصوّروں کی بنائی ہوئی وہ قیمتی تصویریں دیکھیں جو ہندوستانی امیروں

کی تباہی کے بعد انگریزوں کے ہاتھ آئی تھیں۔ یہ تصویریں انگلستان کے مصوروں کی تیار کی ہوئی تصاویر سے بہت اچھی تھیں۔

ہندوستانی اور ایرانی تصاویر

یہاں جو تصویریں میں نے دیکھیں ان میں ایک خمسہ نظامی کہا بہت خوش خط اور مصور تھا جس کی پشت پر نواب شیر جنگ مرحوم کی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہ کتاب محمد میاں نے ان مرحوم کے پاس دیکھی تھی۔ وہ اس کو جان کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ دوسری کتاب "شاہنامہ فردوسی" باتصویر۔ یہ ایران کے ماہر مصوروں کی نازک قلمی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس طرح کے اکثر ٹکڑے اور کتبے مسٹر بشتن اور مرزا گرگ ایڈن کے مکانوں پر بھی دیکھے جو چوکھٹوں میں آویزاں تھے ان کو دیکھ کر بہت عبرت ہوئی۔

اس کے علاوہ شاہی کتب خانہ میں ایرانی اور ہندوستانی مصوروں کی صناعی کے بہت سے شاہکار دیکھے۔ ان میں ایک "شاہجہاں نامہ" تھا۔ جس میں مصوروں نے شاہجہاں بادشاہ کی رزم و بزم کی تصویریں بہت صحیح اور عمدہ بنائی تھیں۔ یہ کتاب دہلی میں آصف الدولہ کے ہاتھ آئی تھی اور وہ اس کو بڑی احتیاط اور قدر سے اپنے پاس رکھتا تھا۔ بنگال کے گورنر سر جان شور نے آصف الدولہ سے لیکر بادشاہ انگلینڈ کی نذر کی تھی۔

چھبیسویں "مسٹر ڈانیل" یہ مصور ہے جس نے آصف الدولہ کے جلسے کی تصویر کھینچی ہے جس میں مسٹر ہیسٹنگز اور دیگر حاضرین دربار بھی نظر آتے ہیں۔ وہ مجھ سے ملنے آیا۔ مجھ کو اپنے یہاں مدعو کیا۔

اس کے مکان پر تاج محل اور ہندوستان کی اکثر مشہور عمارتوں کی تصویریں دیکھیں۔ لندن کے جو دوست کبھی ہندوستان نہیں آئے ہیں۔ یہاں کے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں کوئی چیز قابل دید نہیں ہے۔ ان کو یہ تصاویر دیکھ کر ہندوستان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسٹر ڈانیل نے "سیاہ قلم تصاویر" کا ایک لفافہ مجھ کو دکھایا۔ جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

ستائیسویں مسٹر ہاکر Mr. Haeez جو مشہور مصور ہے اور پرنس آف ویلز کے متوسلین میں ہے۔ مجھ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ مسٹر ڈانیل کے ذریعہ اس سے ملاقات ہوئی۔ اس نے نہایت پرتکلف دعوت کی اور مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے بیٹے کو فارسی زبان سکھاؤں اور اس کے لیے معقول معاوضہ کی پیشکش کی۔ مگر میں لندن کی تفریحات اور احباب سے ملنے ملانے

کے باعث عدیم الفرصت تھا اور وہ لڑکا بھی لاابالی تھا اس لیے یہ خدمت انجام نہ دے سکا۔ اسی لیے مسٹر ہاکر سے تعلقات برقرار نہ رہ سکے۔

اٹھائیسویں • مسٹر برٹن یہ لندن کے مشہور لوگوں میں ہے۔ اس کا مسکان پورٹ اسکوائر میں واقع ہے۔ جہاں ہمیشہ "ڈرونٹ" کے جلسے منعقد کیا کرتا ہے۔ اس کے یہاں میں نے اس فرانسیسی شخص کو دیکھا جس کے گھر میں نپولین بونا پارٹ بادشاہ فرانس نے پرورش پائی تھی۔ لیکن اب اس کے خوف سے وطن چھوڑ کر لندن میں رہتا ہے۔ ایسے ہی جنرل "ڈروبائین" کا خسر بھی جلاوطن فرانس کے مقتول بادشاہ کا وزیر تھا۔ اسی طرح ہالینڈ کے بادشاہ سے وہیں ملاقات ہوئی جو اپنے ملک سے بھاگ کر لندن میں پناہ گزین ہے۔

انتیسویں • مسٹر اسٹریچی یہ ہندوستان میں مختلف عہدوں پر مامور رہا ہے۔ عرصہ تک مدراس میں ترجمانی کے عہدہ پر کام کرتا رہا۔ فارسی ایرانی لہجہ میں بولتا ہے۔ لیکن صاف بناوٹ معلوم ہوتی ہے۔ زبانِ فارسی جاننے کی وجہ سے براہ راست مجھ سے ملنے آیا اور کئی بار مری دعوت کی۔

تیسویں سر رابرٹ چیمبر یہ مدتوں کلکتہ کی عدالت کا حاکم اعلیٰ رہا ہے۔ اس نے سر ولیم اوزلی کے ذریعہ مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ چونکہ بیماری اور ضعف کی وجہ سے سفر آخرت پر مستعد ہے۔ زیادہ ملاقاتیں نہ ہو سکیں۔

اکتیسویں مسٹر ڈکریل یہ بھی ہندوستان میں برسوں رہا ہے کچھ عرصہ پورنیہ کا حاکم رہ چکا ہے۔ اسی زمانہ میں وہاں کے شرفا میں سے ایک عورت اس کے ہاتھ لگ گئی۔ جس سے کئی اولادیں ہوئیں۔ جب وہ ولایت واپس ہوا تو اولاد کی محبت میں وہ عورت بھی ساتھ چلی آئی۔ میرے آنے کی خبر سن کر اس نے مسٹر جانسن کے ذریعہ ملاقات کا شوق ظاہر کیا۔ میں اس کے یہاں گیا چونکہ وہ عورت گوری چٹی ہے اور بیس سال سے اس ملک میں مقیم ہے اس لیے کسی بات میں وہ انگریز لیڈیوں سے کم نہیں ہے۔ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ اس کے لڑکے بالکل یورپین معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ مسٹر ڈکریل پر کچھ جنون کا اثر ہے۔ اس لیے میں دوبارہ اس کے یہاں نہیں گیا۔ اور یہی حالت نور بیگم کی ہے جو جنرل ڈو کے ساتھ یہاں آئی ہے اور ہر بات میں زنانِ فرنگ سے مشابہ ہے۔ مجھ کو دیکھ کر بیحد اظہار مسرت کیا اور نہایت گرم جوشی سے ملی۔ ایک خط اپنی ماں کے نام لکھ کر مجھ کو دیا اور کہا کہ جب تم لکھنؤ جاؤ تو یہ خط اس کو

دے دینا۔ اور کبھی کبھی اس سے ملتے رہنا۔ جنرل ڈو لے جب اس عورت سے شادی کی ہے اس کو ایک علیحدہ مکان لے کر رکھا ہے اور پندرہ سو روپیہ سالانہ اس کو لباس و پوشاک کے لیے دیتا ہے۔ اور بیگم کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ دونوں اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور جب لندن آتے ہیں تو اپنی ماں کے پاس رہتے ہیں۔

بتیسویں مسٹر ملزدن — نہایت خوش طبع اور شوقین مزاج آدمی ہے اور ڈیسپول اسٹریٹ میں اس کا شاندار مکان ہے۔ بلا تکلف کسی ذریعہ کے بغیر مجھ سے ملاقات کی اور کئی بار کھانے پر بلایا۔ اس کے دوستوں کے یہاں جہاں کہیں دعوت ہوتی یا گانے بجانے کا جلسہ ہوتا وہاں مجھ کو ضرور ساتھ لے جاتا۔ میری تفریح اور دل لگی کا بہت خیال رکھتا تھا۔

تینتیسویں مسٹر ٹوونڈ — یہ لندن کے دولت مندوں میں سے ہے۔ سینٹ جیمز اسٹریٹ میں اس کا خوبصورت مکان ہے۔ اس مکان کے نیچے چینی کے برتنوں کا کارخانہ ہے جس کی مثال پورے شہر میں نہیں ہے۔ شہر کی معزز خواتین وہاں خریداری کے لیے آتی ہیں اور چائے اور کافی کے برتن اور چینی کے بنے ہوئے کھلونے خوب فروخت ہوتے ہیں۔ موصوف نے مسٹر جانسن کی معرفت مجھ سے ملاقات کر کے میری دعوت کی اور مراسم مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ جب میں خشکی کے راستے سے واپسی کے سفر کا ارادہ کر رہا تھا تو اس نے مسٹر جانسن کے ذریعہ مجھ کو اس پر آمادہ کیا کہ بغداد سے بصرہ جانا ملتوی کر کے اس کے ہمراہ ایران جاؤں۔ اس سفر کے سب اخراجات وہ برداشت کرے گا۔ دو دن تک سایہ کی طرح میرے ساتھ لگا رہا۔ اتفاق سے انہیں دنوں اس کا ایک شناسا سفر سے واپس آیا تو اس نے ایران کے سفر کی دشواریاں اور مشکلات بیان کیں۔ اس لیے اس نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

چونتیسویں کرنل ہاسرن — یہ پہلے ہندوستان میں اپنی پلٹن کے ساتھ الٰہ آباد میں تعینات تھا۔ اس نے پرگنہ اریل اسماعیل بیگ سے اجارہ پر حاصل کیا تھا اور اس حیلہ سے علاقہ بندیل کھنڈ میں دست درازی شروع کر دی تھی اور اس علاقہ کا کچھ حصہ اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ کئی لڑائیوں میں بندیل کھنڈ کے راجاؤں کو شکست دے چکا تھا۔ لیکن مسٹر ہسٹنگز نے اس کارروائی کو خلاف مصلحت خیال کر کے اس کو روک دیا اور نائب وزیر حیدر بیگ نے اس پر قابو پا کر اریل کی اجارہ داری سے معزول کر دیا۔ کرنل بہت ناراض ہو کر وطن واپس آیا۔ اب بہت مالدار ہے اور ایک پرفضا باغ اور زمین خرید کر آرام سے رہتا ہے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کرتا ہے

اپنے خسر سے ملنے جاتا ہے جو نوبت شاہی میں ایک بڑا افسر ہے۔ چونکہ اس نے میرا نام ہندوستان میں سنا تھا اس لیے بہت خوش ہو کر مجھ سے ملنے آیا اور اپنے مکان پر لے جا کر مسز اسپرن سے ملاقات کرائی۔ متعدد بار پُرتکلف دعوتیں کیں۔ رات کی مجالس رقص و سرود میں مجھ کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ آغاز ملاقات سے آخر وقت تک میں اس کی خوش مزاجی سے بہت خوش رہا۔ اس کی بیوی کی تعریف میں ایک غزل بھی لکھی۔

پینتیسویں "مسٹر پلول" یہ شہر لندن کے علما اور فضلا میں شمار کیا جاتا ہے۔ مسٹر جانسن کے گھر پر جب اس سے پہلی بار صاحب سلامت ہوئی تو اس نے مجھ سے ملنے کی بہت خواہش ظاہر کی۔ میرے مکان پر آیا اور مجھ کو اپنے یہاں بلایا۔ جب تک میں لندن میں رہا اس کے مراسم اخلاق میں فرق نہیں آیا۔

چھتیسویں "مسٹر سوٹن" یہ ایک نوجوان طالب علم ہے۔ نہایت ذہین اور سمجھدار۔ فارسی زبان کی تحصیل کا اس کو بہت شوق ہے۔ فارسی اشعار کے مضامین سمجھ کر بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ کپتان رچرڈسن کے ذریعہ مجھ سے ملنے آیا اور فارسی پڑھانے کی درخواست کی۔ میں چونکہ آٹھ بجے کے بعد ناشتہ سے فارغ ہو جاتا تھا اور یہ وقت وہاں کے معززین کے سونے کا ہوتا ہے اس لیے اسی وقت تھوڑا سا وقت خالی رہتا تھا یہی میں نے اس کے لیے مقرر کر دیا۔ وہ اتنا شوقین تھا کہ کبھی ناغہ نہ کرتا تھا۔ اکثر بغیر منھ دھوئے اور ناشتہ کیے چلا آتا تھا۔ اس کا یہ شوق دیکھ کر میں نے اس پر توجہ زیادہ کی اور ہندوستان واپس روانہ ہونے تک اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور اس نے فارسی میں اچھی استعداد حاصل کر لی اور اس نے پہلے جن استادوں سے غلط طریقے پر پڑھا تھا اس کی اصلاح بھی ہو گئی۔ امید ہے کہ جو لیاقت اس کو حاصل ہوئی ہے وہ انگریزوں میں سے کسی کو کم ہوئی ہوگی۔

سنتیسویں مسٹر رنٹن، یہ ایک ذی شعور، نیک اطوار جوان ہے۔ اس کا باپ شہر کا مشہور سوداگر ہے۔ وہ مسٹر سوٹن کی وساطت سے میری ملاقات کو آیا۔ کبھی کبھی فارسی کے درس میں بھی شریک ہوتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی بار پُرتکلف دعوتیں کیں۔ چونکہ لندن کے ایک تماشہ خانہ میں اس کا حصہ تھا۔ اس لیے اکثر ایک دو ٹکٹ لا کر دیا کرتا تھا۔

ہندوستان کے انگریز دوستوں میں میرے پرانے دوست مسٹر رچرڈ جانسن ہیں۔ وہ لندن میں ایک ذی اعتبار ساہوکار ہیں۔ مسز جانسن بھی بہت عقلمند اور سلیقہ شعار ہیں۔ ہمیشہ شوہر کو رضامند رکھتی ہیں۔ مسٹر جانسن نو ماہ لندن میں رہتے ہیں اور تین ماہ ہیمپشائر میں قیام کرتے ہیں۔ لندن پہونچنے کے بعد انھوں نے میری نقد رقم کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ میں ان سے لے کر خرچ کرتا تھا۔ اپنے سامان کا صندوق بھی انھی کے مکان پر رکھا تھا۔ اس لیے کرایہ کے مکانوں میں بے کھٹکے بسر کرتا تھا۔ وہ اس ملک کے طور طریقے سکھانے میں بھی میری مدد کرتا تھا۔ میں اس کے مکان کو اپنا خانۂ بے تکلف سمجھ کر زمانی کشی کھانے تیار کرتا تھا۔ یہاں گانے بجانے والے بھی اچھے اچھے ملے۔ جن میں سے ایک لیڈی کہلشن ہے جو موسیقی کے نامور استادوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اور اپنی آواز کے سامنے محسن داؤدی کو بھی ہیچ خیال کرتی ہے۔ کئی برس اس نے اٹلی میں اس علم کی تحصیل میں صرف کیے اور کافی روپیہ خرچ کیا۔ ہمیشہ موسیقی کے استادوں میں سے ایک استاد کو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ ایک مصرعے میں دس راگنیاں تبدیل کر دیتی ہے۔ تال سر اس خوبی سے ادا کرتی ہے کہ سننے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا گانا تاثیر سے خالی ہے۔ میں نے اس کے استاد کا گانا بھی سنا جو بڑا اچھا گلے باز اور خوش آواز تھا۔ تانیں لینے میں بڑی خوبی سے راگنی کو بدل کر پھر اصل مقام پر آتا تھا۔ یہ بات میں نے منظور خاں لکھنوی کے علاوہ اور کسی میں نہیں دیکھی۔

اڑتیسویں "مسٹر گشٹن" یہ شخص بمقام ہیمپشائر ایک پرفضا باغ کے اندر خوبصورت مکان میں رہتا ہے اور نہایت عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا ہے۔ کبھی کبھی تنہا لندن بھی چلا آتا ہے۔ مجھ سے بڑے اخلاص و محبت سے ملا اور خوب مہمان نوازی کی۔ پرانے دوستوں کو جو برتاؤ کرنا چاہیے تھا وہ اس نے کیا اور اخراجات کے لیے بھی اعانت کی کوشش کی۔

انتالیسویں" لارڈ ٹمنٹ   جو ہندوستان میں سرجان شور کے نام سے مشہور ہے اور گورنر بنگال رہ چکا ہے۔ میرے آنے کی خبر سن کر مجھ سے ملنے آیا اور خوب مہمان نوازی کی۔ اس کے علاوہ مسٹر ایوز   جو برسہا برس کمپنی کا وکیل رہا ہے ملا۔ اسی طرح میجر مارسنگ اور کرنل وڈ بھی ملے جو ہندوستانی شناساؤں میں سے ہیں۔ آج کل یہ سب فارغ البالی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ لوگ ملے تو

گرم جوشی سے مگر کسی نے دوستی کا خیال نہ کیا۔

اب وقت آگیا ہے کہ میرا یہی باتیں لکھنے والا قلم اس تذکرہ کو ختم کرے اور لندن اور انگلینڈ کی خصوصیات پر روشنی ڈالے اور اس کے ضمن میں امرا و شاہی اور سلطنت کے ارکین اور وہاں کے دستور اور عام حالات کا ذکر بھی کرتا جائے۔

انگریزوں ملک کے جغرافی حالات اور انگریزوں کے علوم وفنون اور معاشرت کا حال

انگلینڈ کی زمین اکثر کوہستانی ہے۔ اور بعض جگہ مسطح ہے۔ لیکن دونوں قسموں میں پتھر کے ساتھ مٹی بھی ملی ہوئی ہے۔ یہ زمین چھتے دار گھانسوں اور کیڑے مکوڑوں کی پیدائش کے قابل نہیں ہے جو زراعت کے لیے نقصان رساں ہوتے ہیں۔ اس لیے تھوڑی سی جوتائی اور کھدائی کے بعد زمین زراعت کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ بارش کثرت سے ہوتی ہے لیکن اس میں شدت نہیں ہوتی اس لیے وہاں کی زمین سخت نہیں ہوتی اور اس کی ملائمت میں فرق نہیں آتا۔ درخت جلد جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ اور ساری زمین کے مقابلے میں اس پتھریلی زمین میں زیادہ شاداب رہتے ہیں۔ اور پھل کثرت سے دیتے ہیں۔ اس ملک کے پھل دوسری جگہوں سے زیادہ نازک اور تروتازہ اور لذیذ ہوتے ہیں۔ چنانچہ سیب کے بہت سے پرانے درخت دیکھنے میں آئے جو آم کے درخت کے برابر تھے۔ اور پتوں کی طرح پھلوں سے لدے ہوئے دکھائی دیتے تھے عام طور پر مکانات کے تہ خانوں کی پشت پر جو صحن سڑک یا گلی کی جانب چھ سات گز لمبا اور دو تین گز چوڑا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس پر پتھر کا فرش ہوتا ہے مگر فرش کا ایک پتھر نکال کر اس جگہ انگور کی بیل لگا دیتے ہیں اور دیوار میں کھونٹیاں گاڑ کر چمڑے کے تسموں کے ذریعے بیل کو دیواروں پر پھیلا دیتے ہیں۔ موسم بہار میں اس قدر پھل آتے ہیں کہ ایک خاندان کے واسطے کافی ہوتے ہیں ایک خوشہ تین سیر سے بھی زیادہ وزن کا ہوتا ہے۔ میدانوں میں بنفشہ اور بعض خودرو پھول پیدا ہوتے ہیں۔ باغات بکثرت ہیں اور رنگارنگ پھولوں اور ہندوستان اور ایران کے درختوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن کی تفصیل باعث طوالت ہے۔ ہر قسم کا پھول کئی کئی رنگ کا ہوتا ہے۔ خاص طور پر نرگس۔ سوسن۔ نسترن۔ گلِ ہزارہ اور سادہ جو سفید، گلابی، زرد اور سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ ان پھولوں کو ایک خاص صنعت سے قبل از وقت شگفتہ کرتے ہیں اور چینی اور شیشہ کے گلدانوں میں سجا کر فروخت کرتے ہیں۔ گل فروشوں کی دکانوں کا نظارہ بڑا دلکش ہوتا ہے ممکن نہیں تھا کہ جب کبھی ادھر سے گزرا ہوں اور وہاں نہ ٹھہرا ہوں۔ یہاں اکثر پھلدار درختوں کو چھوٹا بھی بناتے ہیں۔ یہ پھل لگے ہوئے درخت گملوں میں لگا کر فروخت کرتے ہیں۔

حکایت

سنا ہے کہ دو مالدار یہودیوں نے بادشاہ کی دعوت کی تھی اور کھانے کی میز پر ان پھلدار درختوں کا باغ لگایا تھا تاکہ بادشاہ اور ملکہ اپنے ہاتھ سے پھل توڑ کر کھائیں۔ بڑے آدمیوں کے زنانہ کمرے اور مکانات کے برآمدے ان پھولوں اور پھلوں سے چند ماہ تک رشکِ گلزار بنے رہتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح پھولوں کے زیورات کا رواج نہیں ہے نہ مرد اپنے لباس میں پھول لگاتے ہیں۔

حیوانات کا ذکر

اس ملک کے حیوانات بہت قوی الجثہ اور چست و چالاک ہوتے ہیں، خاص طور پر گھوڑا، گائے اور کتا۔ یہاں دودھ، پنیر اور مسکہ دوسرے ملکوں سے بہتر ہوتا ہے اور اس میں چکنائی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ایک قسم کا گھوڑا جو بوجھ کھینچنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اتنا بڑا ہوتا ہے کہ دوسرے ملک میں اس کو تعجب کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ یہ گھوڑے تیز دوڑ تو نہیں سکتے لیکن بوجھ اٹھانے میں اونٹ کا مقابلہ کرتے ہیں اور رات دن کام میں لگے رہتے ہیں۔ چھکڑوں اور ہلوں میں بھی جوتے جاتے ہیں۔ بیل سے یہ کام لینے کا یہاں بالکل رواج نہیں ہے۔ سواری کے گھوڑے صورت میں تو کچھ اچھے نہیں ہوتے لیکن بہت دَم دار اور شائستہ ہوتے ہیں۔ اگر ایک سوار دس گھوڑوں کے گلے میں رسّی باندھ کر لے جاتا ہو اور راستہ میں کوئی چوڑی خندق پڑ جائے یا قدِ آدم دیوار حائل ہو جائے تو بے تامل سوار کے پیچھے پھاند جائیں گے اس میں ان کو ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔

مزرع اور کنٹری ہاؤس

انگلینڈ میں پہاڑوں اور جنگلوں کی زمین ہر جگہ سرسبز اور زرخیز سطح میدانوں میں کنٹری ہاؤس کی عمارات کی وجہ سے شہر کی سی حالت نظر آتی ہے لیکن آدمی کم دکھائی دیتے ہیں مجھے اس بات سے اکثر تعجب ہوتا تھا کہ اس زمین کو بوتا جوتا کون ہے۔ کنٹری ہاؤس ان مکانوں کو کہا جاتا ہے جو وہاں کے شرفا رگاؤں میں بناتے ہیں جس کے ساتھ باغ بھی ہوتا ہے اور اگر ہرن، بھیڑ بکری وغیرہ کی چراگاہ اور کوئی نہر بھی شامل ہو تو اس کو پارک کہتے ہیں ہر کنٹری ہاؤس سے متعلق اس قدر زمین چھوڑ دی جاتی ہے کہ اس کا غلہ سال بھر تک مالک مکان کے لیے کافی ہو۔ جن لوگوں کے شہر میں ذاتی مکان نہیں ہیں وہ ہمیشہ کنٹری ہاؤس ہی میں رہتے ہیں۔ ضرورت کے وقت شہر میں کرایہ کا مکان حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض کنٹری ہاؤس صرف موسم گرما میں آباد ہوتے ہیں کیونکہ ان کے مالک عرب خانہ بدوشوں کی طرح اس موسم میں خانہ بدوشوں کی حیثیت سے وہاں آ کر آباد ہوتے ہیں اور چار پانچ ماہ سیر کرتے ہیں۔ یہ نقل و حرکت جسم و روح کی

بالیدگی میں اعلیٰ درجہ کا اثر کرتی ہے۔ کیوں کہ ان مکانات کی ہوا اس قدر صاف اور صحت افزا ہوتی ہے کہ جب وہ لندن واپس آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوانی نئے سرے سے عود کر آئی ہے۔

سڑکوں اور راستوں کی حالت

یہاں کی سڑکیں پتھروں کی ہموار سلوں سے بنائی گئی ہیں اور بہت صاف رہتی ہیں۔ دریاؤں اور گھاٹیوں پر مضبوط پل بنے ہوئے ہیں۔ مسافروں کو کہیں ٹھہرنا نہیں پڑتا۔ ہر پانچ چھ میل کے بعد ایک مسافر خانہ موجود ہے جس میں ناشتہ اور کھانا بھی مل جاتا ہے اور صاف ستھرے بستر بھی تیار رہتے ہیں۔ یہاں کے اکثر دیہاتوں میں ہندوستان کے گاؤں کی طرح چھپر کے مکان ہوتے ہیں لیکن ان کی دیواریں اینٹ چونے کی ہوتی ہیں۔ ہر مکان میں آتش دان اور چارپائیاں موجود ہوتی ہیں۔

شہر لندن

یہ شہر یورپ اور ہندوستان کے ان تمام بڑے شہروں سے بڑا ہے جو میں نے دیکھے ہیں۔ یہ تین شہروں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے ملحق ہیں۔ اس کا پھیلاؤ چوبیس میل کے دائرہ میں ہے۔ اس کے اطراف میں اس قدر باغات اور چھوٹے چھوٹے قصبات واقع ہیں کہ نا واقف آدمی کو ہر طرف دس میل تک اصل شہر معلوم ہوتا ہے۔ باوجود اتنی آبادی کے اب بھی بکثرت عمارتیں بن رہی ہیں۔ کوئی شخص ایک یا دو مکان نہیں بنواتا ہے۔ بلکہ ترتیب کے ساتھ پورا محلہ تیار کراتا ہے۔ اور اس کے بعد ایک ایک گھر دوسرے لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ صرف ایک مکان اپنی سکونت کے لیے رکھ لیتا ہے۔ میرے زمانۂ قیام میں اتنے مکان تعمیر ہوئے جو دس محلوں کے برابر ہیں۔ ان کا رقبہ ایک میل سے کم نہ تھا۔ یہ اصل شہر سے اس طرح ملحق ہو گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے برسوں سے آباد ہیں۔

لندن کی عمارتیں

اکثر عمارتیں اینٹ کی بنی ہوئی ہیں۔ لیکن کہیں کہیں پتھر کی عمارتیں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ جیسی ڈبلن میں ہیں۔ مکانوں کے دروازے نہایت سادہ، اور ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں۔ امیروں کے مکانات کے علاوہ صحن دوسرے مکانات میں نہیں ہوتے۔ چنانچہ سڑک سے مکان کے دروازے میں اور دروازے سے بلا فاصلہ عمارت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ حصۂ عمارت تہ خانہ کے اوپر ہوتا ہے۔ جس میں مردوں کی نشست اور کھانا کھانے کے لیے جگہ ہوتی ہے۔ مکانات میں ڈیوڑھی نہیں ہوتی اس لیے دروازہ ہمیشہ ~~بند رہتا ہے~~ جب کوئی آنے والا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ تو ملازم مکان کی چوتھی منزل سے نیچے اتر کر دروازہ کھولتا ہے یہ طریقہ خرچ میں کفایت کے خیال سے اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ مکان میں رہنے والوں کی کثرت اور

ملازموں کی کمی کے سبب ایسا کرنا ضروری ہوا ورنہ اخراجات میں کفایت ممکن نہ ہوتی اور زیادہ ملازموں کی ضرورت پڑتی۔ گھوڑوں اور گاڑیوں کے لیے اس مکان کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک نیا اصطبل ہر سڑک کی پشت پر اس کی لمبائی کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ جس میں اس محلّے کے سب لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اور سب کے گھوڑے اور گاڑیاں اسی میں رکھی جاتی ہیں۔ یہ طریقہ بھی رائج ہے کہ دوسرے تیسرے سال ان عمارتوں کے بیرونی حصّوں پر سفیدی کی جاتی ہے۔ اسی لیے یہ شہر ہمیشہ سفید اور نیا نظر آتا ہے۔ اس طرح نئے اور پرانے مکانوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا ہے گلیاں کشادہ ہیں اور ان میں پتھروں کا فرش ہے۔ ہر سڑک میں تین راستے ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ گاڑی چلانے والوں کے لیے جس کو انگریزی میں وہیل بیرو WHEEL BARROW کہتے ہیں۔ اس راستے پر پیدل بھی چلتے ہیں۔ دوسرے حصّے پر گھوڑا گاڑیاں چلتی ہیں۔ سڑک کا درمیانی حصّہ ماہی پشت ہوتا ہے تاکہ بارش کا پانی نہ ٹھہر سکے۔ اس کے دونوں اطراف کے ڈھلو حصّے جو پیدل چلنے والوں کے راستے سے ملے ہوتے ہیں۔ وہاں نالیاں بنائی گئی ہیں۔ جس کے ذریعہ سے موسم گرما میں نہر کا پانی کھول کر سڑکوں پر چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ یہاں کی دکانیں صاف ستھری اور خوش وضع ہیں۔ سامنے کے حصّے میں شیشے کی تختیاں لگی ہوتی ہیں (شوکیس نما) ان کے اندر دکانوں کا سامان نہایت سلیقہ سے سجایا جاتا ہے۔ رات کے وقت روشنی اتنی زیادہ کرتے ہیں کہ پردیسی کو دیکھ کر کسی بڑے جشن یا شادی کا گمان ہوتا ہے۔ دکانوں کی روشنی کے علاوہ سڑک کے دونوں جانب مکانات پر لالٹینوں کی قطاریں ہوتی ہیں جو لوہے کی سلاخوں کے ساتھ نصب ہوتی ہیں ان کی روشنی کرنے کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ شام سے طلوع آفتاب تک روشن رہتی ہیں۔

اسکوائر اور پارک

اس ملک کی عمدہ اختراعات میں سے ایک اسکوائر SCUAR اور دوسرا پارک ہے جس سے شہر کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ پارک کا بیان تو لندن کی عمارات کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ یہ ہندوستان کے رمنہ کی طرح ہوتا ہے لیکن دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ رمنہ وحشی جانوروں کے واسطے مخصوص ہے اور اس میں بھیڑیں اور بکریاں بھی باورچی خانہ کی ضرورت کے لیے پالی جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ سبزہ زار، نہریں اور ایک سمت باغ اور چاروں طرف درختوں کی قطاریں ہوتی ہیں۔ اور درمیان میں ایک اونچا مکان بھی ہوتا ہے۔ اور اسکوائر کو ہندوستان کا چوک سمجھنا چاہیے۔ البتہ چوک بازار کیلئے مخصوص ہوتا ہے اور اسکوائر سیر اور چہل قدمی کے واسطے بعض اسکوائر اتنے وسیع ہیں کہ ان کا ایک ضلع دو ہزار گز سے زیادہ ہوتا ہے۔ چھوٹے اسکوائر کے ہر جانب چھوٹا

کی طرح ایک کوچہ ہوتا ہے' اور بڑے اسکوائر میں ہر طرف دو دو کوچے ہوتے ہیں۔ اس چوک کے درمیان ایک چکر بنا دیا جاتا ہے کہیں بیضاوی شکل کا اور کہیں ہشت پہل۔ اس کے چاروں طرف لوہے کی سلاخوں کا ایک جنگلہ نصب ہوتا ہے' اور اس جنگلہ میں ہر طرف مقفل دروازے ہوتے ہیں جس شخص کا مکان اس اسکوائر کے کوچوں میں ہوتا ہے' تو اس کے چمن کے دروازے کی کنجی بھی اس کے پاس ہوتی ہے۔ صبح و شام وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ تفریح کیلئے وہاں جاتا ہے اور باغ کی روشوں پر ایک ستھری نکھری ہوئی محفل منعقد ہوتی ہے۔ سازندے بھی وہاں آ جاتے ہیں اور تھوڑے معاوضہ پر باہر کھڑے ہو کر اپنے دلکش نغمات سے محفل کو مسحور کیا کرتے

قہوہ خانے اور آشخانہ

یوں تو پیرس کے بازاروں کی طرح یہاں قہوہ خانوں اور آشخانوں کی کثرت نہیں ہے پھر بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موجود ہیں۔ جو صفائی اور سامان کی افراط اور انتظام میں فرانس سے بڑھے ہوئے ہیں۔ قہوہ خانوں کے اوپر کی منزل میں مسافروں کے لیے کرایہ کے کمرے بھی موجود ہیں۔ بعض قہوہ خانے بہت بڑے ہیں۔ خاص کر لندن ٹاورن LONDON TAVERN جو سامان خورد و نوش اور حسن انتظام اور سلیقہ خدمتگاروں کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اگر پانچ سو آدمی کسی کلب CLUB کے اچانک وہاں پہونچ جائیں تو علاوہ روزمرہ کھانے والوں کے ان سب کو ایک گھنٹہ کے اندر نہایت عمدہ کھانا مل جائے گا۔ وہاں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تیس چالیس کلبوں کے ممبر (ہر کلب میں چالیس ممبر ہوتے ہیں) وہاں ایک ہی وقت میں پہونچے تو سب ہی کھانا کھا کر چلے گئے۔ اور ایک کلب والے کو دوسرے کلب والوں کی اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار اس ہوٹل میں انڈین کلب کے ممبروں کے ہمراہ لذیذ کھانے کھائے۔ غیروں سے کھانے کی قیمت نہیں لی جاتی ہے۔ لیکن کلب کے ہر ممبر کو ایک گنی دینا پڑتی ہے۔ جو ہندوستان کے آٹھ روپے کے برابر ہوتی ہے۔

کلب کیا ہے

یہاں کی دیگر عمدہ رسموں اور طریقوں کے علاوہ ایک اچھی رسم کلبوں کا قیام ہے۔ کلب کے معنی ہیں آپس میں میل جول رکھنے والی جماعت' ایسے لوگ وہاں کم ہیں جو کسی نہ کسی کلب کے ممبر نہ ہوں۔ بعض لوگ بیک وقت کئی کلبوں کے ممبر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اکثر شرفا علوم و فنون اور خاص خاص مشغلوں سے وابستہ ہیں لہٰذا اپنے شوق کی تکمیل اور آپس میں میل جول بڑھانے کے لیے کسی ایک گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں اور خاص خاص اوقات میں کسی قہوہ خانہ یا آشخانہ Refreshments Rooms میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ لطیف صحبت اٹھاتے ہیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور شادی و غمی میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ اور جو کام ایک شخص اپنے طور سے انجام نہیں دے سکتا ہے وہ یہاں آسانی سے انجام پا جاتا ہے۔ کلب کے ممبروں کے علاوہ کوئی دوسرا وہاں شرکت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس نقطہ خیال سے آشخانہ کے خرچ کو بخوشی برداشت کرتے ہیں اور یہ خرچ

اپنا مدعا الیہ کے خرچ کے علاوہ ہوتا ہے۔ کلب کا دستور تمام دفاتر، تراشہ گاہوں میں اور دوسرے پیشہ وروں کے یہاں عام ہے۔ مثلاً ایک مکان شطرنج بازوں سے منسوب ہے۔ کوئی نیا آدمی اجازت کے بغیر وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ ہر شخص مالک مکان کو جس میں کلب ہے اس آسائش کے عوض کچھ سالانہ معاوضہ دیتا ہے۔

جب کسی کلب میں ممبروں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو تب شطرنج آشیانہ میں آتے ہیں۔ مثلاً انجمن کلب میں کئی ہزار ممبر انگلستان شامل ہیں لیکن لندن میں سو دو سو سے زیادہ جمع نہیں ہوتے ہیں۔ ان میں تیس چالیس تو ہر ہفتہ ایک یا دو لندن ٹیورن میں جمع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک جو صدر رہتا ہے وہ محفل ختم ہونے کے بعد آئندہ ہفتہ کے جلسے کے لیے حاضرین میں سے ایک کو اپنا قائم مقام مقرر کرتا ہے اور اشعار پڑھے جاتے ہیں اگر آئندہ ہفتہ انہیں چاہیے ان کی جگہ ان میں سے کوئی دوسرا چلا کرتے ہیں۔

علما اور اہلِ صنعت وقت وقت جاڑوں میں اپنی پارٹی کے کسی مالدار شخص کے مکان پر جمع ہو کر اپنی ایجادات اور تجربات کا حال بیان کرتے ہیں اور اگر کوئی نئی صنعت کسی کے ذہن میں آتی ہے تو اس پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے اور اس میں جو نقائص ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح اس ایجاد کی تکمیل فوراً ہو جاتی ہے۔ صاحبِ خانہ چائے کافی اور مٹھائی سے محفل والوں کی تواضع کرتا ہے۔ مجھ کو بھی ان لوگوں سے حسنِ خلق کے باعث ان کلبوں کے جلسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ چنانچہ اتوار کی رات کو سر جوزف ہک Room (Jool سنڈ کے یہاں شنبہ کی رات کو سر جی من M. H. Son کے مکان پر جایا کرتا تھا اور تین گھنٹے ان علمی مجالس سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ اسی طرح جن لوگوں کو فنِ موسیقی کا شوق ہے ان کے کلب علیحدہ ہیں۔ وہ بھی کسی مکان میں جمع ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میں خود دوشنبہ کی رات کو لیڈی شارٹ کے مکان پر ممبرانِ کلب کے ساتھ ساز و سرود سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ یہ میرا معمول تھا۔

لندن کے تماشا خانے

تماشا خانے یہاں وقت گزاری اور تفریحِ طبع کی غرض سے بنائے گئے ہیں۔ اس میں سے بعض کا ذکر ڈبلن کے حالات کے ضمن میں آ چکا ہے۔ یہ تھیٹر عام ہوتے ہیں اور انہیں کوئی خصوصیت نہیں ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ہر گلی کوچہ میں ایک ایسا مکان ہوتا ہے جس کو پرائیویٹ تھیٹر کہتے ہیں۔ یہ خاص کلب یا جماعت کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کے ممبروں کو اس کی سالانہ ضروریات کے لیے فیس دینا پڑتی ہے اور ان ممبروں کے علاوہ کوئی اور وہاں نہیں جا سکتا ہے تاوقتیکہ منتظمین اجازت نہ دیں۔ ان میں سے اکثر تھیٹروں میں بازی گر، اور سازندے بھی شامل ہیں۔ عورتیں اور مرد دونوں ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنے ساتھ کھانے کا کچھ سامان لاتا ہے، جیسے کباب، مٹھائی وغیرہ۔ یہ سامان ملازم میزوں پر لگا دیتے ہیں۔ اور تماشا ختم ہونے کے بعد سب ساتھ بیٹھ کر بڑی خوشی اور یگانگت کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں ان تھیٹروں کی لندن میں اتنی کثرت ہے کہ جب میں وہاں سے چلا ہوں اس وقت سات تماشا خانے اور کھل گئے تھے۔

اجرامِ فلکی کی رفتار و گردش کی رسدگاہ

لندن کے ایک تماشہ خانہ میں جس کا مالک مسٹر واکر ماہر نجوم و فلسفہ ہے اپنے تھیٹر ہال میں رات کے وقت چاند اور سورج اور ان کے گرد ستاروں کی گردش ایسی صفائی اور خوبی سے دکھاتا ہے کہ ایک نظر میں سب کی رفتار سمجھ میں آجاتی ہے۔ ان کے متعلق ہر بات کا سبب اور رویت کا اختلاف ثابت ہوتا ہے اس کے علاوہ وہ خود بھی اپنی زبان سے بیان کرتا جاتا ہے۔ اس مکان میں مجھ کو ایسا لطف حاصل ہوا جو بیان سے باہر ہے۔ اس مکان میں آٹھ گز اونچا ایک طاق ہے۔ جس کے وسط میں شیشہ کا ڈھلا ہوا ایک کرۂ آفتاب نصب ہے۔ اور اس کرہ کے اندر ایک لیمپ روشن رہتا ہے۔ یہ کرۂ چکی کی طرح اپنے مرکز پر گھومتا ہے۔ اس کے بعد عطارد اور زہرہ پھر زمین اور قمر جو زمین کے چاروں طرف گردش کرتا ہے اور زمین کے ہمراہ آفتاب کا بھی طواف کرتا ہے اس کے بعد مریخ اور مشتری جس کے ہمراہ چار چاند ہیں اور زحل جس کے ساتھ پانچ چاند ہیں اور سیارہ جارج جو نیا دریافت ہوا ہے اپنے چاندوں کے ساتھ آفتاب کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ ان تمام ستاروں کی چالیں ایک ہی سمت میں ہیں' جو ہر ایک کے اختلافِ مدار کی وجہ سے مختلف نظر آتی ہیں۔ چونکہ یہ تمام اجرام کُرّوی شکل کے ہیں۔ لہٰذا کسی سیارہ کے حائل ہونے سے چاندوں کے گہن اور مخروطی سائے اور سورج گرہن کی وجہ اور زہرہ کا شرقی و غربی اور غائب ہونا ایسی اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دل میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ جتنے عرصہ میں کہ زمین آفتاب کے گرد ایک دورہ کرتی ہے تو اتنے عرصہ میں عطارد اور زہرہ کئی دورے کر لیتے ہیں اور قمر اس وقت تک بارہ دورے کر چکا ہوتا ہے۔ چاند کا ہلال سے بدر ہونا اور پھر ہلالی شکل اختیار کر کے آفتاب کے مخروطی سایہ کی وجہ سے محاق میں آنا صاف نظر آتا ہے۔ اور زمین کے بارہ دوروں کے بعد مشتری کا ایک دورہ' اور ایسے ہی زحل جو ان کے حساب سے ثابت ہوا ہے' ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی روزانہ وہاں جا کر یہ تماشا دیکھا کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات صاف طور پر آجائے گی کہ سب کُروں کے قطب شمال کی سمت مائل ہیں اور ایک دوسرے کے متعلق ہیں۔ اور سب کو حرکت دینے والا ایک ہی ہے۔ اور گردشوں کا یہ اختلاف اور سورج اور چاند گرہن اور کمال و زوال سب مداروں کے اختلافات کے سبب سے ہیں۔

چنانچہ زمین کا مدار آفتاب کے گرد ایک خاص جھکاؤ کے ساتھ ہے۔ اگر مدور (گول) ہوتا تو ہر ماہ میں دو بار سورج گرہن اور چاند گرہن پڑا کرتے۔ ایک بار چاند اور سورج کے درمیان زمین کے حائل ہونے سے اور ایک بار آفتاب اور زمین کے درمیان چاند کے آجانے سے۔ اور ایسے ہی فصلوں کی تبدیلی اور ہوا کی سردی اور گرمی گول مدار میں ممکن نہ تھی۔

بھیس بدلنے کا حال

بھیس بدلنے کے لئے ایک خاص مکان ہوتا ہے۔ جس میں نقاب ڈال کر یا کاغذی چہرہ منھ پر لگا کر وضع تبدیل کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی جدتِ طبع کا امتحان لیتے ہیں۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے خاطر خواہ آزادی مل جاتی ہے۔ یہ رسم سارے فرنگستان میں رائج ہے۔ مگر لندن میں یہ ہنر درجۂ کمال تک پہونچ گیا ہے کیونکہ انگریز اطراف عالم میں سفر کرتے ہیں اور مختلف قوموں کی وضع قطع سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ سینکڑوں قسم کے بھیس بدل لیتے ہیں۔ ان کے مکانات میں، ایرانی، ہندی، عربی، ترکی، ہندو جوگی، سنیاسی اور سینکڑوں قوموں اور فرقوں کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اور بعض نقل کو اصل بنانے کی اتنی کوشش کرتے ہیں، کہ حرکات اور بول چال میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ شریف لوگ مختلف پیشہ وروں کا بھیس اس طرح بدلتے ہیں کہ اصل و نقل میں کچھ بھی فرق نظر نہیں آتا۔ مثلاً حجام، گل فروش اور باورچی وغیرہ اور اس میں ان کے اختراعات قابل داد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص شب خوابی کے لباس میں اچانک اس جلسہ میں آکر تیزی کے ساتھ لوگوں سے یوں مخاطب ہوا کہ یہ لوگ کس قدر بدتمیز اور آوارہ ہیں کہ رات ختم ہونے کو ہے اور صبح قریب ہے۔ مگر اب تک اپنی بکواس میں مصروف ہیں اور مجھ کو تمام رات سونے نہیں دیا کیونکہ میں اس مکان کے اوپر کی منزل میں ٹھہرا ہوں۔ حاضرین نے اس پر زوردار قہقہہ لگایا اور اس کی اس ایجاد کو بہت پسند کیا۔ کیونکہ اس نے ایک نیا طرز تبدیل وضع کے لئے اختیار کیا تھا جس میں کسی قسم کا خرچ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

ناچ گھر

اس میں عورتیں اور مرد ناچنے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور ان دونوں مکانوں میں کھانے کے لئے ایک گنی چندہ دینا پڑتا ہے۔ جاڑے کے آخیر موسم میں لندن کے معززین کے یہاں ان دونوں قسموں کے اس قدر جلسے اور دعوتیں ہوتی ہیں کہ

بعض تماشائیوں کو ایک شب میں تین چار جگہ جانا پڑتا ہے۔

مدارس اور شفاخانے

انگریز ایسی تمام عمارتوں کو جو مفاد عامہ کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں، پبلک بلڈنگ یعنی عماراتِ جمہوری کہتے ہیں۔ اس قسم کی عمارتوں میں شفاخانے، مدرسے، کتب خانے، یتیم خانے، زچہ خانے اپاہج خانے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بوڑھے سپاہیوں اور ملاحوں کے لئے خاص عمارتیں ہیں۔ جو ملک اور قوم کی خدمت کرتے ہوئے کمزور یا اپاہج ہوگئے ہیں۔ عبادت خانے بھی انہیں عمارتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جن میں سینٹ پال اور ویسٹ منسٹر ایبے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ اور بھی رفاہ عام کے لئے بہت سی عمارتیں ہیں جن کی تفصیل باعث طوالت ہوگی۔ مدرسوں سے اس قوم کو ایسی دل چسپی ہے کہ شہروں اور دیہاتوں میں چھوٹے بڑے مدرسوں کی کثرت ہے، ان کے علاوہ آکسفورڈ اور کیمبرج دونوں شہر صرف مدرسوں اور کتب خانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ جہاں صرف طالب علم، اساتذہ اور پادریوں کے علاوہ کوئی اور نہیں رہتا اور انہیں کی ضروریات کا سامان ملتا ہے۔ دونوں مقامات میں بیس، تیس ہزار طالب علم تحصیل علم میں مصروف ہیں اور ان میں سے کسی کو مکان اور کھانے پینے کی فکر نہیں کرنا پڑتی ہے۔

آکسفورڈ کے شہر میں جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، مدرسے، کتب خانے اور رصد گاہیں خوب اچھی طرح دیکھیں۔ یہاں کی عمارتیں شان وشوکت میں بادشاہی محلوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ پتھر کا خوبصورت کام، رنگین دروازے، مکانوں کی اندر اور باہر سے سجاوٹ لہلہاتے ہوئے پائیں باغ۔ نہایت فرحت بخش اور مسرت افزا معلوم ہوتے ہیں۔ مدرسہ کے عہدہ داروں میں سے ٹامس نامی پادری نے علم تشریح کی ایک کتاب بطور یادگار سب کو دی۔ یہ پادری علم تشریح کے ماہر استاد سرفرگرگ کے شاگردوں میں ہے۔ مجھ کو بھی بادشاہ کی طرف سے فارسی مدرس کی جگہ کی پیش کش تین ہزار سالانہ تنخواہ پر ہوئی تھی۔ لیکن میں نے وطن واپس جانے کا عذر کرکے یہ وعدہ کیا کہ دوبارہ انگلینڈ آؤں گا تو بسر وچشم یہ خدمت انجام دوں گا۔ یہ سب تعلیمی عمارتیں تمام ضروری سامانوں سے بھری ہوتی ہیں مردوں اور عورتوں کے لئے عہدہ دار اور ملازمین الگ الگ مقرر ہیں۔ ان کا خرچ حکومت اس آمدنی سے پورا کرتی ہے جو تعلیم کے لئے عوام سے ٹیکس کی صورت میں

حاصل کی جاتی ہے۔ بعض کا انتظام امراء کے قائم کردہ اوقاف کی آمدنی سے ہوتا ہے۔ جو روپیہ ان مدرسوں کی دستکاریوں سے حاصل ہوتا ہے وہ بھی اسی مدرسہ کے فنڈ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جن مدارس کو انگریزی میں اسکول کہتے ہیں، وہ ان میں شامل نہیں ہیں۔ اکثر شہروں میں عالموں کے مکانات ہیں، جو طلبار کو پڑھاتے ہیں۔ ان کے شاگرد خوراک اور پوشاک کے اخراجات کے نام سے ایک مقررہ رقم ان کو دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ علمار اور اساتذہ طلبار کے لئے ان کی ضروریات کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور ان کے اوقاتِ تعلیم اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ طالب علم، پانچ چھ سال میں فارغ التحصیل ہو جاتا ہے۔ اور نہایت مہذب اور شائستہ ہو کر نکلتا ہے۔ بعض اسکولوں میں پانچ سو طلبار نظر آئے۔ اور ہر اسکول کا ہیڈ ماسٹر خود مالک مکان ہے۔ انتظامات اس کی بیوی کرتی ہے۔ اس کی مدد کے لئے دو تین مرد اور عورتیں ملازم رکھی جاتی ہیں۔ لیکن تمام کام باضابطہ اور مقررہ قوانین کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ ہر چیز اپنے وقت پر مہیا ہو جاتی ہے گویا انگریزوں کی ذاتی خوبیوں کے باعث ایک چھوٹی سی علمی دنیا کی بنیاد پڑتی ہے۔

انگلستان میں خیرات کا طریقہ

ہندوستان کے برخلاف یہاں کے لوگ غریبوں، مسکینوں شاعروں اور عزیزوں کو ایک حبہ بھی نہیں دیتے ہیں۔ ان کو دینا گناہ خیال کرتے ہیں۔ اور اس پر اتنی سختی سے قائم ہیں کہ اگر کوئی شخص دو میل تک ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ کچھ مانگنے کے لئے دوڑے تب بھی ان کو رحم نہیں آتا۔ ان کے یہاں خیرات کا نہایت اچھا طریقہ رائج ہے، انہوں نے شہر کے ہر محلہ میں خیرات خانے قایم کر دیئے ہیں، جہاں سے غریب اور مجبور لوگوں کو کھانا ملا کرتا ہے۔ جو شخص اس خیرات خانہ سے متعلق محلہ کا رہنے والا ہے، اگر وہاں جاکر اپنی مفلسی اور مجبوری کا ثبوت دیتا ہے تو وہاں کے منتظمین اسی وقت اس کی روزانہ خوراک کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اس کی درخواست ردّ نہیں کرتے ہیں۔ ہند کے صاحب حیثیت لوگ اس خاص کی مد کی رقم خیرات خانہ کے فنڈ میں جمع کرا دیتے ہیں۔ انفرادی طور پر کسی کو ایک پیسہ نہیں دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان خیرات خانوں پر تین کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ اور یہ سب رقم شہر کے لوگ خیرات فنڈ میں جمع کرتے ہیں۔ اس اچھے انتظام کے باوجود لندن میں فقیر بہت ہیں۔ سُنا گیا ہے کہ خیرات خانوں

میں چونکہ کھانا افراط سے نہیں ملتا۔ اس لئے یہ لوگ وہاں نہیں جاتے ہیں۔ اور بعض صرف زبان کے چٹخارے اور شراب نوشی کی غرض سے گداگری کرتے ہیں۔ شہر کے حاکموں کو عوام کی نفع رسانی کا اس قدر خیال ہے کہ اگر کوئی کاریگر نفع عام کے خاطر کوئی نئی چیز ایجاد کرتا ہے تو وہاں کی پارلیمنٹ اسی وقت اس کے لئے لاکھوں روپیہ کا خرچ منظور کر لیتی ہے۔

بنک آف انگلینڈ

بینک کا لفظ ساہوکار کی کوٹھی کے لئے استعمال ہوتا ہے لندن کا بینک زرداری کے اعتبار سے، دنیا کا سب سے بڑا بینک ہے۔ اس کی عمارت، پندرہ بیگھہ زمین پر بنی ہے جس کے اندر سینکڑوں کمرے ہیں ہر شہر کے لین دین کے واسطے ایک کمرہ مخصوص ہے۔ اس بینک کے مالکوں کی بھی ایک کمپنی ہے جنہوں نے بہت عرصہ قبل اپنی دولت کو اکٹھا کر کے آپس کے چند معتبر لوگوں کی نگرانی میں کاروبار شروع کیا تھا۔ یوں تو لندن کے ہر محلہ میں مہاجنی کا کاروبار ہے اور مہاجنوں کے دفاتر کھلے ہوئے ہیں چنانچہ میرے دوست مسٹر جانسن اور مسٹر مڈلٹن بھی یہی کام کرتے ہیں، لیکن یہ سب بنک آف انگلینڈ کی شاخوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں کی ہنڈی نہ صرف سارے یورپ بلکہ ساری دنیا میں بغیر کسی کا نام متعین کئے ہوئے بک جاتی ہے۔ بلکہ دس پندرہ فی صد زیادہ دے کر خرید لیتے ہیں۔ کیونکہ اس بینک سے چاندی کے عوض میں سونے کا سکہ ملتا ہے جو دوسرے ملکوں میں کمیاب ہے۔ تمام شاہی لین دین، سرکاری اخراجات اور پارلیمنٹ کے اخراجات کی کفالت اسی بینک کے ذمہ ہے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ کبھی ایسا کوئی وقت نہیں پڑا کہ اس بینک میں ایک ارب روپیہ موجود نہ رہا ہو۔ اس کے اور معاملات کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے۔

ایکسچینج

یہ وہ مکان ہے جس کے اندر بڑے بڑے بیوپاری روزانہ جمع ہوتے ہیں اور ہر قسم کے سامان کی خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں۔ اور اشیاء کا نرخ مقرر کرتے ہیں یا گھٹاتے بڑھاتے ہیں۔ اخبارات کا مطالعہ کر کے تجارتی جہازوں کی

لہ بینک آف انگلینڈ ۱۶۹۱ء میں قائم ہوا تھا۔ پہلے کرایہ کے مکانات میں رہا۔ اس کے بعد [illegible] میں اس کے لئے ایک خاص عمارت کا کچھ حصہ تعمیر ہوا۔ پھر یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ اب اس کی عمارتیں محلوں میں پھیل گئی ہیں اور موجودہ دور میں اس کی عمارت اور کاروبار کا سلسلہ بہت زیادہ وسیع ہے اور دنیا بھر کے بینکوں کے مقابلے میں اب بھی اس کی حیثیت نمایاں ہے۔ (مترجم)

آمدورفت کا حال معلوم کرتے ہیں۔ ہر ملک کی پیداوار کا نرخ دیکھتے ہیں اور اسے مال کی روانگی اور آنے والے جہاز سے مال آتارنے کا بندوبست کرتے ہیں۔ بہرحال اس مکان یعنی اکسچینج کے جو خاص فوائد ہیں ان کی تفصیل تو بیوپاری ہی بیان کر سکتے ہیں۔ ہم نہ خریدتے ہیں نہ فروخت کرتے ہیں۔ جو خریدتے ہیں وہی فروخت بھی کرتے ہیں۔

پُل شہر لندن کے راستوں اور شہر کے کنارے سڑکوں پر پل بکثرت بنے ہوئے ہیں۔ لندن کے تین پلوں کا حال تو میں اپنی ایک مثنوی میں بیان کر چکا ہوں۔ ان کے علاوہ ایک اور پل ہے جو گرویزنڈ" GRAVRSAND کے نیچے تعمیر ہو رہا ہے۔ اس کی صنعت دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دریائے ٹیمس کے نیچے قوسی شکل کی ایک سرنگ نکالی ہے جس کا ایک راستہ اِس کنارے پر اور دوسرا اُس کنارے پر ہے۔ اندر سے یہ سرنگ پتھر اور مصالحہ کی چنائی سے پختہ کی گئی ہے۔ اور چھت محراب دار لداؤ کی ہے۔ اور ایسی مضبوط جوڑائی کی ہے کہ ہرگز اس میں پانی کا اثر نہیں پہونچ سکتا۔ اس سرنگ کے نیچے سے چھت تک بیس بائیس گز کی بلندی ہے اور اسی قدر چوڑائی بھی ہے چار گاڑیاں ایک ساتھ برابر سے چل سکتی ہیں پل کے اوپر دریا کی گہرائی اتنی زیادہ ہے کہ کشتیاں اور جہاز اس پر سے گزرتے ہیں۔ سرنگ کے اندر رات دن بکثرت لالٹینیں روشن کی جاتی ہیں۔

اخبارات کے فوائد اخبارات کے فوائد سے نہ صرف انگلینڈ بلکہ یورپ کے تمام مقامات کی اہم خبریں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ چیزوں کے نرخ اور تمام ملکی و قومی معاملات کی جزوی اور کلی باتیں صحیح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ کس تماشاخانہ اور تھیٹر میں کون سا کھیل دکھایا جائے گا۔ اور کون کون ایکٹر اس میں حصہ لیں گے۔ اس ملک کے معززین اور حکام کی آمد و رفت، اور ان کے یہاں کی شادی غمی کی خبریں اخبار میں شائع ہوتی ہیں۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر کاروبار کرنے والا اور کارخانہ دار اپنی صنعت و حرفت کا اشتہار شائع کرا کے شہرت حاصل کر سکتا ہے۔ تھیٹر کے مالک ایک بار ایک رات کی آمدنی خیرات کی مد میں دیتے ہیں، تاکہ اس سے غریب شرفا کی امداد ہو سکے۔ ایک بار واکسال VAUXHALL کے ایک تھیٹر کے مالک نے جس رات کی آمدنی خیرات میں دینا تھی اس رات میرے ایک

دوست کے ذریعہ پیام بھیجا کہ اگر میں تماشا دیکھنے آؤں گا تو ٹکٹ نہیں لینا پڑے گا۔ اور تمہارے ذمے کی وجہ سے لوگ زیادہ شریک ہوں گے۔ اور آمدنی زیادہ ہو جائے گی اس سبب سے تم بھی داخل حسنات ہو گے۔ میری منظوری کے بعد اس نے تماشا خانہ میں میری شرکت کی اطلاع اخبارات میں شائع کرا دی۔ چونکہ مقام واکس ہال VAUX HALL شہر برہ Borough میں دریا کے اس پار واقع ہے اور اس طرف میرا جانا کم ہوا تھا تو اس جانب کے لوگ مجھے دیکھنے کے شوق اس قدر جمع ہو گئے کہ جتنے کبھی اس مقام پر جمع نہیں ہوئے تھے اور تماشائیوں کے اژدھام کی وجہ سے تھیٹر میں جگہ باقی نہیں رہی۔

اخبار کی خریداری کا طریقہ یہ ہے کہ معزز لوگ ایک مقررہ رقم ماہوار مالک اخبار کو ادا کر دیتے ہیں۔ اور مالک اخبار کے ملازم ہر روز اخبار خریدار کے گھر پر پہونچا دیتے ہیں ان کے علاوہ جو شوقین اخبار پڑھنا چاہتے ہیں وہ تین چار پیسے میں ان سے خرید لیتے ہیں جو سڑکوں پر فروخت کرتے ہیں۔ اور جو لوگ یہ معمولی قیمت بھی ادا نہیں کر سکتے وہ تو قہوہ خانوں میں کھانے اور ناشتہ کے وقت جا کر پڑھ لیتے ہیں۔ کیونکہ قہوہ خانوں وغیرہ میں لوگوں کے لئے اخبار رکھے جاتے ہیں۔ ان اخباروں میں وزیروں، امیروں اور بادشاہ سے میری ملاقات کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اور مجھ کو عام طور پر پرشین پرنس Persian Prince یعنی شاہزادۂ ایران کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لقب بغیر میری خواہش کے اس قدر زبان زد خلائق ہو گیا تھا کہ پھر مجھ کو بھی قبول کرنا پڑا۔ کسی شخص کو بغیر اس لقب کے میرا اور میرے مکان کا پتہ نہیں مل سکتا تھا۔ کلب کے ممبر بھی ایک دوسرے کے ارادوں سے اخبار کے ذریعہ واقف ہوتے ہیں۔ وزیروں کو ان کی بداعمالی پر گمنام لوگوں کی طرف سے دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ اس طرح یہ اخبار کار آمد ہیں۔ وزیروں اور تمام لاپرواہ حاکموں کی تنبیہ کے دو طریقے اور ہیں ایک تو مضحک تصاویر (کارٹون) بناتے ہیں۔ یہ مصوری کے ذریعے رمز و کنایات میں طنز کرنے کا طریقہ ہے۔ جان بل اور وزیر کے درمیان مزاحیہ انداز میں سوال و جواب ہوتے ہیں اور الفاظ کے پردہ میں وزیر کی فضیحت کی جاتی ہے۔ اور ایسے لطف کے ساتھ کہ اگر وہ خود بھی دیکھے تو بے اختیار ہنس پڑے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تماشا خانوں میں نقل اور سوانگ بنا کر دکھاتے ہیں جس میں اس وزیر کا کردار سامنے آتا ہے مگر انداز ظرافت آمیز ہوتا ہے۔ ان تنبیہی نقلوں کو کوئی روکنے

پابند کرنے کی مجال نہیں رکھتا ہے، خواہ وہ نقل درست ہو یا غلط۔ اسی طرح علمی باتوں کی اشاعت پر بادشاہ یا عمائدین کوئی پابندی نہیں لگا سکتے کیونکہ جو شخص علمی کتابیں چھاپ سکتا ہے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اخبار کے ذریعے سے لوگوں کو مطلع کرے اور اپنے علم و ہنر سے ضرورت مندوں کو آگاہ کرتا ہے تاکہ جس کسی کو ضرورت ہو وہ اس سے رجوع کر سکے۔ اس معاملے میں عوام کو اس قدر آزادی ہے کہ جس کو مفر اور عجیب کہا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق آئندہ لکھا جائے گا۔

مسافروں کے آرام و آسائش کا انتظام

مسافروں کے لئے سفر کی سہولتوں کا حکومت نے اچھا انتظام کیا ہے۔ خاص طور پر "میل کوچ" پر ایک ہزار میل کی مسافت چھ سات روز میں آرام کے ساتھ سایہ میں بیٹھ کر طے ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس قسم کی گاڑیاں فرانس اور دیگر ممالک فرنگ میں بھی چلتی ہیں۔ لیکن انگلینڈ جیسی عمدہ اور تیز رفتار گاڑیاں کہیں اور نہیں ہیں۔ اس سے قبل آئرلینڈ کے سفر میں میل کوچ کی جو خرابیاں معلوم ہوئی تھیں، وہ صرف مسافروں کی مجبوری اور کوچبان کے تحکمانہ انداز کی وجہ سے ہیں لیکن فرانس کے سفر کے بعد سے اس گاڑی کی خوبیاں ظاہر ہوئیں۔ اس قدر سبک رو ہوتی ہے کہ بیٹھنے والے کو ذرا سا جھٹکا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اور یہ گاڑی ٹھیک وقت پر مقررہ جگہ پہونچ جاتی ہے اور کھانے اور ناشتہ کے اوقات میں اس جگہ پہونچا دیتی ہے۔ جہاں کھانا یا ناشتہ کرنا ہے۔ مسافر خانوں میں ٹھیک وقت پر آتارتی ہے یہ مسافر خانے اور ان کے ملازم بہت صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ان کا کھانا فرانس کے کھانوں سے بہتر ہوتا ہے۔ وقت مقررہ پر جب بگل کی آواز سنتے ہیں تو تمام چیزیں فراہم کر کے مستعد ہو جاتے ہیں تاکہ مسافروں کے آتے ہی ان کی ضروریات مہیا کر دیں۔ مسافرت علمی فوائد اور صحت جسمانی کی درستی کے لئے یا دیگر تجربات حاصل کرنے کے لئے کی اختیار کی جاتی ہے۔ اس ملک میں اس کا معمول ہے اور عام طور پر لوگ تفریحاً بھی یہ مسافرت اختیار کرتے ہیں۔

نہروں کا ذکر

اس ملک میں نہروں سے یہ فائدہ ہے کہ وزنی اور بھاری چیزیں چھوٹی کشتیوں پر لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہونچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتوں اور باغوں کی سینچائی کے لیے پلوں کے در بند کر کے پانی ہر طرف جاری

کر دیتے ہیں. چونکہ ان جزائر میں بارش ہمیشہ ہوتی رہتی ہے اس لئے نہریں آب پاشی کے بجائے سامان کی نقل وحمل کے کام آتی ہیں. اس کی وجہ سے یہاں چیزیں ارزاں رہتی ہیں. کیونکہ انگلینڈ میں مزدوروں کی اجرت اور جانوروں کا چارہ اس قدر گراں ہے کہ اگر سمندروں میں جہاز اور خشکی میں یہ نہریں اور ہر کام کے لئے کلیں نہ ہوتیں تو چیزوں کا نرخ اس سے زیادہ گراں ہو جاتا. کیوں کہ دوسرے ملکوں میں جو کام آدمیوں، گھوڑوں اور بیلوں کی طاقت سے انجام پاتے ہیں، یہاں اس کا دو تہائی مشینوں، بھاپ اور پانی کے ذریعہ پورا ہوتا ہے اور ایک تہائی کام آدمیوں اور جانوروں سے کراتے ہیں. اس لیے کہ یہ کام ان کے سوا کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتے.

لندن میں گرانی کی یہ حالت ہے کہ جن چیزوں کی ارزانی وزیروں کے ذمہ ہے، ان کا نرخ اعتدال کی حالت میں یہ ہے. خمیری روٹی دو سیری فی عدد آٹھ آنہ. گوشت فی سیر آٹھ آنہ. بیئر یعنی جو کی شراب دو آنہ کی آدھ سیر، یہ بجائے پانی کے مستعمل ہے.

ہاٹ ہاؤس Hot House

میری رائے میں یہ صنعت دوسری صنعتوں سے زیادہ مفید نہیں ہے. لیکن قابلِ شہرت اور لائق تعریف ضرور ہے اس کے ذریعہ سے طبیعت تبدیل کر دی جاتی ہے. ہاٹ ہاؤس میں گرم ملکوں کی ترکاریاں اور پھل پیدا کئے جاتے ہیں اور سرد ملکوں کے پھل، ترکاریاں بھی قبل از وقت اور عمدہ پیدا ہوتی ہیں. اس صنعت کا کمال اس بات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ چیری اور اسٹرابیری جو انگلینڈ اور پیرس کے خاص پھل ہیں اگر ہندوستان کے امراء اور سلاطین ان کا ایک دانہ لاکھ روپیہ میں لینا چاہیں تو میسر نہ ہوگا. بخلاف اس کے انگلینڈ کے عوام کو ہندوستان کا ہر خاص میوہ میسر ہے حالانکہ قیمتی زیادہ ہوتا ہے مگر سال میں ہر شخص کو ایک دو بار کسی نہ کسی طرح ضرور مل جاتا ہے.

اس ہاٹ ہاؤس کی صورت یہ ہے کہ ایک مکان کھپریل کی طرح ایک رخا بناتے ہیں، اس کی پشت پر پختہ دیوار ہوتی ہے، اور تین طرف تختوں اور شیشوں کی دیواریں ہوتی ہیں. اور چھت بھی تختہ اور شیشے کی ہوتی ہے. اس مکان کی زمین کے نیچے ایک تہ خانہ ہوتا ہے. جس میں آتش دانوں اور دھواں نکالنے والی چمنیوں کے ذریعے آنچ زمین کو گرم کرتی ہے. اور آفتاب کی تپش بھی شیشوں کی وجہ سے دوگنی تگنی ہو جاتی ہے. جب برف باری یا سرد ہوا نہیں ہوتی تو

اس کے دروازوں کو ضرورت کے مطابق کھول دیتے ہیں تاکہ ہوا اندر جاسکے۔ ورنہ بند رکھتے ہیں اس لئے اس مکان کے اندر سردی کا کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ اور ہوا گرم سیر ممالک کی ہوا کی طرح ہوجاتی ہے۔ اس لئے ان ملکوں کے پھل وہاں خوب پیدا ہوتے ہیں۔

جہازوں کی کثرت

جہاز سازی کی صنعت سلطنت انگلشیہ کی ترقی و استحکام کا باعث ہے۔ اس صنعت کو اس ملک نے بہت ترقی دی جہازوں کی کثرت کے سبب سے انگریزوں کو اپنی قوت پر زعم ہے کہ وہ جب چاہیں کسی ملک پر حملہ کرکے اس کو فتح کرسکتے ہیں اور اگر نہ فتح کرسکے تو بغیر نقصان اٹھائے اپنے ملک میں واپس آسکتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کے ہمسائے حتیٰ کہ فرانس بھی جس کو آج اپنی قوت اور فوج کی کثرت میں یکتائی کا دعویٰ ہے۔ انگریزوں کو ان کے جہازوں کی قلعہ بندی کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

جہازوں کی بناوٹ، ان میں مستول اور بادبانوں کا لگانا، توپیں چڑھانا اور ان کے نشانے باندھنا نیز جہاز میں گزربسر کرنے کے اصول و قوائد وغیرہ میں جو حکمتیں اور صنعتیں رکھی گئی ہیں وہ میری حد فہم اور بیان سے کئی درجے زیادہ ہیں۔ اس بات کی تائید اس حکایت سے ہوتی ہے۔

لارڈ منٹ [illegible] نے بیان کیا کہ ایک بار کیپ گڈ ہوپ کے قریب ہمارا جہاز سخت طوفان میں پھنس گیا۔ اور بیچ کے مستول پر بجلی گری جس کی وجہ سے اس کے پردے، لکڑی اور رسیاں بالکل جل گئیں اور آگ چھت کے قریب پہونچ گئی۔ کپتان اور جہاز کے عملے نے بغیر کسی گھبراہٹ کے نہایت سلیقہ سے آگ کو بجھایا جس کی وجہ سے باقی چیزیں محفوظ رہیں۔ میری بیوی اور بیٹیاں جہاز کے نیچے کے درجہ میں موجود تھیں مگر آگ ایسی خاموشی سے بجھائی گئی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ شام کے قریب جو طوفان ختم ہوگیا تو میں مع اہل و عیال تفریح کے لئے جہاز کی چھت پر چڑھا تو ایک مستول غائب تھا۔ پوچھنے پر آتش زدگی کا علم ہوا۔ اگرچہ بظاہر ترکی، فرانس اور تمام یورپ کے جہاز دیکھے ہیں انگریزی جہازوں کی طرح مضبوط ہوتے ہیں۔ لیکن انگریز ان کو بنگال کی غلہ ڈھونے والی کشتیوں کے برابر بھی نہیں سمجھتے ہیں۔

شمالی نخلستان کے بادشاہوں سے انگریزوں کا [illegible]

اس زمانے میں انگریزوں کے جہاز اکثر فرانس

کے جہازوں کی روک تھام کرتے اور ان کو تباہ و برباد کرتے تھے اس سلسلے میں روس، ڈنمارک سویڈن اور پروشیا، چاروں ملکوں کے جہازوں کو بھی انگریزوں کے ہاتھوں کافی نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس لئے فرانس کی مدد کرنے کے بجائے مذکورہ ممالک کے بادشاہوں نے انگریزی جہازوں کی سرزنش کرنے کا ارادہ کر لیا اور انہوں نے اپنے ملکوں کے ساحل پر جو انگریزی جہاز تھے ان کو مع مال و اسباب کے ضبط کر لیا۔ اس طرح ان ملکوں کا سامان بھی انگلینڈ آنا بند ہو گیا اور انگریز تاجر جو مال دوسرے ملکوں سے لاتے تھے اس میں دشواری پیدا ہو گئی۔

جب یہ اطلاع لندن پہنچی تو عوام مایوس ہو گئے ان کو جو فوائد باہر سے مال آنے پر حاصل ہوتے تھے ان سے محروم ہونے کے نقصانات کا اندازہ ہوا۔ لیکن شاہی وزیروں اور حاکموں پر اس خبر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور مجلس شوریٰ نے لارڈ نلشن Lord Nelson کو پچاس چھوٹے بڑے جہازوں کا بیڑہ دے کر بحر شمالی کی طرف روانہ کر دیا اور ان کو ہدایت کر دی کہ ان ملکوں کے ساحلوں پر پہنچ کر ان کے جہازوں کو جلا دیں یا غرق کر دیں یا گرفتار کر لیں اور جو انتقامی کارروائی مناسب ہو وہ کریں اس میں ذرا بھی کوتاہی نہ ہو۔ لارڈ نلشن نے بحر شمال سے بحر بالٹک میں داخل ہو کر پہلے ڈنمارک کا رخ کیا۔ جو راستہ پر ہے اور بحری طاقت میں بھی ان چاروں سے بڑھا ہوا تھا۔ ڈنمارک کے لوگوں نے اس مقام کو جہاں بحر بالٹک ڈنمارک اور ناروے کے درمیان بہت تنگ ہو گیا ہے اور اس کے کناروں پر پتھر کے قلعے بنے ہوئے ہیں اس مقام کو اور دشوار گذار بنا کر لارڈ نلشن کا راستہ روکا۔ اور قلعہ کی توپوں سے گولہ اندازی کر کے انگریزی جہازوں کو جس قدر نقصان پہنچانا ممکن تھا پہنچایا۔ لیکن لارڈ نلشن قہراً جبراً وہاں سے گزر کر ڈنمارک کے دارالسلطنت کوپن ہیگن پہنچے اور ان کے جہازوں سے مقابلہ ہوا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ چھ ہزار سے زیادہ آدمی مارے گئے انگریزی بیڑے کو بھی بہت نقصان پہنچا لیکن ڈنمارک نے پریشان ہو کر صلح کر لی اور انگریزوں کی بحری برتری کو طوعاً و کرہاً تسلیم کر لیا۔ حالانکہ غیرت مند بادشاہوں کے لئے اس کو تسلیم کرنا مشکل تھا۔ ڈنمارک نے انگریزوں کے ضبط کئے ہوئے جہاز اور مال و اسباب واپس کر دیا۔ باقی بادشاہوں نے ڈنمارک کا انجام دیکھ کر اور زار روس کی اچانک موت کے باعث مجبوراً انگریزوں سے صلح کر لی۔ ایک ہی وقت میں سب نے اپنے پہلے قول و فعل کو غلط ثابت کر دیا۔

اس سفرنامہ کی تالیف کے وقت انگلینڈ کے بادشاہ کے پاس آٹھ سو تیس جنگی جہاز ہیں۔

اور ہر جہاز پر سوا توپوں سے لے کر سو توپیں تک نصب ہیں۔ انگلینڈ میں جہاز سازی کا سامان اتنی بڑی تعداد میں موجود ہے کہ تھوڑے عرصہ میں اتنے ہی جنگی جہاز اور تیار ہو سکتے ہیں۔ جتنے موجود ہیں اور تجارتی جہازوں کی تعداد سوائے کسی دانائے راز کے کوئی نہیں جان سکتا۔ ان تجارتی جہازوں میں ایک قسم کا ویلر WHALER ہے جس پر سوار ہو کر میں کیپ جنش سے آئرلینڈ آیا تھا۔ اس جہاز کا کام وہیل مچھلی کا شکار اور اس کی چربی نکالنا ہے۔ ان جہازوں پر چھ سے دس تک توپیں ہوتی ہیں اور ان کے قواعد و ضوابط بھی لگ بھگ جنگی جہازوں جیسے ہوتے ہیں۔ اکثر یہ جہاز فرنگستان کے دوسرے ممالک کے جہازوں کی روک تھام اور ان کے تعاقب کا کام کرتے ہیں فرانس کے بہت سے جہاز ان کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔ چنانچہ جس ویلر پر میں آیا تھا اس نے بھی ایک فرانسیسی جہاز کو گرفتار کر کے کیپ ٹاؤن میں چالیس ہزار ڈالر میں فروخت کر دیا تھا۔ اور قیمت کی رقم قانون کے مطابق آپس میں تقسیم کر لی۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر مخالف ملک کا جہاز خواہ حلقہ جنگ میں یا اس کے باہر مغلوب ہو جائے تو پھر اس جہاز کے سامان اور جہاز پر اس کا کوئی حق نہیں رہتا۔ بلکہ وہ غالب ہونے والے جہاز کے لئے مال غنیمت ہوتا ہے۔ چاہے اس کو شاہی ملازمین ہی نے مغلوب کیا ہو۔ سبب یہ ہے کہ جہازی ملازمین کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں۔ اور سمندر میں رہ کر یہ جانفشانی صرف مال غنیمت کے لالچ میں کرتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ اگر کوئی جنگی جہاز شاہی خدمت کے لائق ہے تو بادشاہ بازار کے نرخ کے مطابق قیمت دیکر خرید سکتا ہے۔ چنانچہ جہاز وکٹوریہ جس پر سوار ہو کر میں بنگال gal Hoan سے قسطنطنیہ آیا وہ بھی فرانس کا جنگی جہاز تھا۔ جو سات سال قبل ایڈمرل لارڈ ڈنکن کے جنگی بیڑے نے گرفتار کیا تھا اور اس جہاز کو اس کے کپتان سے معقول قیمت دے کر خرید لیا تھا۔

جہاز سازی اور توپیں ڈھالنے کے لئے کئی مقامات پر کارخانے قائم ہیں لیکن دو مشہور شہر اس کے لئے خاص طور پر وقف ہیں جہاں کاریگروں، ملاحوں اور ان کے ضروری سامان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان شہروں میں اس قدر مشینیں اور اتنے کارخانے ہیں کہ ان کا بیان باعث طوالت ہوگا۔ ایک شہر کا نام پورٹ سموتھ Portsmouth ہے یہ بڑا لنگر گاہ ہے اور دوسرے کا نام ولوچ Woolwich ہے۔ ان کے علاوہ ان مقامات پر جہاں نہریں اور ندیاں سمندر میں گرتی ہیں بڑے بڑے حوض اور باندھ تعمیر کئے ہیں۔ بعض مقامات

پر ان کا رقبہ دو دو میل تک ہے. جیسا کہ ہنرڈطن کے ذکر میں گزر چکا ہے. ان مقامات پر دس دس پندرہ پندرہ جہاز ایک وقت میں مرمت کے لئے آسکتے ہیں. کیونکہ یہ حوض میں داخلہ کا راستہ الگ اور باہر نکلنے کا الگ ہے اگر چاہیں تو درمیانی حوض کا پانی نکال دیں اور چاروں طرف کے حوض بھرے رہیں. ولوچ میں کارخانہ کے افسر کرنل پیچ Col Peach نے میری دعوت کی اس لئے مجھے وہاں جانا پڑا، اور میں نے اس جگہ توپیں ڈھالنے، گولے بنانے اور فولاد کا کام دیکھا. یہ سب کام مشینوں کے ذریعے ہو رہے تھے اور یہ سب مشین بھاپ پانی کے ذریعے چلتی ہیں. مجھے ایک بہت بڑا جہاز دکھایا گیا جو مکمل ہونے کے قریب تھا. ان مشینوں کو دیکھ کر آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے کام ان کی مدد سے بوڑھے اور بچے بھی کر سکتے ہیں. بشرطیکہ ان کو چلانا سیکھ لیں. ان کے علاوہ میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے احاطوں کے اندر لکڑی کے تختے، کیلیں، ٹاٹ اور مستولوں کی چوبیں اور جہاز سازی کا دوسرا سامان بھرا ہوا تھا. کوئی شخص بغیر اجازت احاطہ کے اندر نہیں جا سکتا. یہاں جہاز سازی کا اس قدر سامان موجود ہے کہ اگر یورپ کے تمام بادشاہوں سے انگریز دس برس تک لڑائی جاری رکھیں اور باہر سے کوئی مدد نہ ملے، تب بھی یہ سامان کافی ہوگا.

انگلینڈ کے نصف باشندے فنِ جہازرانی سے بخوبی واقف ہیں. پھر بھی یہ جماعت برابر بڑھ رہی ہے، اس لئے کہ وہاں کا معمول ہے کہ جو تاجر اپنا نیا جہاز سمندر میں اُتارتا ہے اس کو اپنے جہاز پر پانچ انگریزوں کو ضرور ملازم رکھنا پڑتا ہے.

سالانہ فوجی جائزہ

انگریز قوم کے عمدہ کاموں میں ایک یہ ہے کہ وہ جنگی قواعد کی تعلیم و تربیت اچھی طرح دیتے ہیں. توپ اور بندوق چلانا سکھاتے ہیں. اور سال میں ایک بار تمام فوجی کاموں کا جائزہ لیا جاتا ہے. اس سے خاطر خواہ حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے. اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر سال لندن کی موجودہ فوجیں لندن سے بیس میل کے فاصلے پر کسی جگہ جمع ہوتی ہیں اور اپنے بادشاہ کو لڑائی کے ہنر دکھاتی ہیں. صف آرائی کر کے باقاعدہ مصنوعی جنگ کی حالت پیدا کی جاتی ہے. توپوں کے گرجتے اور بندوقوں کے چلنے کی آوازیں، سوار اور پیدل فوجوں کی الگ الگ صف بندی، بالکل میدان کارزار کا نقشہ نظر آتا ہے. آخر میں تمام فوج حلقہ باندھ کر بادشاہ کی سلامی کے لئے تیار ہو جاتی ہے. بادشاہ گھوڑے پر سوار اپنے چند مصاحبین کے ساتھ ایک طرف سے فوج کے حلقہ میں داخل

ہوتا ہے، اور سلام لیتا ہوا پورے حلقہ کا چکر لگاتا ہے۔ اس کے بعد ایک سرے سے بندوقوں کے فیر شروع کر کے دوسرے سرے تک اتنی تیزی سے کرتے چلے جاتے ہیں کہ دیکھنے والے کو صرف آگ کے شعلہ کا ایک دائرہ سا نظر آتا ہے۔ اس طرح کئی بار فائرنگ ہوتی ہے اس کے بعد بادشاہ اپنے مقام پر واپس آتا ہے۔ اور فوج کا حلقہ جدا ہو کر ایک الگ دستہ کی صورت میں نہایت شان سے بینڈ بجاتا ہوا بادشاہ کے سامنے سے گزرتا ہے، دس بجے صبح سے پانچ بجے تک سات گھنٹہ یہی ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ اس کے بعد ہر ایک اپنے اپنے مقام پر چلا جاتا ہے۔ اس مقررہ دن پر لندن کے اکثر باشندے تماشے کے واسطے آتے ہیں۔ اور اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔

ایک ایسا فوجی تجربہ (ریہرسل) جو شہر ونزر [illegible] کے میدان میں منعقد ہوا تھا اور اس میں پچیس ہزار سوار اور پیادہ فوج تھی۔ اس کو دیکھنے کے لئے میں نے اپنے دوست مسٹر کلیو کے ہمراہ جانے کا ارادہ کیا۔ اور شروع ہونے سے ایک دن پہلے وہاں پہونچ کر شب باشی کے لئے جگہ تلاش کی۔ ہم سے پہلے ہزاروں آدمی وہاں پہونچ کر قیام گاہیں کرایہ پر لے چکے تھے اس لئے ہم کو بڑی دشواری ہوئی۔ صرف ایک رات کے لئے ایک کمرے اور دو چارپائیوں کے پچاس روپیہ دیتے تھے مگر کوئی کمرہ نہ مل سکا۔ مجبور ہو کر مسٹر کلیو نے اپنے ایک عزیز کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ آدھی رات گزری تھی کہ کھیتوں اور دیواروں کو پھاندتے ہوئے بڑی مصیبت سے وہاں پہنچے دن کا کھانا نہیں کھایا تھا اس لئے رات کو کچھ کھا کر آرام کا ارادہ کیا۔ یہ ایک اسکول کی عمارت تھی۔ مسٹر کلیو کے عزیز اس اسکول کے مالک تھے۔ اس اسکول میں ستر لڑکے پڑھتے تھے جن میں مسٹر برسٹو اور مسٹر کاکرل کے بچے بھی شامل تھے۔ میزبان نے چار چار شاگردوں میں سے دو دو کو ایک ایک پلنگ پر لٹایا اور ان دو کی جگہ ہم کو عنایت کی۔ صبح سویرے ناشتہ کر کے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور معرکہ آرائی کی جگہ پہونچے۔ وہاں پچاس ہزار سے زیادہ گاڑیاں تھیں اور لاکھوں تماشائی۔ سب فوج کے پیادہ اور سواروں کے گرد حلقہ بنائے ہوتے تھے۔ اور ہر گاڑی کی چھت پر چار پانچ عورتیں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں اس دن اس قدر حسین صورتیں نظر آئیں کہ جن کا عشر عشیر بھی کبھی لندن میں نہیں دیکھا تھا۔ پانچ بار اس دائرہ کا طواف کیا اور فوج کے عجیب و غریب ہنر اور کرتب دیکھے جن کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ بادشاہ کی روانگی اور سلامی نازرنگ کے بعد ہم اس جگہ پر آکر کھڑے ہوئے جہاں ڈیوک

آف یارکؒ سپہ سالار افواج موجود تھا۔ سپہ سالار کا خاص بینڈ اس کے سامنے بج رہا تھا۔ جب کوئی فوجی دستہ اس کے سامنے سے گزرتا تھا تو اپنا باجا بجانا شروع کر دیتا تھا۔ اور یہ بینڈ خاموش ہو جاتا تھا۔ اس باجے اور گانے کی دل کشی کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ ایسا دل تڑپانے والا گانا اور روح کو بالیدہ کرنے والی دل کش آواز میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ طبیعت کو بے حد سرور حاصل ہوا۔ اس کے سامنے لندن کے آپرہ اور تھیٹروں کا گانا وحشی جانوروں کی چیخ پکار معلوم ہوتا تھا۔

غرض یہ کہ جب تمام فوجیں اپنے ساز و سامان کے ساتھ "ڈیوک آف یارک" کے ملاحظہ سے گذر چکیں تو میں ایک تیز رفتار گاڑی پر سوار ہو کر شہر کی طرف واپس ہوا اس دن لندن میں ایک دعوت تھی، اس میں بھی شرکت نہ کر سکا۔

گھوڑ دوڑ

یہ تماشا موسم سرما میں نیو مارکٹ New market کے میدان میں ہوتا ہے۔ اور وہاں بھی اتنی ہی بھیڑ ہوتی ہے جتنی فوج کے اجتماع اور پریڈ میں ہوتی ہے۔ چونکہ کلکتہ میں گھوڑ دوڑ کا نمونہ لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس لئے یہاں اس کا تفصیلی حال بیان کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔

ٹاور آف لندن

یہ پرانا قلعہ لندن کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ لوگ اس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آتے ہیں، اور اس کے لئے تماشا خانوں سے زیادہ رقم خرچ کرتے ہیں۔ میں اپنے دوست کرنل براسویٹ colonel Brastthwaite کے شوق دلانے پر وہاں گیا۔ پہلے شاہی حیوان خانہ دیکھا جس کے اندر شیر، شیر ببر، چیتے، گلدار، کئی قسم کے بندر، ہاتھی اور تمام دنیا کے عجیب الخلقت جانور موجود تھے۔ خاص طور پر افریقہ کے جانور، جن کو میں نے نہ کبھی دیکھا تھا نہ نام سنے تھے۔ اس کے بعد اندر جا کر جواہر خانہ کی سیر کی، یہاں بادشاہ کا تاج اور عصا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام جڑاؤ سامان، جو بادشاہ اور ملکہ کے جلوس کے دن استعمال ہوتا ہے وہاں ایک دانہ زمرد اور ایک یاقوت کا دیکھا۔ یہ دونوں دس دس لاکھ روپیہ میں خریدے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ قیمتی جواہرات سے مرصع بہت سی چیزیں موجود ہیں۔ احتیاط کے خیال سے اس وقت دروازہ مقفل کر دیا گیا تھا۔ لیکن لوہے کی جالیوں سے تمام چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے بعد

اسلحہ خانہ دیکھنے گئے۔ اس کے صحن میں چھوٹی بڑی توپیں رکھی ہوئی تھیں، جن کی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ ان میں دو توپیں پچیس ۲۵ گز لمبی ہیں۔ اسلحہ خانہ کی عمارت کے پیچھے ایک بڑا ہال ہے اس کی لمبائی چوتھائی میل ہے۔ اس کے اندر ساٹھ ہزار سواروں کا جنگی سامان رکھا ہوا ہے ہزاروں کے ساز و سامان۔ توپخانوں کے گھوڑوں کے ساز، رسیاں، توپوں کی زنجیریں ترتیب وار رکھی ہیں۔ اس کے اوپر سات سو قدم لمبا ایک دالان ہے جس کے اندر طرح طرح کی بندوقیں، نیزے، سنگینیں، اور تلواریں بڑے قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے رکھنے کا انداز ایسا ہے کہ ان سے طرح طرح کے بیل بوٹے بن گئے ہیں۔

لوگوں کا بیان ہے کہ اس مکان میں ایک لاکھ بیس ہزار بندوقیں اور اتنے ہی طینچے تلواریں اور نیزے موجود ہیں۔ اس کے دوسری سمت ایک اور عمارت ہے۔ جس کے اندر لندن کے اٹھارہ بادشاہوں کے مجسمے رکھے ہوئے ہیں جو لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور سب گھوڑوں پر سوار ہیں۔ ہر بادشاہ اپنا خاص لباس پہنے ہوئے ہے اور ہتھیار لگائے ہوئے ہے۔ وہ اس طرح کھڑے ہیں کہ دیکھنے میں بالکل زندہ شخصیت نظر آتے ہیں۔ ہر شبیہ میں اصل کے مطابق رنگ و روغن چڑھایا ہے یہ نقل بالکل اصل معلوم ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ یہ انگریزوں کے قدیم ہتھیار ہیں۔ ان کی ساخت عجیب و غریب ہے۔ ان کی زرہ لوہے کی زنجیروں سے نہیں بنتی ہے۔ بلکہ جسم کے لئے چار آئینہ کی طرح، لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جسم کے اعضا کے مطابق کاٹ لیتے ہیں اور ہر ٹکڑا ایک عضو کے موافق ہوتا ہے۔ جیسے پاؤں لئے موزہ کی شکل جو پنجہ کی طرح کھلتا بند ہوتا ہے، دستانہ، بازو اور کلائی کا غلاف علیحدہ ہوتا ہے۔ سر کے لئے خود، چہرے کے لئے لوہے کا غلاف۔ جس میں آنکھ، ناک اور منہ کے مقابل سوراخ ہیں۔ غرض یہ کہ تمام جسم کے لئے خول ہے جو انگلستان کے بادشاہ قدیم زمانہ میں صبح سویرے اٹھ کر پہنتے تھے اور رات کو سونے کے وقت تک پہنے رہتے تھے۔

مشینوں اور چرخیوں کا حال

لندن کی صنعتوں کا دار و مدار اور چیزوں کی ارزانی مشینوں ہی کی وجہ سے ہے اور انگریز مشینوں کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر ضرورت کی مشین دستیاب نہ ہو تو اس کام ہی کو چھوڑ دیں گے۔ بخلاف اس کے فرانس کے لوگ بے دھڑک بغیر کسی مشین اور آلہ کے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اور محنت سے بالکل نہیں گھبراتے

ہیں. ہر قسم کی مشینوں کا بیان کرنا مشکل ہے اور ان کے کل پرزوں کی صحیح تصاویر کے بغیر سمجھ میں بھی نہ آئے گا. تاہم بعض مشینوں کا حال بیان کرنا ضروری ہے۔

ایک کار آمد چیز پن چکی ہے جو پانی میں چلتی ہے اور ایک ہوا چکی جو ہوا سے گھومتی ہے. یہ اس قدر عام ہیں کہ ہاتھ کی چکی کو کوئی جانتا بھی نہیں. اور جانتا بھی ہے تو کافی پینے کی چھوٹی سی چکی کو جو لوہے سے بنتی ہے. دوسری چیز لوہے کا چرخ ہے جو بھاپ سے چلتا ہے. اس کے ذریعہ لوہے کے بڑے بڑے ستون ڈھالے جاتے ہیں، دروازوں کے پٹ، باغوں کے جنگلے، توپوں کی خرادی اسی کے ذریعہ ہوتی ہے اس کے علاوہ جو کام انسان کے ہاتھوں کی ضرب سے ممکن نہیں وہ اس کے وزنی ہتھوڑوں کی بے پناہ ضرب سے بہت جلد انجام پاتے ہیں. آدمی کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ لوہے کو سرخ کر کے جرِ ثقیل کے ذریعے ہتھوڑے کے نیچے لائے. لوہار اس چرخ سے چھوٹے چھوٹے کام بھی لیتے ہیں۔

سوئیاں بنانیکی مشین

ایک مشین سے سوئیاں بناتے ہیں. پہلے لوہے کے تار مشین کے اندر ڈالتے ہیں اور اس کو سوئی کے برابر باریک کر کے مشین اس کو باہر نکالتی ہے. اس کے منہ سے ملی ہوئی ایک قینچی لگی ہے جو مشین کی حرکت سے تاروں کو تراش دیتی ہے اس ترکیب سے ذرا دیر میں ایک لاکھ سوئیاں تیار ہو جاتی ہیں. ایک لڑکا جو وہاں بیٹھا رہتا ہے ان کو جمع کر کے ایک اور کاریگر کو دیتا ہے، جو سوراخ کرتا ہے. وہ بھی ایک مشین کے ذریعہ تھوڑی دیر میں سوراخ کر کے تیسرے آدمی کو دیتا ہے جو نوک نکالتا ہے اور اس کو تیز کرتا ہے. تیار ہونے پر یہ سوئیاں دھیلے کی دس دس فروخت ہوتی ہیں۔

لوہے اور تانبے کی چادریں بنانے کی مشین

ایک مشین لوہے اور تانبے کی چادریں بناتی ہے، عام طور پر یہ چادریں دو گز لمبی اور پون گز چوڑی ہوتی ہیں. کاریگر دل کو یہ بھی اختیار ہے کہ جتنی بڑی چادر چاہیں بنا سکتے ہیں. میں نے لندن کے بعض مکانوں میں دیکھا ہے کہ جو کمرہ رات کی نشست کے لئے مقرر ہے اس کی چھت پر بیس مربع گز سیسے کی چادر چڑھاتے ہیں. اس کی وجہ سے چھت ٹپکنے کا اندیشہ اور دراڑ پڑ جانے کا خطرہ نہیں رہتا ہے۔

سوت کاتنے کی مشین

سوت کاتنے والی اکثر مشینیں پانی کے زور سے اور بعض بھاپ کی قوت سے چلتی ہیں. ہزاروں باریک دھاگے

ایک دفعہ میں نکلتے چلے آتے ہیں۔ ایک لڑکا یا عورت صرف اس غرض سے بیٹھی رہتی ہے کہ جس چرخی کی روئی ختم ہو جائے تو اس میں اور روئی ڈال دے یا اگر کوئی تار ٹوٹ جائے تو اس کو جوڑ دیا کرے اس مشین میں اس قدر باریک سوت بھی کاتا جاتا ہے کہ لندن میں ڈھاکہ کی ململ اور اعلیٰ درجہ کا کپڑا تیار ہو کر اس سے ارزاں فروخت ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس کا سوت زیادہ بٹا ہوا ہوتا ہے اس لئے ڈھاکہ کی ململ جیسا ملائم نہیں ہوتا اور چند بار دھلنے کے بعد اس کی صورت اور چمک میں فرق آجاتا ہے۔

تارکشی کی مشین

اس مشین کے ذریعے باریک سے باریک تار کھینچ سکتے ہیں۔ چنانچہ وہاں مشہور ہے کہ ایک شخص نے چاندی کے ذرا سے ریزے سے ایک تار کھینچا جس کا طول لندن سے ونزر تک ہوا جو بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ ایسی ہی رسی بنانے کی مشین ہے جس کے ذریعہ تھوڑی دیر میں نہایت صاف اور سڈول ایک ہزار گز لمبی رسی بٹی جا سکتی ہے اور اس کے بل میں کہیں فرق نہ ہو گا۔

پورٹر سازی کا کارخانہ

پورٹر PORTER جو کی شراب کو کہتے ہیں اس کے بنانے کا ایک کارخانہ ہے اس کے اندر متعدد کمرے ہیں ہر کمرہ ایک خاص کام کے لئے مخصوص ہے۔ انگریزی میں اس پورے مکان کو مشینری کہتے ہیں۔ اس میں بہت سے چرخ لگے ہوئے ہیں۔ جو بھاپ کی قوت سے گردش کرتے ہیں۔ ایک حصے میں جو ذخیرہ رکھا جاتا ہے اور ایک جگہ اس کو سڑایا جاتا ہے اور دوسری جگہ بھگو کر لاہن تیار کیا جاتا ہے۔ ایک چرخ ایک کنویں کے منہ پر نصب ہے اور کنویں کی تہہ میں پانی کے نیچے لوہے کا تختہ رکھا گیا ہے اس کے نیچے آگ جلتی ہے۔ پانی گرم ہونے سے بھاپ بنتی ہے اور یہ بھاپ اوپر کو چڑھتی ہے اور چرخ کو حرکت دیتی ہے پھر یہ بھاپ چھت سے ٹکرا کر پانی بن جاتی ہے اور کنویں میں ٹپک پڑتی ہے۔ لہٰذا کنویں کا پانی بھی کم نہیں ہوتا یہاں جو شراب بنتی ہے وہ عام لوگوں کے لئے ہوتی ہے اور وہ روٹی کی طرح ارزاں ہے۔ میں اپنے ایک دوست مسٹر رابرٹ کلیسی کے ساتھ یہ کارخانہ دیکھنے گیا کلیسی کا باپ اس کارخانہ کا مالک ہے۔ اس نے گائے کے گوشت کے کباب کھلائے۔ جو مشین سے آتش دان میں پکے تھے اور نہایت لذیذ تھے۔ مشینوں کے ذریعہ کام ہونے کے باوجود باون ۵۲ آدمی اس کارخانہ میں ہمیشہ کام کرتے ہیں۔ جزوی باتوں کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں ہے مالک کارخانہ نے مجھ سے کہا کہ اگر یہ چرخ بھاپ کے زور سے نہ گھومتا تو پچیس ۲۵ گھوڑے اس کو

گھمانے کے لئے درکار ہوتے اور چونکہ ایک جانور ہر روز کام نہیں دے سکتا تو ان پچیس[۲۵] گھوڑوں کی مدد کے لئے پچیس[۲۵] اور رکھنا پڑتے۔ اس طرح پچاس گھوڑوں کا خرچ اور سائیسوں کی تنخواہ وغیرہ پورٹر کی قیمت پر اثر انداز ہوتی جو اس وقت دو آنہ کی آدھ سیر ملتی ہے۔ اگر قیمت میں اضافہ ہوتا تو شہر کے لوگ اس کو کس طرح برداشت کرتے۔

پیپر مل (کارخانہ کاغذ سازی)

اس کارخانہ میں ہر قسم کا کاغذ تیار کیا جاتا ہے اگر چاہیں تو ایک کاغذ کا تختہ بیس مربع گز تک تیار کرا سکتے ہیں۔ میرے دورانِ قیام میں جَو کی خشک تیلیوں سے کاغذ تیار کیا گیا جو چکناہٹ اور دبانت میں معمولی مروجہ کاغذ سے دس گنا زیادہ تھا۔

دریا کا پانی بلندی پر چڑھانے کی مشین اور نلوں کا رواج

ایک ایسی مشین ہے کہ اس کی طاقت سے دریا کا پانی بلند ہو کر زمین پر گرتا ہے جس سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی اس قدر اونچے منبع میں چڑھاتے ہیں۔ جہاں سے سہ منزلہ اور چہار منزلہ مکانوں کی چھتوں تک پانی آسانی سے پہونچ جاتا ہے۔ اور اونچے طبقے کے لوگوں کو پانی کے واسطے نیچے اترنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چنانچہ لندن کی ہر سڑک میں سیسہ کے نل دوڑے ہوئے ہیں اور ان کی شاخیں ہر گھر میں پہونچا دی گئی ہیں۔ اکثر مکانوں کی تیسری اور چوتھی منزل پر انہیں نلوں کے ذریعے پانی پہونچتا ہے۔ پانی پہنچانے کا یہ کارخانہ دریا کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے۔

ہینڈ پمپ

یہ سر بند کنویں پر نصب کیا جاتا ہے۔ اس میں لوہے کا ایک دستہ لگا ہوتا ہے اور نیچے پانی نکلنے کی نالی بنی ہوتی ہے اس دستے کو نیچے اور اوپر کی طرف دبانے سے پانی نل میں چڑھتا ہے اور نالی میں سے نکلنے لگتا ہے حسب ضرورت اس سے برتن بھر لیتے ہیں اور ڈول اور رسّی کی محنت سے بچ جاتے ہیں۔ اس ملک میں ڈول اور رسّی سے کوئی واقف بھی نہیں ہے۔

ان مشینوں کے علاوہ اناج پھٹکنے، تیل پیلنے اور ہر قسم کے دوسرے کاموں کے لئے بھی مشینیں موجود ہیں جو بھاپ اور پانی کی قوت سے چلتی ہیں۔ کیونکہ اس ملک کے لوگ وقت ضائع ہونے اور دیر میں کام ہونے سے گھبراتے ہیں۔ اسی لئے باورچی خانہ تک میں کباب کی سیخ چلنے

گیہوں، چاول کوٹنے اور قیمہ بنانے کی مشینیں بھی موجود ہیں۔

چھپائی کا کارخانہ (پریس) یہ نہایت مفید صنعتوں میں ایک اعلیٰ درجہ کی صنعت ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے اشاعت علوم کا کام انجام پاتا ہے۔ جو تصنیف و تالیف کی علّت غائی ہے۔ اس کے علاوہ بے سلیقہ کاتبوں کی تصحیف و ترمیم سے کتاب کے مضامین محفوظ ہو جاتے ہیں[1]۔ چونکہ کلکتہ میں چھاپہ خانے قائم ہو جانے کی وجہ سے اس صنعت سے ہندوستانیوں کو بھی واقفیت ہو گئی ہے اس لیے پریس کے متعلق تفصیلات بتانے کی ضرورت نہیں ہے البتہ تصاویر چھاپنے کا حال لکھا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ ہے پہلے کاغذ پر تصویر کھینچتے ہیں جب وہ لوگوں کو پسند آجاتی ہے تو ایک پیتل کی تختی اس تصویر کے برابر تراشتے ہیں اور اس کو خوب صاف کر کے چمکاتے ہیں۔ اس کے بعد کاغذی تصویر کے مطابق اس پر ہلکے خطوط اور نقوش بناتے ہیں۔ جن کو سوا مصوّر کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ پھر ان خطوط پر تیزاب ڈالتے ہیں جس سے تمام خطوط اور نقوش پیتل کی تختی میں کندہ ہو جاتے ہیں۔ بعض خطوط پر ایک بار اور بعض پر تین چار مرتبہ تیزاب لگایا جاتا ہے جس سے نقوش میں گہرائی اور ہلکا پن پیدا ہو جاتا ہے اور لباس اور سایا اور کپڑوں کی شکنیں وغیرہ ہر چیز ظاہر ہو جاتی ہے جیسی سیاہ قلم تصویروں میں ہوتی ہے جس جگہ تیزاب کا اثر نہیں چاہتے ہیں اس جگہ ایک خاص قسم کا روغن لگا دیتے ہیں جس سے وہ مقامات محفوظ رہتے ہیں۔ جب یہ پلیٹ[2] اس طرح تیار ہو گئی تو اس سے ہزاروں تصویریں کتاب کی طرح چھاپ لیتے ہیں۔ اب یہ تصویر سادہ اور سیاہ قلم ہوتی ہے اور جب اس کو اصلی کاغذی تصویر کے مطابق رنگین بنانا چاہتے ہیں تو لڑکوں اور شاگردوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ اصل تصویر کو دیکھ کر جا بجا ویسے ہی رنگ بھر دیتے ہیں۔ اس طریقے سے ایسی آسانی ہو گئی ہے کہ جس قلمی اور دستی تصویر کی قیمت چالیس گنّی تھی اب ویسے ہی چھپی ہوئی ایک گنّی سے نصف گنّی تک فروخت ہوتی ہے۔

---

[1] یہ وصف ٹائپ کے چھاپے میں ہے۔ ہندوستان میں ہاتھ کی لکھی تحریر جو پتھر یا پلیٹ پر چھپتی ہے اس میں زیادہ غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

[2] مراد، بلاک سے ہے (مترجم)

انگلینڈ کے تحائف اور نادر اشیاء کا بیان

ساری چیزیں کاریگروں کی عقل و ہنر اور سبک دستی کے ساتھ ساتھ مشینوں اور کلوں کی قوت اور مدد سے بنتی ہیں۔ جس چیز کو دیکھ کر آپ حیرت میں پڑ جاتے ہیں اس کے کارخانہ میں جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہر شخص یہ چیز تیار کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ جو کام محنت اور جانفشانی کے ہیں وہ تو مشینوں کے سپرد ہیں اور جن باریک کاموں میں نگاہ کی تیزی درکار ہوتی ہے ان میں عینکوں اور محدب شیشوں سے مدد لیتے ہیں۔ اگر کسی چیز کے بنانے میں مختلف قسم کے کام کرنا پڑتے ہوں جو کہ پریشانی کا باعث ہوں تو اسے الگ الگ کاریگروں کے پاس بھیج کر بہت اچھی طرح انجام دیا جاتا ہے۔ مثلاً سوئی کا بیان ہو چکا ہے کہ ابتدا سے آخر تک دس ہاتھوں سے زیادہ میں ہو کر نکلتی ہے۔ اسی طرح گھڑی کا معاملہ ہے ہر پرزہ ایک ایک کاریگر بناتا ہے اور ایک شخص مختلف کاریگروں سے اس کے تمام پرزے خرید کر سب کو ترکیب دیتا ہے اور گھڑی مکمل ہو جاتی ہے۔

کسی چیز کے بنانے میں اگر ایک ہی شخص کو ہاتھ پاؤں کی طاقت کے ساتھ دماغ، ذہن اور نگاہ سے بھی کام لینا پڑے تو وہ چیز اتنی عمدہ نہیں بن سکتی جتنی کئی لوگوں کے مل کر بنانے سے صفائی کے ساتھ تیار ہو رہی ہے۔

اس ملک کی مشہور چیزوں میں لوہے، لکڑی اور چمڑے کی مصنوعات ہیں جو تمام فرنگستان بلکہ تمام دنیا میں سب سے بہتر ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ گھڑی سازی، ریشمی کپڑے، شیشہ کے برتن بانات، بندوق، پستول، تلواریں، چاقو، قینچیاں اور تصویریں قابل دید ہوتی ہیں۔ یہاں ایک قسم کی چقماقی بندوق نئی ایجاد ہوئی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اگر بندوق ایک ہفتہ تک پانی میں پڑی رہے تو بھی بارود کے پیالہ میں نمی نہیں پہونچے گی۔ بلکہ پانی ہی میں بندوق چلا سکتے ہیں۔ مسٹر نلٹن جس نے لکھنؤ میں بہت شہرت حاصل کی یہاں بھی اس کی دوکان دیکھنے گیا۔ وہ نہایت معمولی اور گھٹیا درجہ کی دوکان ہے۔

جشن شادی میں رسم چراغاں

شادیوں اور دیگر خوشی کی تقریبات میں روشنی کرنے کا یہاں خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ عام طور پر بادشاہ، ملکہ اور ولی عہد کے ایام ولادت کے موقع پر چراغاں کیا جاتا ہے اور بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ یوں تو میں

نے ہندوستان میں یہاں سے زیادہ روشنیاں دیکھی ہیں خاص طور پر وزیر علی کی شادی کے موقع پر عیش باغ لکھنؤ کے میدان میں پانچ میل کے حلقے کے اندر ایک پنڈال بنایا گیا تھا اس میں بڑے بڑے برج اور بیس بیس گز اونچے بنگلے بنا کر سب میں روشنی کی گئی تھی لیکن اس میں کوئی جدت اور سلیقہ نہ تھا اس لئے یہاں کے مقابلے میں وہ بھدی نظر آتی تھی اور معمولی معلوم ہوتی تھی۔ اس ملک میں روشنی کی جاتی ہے تو ہوا کی رفتار اور روشنی کی کمی و بیشی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ بتیوں کو پھول دار بلوریں قمقموں میں لگاتے ہیں۔ اور ان کو دیواروں اور مکانوں اور دوکانوں کے سامنے کے حصوں میں لگے ہوئے لوہے کے کھمبوں سے باندھ دیتے ہیں ــــ اور اس ترتیب سے لگاتے ہیں کہ اس سے طرح طرح کی شکلیں بن جاتی ہیں۔ مختلف رنگوں کے قمقموں سے بادشاہ اور ملکہ کی تصاویر مع لباس اور تاج کے بناتے ہیں۔ کہیں پھولوں کے پودوں اور پھلوں کے درخت بناتے ہیں۔ بعض مقامات پر قمقموں کی مدد سے مختلف عبارتیں صاف اور خوشخط نظر آتی ہیں۔

یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ مکانوں کی دیواریں اور دوکانیں یہاں ایک قطار اور سیدھ میں ہی ہوتی ہیں۔ مکانوں اور دوکانوں پر روشنی کرنا ان کے مالکوں کے ذمہ ہوتا ہے اس لیے جشن چراغاں کے موقع پر ہر ایک اپنی مہارت اور سلیقہ دکھا کر تعریف کرانے کے خیال سے ایک دوسرے سے بہتر طریقہ پر روشنی کا انتظام کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ روشنی نہایت پر رونق اور فرحت افزا ہوتی ہے۔ جشن صلح کے موقع پر جو چراغاں ہوا۔ اس میں میرا گزر ایک مکان کی طرف ہوا۔ جس کا مالک اشیاء کی گرانی سے کبیدہ خاطر تھا۔ اور صلح کے موقع پر ارزانی کی امید لگائے ہوئے تھا۔ اس کے دروازے پر ایک عجیب ایجاد نظر آتی۔ جو بہت پر لطف تھی۔ اس نے قمقموں کو ترتیب دیکر ایک پورٹر اور ایک پرتن کی تصویر بنائی تھی۔ اور دونوں کے نیچے روشنی کے ذریعہ یہ عبارت لکھی تھی۔ کہ پورٹر سے روٹی کہہ رہی ہے "اب میرا نرخ گھٹنا چاہتا ہے" پورٹر جواب دیتا ہے "ایسے ہی میرا بھی"۔

ان چراغوں کی خوبصورتی سڑکوں پر مربع قطاروں میں اور سڑکوں سے ملے ہوئے کوچوں کی سیدھ میں ایک ہی بار جلوہ گر ہونے سے دوگنی معلوم ہوتی ہے جس رات روشنی ہوتی ہے۔ سواروں پیادوں اور گاڑیوں کی بڑی ریل پیل ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے محلوں میں راہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر بانڈ اسٹریٹ سینٹ جیمز اسٹریٹ۔ پال مال اور آکسفورڈ روڈ پر تو آدمی ایک گھنٹہ میں بمشکل ایک تیر کے برابر راہ چل سکتا ہے۔ اور کمزوروں اور ضعیفوں کے

لئے جان کا خطرہ ہوتا ہے کیونکہ جگہ جگہ آتش بازی داغی جاتی ہے۔ بندوقیں اور پستول چلائے جاتے ہیں۔ غرض ایک ہنگامہ ہوتا ہے، اگر دھکم دھکا میں کوئی گر پڑے تو اٹھنا مشکل ہوتا ہے۔

حکایت | جشنِ صلح کی روشنی کی تیسری رات کو سفیر فرانس مسٹر آٹو کے مکان پر روشنی کا انتظام ہوا۔ جس کا وہ دو ماہ قبل سے اہتمام کر رہا تھا۔ اور روشنی پر پندرہ ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا میں وہاں ہجوم کے باعث رات کو جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے دن میں صرف اس لئے گیا کہ روشنی نہ سہی اس کے نقش و نگار ہی سے لطف اٹھاؤں گا۔ لیکن اس وقت بھی تماشائیوں کی وہ کثرت اور شور و غل تھا کہ میری وہاں تک رسائی نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ اسی وقت ایک جھگڑا بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ یہ کہ مسٹر آٹو نے اپنی پختہ کاری اور ناموری کے پیش نظر روشنی کی عبارتوں سے ایسے جملے بنائے تھے جو ذو معنی تھے۔ مثلاً پیس اینڈ کنکرڈ Peace and concord یعنی صلح اور دوستی اور دوسرے معنی صلح بعد فتح، اس کو دیکھ کر بعض انگریزی سپاہی جو تماشا دیکھنے آئے تھے بگڑ گئے اور ان کی رگِ جاہلیت بھڑک اٹھی اور انہوں نے روشنی کے قمقمے توڑنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر آٹو OTTO نے باہر نکل کر ان کو سمجھایا کہ کنکرڈ concord بمعنی فتح حرکت اعراب میں اس لفظ سے مختلف ہے، مگر سپاہیوں نے نہیں مانا۔ جب تک مسٹر آٹو نے اس لفظ کو بدل کر امٹی Amity نہیں بنا دیا جس کے وہی ایک معنی ہیں۔ غرض یہ کہ نصف شب کو میں نے وہاں جانے کا دوبارہ ارادہ کیا اس خیال سے کہ اب بھیڑ کم ہوگی۔ باوجود یکہ یہ سڑک بہت کشادہ ہے۔ پھر بھی میں جس طرف سے نکلنا چاہتا تھا گاڑیوں کی کثرت کے باعث ایک ایک میل تک راستہ بند تھا۔ آخر کار آکسفورڈ روڈ سے ہائڈ پارک اسٹریٹ کی طرف گیا جو شہر کے ایک سمت واقع ہے اور وہاں سے وہ راستہ پکڑا جو مذکورہ سڑک پر ختم ہوتا تھا اور اس میں بھی آنے جانے والوں کی دھکم دھکا اور گاڑیوں کی کثرت کے باعث جان کا خطرہ نظر آیا۔ چوٹ لگنا، کپڑے پھٹ جانا اس ہجوم میں معمولی بات تھی ہجوم میں شامل عورتوں کے لباس تار تار نظر آئے۔ کسی کی ٹوپی گری، کسی کا زیور رہ گیا۔ وہ ہر ایک سے مدد کی درخواست کرتی تھیں لیکن وہاں نفسی نفسی کا عالم تھا، کوئی کسی کی نہیں سنتا تھا میں نے یہ ہنگامہ دیکھ کر واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر وہ بھی مشکل نظر آیا۔ مگر بڑی دشواری سے مکانات کے تہ خانوں میں لگے ہوئے جنگلوں کو پکڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ دو گھنٹہ اپنی جسمانی قوت کی مدد سے اس راستے کو طے کر کے سڑک پر اطمینان کی جگہ پہونچ گیا۔ اور اچھی طرح تماشا

دیکھنے کے بعد ایک جگہ راستہ کھلنے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ سڑک کے اس پار جانا مشکل تھا بہت سے لوگ جو یہ چاہتے تھے کہ بغیر تماشا دیکھے واپس چلے جائیں وہ بھی نہیں جا سکے کیوں کہ ان کے پیچھے بھی گاڑیوں کی قطار تھی میں تین کو گھر پہنچ سکا اور لوگ تو دن چڑھے تک وہاں پھنسے رہے۔ مختصر یہ کہ مسٹر آٹو Mr. Otto کے جشن چراغاں میں اہل فرانس کی فطری عادت کے مطابق نقش و نگار اور طرح طرح کے رنگ بکثرت استعمال کئے گئے تھے۔ اس لئے سادگی کا لطف جاتا رہا تھا، اور باوجود اتنی مشقت اٹھانے کے یہ تماشا مجھے پسند نہیں آیا۔ البتہ کاؤنٹس اسکوائر [illegible] اور خاص طور پر مسٹر ہوپ Mr. Hope کے مکان کی روشنی مجھے بہت پسند آئی جس نے مسٹر آٹو کی طرح صلح کی خوشی میں بہت خرچ کیا تھا، اور ہر چیز میں سادگی کا خیال رکھا تھا اور بہت دل چسپ ایجادات سے اس کی زینت بڑھائی تھی۔ اس کو دیکھ کر بہت لطف حاصل کیا۔

انگریزوں کی تقسیم اوقات

اوسط درجے کے انگریز عموماً صبح آٹھ بجے کے بعد سو کر اٹھتے ہیں اور ڈیڑھ گھنٹے میں حوائج ضروریہ سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک چھ گھنٹے اپنے فرائض منصبی خواہ ملازمت ہو یا تجارت انجام دیتے ہیں، اور اپنے معاش کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنر Dinner یعنی دن کا کھانا کھاتے ہیں پھر دو گھنٹے زنان خانہ میں اور ایک گھنٹہ مردوں کی صحبت میں وقت گزارتے ہیں۔ آٹھ بجے کے بعد شب نشینی کے جلسوں میں حاضری دیتے ہیں۔ لوگ جو مجرد ہیں وہ دو گھنٹے ڈنر کی میز پر صرف کر کے ٹہلنے اور تفریح کرنے کے لئے نکلتے ہیں یا کسی تھیٹر میں چلے جاتے ہیں۔ اور گیارہ بجے رات تک تماشے سے دل بہلاتے ہیں اس کے بعد مکان پر واپس آ کر بارہ بجے شب کے قریب سو جاتے ہیں۔ جو لوگ دعوتوں میں مدعو ہوتے ہیں، رات کی مجلس میں شرکت کرتے ہیں اور موسیقی وغیرہ سے لطف اٹھاتے ہیں یا پھر قمار بازی کی میز پر پہونچ جاتے ہیں۔ چونکہ ۹ بجے سے گیارہ بجے تک زیادہ وقت نہیں ہوتا اس لئے قمار بازی میں سب وقت نہیں صرف کر سکتے ہیں۔ اور اس مقررہ وقت کے علاوہ کوئی شخص یہ شغل نہیں کر سکتا جو رقم جیتتے ہیں اس کو الگ رکھتے جاتے ہیں اور کبھی خرچ نہیں کرتے۔ البتہ جب ہارتے ہیں تو اسی رقم میں سے ادا کرتے ہیں ورنہ جواریوں کی پارٹی میں شامل سمجھے جائیں اور بدنام ہو جائیں۔ گیارہ بجے رات کا کھانا سپر Supper کھاتے ہیں اس میں ٹھنڈے کباب اور کچھ حلوے اور شراب

ہوتی ہے بارہ بجے کے قریب سونے کے لئے لیٹ جاتے ہیں۔

انگریزی کھانے اور کھانے کا طریقہ

انگریزی کھانے بہت بامزہ اور وقت اور طبیعت کے مناسب حال ہوتے ہیں اور ڈنر کی میز پر یکے بعد دیگرے اس ترتیب سے لائے جاتے ہیں کہ پہلے شوربا، روٹی، مچھلی اور گوشت کی بنی ہوئی دوسری چیزیں دوسرے دور میں کباب، مرغ، پرندوں کا گوشت یا کباب اور حلوے تیسری دفعہ تازہ اور خشک میوے۔ باوجود انواع واقسام کی غذاؤں کے کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھاتے ہیں۔ اس طرح بعض لوگ دن رات میں چار دفعہ اور کچھ لوگ پانچ بار کھا کر ہضم کر لیتے ہیں۔ کھانے کے تین وقت تو مقرر ہی ہیں مگر حاضری اور چاشت کے درمیان بھی کچھ کھا لیتے ہیں جس کو ٹفن Tiffin کہتے ہیں۔ ڈنر اور رات کے کھانے کے درمیان چائے کے ساتھ روٹی اور مکھن استعمال کرتے ہیں۔

سونے جاگنے کے اوقات

صبح آٹھ بجے سے لے کر نصف شب تک کہ سولہ گھنٹے ہوئے آرام نہیں کرتے ہیں اور کھانا کھانے سے پہلے جو کسل معلوم ہوتا ہے اس کو ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدل کر اور کھانا کھانے کے ذریعہ دور کر دیتے ہیں اور کھانے کے بعد تکان اور طبیعت کے انقباض کو زنانہ مجلسوں اور تماشا خانوں میں جا کر دور کرتے ہیں لہٰذا دن میں جو کاروبار کا وقت ہے اس میں کوئی سستی محسوس نہیں ہوتی ہے اور رات کو خوب گہری نیند سوتے ہیں۔ اونچے طبقے کے لوگ متوسط طبقہ والوں سے ایک گھنٹہ بعد یہ اشغال شروع کرتے ہیں اور ایک یا دو گھنٹہ بعد ختم کرتے ہیں۔ اور معمولی طبقہ کے لوگ متوسط طبقہ والوں سے ایک گھنٹہ قبل کام شروع کرتے ہیں دو گھنٹہ قبل ختم کر دیتے ہیں۔

انگلینڈ کے لیل ونہار

موسم سرما کے وسط میں سورج آٹھ بجے کے بعد طلوع ہوتا ہے اور تین بجے غروب ہو جاتا ہے۔ سات گھنٹہ کا دن ہوتا ہے اور اگر صبح وشام کی سفیدی ظاہر ہونے کے اوقات شامل کر دیئے جائیں جو دو گھنٹہ ہوتے ہیں تو دن نو گھنٹہ کا اور رات پندرہ گھنٹے کی ہوتی ہے۔ اس کے بخلاف موسم گرما میں پانچ بجے سورج طلوع ہوتا ہے اور دس بجے کے بعد غروب ہوتا ہے (ہندوستان کے حساب سے رات کے دس بجے کے بعد) اور اس موسم میں ڈھائی گھنٹہ صبح کی سفیدی اور ڈیڑھ گھنٹہ

شام کی سفیدی قائم رہتی ہے اور رات دن کے گھٹنے بڑھنے کا وہاں یہ حساب ہے کہ اکیسویں دسمبر سے جو موسم سرما کا وسط ہے، رات گھٹنا شروع ہوتی ہے اور اکیس مارچ کو رات دن برابر ہو جاتے ہیں۔ یعنی رات کے سترہ گھنٹوں میں سے پانچ گھٹ کر بارہ گھنٹے باقی رہ جاتے ہیں۔ پھر اکیس[21] مارچ سے ۲۱ جون تک رات اس مقدار میں سے کم ہوتے ہوتے سات گھنٹہ رہ جاتی ہے اور یہ وقت دن کی انتہائی درازی کا ہے یعنی سترہ گھنٹہ دن رہتا ہے۔ پھر اکیس[21] جون سے کم ہونا شروع ہوتا ہے اور اکیس[21] ستمبر کو رات دن برابر ہو جاتے ہیں پھر اکیس[21] ستمبر سے اکیس[21] دسمبر تک اصل میں سے بھی پانچ گھنٹہ اور کم ہو کر دن سات گھنٹہ کا رہ جاتا ہے یہ زمانہ رات کی انتہائی درازی کا ہوتا ہے۔ لیکن شمالی انگلینڈ کی سرحد پر رات دن کی لمبائی اٹھارہ گھنٹہ تک ہوتی ہے اور گرمیوں کے وسط میں تو چند دن تک رات ہوتی ہی نہیں۔ یا سورج نظر آتا ہے یا شام و صبح کی حالت قائم رہتی ہے۔ مذکورہ تینوں طبقوں کے لوگ اسی کے مطابق اپنے کام اور آرام کے اوقات تقسیم کر لیتے ہیں۔

عورتوں اور مردوں میں فرائض کی تقسیم

عام طور پر ہلکے کام جن میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی ہے وہ سب عورتیں کرتی ہیں۔ مثلاً کھانا، پکانا، آتش دان میں آگ جلانا، گھر کی صفائی، برتن دھونا، پلنگ اور بستر بچھانا، دوکان کی نگرانی، سودا فروخت کرنا۔ اور جن کاموں میں زیادہ مشقت کرنا پڑتی ہے یا مشوروں اور تدبیروں کے ذریعہ انجام دیئے جاتے ہیں وہ سب مرد کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس کے خلاف کیا جائے تو ان کا انجام پانا مشکل ہوگا اگر ہندوستان کی طرح عورتوں کے سپرد کوئی کام نہ کیا جائے تو ان کی کاہلی اور ناتوانی میں ترقی ہوتی ہے۔ دوکانوں پر عورتوں کے بیٹھنے سے یہ فائدہ بھی ہے کہ ان کے حسن و شیرینی گفتار کے باعث خریدار زیادہ آتے ہیں۔ خود میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر بھی اس کا اثر ہوا چنانچہ نیومین اسٹریٹ New man street کے کنارہ پر جو آکسفورڈ روڈ سے ملتا ہے ایک حلوائی کی دوکان تھی جس پر ایک خوبصورت اور خوش ادا لڑکی بیٹھتی تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں اس طرف سے گزرا ہوں اور اس کی میٹھی میٹھی باتیں سننے کے لئے تھوڑی بہت مٹھائی نہ خریدی ہو۔ عورتوں کا کاروبار میں مصروف رہنا اس لئے بھی بہت اچھا ہے کہ وہ میرے خیالات اور شوہروں کے ساتھ لڑائی جھگڑے سے محفوظ رہتی ہیں۔

انگلینڈ کے ذی فہم لوگوں نے مذکورہ اشتغال کے علاوہ ایسے قواعد و ضوابط بھی مقرر کئے ہیں۔ جو غیر مردوں سے ربط و ضبط رکھنے اور بے پردگی کے باوجود عورتوں کو بدچلنی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ مثلاً ڈنر یا شب کی محفل میں جب تمام لوگ جمع ہوں اس وقت عورتیں شرکت کر سکتی ہیں۔

غیر شادی شدہ شخص کی محفل پر عورتوں کو جانا منع ہے۔ گھر سے باہر جانے کے لئے شوہر کا ساتھ ہونا ضروری ہے یا پھر باپ یا شوہر کے کسی عزیز قریب یا شوہر کے کسی معتمد ملازم کے ہمراہ، اور شام کے بعد عورت کا باہر جانا ممنوع ہے۔ شوہر کی خواب گاہ کے علاوہ کسی جگہ آرام کرنا چاہے وہ والدین ہی کا گھر کیوں نہ ہو منع ہے۔ لہٰذا ان وجوہات کی بنا پر ان کو بُرے خیالات کا موقع ہی نہیں ملتا۔ شادی کے بعد والدین سے ملنا جلنا تو زیادہ تر ترک ہو جاتا ہے۔ ان کی شرع میں یہ بھی جائز ہے کہ اگر عورت شوہر کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرے تو اس کو ایک عرصہ تک کسی مکان میں بند کر دیا جائے۔ اور جسمانی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ مگر اس طرح کہ جسم کا کوئی عضو نہ ٹوٹے۔ اسی لئے عورت معمولی جھگڑوں اور زبانی تکرار کی جرارت بھی نہیں کر سکتی۔ اگر کسی عورت کی بدکاری ثابت ہو جائے تو اس کے اقربا اور تمام دوسری شریف عورتیں اس سے کنارہ کشی کر لیتی ہیں اور شوہر شرع کے مطابق اپنی اولاد اور روپیہ اور زیور وغیرہ چھین کر اس کو گھر سے نکال سکتا ہے۔ جو عورتیں اپنی آبرو اور اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھتی ہیں وہ مصیبتوں کے خوف سے کبھی بدکاری پر آمادہ نہیں ہوتی ہیں۔ ان پابندیوں کے باوجود بھی اگر کوئی عورت نفس کے بھڑکانے یا شوہر کی عدم توجہ کے باعث کسی حسین و جوان مال دار شخص کے لبھانے کے باعث بدچلنی اختیار کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو قواعد کی سختی اور بدنامی کے خطرہ سے واقف ہونے کے باعث ملاقات تو اپنے چاہنے والے سے کرتی ہے مگر دونوں دل کے جوش و ولولے کو ضبط کئے رہتے ہیں تاکہ کوئی ایسی علامت نہ ظاہر ہو جو شوہر اور خاندان کی فضیحت کا سبب بنے۔

اس کے علاوہ انگریز عورتوں کو شوہر کے مال و اسباب اور اپنے جہیز کے سامان اور اولاد پر کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ اس لئے بدچلنی کی حالت میں بھی وہ ہندوستانی عورتوں کی طرح گھر بار کو تباہ نہیں کر سکتی ہیں۔ ان حالات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انگریزوں نے عورتوں کو بظاہر تو آزادی دے رکھی ہے اور بہت ناز برداری بھی کرتے ہیں مگر عقلمندی کے ساتھ ان کو اس طرح قید کر دیا ہے کہ عورتوں کو یہ پابندی گراں بھی نہ گزرے۔ اور مسلمانوں نے باوجود پردہ کی رسم کے جو ایک

قسم کی قید ہے اپنی نادانیوں سے ان عورتوں کو بد اطواریوں کی آزادی دے دیتا ہے۔ تمام مال و اسباب روپیہ پیسہ بال بچوں اور ماؤں اور اصیلوں پر عورتوں کا اختیار ہوتا ہے۔ وہ آزادی سے اپنے والدین اور اعزا کے گھر جا کر ایک ایک ہفتہ اور مہینہ مہینہ بھر بلا تکلف رہتی ہیں۔

دوکانداروں کا برتاؤ خریداروں سے

کاروباری لوگ نہایت شریف ہیں اپنی وضع قطع علمی لیاقت اور سوجھ بوجھ میں عمائدین شہر اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ نہایت متحمل اور خوش مزاج ہوتے ہیں۔ خریدار کتنا ہی جھنجھٹ اور تکرار کرے لیکن ان کے رویہ میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ سنا گیا ہے کہ کسی شخص نے جان بوجھ کر امتحان کی غرض سے ایک بزاز کی دوکان پر جا کر بانات خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور پورا ایک گھنٹہ تھانوں کو الٹنے پلٹنے اور قیمت چکانے میں صرف کیا۔ کپڑوں کے بہت سے گٹھر کھلوانے، اور بندھوانے کے بعد ایک تھان پسند کیا اور دس روپیہ گز قیمت طے کی، ان تمام جھگڑوں کے بعد دوکاندار کو خیال تھا کہ کم سے کم پانچ چھ گز بانات ضرور خریدے گا۔ مگر اس خریدار نے جیب سے ایک شلنگ نکال کر دیا کہ اس کی بانات دے دو۔ دوکاندار نے بڑی خندہ پیشانی سے لے لیا اور اس شلنگ کو تھان کے ایک کونہ پر رکھا اور قینچی سے اسی کے برابر ایک گول ٹکی بھر کاٹ کر خریدار کو دے دیا۔

دوکاندار عام طور پر خریداروں پر اعتماد کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز میں چاندی کے سامان کی دوکان پر گیا اور پچاس روپیہ میں دو گھڑیاں طے کیں۔ اور اپنے مکان کا پتہ دوکاندار کو بتا کر اس سے کہا اگر کل دوپہر تک مجھ کو مہلت دو تو اپنے دو ایک دوستوں کو گھڑیاں دکھا لوں تب خرید لوں گا۔ اس نے میرے اجنبی ہونے کے باوجود میری بات مان لی۔ میرے ایک دوست نے مجھے منع کیا کہ مت خریدو، لیکن میں نے دوکاندار کی مروت سے شرم کر کے دوسرے روز وقت مقررہ پر روپیہ پہونچا دیا۔ معمولی قسم کے دوکاندار اکثر بیہودہ ہوتے ہیں اور اکثر بے ایمانی بھی کرتے ہیں۔ لیکن بہت فرماں بردار رہتے ہیں اور اپنے مستقل خریداروں کے یہاں ٹھیک وقت پر سامان پہونچا دیتے ہیں۔ نہ تو وہ وقت کی برائی بھلائی بیان کرتے ہیں نہ کسی چیز کی کم خریداری کا شکوہ کرتے ہیں اور دو چار ہفتہ تک روپیہ بھی نہیں مانگتے ہیں۔ اس لئے کبھی کسی دغاباز خریدار سے ان کو نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

میرے محلّہ میں ایک اوباش عورت آکر ٹھہری اور تین چار ہفتہ میں تقریباً پانچ سو روپیہ کا سامان وہاں کے دوکانداروں سے قرض لیا اور مالک مکان کا کرایا بھی نہیں دیا اور وہاں سے چلتی ہوئی یہ حرکتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں مگر کرایہ دار کو بھاگنے سے مالک مکان روک نہیں سکتا۔ ہاں بھاگ جانے کے بعد اس کا پتہ لگا کر اس کے خلاف کارروائی کر کے قید کرایا جا سکتا ہے لیکن اگر قرض دار مفلس ہے تو قید کرانے والے کو اس کا خرچ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

میں نے اپر بارکلی اسٹریٹ پر جو مکان کرایہ پر لیا تھا اس کی ٹھیکہ دار ایک عیار اور شیریں زبان عورت تھی اس نے دونوں مکانوں کے ٹھیکہ کی رقم بقدر دو سو گنی اور میرے مقررہ دوکانداروں سے بیس گنی وصول کی اور فرار ہو گئی۔ میں چونکہ اس کی بدمعاشگی سے دوکانداروں کو آگاہ کر چکا تھا اس لئے انہوں نے مجھ سے کچھ نہ پایا۔ دو ماہ بعد اس عورت کا پتہ چلا تو اس کی مفلسی کے باعث کسی نے اس کے خلاف عدالت میں دعویٰ نہیں کیا۔

انگریزوں کی آزادی کا دستور

ظاہر ہے کہ آزاد انسان کیسی بے فکری اور فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انگریزوں کو بغیر کسی خطا کے حکام کی خفگی اور عزت و مال کے ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ حاکموں اور تمام بڑے لوگوں کو عام لوگوں پر کسی طرح کا قابو حاصل نہیں ہے۔ نہ ان پر کوئی جبر کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے برخلاف یہاں شرفاء ہر وقت سیر و تفریح کر سکتے ہیں؛ اور بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے گھوم پھر سکتے ہیں۔ کتاب یا کوئی اور چیز بازار سے خرید کر رومال میں لپیٹ کر گھر لا سکتے ہیں۔ جب چاہیں اوباش عورتوں کے ٹھکانوں پر جا سکتے ہیں کسی عورت یا اپنے دوست کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر باغ کی سیر بھی کر سکتے ہیں۔ بادشاہ اور وزراء کے عیوب بے دھڑک زبان سے بیان کر سکتے ہیں اور تصاویر اور کتابوں کے ذریعہ بھی مشتہر کر سکتے ہیں۔ میں نے تو عمر بھر کبھی گلیوں میں چہل قدمی نہیں کی تھی نہ خرید و فروخت کے لئے بازار گیا تھا۔ اور عورتوں کے مکانوں پر جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ یہاں کی اس آزادی سے میرے سر سے ہزار من کا بوجھ اتر گیا گویا مدت کی قید سے اب رہائی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ جس کام سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے یا قانون کے خلاف نہ ہو اس کو بلاتکلف کر سکتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہ ہر شخص جو کام بھی چاہے کرے کیونکہ پابندیٔ وضع اور حفظ مراتب کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ مثلاً کسی ادنیٰ آدمی

کے سامنے اگر کوئی ذی عزت شخص رستوران میں کھانا کھائے تو پھر شرفا اس سے نہیں ملیں گے، اور اس سے بڑے عیبوں کا کیا ٹھکانا۔ اور لوگوں کو نقصان پہونچانے اور قانون توڑنے والوں کو غلطی کرنے کے بعد سزا سے ایک لمحہ کو بھی بچ جانا ممکن نہیں ہے۔ اور حکام اور جج کسی معاملہ میں غور کرنے کے لئے دو تین دن فیصلہ میں تاخیر کرتے ہیں تو وہ عوام کی ملامت کا نشانہ بن جاتے ہیں کیونکہ ایسے مجرم کی طرف سے لوگوں کے دل میں تین وجوہات سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو اس کے تصور کے باعث دوسرے ہم قوم ہونے کی شرط تیسرے یہ کہ اس نے خلاف قانون حرکت کرکے اوروں کو بھی خلاف قانون کام کرنے کی ترغیب دی جس کی وجہ سے سب کی ذلت کا اندیشہ ہے۔

چونکہ تمام انگریز قوم خصوصاً ان کے عمائدین اپنی ترقی اور عروج کو قوانین مروجہ کی پابندی کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ اور ان کی ترقی اس زمانہ میں حد کو پہنچ گئی ہے اس لئے وہ لوگ قوانین کی جزوی طور پر بھی عدم پابندی کو برا خیال کرتے ہیں۔ اور قانون شکنی کے خیال سے وہ بید کی طرح کانپتے ہیں۔ اسی لئے وزیر بھی نئے احکام جاری کرنے اور قوانین تبدیل کرنے کی یکایک جرات نہیں کرتے خواہ وہ پارلیمنٹ سے بحث مباحثہ کے بعد منظور ہی کیوں نہ ہو چکے ہوں۔ بلکہ بتدریج ہر ہر پہلو پر غور و فکر کرکے ان کا اجرا عمل میں لاتے ہیں۔ کیونکہ ان کو اس بات کا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ آغاز کرتے وقت پچھلا کام پہلے سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور آخر میں نہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ نیا قانون ایک خاص فریق کے لئے پہلے قانون سے بہتر ہو لیکن عوام کے لئے اس کا نتیجہ خراب ہو۔ یہاں ادنیٰ اور اعلیٰ میں مساوات چند موقعوں پر صرف ظاہری طور پر نظر آتی ہے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی معاشرت کو ادنیٰ درجہ والوں سے کوئی نسبت نہیں بلکہ یہاں بہ نسبت ہندوستان سے بھی زیادہ نازک ہے۔ خدمت گاروں اور آقاؤں کے مابین جو آداب مقرر ہیں ان سے خدمت گاروں کی بے اختیاری اور مجبوری اتنی زیادہ ہے کہ ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے خدمت گذاروں کو بادشاہ سمجھنا چاہیئے۔ ظاہری مساوات اول تو وضع قطع میں ہے کیوں کہ امیر لوگ اگرچہ بہت قیمتی لباس پہنتے ہیں لیکن نہایت سادہ ہوتا ہے اور دوسرے عوام کے لباس کی طرح نظر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ سڑکوں اور گلیوں میں عام لوگ معززین کے آگے پیچھے کا لحاظ کئے بغیر چلتے پھرتے ہیں بلکہ قصداً ان کے شانہ سے شانہ رگڑ کر چلتے ہیں، اور معززین کو ان پر خفا ہونے کی مجال نہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ ایک بار شاہزادہ ولی عہد نے

راہ چلتے میں کسی شخص کی رگڑ سے برہم ہو کر اس کو دو تین ڈنڈے مار دیے۔ اس نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ شاہزادہ کے وکیل کو کئی ہزار کی رقم مدعی کو اور عدالت کو دینا پڑی۔ ایسے موقعوں پر عوام دولت مند اور معزز لوگوں پر غالب رہتے ہیں۔ میں نے بھی ایسے لوگوں سے اذیت پائی اور یہ زیادتی سب پر ظاہر بھی ہو گئی۔ مگر اس کا کوئی علاج نہیں اس لئے کہ عقل مند لوگ اس طریقے کو درست سمجھتے ہیں اور عوام کو ملک و قوم کی طاقت خیال کرتے ہیں اور اس طریقہ کو بہادری اور ہمت پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بڑے لوگ بغیر چوبدار یا خدمت گزار کو ساتھ لیے ہوئے مجمع عام میں چلتے پھرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ تقریر اور تحریر میں خادم اپنے آقا کو اسی طرح مخاطب کرتا ہے جس طرح آقا خادم کو مخاطب کرتا ہے۔

ایک دن مسٹر ہسٹن Hastings مجھ سے ملنے مکان پر آئے۔ اس وقت میرے مالک مکان نے دروازہ پر سیاہ روغن کر کے ایک باریک ڈورا کنڈی پر باندھ دیا تھا اور خود دروازہ کے باہر رنگنے کا سامان جمع کر رہا تھا۔ مسٹر ہسٹن اس بات سے بے خبر تھا اس نے دروازے کی کنڈی ہلائی جس کی وجہ سے ان کے ہاتھ اور قیمتی دستانے سیاہ ہو گئے۔ انہوں نے اعتراض کے طور پر مالک مکان سے کہا کہ تو نے مجھ کو بتایا نہیں کہ تازہ روغن لگا ہے۔ اس نے بھی سختی سے جواب دیا کہ تم نے ڈوری باندھنے کی وجہ کیوں نہ معلوم کر لی۔ مسٹر ہسٹن اس معقول جواب پر ہنس دیے اور مجھ سے اندر آ کر یہ واقعہ بیان کیا۔

چوتھے یہ کہ کوئی شخص کسی کی گاڑی کے پیچھے نہیں دوڑتا ہے۔ بلکہ گاڑی کے پیچھے بیٹھتا ہے اور گھوڑے پر سوار ہو کر آقا کے پیچھے چلتا ہے۔

پانچویں یہ کہ عمائدین کے سونے کا سامان بہت نفیس اور آرام دہ ہوتا ہے لیکن کوئی خادم یا متعلقہ شخص زمین پر نہیں سوتا۔

چھٹے یہ کہ عدالت فوجداری میں امیر اور غریب دونوں کو اصالتاً حاضر ہونا پڑتا ہے۔

ساتویں یہ کہ کوئی آقا اپنے ملازم کو مار نہیں سکتا چاہے اس سے کتنا ہی بڑا قصور کیوں نہ سرزد ہوا ہو۔ البتہ عدالت سے رجوع کر سکتا ہے۔

ڈویل یا DUEL خانہ جنگی

اس رسم کے ذریعے اپنی عزت کی حفاظت اور ظالم سے بدلہ لینے کے لئے اور اپنے دل کا غبار

نکالنے کے واسطے معزز لوگ منصف مزاج گواہوں کے سامنے آپس میں تلوار یا پستول سے لڑتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا فریب اور دغا نہیں ہوتا۔ اور عوام بغیر کسی داؤں پیچ کے گھونسہ بازی کرتے ہیں اور ہندوستان کی بنوٹ کی طرح مقابل پر وار کرتے ہیں اور اپنے بچاؤ کے لئے جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں۔ اس طرح کے مقابلہ کا وہاں عام رواج ہے۔ اسی لئے وہاں ایسے آدمی کم نظر آئیں گے جن کا پنجہ اور کلائی مضبوط نہ ہو اور مکا بازی میں ماہر نہ ہوں۔ اس مقابلہ میں جب ایک آدمی دوسرے کی ضرب کھا کر گر پڑتا ہے تو جب تک دوبارہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہو جاتا اس وقت تک غالب آنے والا شخص اس پر حملہ نہیں کرتا اور اس کے اٹھ کر مقابلہ پر آنے کا انتظار کرتا ہے۔ اور اگر غصہ میں آکر اس پر اٹھنے سے پہلے حملے کا ارادہ کرتا ہے تو تماشائی اس کو روک دیتے ہیں۔ کبھی اس لڑائی میں دونوں میں سے ایک مر بھی جاتا ہے۔ ویسے ناک ٹوٹنا، آنکھ پھوٹ جانا، دانت اکھڑ جانا تو معمولی بات ہے۔ میں نے سیکڑوں بار دیکھا کہ ذرا سی دیر میں دو شخص خون آلود ہونٹ اور ٹوٹے ہوئے دانت لئے اپنے مکان واپس جا رہے ہیں۔

تربیت اولاد اور بال بچوں کے ساتھ برتاؤ

انگریزوں میں تربیت اولاد پر خاص توجہ دی جاتی ہے جس کی وجہ سے لڑکوں میں علم و ادب، سنجیدگی اور متانت پیدا ہوتی ہے۔ اور جفاکشی کی عادت کے باعث شجاعت کا جوہر ابھرتا ہے۔ لڑکیوں کو رقص و سرود اور بزم آرائی، شوخی و ظرافت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور آپس میں میل و محبت زیادہ اور نفاق بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے کئی سبب ہیں۔ اول یہ کہ وہاں ایک شادی کی رسم ہے۔ اس لئے اولاد ایک ہی بطن سے ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ والدین ایک پر دوسرے کو فوقیت نہیں دیتے ہیں سب اولادوں کے ساتھ یکساں محبت کرتے ہیں۔ اور اگر کسی ایک سے زیادہ محبت ہے تب بھی اس کو پوشیدہ رکھتے ہیں تاکہ دوسرے بچے اس فرق کو محسوس نہ کریں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ دور کے رشتہ داروں سے بیگانگی کا سلوک کرتے ہیں اور اگر کبھی ان کے ساتھ خلاف معمول کوئی سلوک کرتے ہیں تو وہ ممنون ہوتے ہیں۔ برخلاف مسلمانوں کے رشتہ داروں کے جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ امداد حاصل کرتے ہیں اور اپنے کو اس کا حق دار خیال کرتے ہیں۔ اگر اس میں کبھی کوئی کمی ہوتی ہے تو رنج و نفاق کا باعث بن جاتی ہے۔ چوتھا سبب اولاد کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور خوش کلامی سے پیش آنا۔ کیونکہ کاروبار کے تمام اختیارات شوہر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور

جزوی گھریلو انتظامات بیوی کے سپرد۔ بچوں کو کسی کام میں دخل کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس لئے کبھی کسی جھگڑے فساد کا موقع نہیں آتا۔ اگر کسی لڑکے، لڑکی سے کبھی کوئی خطا ہو بھی جائے تو گرفت نہیں کرتے۔ بلکہ آئندہ کے لئے اس کا تدارک کر دیتے ہیں۔ بچپن کے زمانہ تک ان کی غذا اور لباس دونوں میں گرمی اور سردی کے موسموں کا لحاظ رکھنے کے علاوہ جسم کی چستی، اور صحت و صفائی کا خیال رکھتے ہیں، اور ایسی حکمتیں استعمال کرتے ہیں، جن کے باعث بچوں کا قد و قامت موزوں اور ان کے حسن میں اضافہ ہو، بچوں کے لباس میں ایک گوش بند ہوتا ہے جو سوتے وقت کانوں پر باندھ دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی بچوں کے کانوں میں کجی پیدا نہیں ہوتی۔ دوسرے ایک سبک سینہ بند ہوتا ہے۔ جس کے ڈورے سرخ ریشم کے ہوتے ہیں اس کو پیٹھ پر صلیب کی صورت کھینچ کر کمر میں پیٹی کی طرح کسے رہتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کمر پتلی رہتی ہے اور شانہ ابھرے ہوئے اور جسم سڈول رہتا ہے۔ یہ سینہ بند اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ لڑکیاں چودہ سال کی عمر تک اس کو لباس کے اوپر باندھے رہتی ہیں۔

بچوں کی غذا بہت ہلکی اور سادہ ہوتی ہے اور اس کی مقدار مقرر ہوتی ہے۔ اکثر لوگ بچوں کو بارہ سال کی عمر تک میوے اور مٹھائیاں نہیں دیتے ہیں۔ گھر کی نوکرانیوں کو تازہ کھانے یا دسترخوان کے بچے ہوئے کھانوں پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ ہندوستانیوں کی طرح شفقت اور محبت کے پیش نظر کوئی چیز چھپا کر جن بچوں کو نہیں کھلا سکتی ہیں۔ اور بچے صرف اپنی مقررہ خوراک پاتے ہیں۔ اس لئے ان کی صحت کبھی خراب نہیں ہوتی۔ ہر صبح و شام ان کو پیدل یا گاڑی پر ہوا خوری کے لئے پارکوں اور باغوں میں لے جاتے ہیں جس سے ان کی نشو و نما میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ اور بچوں کو ایسے مقامات پر جانے سے روکتے نہیں ہیں چاہے اس میں کوئی خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ بچے کو روکنے سے اس میں ضد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اور آزادی کی حالت میں جب وہ خود کسی خطرہ سے واقف ہوتا ہے تو خود اس کی میں احتیاط کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔

لیڈی الفرڈ Lady Alfred کا بیٹا جس کی عمر بیس سال کی ہوگی اپنی تیام گاہ سے لندن آیا ہوا تھا۔ میں اس سے ملنے گیا۔ لیڈی موصوف کو جب میرے آنے کی اطلاع ہوئی تو میرے اندر داخل ہونے سے پہلے باہر آ کر مجھ سے کہا کہ میرے لڑکے کی گردن میں کسی عارضہ کی وجہ سے بچپن میں ذرا کجی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر جب سے اب تک ہم نے کبھی اس سے یہ بات نہیں بتلائی۔

تم بھی اس کے متعلق کچھ نہ پوچھنا ورنہ وہ دل شکستہ ہوگا۔

جب اولاد کی دل شکنی کا ان لوگوں کو اس قدر خیال ہے تو ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کا کیا ذکر۔ وہ لوگ تو بڑی عزت اور احترام سے اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سزا صرف یہ ہے کہ ان کو آرام گاہ میں بٹھا کر باہر سے دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی اولاد میں ادب تمیز اور لیاقت بہت ہوتی ہے اور ان کا چار پانچ سال کا بچّہ ہمارے ملک کے پندرہ برس کے بچّے سے زیادہ ہوشیار اور لائق ہوتا ہے اور ممنوعہ چیزوں کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا۔ ان کے کھیل کی چیزیں بھی ایسی ہوتی ہیں جس سے تعلیم میں مدد ملتی ہے جیسے چھوٹے چھوٹے برتن اور کھلونے جس پر حروف نقش ہوتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت کتابیں جن میں جانوروں کی تصویریں اور ان کے متعلق سوال و جواب لکھے ہوتے ہیں۔ اور ان میں ہنسی کی باتیں بھی ہوتی ہیں اور ایسی چیزیں بھی جن کی وجہ سے بچّوں میں پڑھنے کا شوق بڑھتا ہے۔ مکتب میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان میں لکھنے پڑھنے کی شُد بُد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد لڑکے اسکول بھیجے جاتے ہیں، اور لڑکیاں گھر ہی پر کافی تعلیم و تربیت حاصل کر لیتی ہیں۔ حروف شناسی اور لکھنا تو کھیل کے سامان کے ذریعہ سیکھ جاتی ہیں۔ اور اس کی مشق ماں اور بھائیوں کی مدد سے ہو جاتی ہے۔ رقص و سرود سکھانے کے لیے استاد ملازم رکھ لیے جاتے ہیں۔ اور شب نشینی کی محفلوں میں شریک ہو کر اپنی مشق بڑھا لیتی ہیں۔ ظرافت اور شوخی ان ناولوں کے مطالعہ سے آجاتی ہے جو خاص اس غرض سے لکھے گئے ہیں۔ لیکن لڑکے چونکہ اسکول میں رہتے ہیں، اور والدین کی نازبرداری سے محروم ہوتے ہیں اور سوا لکھنے پڑھنے اور گیند وغیرہ کھیلنے کے ان کا کوئی اور شغل نہیں ہوتا، اور اسکول کے سخت مزاج منتظم ان کو مقرّرہ خوراک سے کبھی زیادہ نہیں دیتے، اور سال بھر میں صرف دو بار زیادہ سے زیادہ ایک ایک ہفتہ کے لیے اپنے مکان جا سکتے ہیں، لہٰذا کوشش کرتے ہیں کہ جلد تعلیم سے فراغت حاصل کر لیں۔ اس لیے محنت بھی زیادہ کرتے ہیں، سختیوں میں رہ کر ان کے اندر صبر و تحمل کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ بچپن میں والدین کے یہاں اور اس کے بعد اسکول میں ان کو مقرّرہ خوراک سے زیادہ کبھی نہیں ملتی اس لیے ان کے جسموں میں بھدّا پن ہرگز نہیں ہوتا اور زیادہ تر لڑکے تندرست اور چھریرے بدن کے ہوتے ہیں۔

انگریزوں کا طرزِ حکومت اور اقتدارِ حکومت

انگریزی حکومت جو تمام خوبیوں کا سرچشمہ اور حکمتوں کو ترقی دینے والی ہے چار اجزا پر مشتمل ہے جو بادشاہ وزراء اور رعایا میں مشترک ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جز بادشاہ کی شخصیت ہے جس کو تمام معاملات میں کل اختیارات حاصل ہوتے ہیں یہاں تک کہ اگر قاتل کو عدالت سے پھانسی کی سزا ہو چکی ہو تب بھی بادشاہ اس کو معافی دے کر رہا کر سکتا ہے۔

میرے لندن کے زمانۂ قیام میں مسٹر ولیم پیٹ MR. WILLIAM PITT کی معزولی کا حکم ہوا جو سترہ سال سے انگلینڈ کا وزیراعظم اور وہاں کے سیاہ و سپید کا مالک تھا اس کی معزولی بعض ملکی مصلحتوں کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس کے بعد پانچ اور وزیروں نے مسٹر پٹ کی وجہ سے استعفیٰ دینے کا ارادہ کیا لیکن بادشاہ نے کچھ تو جنگ فرانس کی وجہ سے اور کچھ مرض جنوں میں مبتلا ہو کر صاحب فراش رہنے کے سبب سے ایک دن سب وزیروں کو معزول کر دیا۔ اور بادشاہ کی شدید علالت کے باعث نئے وزیروں نے کوئی اقتدار حاصل نہیں کیا اور دو ماہ تک تمام معاملات تذبذب اور التوا میں پڑے رہے، پھر بھی حکومت کے کاروبار میں کوئی خرابی تو درکنار وہ پہلے سے بھی بہتر طریقہ پر جاری رہا، اور کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ بادشاہ کو ضروری اور مستقل کاموں کے علاوہ ہر قسم کے نئے کام اور خلافِ قانون کام کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔ کیونکہ تمام فوج اس کی ملازم ہے جو اس کے سوا کسی کو اپنا آقا نہیں جانتی۔ تمام ملک میں کوئی اور شخص مسلح فوج نہیں رکھ سکتا ہے۔ جس کا آخری نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ امور متعلقہ کے لیے پارلیمنٹ سے مشورہ نہ لے یا بظاہر پارلیمنٹ کے قوانین کے خلاف کام کرے تو اس صورت میں عوام کی مخالفت کا اندیشہ ہے اور اس کا بھی کہ لوگ بادشاہ کو مجبور کر کے تخت سے اتار دیں، لیکن موجودہ بادشاہ کنگ جارج اس قدر خوش اخلاق اور مہذب ہے کہ کبھی کسی خراب کام کی طرف اس کی توجہ طبیعت راغب نہیں ہوتی ہے۔ اور اس کی ساری توجہ مخلوق کی بہبودی اور علم و ہنر کی ترقی کی طرف منعطف رہتی ہے۔ وہ خواہشات نفسانی سے بہت دور رہتا ہے اور خود زراعت و باغبانی کا شغل اختیار کرتا ہے۔ اسکولوں میں جا کر طلباء کا معائنہ کرتا ہے اور ان کی فلاح کے لیے ہدایات جاری کرتا ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ججوں کو معزول کرنے کے اختیارات اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے ہیں تاکہ وہ آزادی کے ساتھ

حق وانصاف کے مطابق فیصلہ کر سکیں اور اس میں کوئی خوف محسوس نہ کریں۔ اس وقت تک بیالیس۴۲ سال ہو چکے ہیں کہ یہ بادشاہ تخت حکومت پر نہایت شان وشوکت سے جلوہ گر ہے اور تمام رعایا جان ودل سے اس کی بہی خواہ اور وفادار ہے۔ اس کی خوشی سے خوش اور اس کے غم سے غمگین ہوتے ہیں۔ میں اس شاہِ جم جاہ کی مدح ایک مثنوی میں کر چکا ہوں جس کا مطلع یہ ہے ؎

شاہے کز فرطِ عقل و تمکین
کارش بکمال از ہر آئین

اس بادشاہ کے فلک بارگاہ محل میں جو لندن کے معمولی مکان کی طرح ہے، میں کئی بار حاضر ہوا۔ اور ملکۂ انگلینڈ کوین شارلٹ کے حضور میں بارہا مجھے حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ اور دونوں حضرات نے تقریباً ایک ایک گھنٹہ تک مجھ سے گفتگو فرمائی۔ باوجود اس کے کہ میں ترجمان ساتھ لے جاتا تھا۔ لیکن میری عزت افزائی کی غرض سے میری ہی ٹوٹی پھوٹی انگریزی زبان اختیار کی۔ چونکہ بادشاہ بہت نرمی اور ملائمت سے گفتگو کرتا ہے اس لئے اپنے سوال کو دو تین بار مجھ کو سمجھا کر جواب مانگتا تھا۔ اور دوران گفتگو میں اکثر حکیمانہ سوالات اور عاقلانہ نکات سے مجھ کو مستفید فرماتا تھا اور رخصت کے وقت بغیر میری طلب اور ضرورت کے نو ہزار روپیہ خرچ کے واسطے مجھے مرحمت فرمایا اور اپنے ان وکیلوں اور سفیروں کو جو میرے سفر کے راستہ میں موجود تھے میری مدد کے لئے احکامات جاری کئے۔

ملکۂ انگلینڈ کا دربار

بادشاہ عام طور پر حاضر ہونے والوں سے بہت سادہ طریقہ پر ملاقات کرتا ہے۔ لیکن ملکہ کے دربار کے روز بہت شان وشوکت نظر آتی ہے کیونکہ اس دن امیروں، وزیروں کی بیویاں موتیوں کے لباس اور زیورات میں سر سے پیر تک جگمگاتی ہوئی آتی ہیں۔ اور قدیم رواج کے مطابق بید کا بنا ہوا حلقہ لباس کے نیچے لگاتی ہیں تاکہ ان کے گون کی گولائی ٹھیک رہے۔ اور بعض کا حلقہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ ان کا دروازے سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس دن مرد بھی پرانے دستور کے مطابق زردوزی کا ڈھیلا ڈھالا اور نیچا لباس پہن کر دربار میں آتے ہیں۔ اس لباس کے بغیر کوئی ملکہ کے دربار میں نہیں جا سکتا۔

سلطنت کا دوسرا اہم جز ولی عہد ہے جو بادشاہ کا بڑا بیٹا ہوتا ہے۔ وہ شاہزادگی کے زمانہ میں "پرنس آف ویلز" یعنی ویلز کا شاہزادہ' کہلاتا ہے۔ اور ویلز انگلینڈ کے تین

حصوں میں سے ایک حصہ ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ ولی عہد کا بادشاہ کی زندگی میں سلطنت کے کاموں میں کوئی دخل نہیں ہوتا اگر ولی عہد باپ سے پہلے مرجائے تو اس کا بڑا بیٹا یا بیٹی ولی عہد ہوتی ہے اور اگر لاولد ہے تو اس کا دوسرا بھائی جو فوج کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔ بادشاہ بنایا جاتا ہے۔ اس طریقہ کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت کے لئے بھائیوں میں فساد نہیں ہوتا اور مخلوق خدا کشت و خون سے محفوظ رہتی ہے۔ اور کوئی غیر مستحق سلطنت کا دعوے دار نہیں ہوسکتا۔

ولی عہد لندن کے اوصاف

پرنس آف ویلز (Prince of Wales) نہایت مہذب، خوش مزاج اور شیریں کلام ہے۔ اس کا عالی شان محل لندن کے محلہ پال مال Pall Mall میں واقع ہے۔ دو تین بار میں اس سے ملنے گیا۔ اس کے آرام کی اوپر والی منزلیں بہت زیادہ سنہرے کام سے آراستہ ہیں جو مجھے دیکھنے میں اچھی نہیں معلوم ہوئیں۔ البتہ نیچے کی منزل بہت اچھی ہے۔ خاص طور پر وہ حصہ جو چینی روم کہلاتا ہے۔ اس کے اندر ملک چین کے اس قدر تحائف رکھے ہوئے ہیں کہ جنکو دیکھکر نگاہیں چکا چوند ہوجاتی ہیں۔ ان میں بہت بڑے بڑے آئینے بھی ہیں۔ بعض دس دس گز لمبے ہیں سو سو بتیوں والے جھاڑ بھی دیکھے۔ ایک ایسی گھڑی موجود ہے جس کی شکل حبشی عورت جیسی ہے اس کی آنکھوں کی حرکت سے وقت معلوم ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی عجیب و غریب چیزیں دیکھیں۔

مجلسِ وزراء

تیسرا اہم جزو حکومت مجلس وزراء ہے جو تمام ملکی اور مالی معاملات کی نگراں ہے۔ ان وزیروں کی تعداد نو ہے۔ ہر ایک کا تعلق ایک خاص محکمہ سے ہے جس میں کوئی دوسرا دخل نہیں دے سکتا۔ مگر ایک دوسرے کے کاموں سے واقفیت کے لئے ہر وزیر کے دفتر میں دوسرے وزیروں کے منشی موجود رہتے ہیں۔ ان میں اول وزیر خزانہ ہے۔ پہلے اس عہدہ پر مسٹر پٹ Mr. William Pitt تھا اور اب مسٹر اڈنگٹن Mr. Adding ton ہے جو نہایت نیک خصلت اور آزاد منش شخص ہے۔ اور یہی وزیر اعظم بھی ہے تحصیل احوال اور پارلیمنٹ کی تجویز کے مطابق مختلف محکموں کے لئے مالیات کی تقسیم اسی کے ذمے ہے وہ پارلیمنٹ میں بادشاہ اور امراء کے لئے وکیل کی حیثیت سے اجلاس کرتا ہے۔ چونکہ پارلیمنٹ کے بعض ممبران اپنے معاملات میں شاہی دربار کی طرف سے امید و بیم

کشمکش میں رہتے ہیں۔ اس لئے وزیر اعظم کسی کو کوئی عہدہ اور کسی کو کوئی خطاب دیکر اپنا ہم رائے بنا لیتا ہے۔ کیونکہ پارلیمنٹ میں معاملات اور تمام حکامات کا اجرا کثرت رائے سے ہوتا ہے اس لئے اپنے عہدہ کو دوسرے دعویٰ داروں سے بچانے کے لئے ممبران کو ہم خیال بناتا ہے۔ اس زمانہ میں وزیر اعظم کے مخالفوں میں مسٹر فاگ اور ڈیوک آف نارفولک قابل ذکر ہیں۔ جو اس کے عیوب کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہ دونوں بھی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ چونکہ بادشاہ اور امراء پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے اس لئے وزیر اعظم بادشاہ کے ان احکامات کو بھی رد کر دیتا ہے جو اس کے نزدیک بہتر نہیں ہوتے اور ان کے لئے پارلیمنٹ کی نامنظوری کا حیلہ کر دیتا ہے۔ اور اسی بہانہ سے امراء کے تقرر اور معزولی کا کام حسب منشاء کرتا رہتا ہے حقیقت میں خود مختار بادشاہ وہی ہے۔ مسٹر پٹ کو اپنی دور اندیشی اور عالی دماغی کے باعث تمام انتظامات پر پورا قابو حاصل تھا۔ میں بارہا مجلس پارلیمنٹ میں گیا۔ کئی بار بعض احباب کے ساتھ۔ جن میں سر ولیم الفرڈ (Sir William Alfred) سر چارلس ٹالبٹ (Sir Charles Talbot) اور سر جان مکفرسن (Sir John Macpherson) سابق گورنر بنگالہ اور مسٹر جانسٹن بخشی لکھنؤ قابل ذکر ہیں۔ میں نے تمام ممبران پارلیمنٹ کے طور طریقے بغور دیکھے۔ مجھ کو یہ سب ایک طوطوں کے جھنڈ کی طرح نظر آئے سب کی گویائی اور رٹی رٹائی صرف ایک شخص پر منحصر ہے جو آئینہ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور وہ ہے مسٹر پٹ Mr. Pitt جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ گویا اس وقت تو پارلیمنٹ کی شان محض دل لگی اور رعایا کو بہلانے کا بہانہ نظر آتی تھی۔ لیکن دوسرے وقت جب وزیر اعظم اس پر ستارہ نہ ہو اور اس کو اپنے احاطہ اقتدار میں لئے ہوئے نہ ہو تو یقیناً پارلیمنٹ کو طاقت واقعی حاصل ہوتی ہے اور وہ بہت سے فوائد کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً شاہی مالیات کی تحصیل میں آسانی۔ اور اہل کاروں کا غلط کام نہ کرنا۔ اسی طرح بادشاہ اور وزراء کے احکامات کی تعمیل۔ چنانچہ بادشاہ کے مرض کی طوالت کے زمانہ میں جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اور دوسری یورپین طاقتوں کے ساتھ معرکہ آرائی کی صورت میں بعض انگریز دانش ور ضروری خیال کرتے تھے کہ بادشاہ کے صحت مند ہونے تک ولی عہد انتظام حکومت کا ذمہ دار بنایا جائے یا کوئی ایسی کمیٹی بنائی جائے جس میں ولی عہد بھی شریک ہو۔ لیکن اس کے لئے سوائے پارلیمنٹ کے کسی اور کو غور کرنے کا اختیار نہ تھا۔ کیونکہ شاہزادے اور امراء شاہی اس بات کو بدنامی اور بادشاہ سے بے وفائی کا باعث

جاتے تھے۔ ان حالات میں پارلیمنٹ سے اچھی طرح غور و فکر کر کے اور بادشاہ کی خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر یہ حکم دیا کہ تمام وزراء اور امراء اپنے متعلقہ کار بھی کو جہاں تک ہو سکے اچھی طرح انجام دیں۔ اگر متعلقہ کاموں کے انجام دینے میں کوئی رکاوٹ پیش آئے گی تو اس وقت کوئی دوسری فکر کی جائے گی۔

وزیر دوم آج کل لارڈ پلہم (Lord Pelham) ہے اس کا مرتبہ وزیر خزانہ کے بعد ہے۔ اور اس کے سپرد محکمہ امور خارجہ ہے۔ مجھے اس کی خدمت میں پورا رسوخ حاصل تھا وہ خود میرے حال پر بہت مہربان تھا اور ہر قسم کے کاموں میں میری مدد کرتا تھا۔ کئی بار میری پرتکلف دعوتیں کیں۔ حسن سیرت کے ساتھ خدا نے اس کو حسن صورت سے بھی نوازا ہے۔ متناسب الاعضاء کشادہ پیشانی، متوسط قد و قامت کا ایسا شاندار اور ہنس مکھ آدمی ہے جس کو دیکھ کر دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اب سے پانچ سال پہلے گورنر بنگال لارڈ ولزلی کے دربار میں حاضر ہوا تو اس کے کمرے میں لارڈ پلہم کی تصویر دیکھی جو اس زمانہ میں آئرلینڈ کے وزراء میں شامل تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر میرے دل میں اس کی عظمت اور محبت جاگزیں ہو گئی۔ اس درمیان میں میجر ڈیوس اور گورنر کے دیگر مصاحبین جو دربار میں آئے ہوئے تھے مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ چونکہ اسی زمانہ میں نپولین بونا پارٹ نے مصر فتح کیا تھا اور ہندوستان پر حملہ کرنے کا چرچا تھا۔ اس لئے احباب نے اس کے متعلق میری رائے دریافت کی۔ میں نے نپولین کے ہندوستان نہ آسکنے کی بہت سی دلیلیں پیش کیں لیکن ان لوگوں کو ان دلائل سے اطمینان نہ ہوا۔ اتفاق سے اسی وقت میری نظر اس تصویر پر پڑی۔ میں نے مزاحیہ انداز میں کہا کہ جب تک انگلینڈ میں اس تصویر جیسی صورت والا ایک آدمی بھی موجود رہے گا اس وقت تک نپولین بونا پارٹ کو ہندوستان کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی یہ بات سن کر سب ہنس پڑے اور اس تصویر کی طرف متوجہ ہو گئے لارڈ پلہم کے اوصاف میں نے اس قصیدہ میں بیان کئے ہیں جو لیڈی پلہم (Lady Pelham) کی مدح میں لکھا ہے۔

تیسرا وزیر لارڈ ہاکسبری (Lord Hawkesbury) ہے جس کے سپرد محکمہ داخلہ ہے مگر اس سے میرا تعارف نہ ہو سکا۔ چوتھا وزیر لارڈ ہوبرٹ (Lord Hobart) ہے یہ محکمہ دفاع کا ذمہ دار ہے۔ پہلے اس عہدہ پر مسٹر ڈنڈاس تھا۔ چونکہ وزارت ہند اور کمپنی کے امور اسی سے متعلق تھے اس لئے میں سب سے پہلے اسی سے ملا تھا اور اسی کے ذریعہ سے ملازمت شاہی سے

مشرف ہوا. موجودہ وزیر دفاع لارڈ ہیرٹ بھی میرے حال پر بہت مہربان رہا. موصوف ایک وجیہہ شخص ہے اور نہایت شریف اور خوش اخلاق ہے. وزیراعظم کے بعد ان تینوں وزیروں کو ملکی انتظامات میں بہت دسترس حاصل ہے۔

پانچواں وزیر لارڈ سنٹونسنٹ ہے ـــــــــــــــــ اس کے سپرد محکمہ جہازرانی ہے۔ وہ جہاز کے افسروں کا تقرر کرتا ہے۔ ایڈمرلوں کو احکامات دیتا ہے. بحری فوج کی نگرانی اور اس کا کل انتظام کرتا ہے. بحری فوج یہاں بڑی فوج سے زیادہ ہے. پہلے اس وزارت کا انچارج لارڈ اسپنسر تھا. موجودہ وزیر جہازرانی سے میری شناسائی نہیں ہوئی. سابق وزیر جہازرانی لارڈ اسپنسر lord spencer اور ان کی لیڈی سے لندن پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد میری ملاقات سر جوزف بنک کے یہاں ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ برابر نہایت اخلاق سے ملتا رہا. اور بارہا اپنے مکان پر دعوتوں میں مجھے مدعو کیا. لیڈی اسپنسر جو نہایت عقلمند اور نیک خصلت خاتون ہے میرے حال پر بہت مہربان تھی. میرے فارسی اشعار کا انگریزی ترجمہ بڑی دلچسپی سے سنتی تھی اور ان کو لکھ لیتی تھی. اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر میرے سفرنامہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے تو اس کو ضرور روانہ کردوں. اور مجھ کو اس بات کی تاکید کی کہ انگلینڈ کی جو خرابیاں اور بری رسمیں میں نے دیکھی ہوں ان کو ضرور لکھوں۔

چھٹا وزیر لارڈ کارنوالس lord cornwallis ہے اس کے ذمہ محکمہ توپ خانہ اور حفاظت جواہر خانہ ہے۔ چونکہ میرے لندن پہونچنے کے زمانہ میں وہ آئرلینڈ کا گورنر تھا اور میری اس کی ملاقات ہندوستان میں ہو چکی تھی اس لئے پہلے آئرلینڈ پہونچکر اس سے مل چکا تھا۔ جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہ ڈیوک آف یارک کے بعد فوج کا سب سے بڑا افسر بھی ہے۔

ساتواں وزیر لارڈ ڈارٹمینٹ lord dartment ہے۔ یہ وزیر ہند کہلاتا ہے، ہندوستان سے متعلق سارے معاملات اس کے ذمہ ہیں۔ پہلے اس عہدہ پر مسٹر ڈنڈاس فائز تھا۔ موجودہ وزیر ہند ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے. اور وہ لارڈ پلم کا دوست ہے اس لئے مجھ پر بھی مہربان تھا. بڑی دھوم دھام سے اس نے میری دعوتیں کیں. ان دعوتوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر جو ہندوستان کے گورنروں کے افسر ہیں ان کے مقابلہ میں مجھے نمایاں جگہ دی جاتی تھی اور وہ سب وزیر ہند کے کہنے پر میری مہمانداری کرتے تھے لارڈ ڈارتھمٹ نے مجھے حکومت انگلستان کی طرف سے ایران اور افغانستان کا سفیر نامزد کیا

اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں خطوط اور تحائف لے کر قسطنطنیہ کے راستے سے خراسان اور خوازم جاؤں اور وہاں سے کابل پہونچوں. میں نے زمانہ سفر کی طوالت اور بال بچوں کو دیکھنے کا عذر پیش کرکے مہلت طلب کی اور یہ اقرار کر لیا کہ اپنے وطن ہندوستان واپس پہونچکر سفارت کی خدمات کے لئے مذکورہ ممالک کا سفر کروں گا. وزیر ہند نے لارڈ ویلزلی Lord Wellesley کے نام ایک خط لکھ کر دیا جس میں لکھا تھا کہ انگریزوں کی دوستی کے باعث حاسدوں کے ہاتھوں مجھ کو نقصان پہونچا ہے اس کی خاطر خواہ تلافی کی جائے اور معاوضہ دیا جائے. اور مجھ کو ایران اور افغانستان کی سفارت پر روانہ کر دیا جائے.

میں نے اکثر مقامات پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کا ذکر کیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق بھی کچھ لکھا جائے اور ان کے حالات اور طریقۂ کار پر روشنی ڈالی جائے.

ایسٹ انڈیا کے ڈائریکٹروں کا تذکرہ

کمپنی کے معنی سب جانتے ہیں. یہ اس ملک کے تاجروں کی ایک بڑی جماعت ہے ابتدا میں اس جماعت کے ہر رکن نے اپنا اپنا روپیہ ہندوستان سے تجارت کرنے کے لئے لگایا تھا اور جب کافی منافع حاصل کر لیا تو تجارتی کاروبار اپنے گروہ کے چند لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا اور منافع تمام اراکین جماعت پر اس کے لگائے ہوئے سرمایہ کے مطابق تقسیم کرنے کا سلسلہ جاری کیا. اس کے بعد سے ہندوستان کے حکمرانوں کی کمزوریوں کے باعث جو مال غنیمت کمپنی کو ملتا ہے اس کی تقسیم میں بھی سب شریک ہیں. بعض شرکا کمپنی اپنے حصے دوسروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتے ہیں اور اکثر لاوارث مرجاتے ہیں. ان تبدیلیوں سے کمپنی کے حالات میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے. اور ایک گروہ کے بجائے دوسرا گروہ بن جاتا ہے. لیکن کمپنی کے چوبیس ڈائریکٹروں میں یکایک کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے اور ان کی تعداد چوبیس سے کم نہیں ہوتی ہے. کیونکہ قاعدہ مقررہ کے مطابق ہر ڈائریکٹر زندگی بھر اپنے عہدہ پر قائم رہتا ہے. اور کسی بہت بڑی خطا کے بغیر اپنے عہدے سے معزول نہیں ہو سکتا ہے. اس کے مرنے کے بعد کمپنی کے ممبروں میں سے کسی کو اس کی جگہ منتخب کر لیا جاتا ہے. کمپنی کے ممبروں کو سوائے منافع میں حصہ پانے کے کسی معاملے میں مداخلت کا

اختیار نہیں۔ بلکہ بعض حصہ دار تو اس قدر حقیر ہیں کہ ان کو ڈائرکٹروں کی ملاقات بھی میسر نہیں ہوتی۔ ان چوبیس ڈائرکٹروں میں سے ایک چیرمین یعنی کرسی نشین ہوتا ہے۔ جس کا انتخاب سال بھر کیلئے کیا جاتا ہے۔ یہ باقی ڈائرکٹروں کا افسر اور تمام کاروبار کا بااختیار منتظم ہوتا ہے اور سال بھر تک سارے کام انجام دیتا ہے۔ دوسروں کو سوا مشورہ دینے کے اسے اور کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ دوسرے سال کے آغاز میں دوسرے ڈائرکٹر کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ ان ڈائرکٹروں میں اکثر ایسے ہیں کہ جو عدم قابلیت کی وجہ سے تمام عمر چیرمینی کے منصب سے محروم رہے اور بعض ایسے ہیں جو اپنی قابلیت اور انتظامی لیاقت کے باعث چھ چھ سات سات بار چیرمین منتخب ہوئے۔ دو تین ایسے بھی ہیں کہ جو چار پانچ سال متواتر منتخب ہوتے رہے ہیں ڈائرکٹر اتوار کے سوا جو نصاریٰ کے لئے ہمارے جمعہ کی مانند ہے انڈیا ہاؤس میں جمع ہوتے ہیں۔ انڈیا ہاؤس بڑی عالی شان شاہانہ عمارت ہے جس کے احاطہ کا دور ایک میل کا ہے۔ یہاں بیٹھکر صلاح و مشورہ ہوتا ہے اور ہندوستان کے گورنروں کی رپورٹوں پر غور کیا جاتا ہے۔ ان کو مناسب احکامات جاری کئے جاتے ہیں۔ مگر پہلے ڈائرکٹر اپنی تجویزوں کو وزیر ہند کے سامنے پیش کر کے منظوری حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ منظور نہیں کرتا تو تجویز رد ہو جاتی ہے۔ چونکہ تمام ڈائرکٹر تاجروں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور انگلستان کی رعایا ہیں اور لارڈ ڈرنہمت کی نظروں میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس لئے ہندوستانی معاملات کے طے کرنے کا دارومدار اسی پر ہے۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ چند سال سے ہندوستان کے گورنروں کی بدانتظامی اور ان کی خودغرضیوں کی شکایات ملنے کے بعد کہ جس سے انگریز قوم کی بدنامی پھیلی۔ پارلیمنٹ کی تجویز اور حکم شاہی کے ذریعہ ڈائرکٹروں کو من مانی کرنے سے روک دیا گیا۔ اس کے باوجود کمپنی کے مقرر کردہ افسر مختلف بہانوں سے پارلیمنٹ کے احکامات کے خلاف جو دل میں آتا ہے کرتے رہیں۔ اور جب اس کی خبر لندن پہنچتی ہے تو ان کی سخت مخالفت کی جاتی ہے۔ اور ان کی تجویزوں کو رد کر دیا جاتا ہے۔ میرے زمانہ قیام میں گورنر مدراس لارڈ کلیب کی تجویز انہدا اس پر عمل درآمد کو رد کر دیا گیا تھا۔ جس میں اس نے ایک محروم الارث شخص کو کرناٹک کا صوبہ دار مقرر کیا اور اس علاقہ میں جزوی طور پر مداخلت شروع کی تھی اور اسی طرح معاہدہ کے خلاف لارڈ ویلزلی کا پارلیمنٹ سے مشاورت کے بغیر صوبہ اودھ میں مداخلت کرنا اس وقت زیر غور ہے۔ دیکھنا ہے کیا

طے پاتا ہے۔ میرے لندن پہنچنے کے بعد کمپنی کے ڈائرکٹروں کو یہ شبہ ہوا کہ میں ہندوستان کے کسی امیر کی جانب سے کمپنی کے مقرر کردہ حکام پر بحث کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں، اس لئے کمپنی کے ڈائرکٹر مجھ سے بدظن تھے۔ مگر جب ان کو اس کے برعکس حالات کا علم ہوا تو مجھ سے نہایت خلوص کے ساتھ پیش آئے۔ اور ان میں سے بعض معززین نے جو چیرمین رہ چکے ہیں۔ نہایت عزت واکرام کے ساتھ میری مہمانداری کی۔ خاص طور پر مسٹر انگلش جو ایک نیک خصلت شخص ہے اور مسٹر ڈورین، مسٹر مٹکاف ... مسٹر لشنٹن اور مسٹر چارلس گرانٹ ... سے میری ملاقات ہوئی اور باقی اٹھارہ اراکین سے نہ مل سکا جس مقام پر وزیر ہند اجلاس کرتا ہے، اس کو انڈیا بورڈ کہتے ہیں۔ اس عمارت میں سینکڑوں اہل کار کام کرتے ہیں اور بہت سے دفاتر قائم ہیں۔ دفاتر کا افسر اعلیٰ مسٹر میرک Mr. Mereek نامی ایک لائق آدمی ہے جو نہایت خلیق اور ہنس مکھ ہے اور مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اکثر میرے پاس آتا رہتا تھا۔ اور کئی بار اس نے مجھ کو اپنے مکان پر بلا کر دعوت کی۔ اس کا مکان شہر کے باہر اسلون اسٹریٹ (Sloome Street) میں واقع ہے۔ اس کا ایک بھانجا مسٹر میچ جو آج کل سیلون میں ملازم ہے اس نے چند ماہ مجھ سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ نہایت خوش رو اور نیک آدمی ہے۔

آٹھواں وزیر عدالت جو بمنزلہ قاضی القضاۃ کے ہے۔ یہ ساری عدالتوں اور ان کے کاموں کا نگران اعلیٰ ہوتا ہے۔ ججوں کی معزولی کی رسم یہاں ختم کی جا چکی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اگر عدالت کسی کو قتل کا حکم دیتی ہے تو اس کو تصدیق کے لئے بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر بادشاہ چاہے تو قاتل کو معاف کر سکتا ہے۔ اگر معاف نہیں کرتا ہے تو مجرم کو عدالت کے فیصلے کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔ اس محکمہ کے وزیر کو لارڈ چانسلر کا لقب ملتا ہے میں نے اس کی صورت دیکھی ہے مگر تعارف نہیں ہوا۔

نواں وزیر شریعت جسکو انگریزی میں بشپ ... کہتے ہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ انگریزی شرع پادری کو قتل اور قصاص اور سیاسی معاملات میں کوئی دخل نہیں اس کا تعلق صرف چند کاموں تک محدود ہے اول اتوار کو گرجوں میں امامت کرنا اور وعظ کہنا۔ دوسرے نکاح وطلاق تیسرے مُردوں کی تجہیز وتکفین کے کام چوتھے بچوں کے نام رکھنا اور بپتسمہ دینا۔ ان کے عقیدے میں بچے لامذہب پیدا ہوتے ہیں جب تک ان کو

چیتھے نہ دیا جائے عیسائی نہیں ہو سکتے ہیں. ان کاموں کے معاوضے میں ان کو زراعت اور مال غنیمت میں سے دسواں حصہ دیا جاتا ہے. اس کا طریقہ یہ ہے کہ ملک انگلینڈ کو چھوٹے چھوٹے قطعوں میں تقسیم کیا ہے. ہر قطعہ کو پیرش (Parish) کہتے ہیں اور ہر پیرش میں مذکورہ کاموں کو انجام دینے کے لئے ایک گرجا اور اس کا ایک امام ہوتا ہے جس کو کلرجی مین (Clergyman) کہتے ہیں. یہ اپنے متعلقہ علاقہ سے غلہ اور مال گزاری وغیرہ وصول کر کے بشپ کے پاس پہنچاتا ہے اور بشپ سے اپنا مقررہ وظیفہ حاصل کرتا ہے. ایک بشپ کے ماتحت کئی کلرجی مین ہوتے ہیں. ان کا تقرر اور برطرفی اسی کے اختیار میں ہوتی ہے. کل بشپ بارہ ہیں ان سب کا تعلق وزیر مذکور سے ہے جس کا نام ڈاکٹر مور ہے. اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی. جب کوئی بشپ مرجاتا ہے تو بادشاہ وزیر مذکور سے مشورہ کر کے کسی کلرجی مین کو اس کی جگہ مقرر کر دیتا ہے.

لندن کے بشپوں کا ذکر اور ایک بشپ سے مباحثہ

انگلینڈ کے بشپوں میں ایک بشپ آف لندن ہے (Bishop of London) جو فلسفیانہ خیالات رکھتا ہے اور نہایت معقول آدمی ہے. مجھ سے بہت محبت کرتا تھا. اکثر میرے ساتھ بحث و مباحثہ ہوتا تھا. چنانچہ ایک روز میں نے اس کو بتایا کہ انجیل میں نبی آخرالزماں علیہ السلام کی خبر دی گئی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو آنحضرت صلعم کی پیروی کی وصیت کی ہے. اس نے اس روایت سے انکار کیا اور آئندہ ہفتہ اس کا جواب دینے کا وعدہ کیا اور اس مقررہ دن پر اس نے میری بات کی تصدیق کی. اس کے ساتھ اس نے یونانی زبان کی ایک نہایت قدیم انجیل کا نسخہ دکھایا جس میں یہ مضمون درج تھا جو قرآن کی آیت کے بھی مطابق ہے. میں نے اس سے کہا جب تمہاری آسمانی کتاب میں جو تمہارے نبی پر نازل ہوئی ہے یہ لکھا ہے تو تم اس کے حکم پر عمل کیوں نہیں کرتے. کہنے لگا ہم کو یہ گمان ہے کہ یہ الفاظ روم کے قیصروں میں سے کسی قیصر نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں جو آغاز اسلام میں اس مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا. میں نے جواب دیا کہ ایسی کتاب جس کی نقل ہر ایک کے پاس موجود ہے اس میں الحاق دشوار ہوتا ہے اس کے علاوہ آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ جانبین کی تاریخی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب حضرت محمد صلعم نے خود نصاریٰ

سے گفتگو فرمائی اور ان سے کہا میں وہی نبی موعود ہوں جس کی فرماں برداری کی وصیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی تھی تو نصاریٰ نے اس خبر کی اصلیت کا انکار نہیں کیا. بلکہ یہ کہا کہ آپ وہ پیغمبر نہیں ہیں جن کی اطلاع حضرت عیسیٰ نے دی تھی. ہم تو ان کے منتظر ہیں. اگر یہ الفاظ زمانہ قدیم سے منقول نہ ہوتے تو نصاریٰ کو جواب میں کہنا چاہیئے تھا کہ حضرت عیسیٰ نے ہم کو یہ وصیت نہیں کی ہے. یہ بات سن کر وہ بشپ ہنس پڑا اور کہنے لگا اچھا آپ اسی لئے انگلینڈ تشریف لائے ہیں کہ لوگوں کو ان کے قدیم مذہب سے برگشتہ کر دیں ؟

دوسرا بشپ آف ڈارم

یہ بشپ میری بہت عزت کرتا تھا اور نہایت اخلاص و محبت سے پیش آتا تھا اس نے بہت دھوم دھام سے میری دعوت کی اور اس میں لندن کے ان تمام معزز اہل علم کو مدعو کیا جو فارسی داں تھے. اس زمانہ میں لندن کے اندر قحط پڑا ہوا تھا. دوران گفتگو بشپ نے مجھے بتایا کہ جب تک ایک ہزار محتاجوں کو اس کے یہاں سے کھانا نہیں مل جاتا ہے اس وقت تک وہ خود کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتا. اس سے اس کی شان و شوکت اور آمدنی کی فراوانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے.

الغرض یہ دو آخر الذکر وزیر ظاہری شان و شوکت اور عزت و حرمت میں دوسرے وزیروں سے بڑھے ہوئے ہیں بلکہ شاہزادوں سے بھی زیادہ بلند مرتبہ سمجھے جاتے ہیں. لیکن ملکی معاملات میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے. باقی نو وزیر ہر روز بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے فرائض منصبی کے متعلق گفتگو کرتے ہیں. احکامات پر بادشاہ کے دستخط کراتے ہیں. اپنی تجاویز پیش کرتے ہیں. اور ان پر بادشاہ کی منظوری حاصل کر کے وزیر خزانہ کو دیتے ہیں تاکہ وہ پارلیمنٹ سے منظوری حاصل کر کے ان پر عمل درآمد کرائے. اب میں پارلیمنٹ کا مختصر حال تحریر کروں گا جو اس سلطنت کا جزو ہے.

انگلینڈ کی پارلیمنٹ

House of Commons "دار العوام"

اس پارلیمنٹ کے ممبر رعایا میں سے منتخب ہوتے ہیں. ان کی تعداد ساڑھے تین سو سے زیادہ ہے یہ سب ذی علم، عالی دماغ اور نہایت ہوشیار ہوتے ہیں. یہ ممبر انگلستان کے

تمام شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کے لوگوں کی کثرت رائے سے منتخب ہوتے ہیں۔ اور ان کا انتخاب سات سال کے لئے ہوتا ہے یہ ممبر موسم سرما کے سات ماہ لندن میں گزارتے ہیں۔ کیونکہ یہ پارلیمنٹ کے اجلاس کا زمانہ ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ کی عمارت بہت شاندار ہے جو شہر کے ایک پرفضا میدان میں تعمیر کی گئی ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبران کا پہلا کام یہ ہے کہ ہر سال کا بجٹ جو وزیروں کے مشورے سے تیار ہوتا ہے اس کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ مناسب اور درست ہوتا ہے تو اسی صورت میں ورنہ ترمیم و تنسیخ کے بعد منظور کر دیتے ہیں۔ ہر قسم کے نئے کام اور صلح و جنگ کے معاملات انہیں کی رضامندی پر موقوف ہیں۔ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے جو تجویز بادشاہ اور امراء نیز دوسرے ذی فہم لوگوں کے ذہن میں آتی ہے اس کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر پارلیمنٹ نے اس کو منظور کر لیا تو وہی اس کے اخراجات کی ذمہ دار ہوتی ہے اور وہ کام بادشاہ اور وزراء کے زیر اہتمام انجام پاتے ہیں۔ البتہ پارلیمنٹ اس کے اخراجات اور آمدنی کی جانچ ضرور کرتی ہے، جس زمانہ میں دوسرے ضروری کام درپیش نہیں ہوتے اس زمانہ میں اشیاء کی ارزانی اور رعایا کے آرام و آسائش کے لئے تجاویز منظور کی جاتی ہیں۔ غرض یہ کہ تمام ملکی قوانین، تجارت، عدالت اور فوج کے انتظامات کے سارے معاملات پارلیمنٹ طے کرتی ہے۔ مجرموں کی سزا وغیرہ کے سلسلے میں آسمانی احکام اور شریعت کے قوانین پر عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وقت اور حالات کے مطابق قوانین وضع کرلئے جاتے ہیں۔

ہاؤس آف لارڈس

دارالامراء

پارلیمنٹ کی عمارت سے ملا ہوا ہاؤس آف لارڈس یعنی دارالامراء واقع ہے۔ جس دن پارلیمنٹ کا آخری اجلاس ختم ہوتا ہے اس دن بادشاہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ دارالامراء میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ وزراء، شہزادے اور دوسرے ممالک کے سفیر زرق برق لباسوں میں آتے ہیں۔ شہر کے بہت سے معزز مرد اور خواتین بھی اجازت لے کر شرکت کرتے ہیں۔ میں بھی اس موقع پر مسٹر وبرٹ کے ہمراہ جن کا ذکر آچکا ہے اس تقریب میں شریک ہوا۔ بادشاہ کے بھائی ڈیوک آف کلاسٹر کی مہربانی سے شاہی کرسی کے متصل مجھے جگہ ملی۔ میں نے بادشاہ اور اراکین پارلیمنٹ کی باتیں قریب سے خوب سنیں اس مجلس کی عظمت و شان سے لطف اندوز

ہوا۔ بادشاہ ایک چتر نما کرسی پر بیٹھا تھا' داہنی جانب ولی عہد کی کرسی تھی بائیں طرف تمام شاہزادوں کی کرسیاں تھیں جو زرد مخمل سے منڈھی تھیں شاہزادوں کی نشست کے قریب بانات سے منڈھی ہوئی بنچیں بچھی ہوئی تھیں جن پر بادشاہ کے دور کے رشتہ دار اور شہر کی معزز خواتین بیٹھی تھیں۔ ولی عہد کی کرسی سے ذرا نیچے شاہزادگانِ فرنگ اور ممالک غیر کے سفرا کھڑے تھے۔ بادشاہ کی تلوار لارڈ اسپنسر کے ہاتھ میں تھی۔ اور ٹوپی اول دنچلسی lord wain chelsea کے پاس تھی یہ دونوں سب سے زیادہ بادشاہ سے قریب بالکل سامنے کھڑے تھے۔ اس دیوان خانہ کا انتظام لارڈ پیٹر گوڈیا بارل load peter. Miss talia Barrell کے سپرد تھا جو مس بارل gow sir Burrell کا چچا زاد بھائی ہے۔ امرا بادشاہ کے پیچھے پادری' جج اور ممبران پارلیمنٹ موجود تھے۔ بادشاہ کی واپسی کے بعد تماشائیوں کی بھیڑ بھاڑ اور گاڑیوں کی کثرت کے باعث اس ایوان سے باہر جانے میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ دن کے کھانے کا وقت بھی گزر گیا جس کے لئے میں ایک معزز شخص کے یہاں مدعو تھا۔ مجھ کو اس سے شرمندہ ہونا پڑا۔

ڈیوک (چھوٹے شاہزادے) کا ذکر

انگلینڈ کے نہایت بلند مرتبہ دوسرے معززین میں زمانہ قدیم سے ڈیوک اعلیٰ سمجھے جاتے ہیں ان کا شمار بھی اراکین سلطنت میں کیا جاتا ہے مگر امور سلطنت میں ان کا دخل بالکل نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا تعلق جس علاقہ یا مقام سے ہوتا ہے' وہ اسی کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں جیسے ڈیوک آف نارفولک' ڈیوک آف یارک' ڈیوک آف شمبلن وغیرہ جب کوئی ڈیوک مر جاتا ہے تو اس کی جائیداد اس کی اولاد میں تقسیم نہیں کی جاتی بلکہ اس کا بڑا بیٹا یا چھوٹا بھائی اس کی جگہ ڈیوک بنا دیا جاتا ہے یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ ریاست کی طاقت کم نہ ہو۔ سنا گیا ہے کہ بعض بعض ڈیوکوں کی آمدنی بادشاہ کے مقررہ وظیفہ کے برابر ہے اور خاندانی قدامت کے باعث ان کے عزیز و اقارب اور متعلقین اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی ایک فوج تیار ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں کی سخاوت کے باعث ان کے علاقہ کے باشندے ان سے بہت خوش رہتے ہیں۔ اسی لئے حکومت کی طرف سے ان کو نہ تو فوج رکھنے کی اجازت ہوتی ہے نہ ملکی انتظامات میں کوئی عہدہ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ان کے موجودہ اقتدار کے ساتھ اگر

کسی جھنڈے کی قوت بھی شامل ہو جائے تو ملک گیری کی ہوس میں بغاوت کا ارادہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اب سے چھ سال پہلے آئرلینڈ کے ایک ڈیوک آف لنسٹر کے بھائی نے بغاوت کر کے بادشاہ پر حملہ کیا تو آئرلینڈ کے بہت سارے لوگ اس کے مددگار بن گئے، اور ایک بڑا فساد برپا ہوا۔ قریب تھا کہ یہ ملک انگلینڈ کے قبضہ سے نکل جاتا لیکن بہت کشت و خون کے بعد باغی ڈیوک گرفتار ہوا۔ اور قید خانہ میں مر گیا۔ اس بغاوت کو لارڈ کارنوالس نے اپنی فہم و فراست اور شجاعت کے ذریعہ ناکام بنا دیا تھا۔ دوسرے ڈیوکوں کے علاوہ ایک نیک نام ڈیوک بڈفورڈ Duke of Bedford تھا۔ بہت خوبصورت، خوش اخلاق اور میرا شناسا تھا۔ تین ماہ ہوئے میں نے وفات پائی۔ اس کا بھائی اس کا قائم مقام ہوا۔

ایک دوسرا ڈیوک آف نارتھا مبرلینڈ Duke of Northumberland ہے جو بہت مالدار ہے۔ اس کا باغ اور مکان اسین ہاؤس کہلاتا ہے۔ اس کی تعریف ایک مثنوی میں کر چکا ہوں۔ میں نے اس کے باغ اور مکان کی سیر کی۔ اس کی دعوت میں شرکت کی۔ ڈچیز کا مقصد اس دعوت سے یہ تھا کہ مجھے اپنے مکان کی زیب و زینت دکھا کر مرعوب کرے۔ حالاں کہ میری نظر میں اس کی کچھ وقعت نہ تھی۔ اس نے اپنی خست کے باعث میرے لائق خاطر مدارات بھی نہ کی۔

تیسرا ڈیوک آف ڈونشائر Duke of Devonshire جو لارڈ اسپنسر کا بہنوئی ہے اس کی بیوی ہر سال اپنے مکان واقع چوک ہاؤس میں لندن کے شرفا کی دعوت کرتی ہے۔ یہ مقام لندن سے دس میل دور واقع ہے۔ اس کی دعوت کا مفصل حال میں نے ایک مثنوی میں لکھا ہے جس سے اس کی شان و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی دولت بے بہا ایک لڑکی ہے جس کا نام جارجینا ہے۔ اس کا حسن حسینانِ روزگار کے لئے باعث رشک ہے اور اس کا اندازِ کلام بے قرار دلوں کے لئے باعثِ راحت ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ جب میں اس سالانہ جلسہ میں پہونچا تو ڈچیز ڈونشائر Duchess of Devonshire نے ازراہِ مہربانی ایلزبتھ فاسٹر Lady Elizabeth Foster سے ملاقات کرائی کو میری میزبانی کے لئے مقرر کیا۔ لہٰذا لیڈی مذکور نے لندن کے دستور کے مطابق میرے بائیں بازو کے نیچے اپنا ہاتھ دے کر باغ کی عمارات دکھائیں اور ناچ گانے کے جلسے وغیرہ کی ابتدا سے کھانے کے وقت تک سیر کراتی رہی۔ جب ہم کھانے کی میز پر پہونچے تو اتفاقاً اسی وقت پرنس آف ویلز دوسری طرف سے کمرے میں داخل ہونے

کے لئے پہونچے۔ میں نے تعظیم کے خیال سے پیچھے ہٹ جانا چاہا تاکہ پرنس پہلے داخل ہو جائیں۔ لیڈی مذکور کو بھی میری وجہ سے ٹھہرنا پڑا۔ شاہزادہ لیڈی کی عظمت اور اعزاز کی وجہ سے خود پیچھے ہٹ گیا۔ اور مجھ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں سٹ پٹایا کہ کیا کروں۔ لیڈی میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ اور کہنے لگی چونکہ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہے' اس لئے شہزادہ تم پر سبقت نہ کرے گا۔ اور اس کے حکم کی تعمیل ادب میں داخل ہے۔ لہٰذا کھانے کی میز پر بھی انگریزی قانون کے مطابق مجھ کو پہلے بٹھایا گیا۔ جو دراصل شاہزادے کا حق تھا۔ چونکہ اس دن لندن کے ایک اوپرہ ہاؤس میں شرکت طے تھی۔ اس لئے ڈچز ڈوونشر نے مجھ کو وہاں چلنے کی ترغیب دی۔ اور اپنے کیبن کا ٹکٹ مجھ کو دے دیا۔ میں نے اس وجہ سے معذرت کی کہ لندن تک پہونچنے اور ذرا دیر آرام کرنے میں بہت وقت ہو جائے گا۔ لیکن ڈیوک آف گلاسٹر نے جو بادشاہ کا بھائی ہے' مجھ سے کہا کہ تمہارا یہ عذر قابل قبول نہیں ہے۔ ہم بھی وہاں آئیں گے۔ لہٰذا تم کو بھی آنا چاہئے۔ لیڈی ایلزبتھ فاسٹر اور لیڈی ہاروے Harraway اس کے بھائی کی بیوی اور لیڈی جارجینا Georgiana نے کہا کہ ہم سب بھی آٹھ بجے تماشا گاہ پہنچیں گے۔ اور اگر اس وقت تم نہ آئے تو تم سے جرمانہ وصول کیا جائے گا۔

اس لئے میں نے مکان پر پہنچ کر جھٹ پٹ لباس تبدیل کیا اور تماشا خانہ پہنچ گیا۔ ڈیوک آف گلاسٹر مجھ سے پہلے وہاں پہنچ کر خواتین مذکورہ کا انتظام کر رہا تھا۔ وہ دو گھنٹہ میرے ساتھ رہا' اور جب وہ نہ آئیں تو خفا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ آدھی رات گئے وہ خواتین آئیں۔ میں نے ڈیوک کے حکم کے مطابق ان سے وعدہ خلافی اور دیر میں آنے کا جواب طلب کیا۔ انہوں نے بے پروائی کے ساتھ ایک فضول بہانہ کر دیا کہ گاڑیوں کی کثرت کے باعث ہم کو جو ڈک باغ Kensington سے نکلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس عذر گناہ بدتر از گناہ پر میں نے ایک غزل لکھ ڈالی۔ اور اس کا انگریزی ترجمہ ان خواتین کو سنایا' وہ بہت لطف اندوز ہوئیں۔ اور یہ ترجمہ زبان زد عام وخاص ہو گیا۔

چوتھا ڈیوک مالبرو Duke of Marlborough جو بلینم پارک کا مالک تھا میں اس کی تعریف پہلے کر چکا ہوں۔ بعض اشعار میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈیوک پورٹ لینڈ Portland ڈیوک نارفوک Norfolk ڈیوک گارڈن

Gordon ڈیوک گورڈن ڈیوک رچمنڈ Richmond وغیرہ ہیں جن سے میرا تعارف نہیں ہو سکا۔ زمانہ حال میں بہت سے نئے ڈیوک بنائے گئے ہیں جو سب کے سب شاہی خاندان سے ہیں کیونکہ بادشاہ سوائے اپنے عزیزوں کے کسی کو یہ منصب نہیں دیتا ہے۔ ان میں ڈیوک آف گلاسٹر، ڈیوک آف پارک امیر الامرا، ڈیوک کلارنس اور ڈیوک آگسٹن قابل ذکر ہیں۔ یہ سب بادشاہ کے بیٹے ہیں۔ ان کو نیا منصب حاصل ہوا ہے مگر کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے۔ کئی بار ان سب کے ساتھ کھانا کھانے کا موقع ملا اور تھیٹروں میں بھی ساتھ گیا۔ سب با اخلاق اور متواضع لوگ ہیں۔ یہ خود دوسرے معزز لوگوں کے یہاں دعوتوں میں شرکت کرتے ہیں اور بے تکلفی کے ساتھ ہنستے بولتے ہیں۔ خاص طور پر ڈیوک گلاسٹر بہت ظریف طبع اور خوش مزاج ہیں۔ کھانے کی میز پر بیٹھنے والی عورتوں سے میرے ساتھ عشق و عاشقی کی چھیڑ چھاڑ کرتے تھے اور ان کی اتفاقیہ حرکات کو میرے ساتھ عشق کے رشک و حسد پر محمول کر کے لوگوں کو خوب ہنساتے تھے۔

لارڈ میئر کا حال

لندن کے بڑے حکام میں ایک لارڈ میئر Lord mayor ہے شہر لندن کی حکومت اس سے متعلق ہے۔ شہر کا جو حصہ شاہی مسکن ہے، اس کو چھوڑ کر باقی کل شہر پر لارڈ میئر حکومت کرتا ہے۔ اس کے علاقہ میں بادشاہ کا حکم نافذ نہیں ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ یا شہزادے کسی تقریب کے سلسلہ میں شہر کے اندر آتے ہیں تو لارڈ میئر ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس تقریب یا محفل کا صدر نشین وہی ہوتا ہے۔ اسی طرح ملکۂ انگلینڈ اور شہزادیاں محافل رقص و سرود وغیرہ میں لیڈی میئرس پر فوقیت نہیں رکھتی ہیں۔ لارڈ میئر ہر سال تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور ایک ایلڈرمین میئر منتخب کر لیا جاتا ہے۔ شہر کے شرفاء اور عمائدین کو فری مین (Freeman) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے دو تین ہزار کا انتخاب لوری مین Liveryman کے نام سے ہوتا ہے۔ اور ان میں سے چوبیس ایلڈرمین Alderman منتخب ہوتے ہیں۔ فری مین کے معنی ہیں مرد آزاد یعنی لندن کے باقی حصوں کے تعلق سے آزاد اور بلدہ شہر لندن سے مخصوص کیونکہ دوسرے حصوں کے علاقہ داروں کو بلدے میں نہیں رہنے دیتے ہیں۔ لوری مین اہل حل و عقد کو کہا جاتا ہے اور ایلڈرمین چودھری یا رئیس کو کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ پورے شہر کے چوبیس حصے کر دیے گئے ہیں۔ اور ہر حصے میں فری مین اور لوری مین اور ایک ایلڈرمین ہے۔

رہتا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ جب اس حصے میں کوئی جھگڑا یا تنازعہ پیدا ہو تو بعض یوری مینوں کے مشورے سے اس کا فیصلہ کریں۔ اور اگر فریقین راضی نہ ہوں تو وہ معاملہ لارڈ میئر کے سامنے پیش کردیں۔

ایلڈرمین Alderman کا منصب عمر بھر کے لئے ہوتا ہے۔ جب کسی حصے کا ایلڈرمین مرجاتا ہے تو اس حصے کے یوری مین جمع ہوکر اپنے گروہ میں سے کسی ایک کو کثرت رائے سے ایلڈرمین منتخب کرلیتے ہیں اور فری مین Freemen میں سے کسی ایک کو اس کی جگہ یوری مین مقرر کرتے ہیں۔ لارڈ میئر Lord Mayor کے انتخاب کا طریقہ یہ ہے کہ تمام یوری مین ہر سال کے آغاز پر کامن ہال میں جمع ہوتے ہیں اور دو شخصوں کے نام انتخاب کرتے ہیں۔ اس کے بعد چوبیس ایلڈرمین اپنا جلسہ کرتے ہیں اور ان دو ناموں میں سے ایک کو لارڈ میئر کے منصب کے لئے انتخاب کرلیتے ہیں۔ وہی سال بھر کے لئے شہر کا حکمران ہوتا ہے اور ہر روز عدالت میں اجلاس کرتا ہے اور احکامات جاری کرتا ہے۔ اس لارڈ میئر کے دو ماتحت کوتوال کی طرح کے ہوتے ہیں جن کو شیریف Sheriffs کہا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے سے مجرموں کی پکڑ دھکڑ اور ترقی و ضبطی وغیرہ کے کام انجام پاتے ہیں اور شہر کے تمام انتظامات بھی انہیں کے ذمے ہوتے ہیں۔ شہر کے لوگ لندن کے بادشاہی حصے کے لوگوں کی طرح لارڈ میئر دن ڈھلے نہایت شان و شوکت کے ساتھ سوار ہوکر نکلتا ہے اور واپسی کے وقت اسی طمطراق سے کشتی میں بیٹھ کر دریا کے راستے سے اس عالی شان محل میں وارد ہوتا ہے جس کو گلڈ ہال Guild Hall کہتے ہیں۔ یہ ہال مجالس جشن کے واسطے مخصوص ہے۔ یہاں سے لارڈ میئر کھانے کے جلسے میں جاتا ہے، جہاں تقریباً پانچ ہزار معززین شہر میزوں کے گرد بیٹھے ہوتے ہیں۔ لارڈ موصوف امراء شاہی اور عمائدین لندن کے ساتھ اپنی خاص میز پر بیٹھتا ہے۔

میرے زمانۂ قیام میں لارڈ میئر کم Lord Cowen تھا۔ اس نے مجھ کو اس جشن میں مدعو کیا۔ سواری سے اتر کر میں اس عمارت میں گیا۔ میرے پہنچتے ہی باجے والوں نے ایک خاص گیت بجاکر اہل محفل کو مطلع کردیا اور اسی وقت تقریباً پچاس چوبداروں نے اور لارڈ مذکور کے نیزہ برداروں نے مجھ کو اپنے حلقہ میں لے کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس کمرہ میں پہونچادیا جہاں لارڈ میئر اور شاہی امراء بیٹھے تھے۔ لیڈی میئرس جو

اس روز شہزادیوں کی طرح نہایت بھاری زرکار لباس پہنے ہوئے تھی اور جو کسی کی تعظیم نہیں کرتی اس نے میری غریب نوازی کے خیال سے کھڑے ہو کر تعظیم کی۔ اور لارڈ میئر میرا ہاتھ پکڑ کر کھانے کی سجی ہوئی میز پر لے گیا، اور مجھ کو اپنے مقابل بٹھایا اور خود لیڈی میئرس کے داہنی جانب جس کی نشست صدر میں تھی بیٹھا۔ اوس کے برابر لارڈ چانسلر پھر شاہی میر توزک اس کے بعد لارڈ اسپنسر Lord Spencer اور لارڈ نلسن Lord Nelson اور دیگر امرا میرے قریب تک بیٹھے۔ لیڈی میئرس کی بائیں طرف اس کی بیٹی مس کمب Miss Combe اور سابق لارڈ میئر اور بڑے بڑے جج بیٹھے تھے۔ میز پر ایسے انواع و اقسام کے کھانے جن سے بڑھ کر ممکن نہیں، نہایت سلیقے سے چنے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان جگہ جگہ بیش قیمت گلدان رکھے تھے، برتن نہایت قیمتی تھے۔ ایسی جگمگاتی ہوئی میز میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ایک مرتبہ لیڈی میئرس اور لارڈ میئر کا کام جام تجویز ہوا۔ اور ایک بار بادشاہ اور ملکۂ انگلینڈ کا جام صحت پیا گیا۔ ایک بار میری سلامتی کا جام پیا گیا۔ ہر بار جب پانچ ہزار شرکا گلاسوں کو بھر کر کھڑے ہوتے تھے اور اشخاص مذکور کا نام لے کر ایک دم سے پیتے تھے تو اس عالی شان مکان میں ایک عجیب غلغلہ مچتا تھا۔ اور خواجہ حافظ کے اس شعر کا مضمون بہت خوبی سے ظاہر ہوتا تھا۔

بیا تا دست افشانیم و مئی در ساغر اندازیم ؛ فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

چونکہ ہماری نشست بعض لوگوں سے بہت دور تھی اور سب کو اس صحبت کے دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لئے کھانے سے فارغ ہونے پر انہوں نے درخواست کی کہ ہماری ایک جانب سے اس شہ نشین میں آئیں۔ اور مجلس کا طواف کر کے اسی راستے سے نیچے چلے جائیں لارڈ میئر نے مجھ سے اجازت لینے کے بعد یہ بات منظور کر لی اور وہ صف بصف آنے اور جانے لگے اور جب میرے قریب پہنچتے تھے تو حسن ظن کے طور پر سر جھکاتے تھے، اور عورتیں جھک کر رسم سلام ادا کرتی تھیں، پورے دو گھنٹے طواف کا یہ ہنگامہ برپا رہا۔ اختتام مجلس پر شرکا نے جواہرات کی جڑاؤ تلوار لارڈ نلشن کو پیش کی اور ان کی مدح سرائی کی کیونکہ موصوف نے رود نیل کے ساحل پر جنگ ابوکیر میں فتح حاصل کی تھی۔ لارڈ نلشن اس تلوار کو کمر میں لگا کر وسط محفل میں کھڑا ہوا، اور تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں اس تلوار سے تمہارے دین اور دولت کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کروں گا۔ اس کے بعد تمام امرا و شاہی رخصت ہوگئے۔

میں نے بھی لارڈ میئر سے اجازت چاہی مگر اس نے منظور نہیں کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک اور بڑے ہال میں جہاں رقص کا انتظام تھا لے گیا۔ لیڈی میئرس پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی تقریباً پانچ سو عورتیں وہاں موجود تھیں، جو اس عمارت کے دور میں تختوں کی بنی ہوئی تہہ بتہہ سیڑھیوں پر جیسے ہندوستان میں تالابوں کے کنارے بنی ہوتی ہیں بیٹھی تھیں۔ ان میں چند عورتیں خاص طور پر ایک امریکن عورت ایسی نظر آئی کہ میں نے عمر بھر ایسی عورت نہیں دیکھی تھی تھوڑی دیر بعد ناچ شروع ہوا۔ مردوں کی تعداد اس محفل میں دس پندرہ سے زیادہ نہ تھی جب ایک پارٹی رقص کرتے کرتے تھک جاتی تو دوسری پارٹی آجاتی۔ غرض کہ سورج طلوع ہونے تک یہ محفل گرم رہی اس کے بعد میں رخصت ہوا۔ یہ رات میرے لئے ان چند عیش و نشاط کی راتوں میں سے ایک تھی جو میں نے لندن میں گزاریں۔ علاوہ دیگر سامان نشاط کے۔ مس کم کا چاند سا مکھڑا نظر کے سامنے رہا اور تاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کے چاند کی بہار دکھاتا رہا۔ یہ مس کم لندن کی حسینوں میں شمار ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس کے مسکرانے کا انداز تو اسی کا حصّہ ہے۔

ایک دن ماسکریڈ کی ایک محفل میں جہاں لوگ بھیس بدل کر جاتے ہیں مس کم نے مجھ کو دھوکہ دینا چاہا۔ گرمی کی وجہ سے منھ پر چھوٹا نقاب تھا اور نصف لب و دندان نظر آتے تھے۔ میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان کر کہا کہ بس زیادہ تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں ہے کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا، کیونکہ لندن میں کسی کو یہ لب و دندان میسر نہیں ہوئے ہیں۔ حاضرین نے یہ لطیفہ پسند کیا اور سب ہنسنے لگے اور ایک نے دوسرے کو یہ لطیفہ سنا کر مجلسوں میں مشہور کر دیا۔

انگریزوں کے فضائل اور رزائل

اب انگلستان اور اہل انگلستان کے عیب و ہنر بھی بیان کروں گا۔ جس کا میں نے لیڈی اسپنر سے لندن میں وعدہ کیا تھا۔ اس طرح ان کی عنایات و نوازشوں کا حق ادا کرتا ہوں۔ اگر اس میں واقعی کوئی خرابی ہے اور میری سمجھ میں غلطی نہیں ہوئی ہے تو اس کا تدارک کر سکتے ہیں۔

پہلے خوبیوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہیں۔ ایک خوبی خودداری اور حفظ آبرو ہے، خاص طور پر اکابرین ہی یہ خوبی لڑکپن کی تعلیم و تربیت کے باعث ہے۔ اور اس قدر

زیادہ ہے کہ باوجود فارغ البالی اور اہل و عیال کی کثرت کے چین کے لوگوں کی طرح ذرا سی بے عزتی پر جان دے دیتے ہیں۔ اور اپنی آزاد منش کے باعث دنیا کے تعلق کو اپنے راستہ میں حائل نہیں سمجھتے ہیں۔ پھر نام و نمود حاصل کرنے اور بہادرانہ کارناموں کے انجام دینے کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتے۔

دوسری خوبی، قدر شناسی ہے، وہ معمولی صاحب کمال کا بھی احترام کرتے ہیں۔ اس اچھی صفت نے ان کو بہت فائدے پہنچائے کیونکہ جب ایک کی عزت و عظمت دوسرے کی نظر میں پیدا ہوتی ہے، تو قوم کی آبرو اور اعتبار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے بخلاف دوسرے ملکوں میں کسی کا کمال ثابت ہو بھی جائے تب بھی اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے ہیں کہ اس کی طرح کے صاحب کمال اور بھی ہیں۔ اور جب ان کے اس غلط خیال کے باعث ایک کی عزت دوسرے کی نظر میں نہیں رہتی ہے، تو دوسرے لوگ بھی تعظیم نہیں کرتے ہیں۔ اور یہ بات ہنرمندوں کی دل شکنی کا سبب بن جاتی ہے اور قوم میں عزت کی کمی اور ذلت کی زیادتی ہو جاتی ہے

تیسری خوبی یہ ہے کہ وہ لوگ خلاف قانون کام کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اور حد سے تجاوز نہیں کرتے، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ملک و قوم کی قوت بڑھتی ہے، اور آپس میں اتحاد و اتفاق رہتا ہے اور یہ باتیں اصول تمدن میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور جب تک کسی قوم میں یہ خصلت باقی رہتی ہے وہ اپنے مرتبہ کی بلندی سے ہرگز نہیں گر سکتی۔ اس سے ایک اور فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بے کار لالچ اور ہوس میں مبتلا نہیں ہوتا کیوں کہ جو لوگ ناممکن باتوں اور موہوم ہوسوں میں کوشاں رہتے ہیں ان میں سے اکثر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے سوائے چند لوگوں کے۔

پانچویں خوبی یہ ہے کہ وہ جدید طرز زندگی کو قدیم طریقوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور کثرت سے یہ جدید رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ بظاہر یہ نقصان پہنچانے والی چیز ہے کیونکہ وہ پرانا سامان جو کار آمد ہے، اس کو نیا بنانے میں فضول خرچی ضرور ہوتی ہے، مگر اس سے صنعت کاروں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور یہ صنعت کار قوم کے ہاتھ پیر ہوتے ہیں۔ اس طرح مکان ہمیشہ نیا نظر آتا ہے۔ لندن میں فیشن کی تبدیلی اور پرانے سامان کی جگہ نئے سامان کی فراہمی کا اس قدر رواج ہے کہ سال بھر کی مستعمل چیزیں آئندہ کے واسطے بے کار ہو

جاتی ہیں بلکہ ایک موسم کی چیزیں دوسرے موسم میں بے کار ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے رکھنے اور استعمال کرنے میں نحوست سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہر قسم کے اخراجات میں کمی کرنے کے لئے اور مزدوروں اور ملازموں کی ضرورت سے بے نیاز ہونے کے واسطے یہاں کے عقلمند نئی نئی چیز ایجاد کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ میرے زمانہ قیام میں لکڑی اور کوئلہ کی گرانی کے سبب سے ایک کاریگر نے ایسا چولہا ایجاد کیا ہے کہ اگر کاغذ کا ایک پرزہ جلا کر اس کے اندر ڈال دیا جائے تو اس میں بہت پائیدار حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور ذرا دیر میں گوشت وغیرہ جو کچھ بھی دیگچی میں ہوتا ہے گل جاتا ہے۔

امور خانہ داری کے سلسلے میں ایسی چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں کہ ہر کام میں تعین وقت کے باعث سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ ہندوستان کے جس گھر میں پندرہ بیس ملازموں سے کام نہیں چلتا یہاں وہ کام ایک مرد اور ایک عورت انجام دیتی ہے باورچی خانہ کے کاموں کے لئے مختلف قسم کی مشینیں موجود ہیں۔ سامان رکھنے کے لئے الگ الگ الماریاں رکھتے ہیں۔

چھٹی خوبی یہ ہے کہ اپنے کاموں کو آسان کرنے کے لئے آلات اور مشینوں کو پسند کرتے ہیں اور ہمیشہ ضرورت کے مطابق نئی نئی اختراعات میں مشغول رہتے ہیں۔

ساتویں خوبی ان کے مزاج کی سادگی اور سلیقہ مندی ہے۔ جس کا اثر اس ملک کی تمام صنعتوں پر پڑتا ہے۔ خاص طور پر رنگوں، زیوروں، لباسوں اور دوسرے سامان پر۔ میرے نزدیک اس معاملہ پر ان کو پوری دنیا پر فوقیت حاصل ہے سوا ایران کے بعض سلیقہ مند لوگوں کے اور کوئی ان کا مقابل نہیں ہے

آٹھویں خوبی ان کی متانت اور مستقل مزاجی ہے۔ ان صفات میں ہر نیک و بد اور شریف و رذیل شامل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صنعت و حرفت میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرف ان کی رغبت بڑھتی ہے اور باہم دوستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

نویں خوبی علم و ہنر اور مال و زر کی تحصیل میں مستعدی۔ ان کاموں میں کاہلی ہرگز نہیں کرتے ہیں۔ چاہے وہ دوسروں کی نظروں میں درجۂ کمال تک پہنچ چکے ہوں مگر وہ خیال کرتے ہیں کہ لفظ کمال بطریق مجاز ہے نہ کہ حقیقی طور پر۔ ان کا کہنا ہے کہ جب انسان وحشت اور آدم خوری کے دور سے بتدریج ترقی کر کے نیوٹن جیسے فلسفی کے مرتبہ پر فائز ہو سکتا ہے تو ممکن ہے کہ آئندہ زمانہ اس قدر ترقی کرے کہ اس سے نیوٹن کو اسی طرح نسبت دی جائے۔

جیسی آج اس کو نیوٹن سے دی جاتی ہے. باوجود اس عزم وہمت کے پستی سے بلندی کے مدارج طے کرتے ہیں اس قدر صبر کرتے ہیں کہ کسی طرح اپنے سے اونچے کی مخالفت ظاہر نہ ہو۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ دوستوں کے لئے جس طرح اُن کا دسترخوان کشادہ رہتا ہے اُسی طرح ان کی پیشانی بھی کشادہ رہتی ہے. وہ مہمانداری کی کثرت کو پسند اور تنہا خوری کو ناپسند کرتے ہیں. یہ صفات گزشتہ زمانہ میں اس وقت سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں. تمام انگلستان کے عمدہ دستور اور رسوم اور قوت وشوکت انہیں عمدہ عادات کا نتیجہ ہے۔

انگریزوں کے رزائل

انگریزوں کے برے خصائل میں سب سے زیادہ بری خصلت مذہب اور آخرت پر ان کی بد اعتقادی ہے ان کا میلان طبع فلسفہ کی طرف زیادہ ہے جس کے سبب سے ملک کے رزیل لوگوں میں بد دیانتی کی کثرت ہے جو دوسرے ملکوں کے مقابلے میں یہاں زیادہ ہے. حالانکہ لوگ قانون شکنی سے بہت ڈرتے ہیں لیکن موقع ملنے پر جس طرح بھی ممکن ہوتا ہے دوسرے کا مال ہڑپ کر لیتے ہیں. اور ہمیشہ دولت مند لوگوں کا مال واسباب اڑا لینے کی گھات میں لگے رہتے ہیں. اسی لئے شرفا اپنے گھروں کے دروازے بند رکھتے ہیں. اور سوا جان پہچان والوں کے کسی سے بات چیت نہیں کرتے. چونکہ اس زمانہ میں سلطنت اور شریعت کی طاقت کا اثر ہے اور بڑے لوگ احتیاط بھی زیادہ کرتے ہیں اس لئے کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوتا ہے. مگر جب یہ بات رفتہ رفتہ عوام الناس میں ترقی پاکر ارباب حکومت میں اثر کرے گی اس وقت خرابیوں کا زیادہ اندیشہ ہے۔

دوسری بری عادت ان کا غرور ہے. قسمت کی موافقت کے باعث گزشتہ پچاس سال سے متواتر اپنی قوت میں ترقی دیکھ ان میں تکبر پیدا ہو گیا ہے. اور وہ بڑے بڑے حادثات کو اب بعید از امکان خیال کرکے ان کے تدارک کی فکر نہیں کرتے ہیں. اس کی ایک مثال یہ ہے کہ لندن کے عوام چیزوں کی گرانی اور نئے نئے ٹیکس لگنے کے باعث بلوہ وفساد کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں. حکام ان کی سراغ رسانی کرتے رہتے ہیں اور پولیس جگہ جگہ ناجائز اجتماع کی خبر پاتی ہے فوراً جاکر اس کو منتشر کر دیتی ہے لیکن اصل جھگڑے کا تدارک نہیں کیا جاتا ہے. کیونکہ بعض کا یہ خیال ہوتا ہے کہ عوام الناس زیادہ مانگنے کے عادی ہو گئے ہیں

اور بعض لوگ اس کا تدارک غیر ممکن خیال کرتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ غرور ہے۔ اسی لئے اطمینان اور فراغت کے وقت کوئی خطرہ نہیں محسوس کرتے اور جب کوئی حادثہ پیش آئے گا تو پھر فرانس کے مقتول بادشاہ کی طرح رعایا کی طلب سے زیادہ دینا منظور کریں گے۔ اور یہ بے سود ہوگا۔ یہ عیب کم و بیش سب میں پایا جاتا ہے لیکن طاقت ور اور زبردست لوگوں کی طرح نہ کہ ہندوستان اور ایران کے مغرور اور غافل لوگوں کی طرح۔

تیسری چیز روپیہ اور دنیاوی معاملات سے ان کی رغبت اور محبت کی زیادتی، اگرچہ یہ خصلت ان کے ملک میں اتنی مضر نہیں کیونکہ اس خصلت کے باعث مال کی قدر دانی اور حفاظت ہوتی ہے لیکن یہ اکثر بری عادات کا سبب بھی ہوتا ہے جیسے بخل، عدم آزادی، اور بے حیائی وغیرہ۔ اور ضعف کی حالت میں برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف سخاوت اگر اسراف کی حد تک بھی پہنچ جائے تب بھی اس کا اثر اچھا ہی ہوتا ہے۔ اور خاص کر ضعف کے وقت۔

چوتھی خصلت آرام طلبی اور سامانِ تعیش کی کثرت نہایت امیرانہ شان سے ہندوستان اور روم کے منحوس کاہلوں کی طرح نہیں۔ ان کی یہ خصلت علوم و فنون کی تکمیل اور جفاکشی کی عادت میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے اور تنگیٔ وقت کی وجہ سے دوستوں کی حاجت برآری میں بھی مانع ہوتی ہے اور معیت کو ختم کر دیتی ہے چنانچہ لندن کے قیام میں جب مجھے کسی نجی کام میں کسی دوست کی ترجمانی کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ اس کے لئے خوشی سے تیار ہو جاتا تھا کہ میرے دس روپیہ کے لئے اپنی جیب سے سو روپیہ خرچ کر دے۔ لیکن اگر کسی نے میرے دس روپیہ بیجا طور پر وصول کر لئے ہیں تو اس کی وصولیابی کے لئے تھوڑا سا وقت صرف کرنے میں بھی اس کے چہرہ سے ناگواری کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ اور مجھ کو اس سے مدد لینے میں شرم محسوس ہوتی تھی۔ مگر فرانس میں حالت برعکس ہے کہ اگر کسی ہوٹل کا مالک مجھ سے کبھی زیادہ کرایہ وصول کرتا تھا تو وہاں کے لوگ میری طرف سے اس کیساتھ بات چیت کر کے زائد رقم واپس دلواتے تھے۔ اگر غور کیا جائے تو اچھی طرح واضح ہو جائیگا کہ انگریزوں نے دوست احباب کی مدد کے لئے ذرا سا وقت بھی نہیں رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے شب و روز کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ایک حصہ ضروریات اور کاروبار کے لئے اور دوسرا عیش و آرام کے لئے۔ پہلے حصے میں ضرورت مند اس شرم سے ان کو

تکلیف نہیں دے سکتا ہے کہ ان کے کاروبار میں نقصان ہوگا۔ دوسرے حصے میں تفریح و آرام کا وقت ہوتا ہے اس لئے اظہارِ مدعا نہیں کر سکتا۔ اور اگر کسی کی ضرورت شدید ہے اور وہ اس کو مختصر الفاظ میں توجہ دلائے گا اور ساتھ میں کچھ معذرت خواہانہ انداز اختیار نہ کرے گا تو اس کو غیر مہذب سمجھ کر اپنے یہاں آنے نہ دیں گے۔ ان کے دروازے عام طور پر بند رہتے ہیں اور دربان کا اکثر جواب یہی ہوتا ہے کہ صاحب موجود نہیں ہیں۔

لندن کی ایک معزز خاتون نے محفلِ رقص و سرود کی تقریب میں مجھ کو بذریعہ رقعہ طلب کیا جس میں صرف یہ لکھا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو مکان پر موجود ہوں گی۔ میں اس کا مطلب کچھ نہ سمجھا۔ رقعہ ایک دوست کے پاس لے گیا۔ اس نے بتایا کہ تم کو بلایا ہے اور شاید محفل رقص و سرود ہوگی۔ میں نے اس عبارت کا مطلب پوچھا تو اس نے بتایا کہ بے مطلب ملاقات کے لئے جانے والوں کو اکثر یہ جواب دیا جاتا ہے کہ "گھر میں نہیں ہیں" لہٰذا یہ رسم جاری ہوگئی کہ جب بلاتے نہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ فلاں وقت گھر میں ہوں' اور جانے والا اگر وقت مقررہ پر جائے گا تو ملاقات ضرور ہوگی۔ انگریزوں کی اس عادت کا اتنا چرچا ہے کہ فرانس کے لوگ ان کی اس خصلت کو دیکھ کر اور ان کے بخلاف اپنی جفاکشی اور اوقات کی وسعت کے لحاظ سے ان پر غالب ہونے کی امید رکھتے ہیں۔ یہ بات ان کے قول و فعل سے اکثر ظاہر ہو جاتی ہے۔

پانچویں بری خصلت ان کی نازک مزاجی اور زود رنجی ہے جس کی وجہ سے کسی خلاف مزاج حرکت یا بات کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ اگرچہ پردیسی لوگوں کے ساتھ اس برتاؤ سے کوئی نقصان نہیں بلکہ فراغت و آرام کا باعث ہے لیکن یہ بری خصلت اغیار سے گزر کر احباب تک جا پہنچی ہے۔ اور جب آپس کی نرم و گرم گفتگو کا بھی تحمل نہ ہو سکا یا دوست کی ضرورت پر بھی اپنے کام کو مقدم رکھ کر ٹال مٹول کر دی تو اس سے محبت کا رشتہ قطع ہو جاتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ عادت تمام قوم اور حکام میں سرایت کر جاتی ہے اور دولت کے زوال کا سبب بن جاتی ہے۔ اگرچہ عقل مندوں میں اس کا اثر کچھ دیر کے بعد ظاہر ہوتا ہے لیکن اس عیب کی اصل اور بنیاد بھی وہی آرام طلبی اور راحت کوشی ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

چھٹی بری عادت حوائج ضروری میں بکثرت وقت ضائع کرنا۔ کیونکہ انگریزوں

کا لباس بہت زیادہ ہوتا ہے، جو جسم کی زیبائی اور چستی کی خاطر پہنتے ہیں۔ جوتے سے لیکر ٹوپی تک بیسیوں چیزوں سے کم نہیں ہوتی ہیں۔ سونے کے وقت سب کو اتارتے ہیں اور صبح کو پہنتے ہیں پھر ڈنر کے وقت بدلتے ہیں اس طرح چار مرتبہ اتارتے اور پہنتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سر اور داڑھی کے بال تراشنے میں دو گھنٹہ صرف ہو جاتے ہیں۔ اور کم سے کم ایک گھنٹے ناشتہ میں صرف ہوتے ہیں اور تین گھنٹے ڈنر میں۔ اس کے علاوہ تین گھنٹے زنانہ مجلس اور موسیقی یا قمار بازی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد نو گھنٹے آرام و خواب میں گزارتے ہیں۔ اس طرح کاروبار میں چھ گھنٹوں سے زیادہ نہیں صرف ہوتے۔ اور بڑے آدمیوں کے لئے چار ہی گھنٹے ہیں۔ اب اگر لباس کی زیادتی کا سبب سردی کو قرار دیا جائے تو وہ اس وجہ سے قابلِ قبول نہیں کہ اگر سجاوٹ اور بناوٹ سنگار کو چھوڑ دیں تو بیس عدد کپڑوں کو گھٹا کر دس میں بھی وہی آسائش ہو سکتی ہے۔ پھر سونے کے وقت سب کا اتارنا۔ صبح کو پہننا۔ دن کے کھانے کے وقت تبدیل کرنا۔ ہر روز داڑھی مونڈنا اور بال بنانا سب ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ساتویں خصلت زندگی کو بہت زیادہ پر تکلف بنانے کے لئے، زیادہ سامان کی ضرورت جیسے چائے اور قہوہ کے لئے طرح طرح کے برتن، باورچی خانہ میں انواع و اقسام کے کھانوں اور مٹھائیوں کے لئے پیالوں، رکابیوں اور قابوں کی کثرت۔ پرندوں کے گوشت کے لئے گھروں میں مرغ خانوں کا اہتمام۔ شراب کے لئے قسم قسم کے برتن، میز و کرسی کا انتظام غرض یہ کہ ان سب چیزوں کو زندگی کے لئے بہت ضروری سمجھتے ہیں اور ان کے بغیر زندگی گزارنا ان کو دشوار معلوم ہوتا ہے۔

اس خصلت کا بڑا نقصان یہ ہے کہ قیمتی اور عزیز وقت ان چیزوں کی فراہمی اور خریداری اور رکھ رکھاؤ میں صرف ہو جاتا ہے اس کے علاوہ ان چیزوں کے لئے اخراجات کے انتظام کی فکر اور اس پر توجہ دینا۔ ایسی حالت میں دل کا اطمینان و یکسوئی کہاں باقی رہتی ہے۔ جس میز و کرسی کو وہ بعض وجوہات سے ضروری خیال کرتے ہیں ان کے لئے ممکن تھا کہ نشست و برخاست کے کمروں میں چاروں طرف پاؤں لٹکا کر بیٹھنے کے لئے کرسی دار چبوترے بنا لیتے یا کوئی اور اس سے اچھی تدبیر کرتے تاکہ میز و کرسی کی حاجت نہ رہے۔ اور رات دن شراب و کباب کی افراط اور کھانے پینے کے دھندوں میں وقت

ضائع نہ ہوتا۔ جو عقل و شرع کے خلاف اور طرح طرح کے امراض پیدا ہونے کا باعث ہے اگر عرب اور ترکوں کی فتوحات کی تاریخ پر غور کریں تو سمجھ میں آجائے گا کہ دو چیزیں ان کی ترقی اور فتوحات کا باعث تھیں۔ ایک تو غیر ضروری سامان سے بے نیازی جس کی وجہ سے جسم میں چستی اور چالاکی اور طبیعت کو آزادی اور بے فکری حاصل تھی اور تحصیل علم و ہنر کے لئے وقت میں گنجائش تھی۔ دوسرے اخراجات کی قلت۔ دوسرے حکمران اپنے آرام و آسائش کے لئے جو رقم رعایا سے حاصل کرتے تھے' ترک اور عرب اس کا نصف لیتے تھے۔ جب کوئی ملک فتح کرتے تھے تو نصف خراج رعایا کو معاف کر دیتے تھے اس لئے لوگ ان کو اپنے سابق حکمرانوں سے بہتر خیال کرتے تھے اور ان کے دوست بن جاتے تھے اور اس ملک کے اطراف کے لوگ بھی یہ حال دیکھ کر چاہتے تھے کہ ایسے حکمران ان کے یہاں بھی حکومت کریں۔ اس طرح بڑھتے بڑھتے ایک عالم ان کا فرماں بردار ہو گیا۔ یوں تو ان دونوں قوموں کی ذاتی شجاعت باہمی اتحاد' شہسواری کی مہارت' فن سپہ گری میں کمال' ان کی فتوحات کا سبب ہیں لیکن اگر وہ رعایا کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتے تو انہیں اتنے کم عرصہ میں اتنی فتوحات حاصل نہ ہوتیں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام بیس دن کے واسطے جَو کے آٹے کی روٹیاں پکا کر رکھ لیا کرتے تھے اور اس اندیشہ کے باعث کہ ان کے ساتھی یا گھر والے ان روٹیوں پر گھی نہ لگا دیں ان کو سربمہر کر دیتے اور حسب ضرورت ان کو تناول فرماتے تھے۔ جب اعزا نے تازہ روٹی کھانے کے لئے اصرار کیا تو آپ نے جواب دیا کہ ہر روز کس قدر وقت اس میں صرف ہو گا۔ اور میرے اوقات مقررہ ہیں جو عبادت اور خدمت خلق کے لئے وقف ہیں فرق پڑ جائے گا۔

امیر تیمور جب ایران کو فتح کرنے کے بعد سمرقند واپس ہونے لگا تو اس نے اپنے تجربہ کار سرداروں کو آذربائیجان کی حفاظت کے لئے متعین کیا۔ اس وقت ان کو یہ وصیت کی کہ اگرچہ ملک کے سب دشمن ختم ہو گئے ہیں لیکن سلطان احمد جلائیر اور امیر یوسف ترکمان' سلطنت عثمانیہ میں پناہ گزیں ہیں۔ سلطان احمد جلائر بادشاہ زادہ ہے۔ اور ا تاجیک مشرب ہے اور ایران کے قدیم لوگوں کی طرح تن پرست ہے اس کو عیش و آرام کے سامان اور زیادہ اخراجات کی ضرورت ہے اس لئے مجھے اس کی کوئی پروا

نہیں ہے لیکن قرا یوسف ایک سپاہی پیشہ اور جفاکش آدمی ہے۔ لہٰذا اس کی طرف سے تم کو ہشیار رہنا چاہیئے۔ آخر وہی ہوا جو امیر تیمور نے دوراندیشی کیا تھا۔ یعنی تیمور کی وفات کے بعد یہ دونوں مزدور آذربائیجان میں آگئے۔ سلطان احمد کو آخرکار تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا اور قرا یوسف اپنی مذکورہ صفات کے باعث آذربائیجان پر قابض ہو گیا اس لئے کہ تیمور کے جانشین عیش و عشرت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ قرا یوسف نے تمام ایران پر اپنی حکومت قائم کرلی۔

آٹھویں خراب عادت یہ ہے کہ غیر زبان اور اس کے علوم کو سمجھنے میں اپنی استعداد کا غلط اندازہ کرتے ہیں یعنی محض زبان کے چند الفاظ یاد کر لینے کے بعد اپنے کو زبان دان اور کسی علم کے چند مسائل جان لینے کے بعد اپنے کو اس کا عالم سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اس علم یا زبان میں کتابیں تصنیف کرنے لگتے ہیں اور ان خرافات کو چھپوا کر شائع کرا دیتے ہیں۔ مجھ کو یہ بات فرانس اور گریک کے لوگوں سے معلوم ہوئی جنکی زبانیں سیکھنے کا انگریزوں میں رواج ہے۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں ان کے تصرفات اور کمالات دیکھ کر اندازہ ہو گیا۔ بعض لوگ ایسی کتابوں کو حسن ظن کی بنا پر خرید لیتے ہیں۔ اور بعض اس زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے مصنفوں کے دعویٰ زباندانی کو سچ سمجھ کر خریدتے ہیں۔ اور جو عقل مند لوگ ان کے نقص سے واقف ہیں وہ بھی ان کی گرفت نہیں کرتے۔ اس لئے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ناقص علم بہرحال جہل مطلق سے بہتر ہے۔ اور آہستہ آہستہ نقص سے کمال تک پہنچ جائے گا۔ مگر ان کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ بے شک ناقص علم، جہل مطلق سے بہتر ہے اور تکمیل کی استعداد رکھتا ہے لیکن یہاں ایسا نہیں ہے اور یہ مثل اس موقع پر درست نہیں۔ کیونکہ ان کی کتابوں میں صحیح علم کا ایک شمہ بھی نہیں بلکہ اس علم کی مسخ کی ہوئی صورت ہے جس سے اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس مسخ شدہ مسئلہ کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد اصل علم کے سمجھنے کی استعداد باقی نہیں رہ سکتی۔ میرے اس دعویٰ کا ثبوت سر ولیم جونس Sir William Jones کی لکھی ہوئی گرامر (قواعد) ہے جو اس زشت خصلت بزرگ نے ہندوستان آکر فارسی زبان کی تحصیل سے قبل اسی قسم کی کتابیں دیکھ کر لکھی تھی اور فارسی زبان کی تحصیل کے بعد چونکہ اس کو علم نحو کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ اور

دوسری ہندوستانی زبانیں سیکھنے کی وجہ سے اس کو اس کا موقع نہ ملا کہ اپنی پہلے کی لکھی ہوئی گرامر میں ترمیم و تصحیح کر سکے۔ لہٰذا اس غلط کتاب کو پڑھنے والا جو شخص فارسی زبان سیکھنے کے لئے میرے پاس آیا میں نے اس کی صحت و اصلاح کی بہت کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بخلاف اس کے مبتدیوں کو میرے پڑھانے سے بہت فائدہ پہنچا۔ غرض یہ کہ اس قسم کی کتابوں کی لندن میں اتنی کثرت ہے کہ اصلی اور صحیح لکھی ہوئی کتابیں مجھے یقین ہے کہ چند روز میں معدوم ہو جائیں گی۔

دوسری بری عادت خود غرضی ہے کہ جس کی وجہ سے اپنے تھوڑے سے نفع کی خاطر دوسرے کے بڑے سے بڑے نقصان کی پروا نہیں کرتے۔ اور اپنے مطلب کے وقت بڑی عاجزی اور انکسار ظاہر کرتے ہیں۔ مگر غرض نکل جانے کے بعد ایک دم آنکھیں پھیر لیتے ہیں اگر بعض لوگ دور اندیشی کے خیال سے ایسا نہیں بھی کرتے ہیں تب بھی اس شخص کے نقصان اور اپنے کئے ہوئے وعدوں کا کبھی ذکر تک زبان پر نہیں لاتے ہیں۔ چونکہ یہ باتیں معاملہ پڑنے ہی پر معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس لئے دوسروں سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لندن میں تو مجھے ان باتوں کا علم ان لوگوں سے ہوا جن کے مکانات میں نے کرایہ پر حاصل کئے تھے۔ ان کے علاوہ کسی سے یہ باتیں نہیں معلوم ہوئیں لیکن ہندوستان میں کرنل بانی، مسٹر جانسن ڈاکٹر بلین سے معاملات میں مجھے خوب سبق حاصل ہو چکا تھا۔ جبکہ ان کی غرض کے وقت میں نے ہر چند اپنے نقصان کا عذر کیا لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور دل خوش کرنے والے وعدے کر کے مجھ کو اہم مہمات میں پھنسا دیا۔ اور جب ان کی غرض پوری ہو گئی تو پھر ہیچ قسم کے عذر کر کے سب الگ ہو گئے۔ اور مجھ کو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ دیا۔ میرے اس تجزیہ سے قطع نظر یہ خصلت ان میں لازمی ہے جس کے لئے کسی توجیہہ اور تامل کی ضرورت نہیں۔

یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب لارڈ ہیسٹنگز گورنر اس نے اپنے عہد حکومت میں اس صوبہ کے اندرونی جزوی معاملات میں دخل اندازی کا قصد کیا، تو سر جان شور سے اجازت طلب کی۔ اس نے منع کر دیا اور یہ عذر لکھ بھیجا کہ یہ رائے پسندیدہ اور وقت کے تقاضے کے مطابق ہے۔ لیکن اپنا معاہدہ کے خلاف ہے جو کمپنی اور اس علاقہ کے رؤسا کے درمیان ہو چکا ہے۔ لارڈ ہیسٹنگز نے اس کے جواب میں لکھا کہ اگر کمپنی کی چالبازیوں اور مکاریوں کا راز افشا ہونے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہو تو پھر آپ کا خیال درست ہے۔

ورنہ مجھ پر اور سب پر یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ قابو پانے کے بعد موقع کو ہاتھ سے دینا بے سود ہے۔

دسویں بری خصلت یہ ہے کہ کنواری لڑکیاں اپنے عاشقوں کے ساتھ فرار ہو جاتی ہیں اور رسم تزویج سے قبل عورت اور مرد کی یکجائی۔ اس کے علاوہ خواہشاتِ نفسانی کے اثر سے عورتوں اور مردوں کا کم عصمت ہونا۔ اس خرابی کا باعث عورتوں کی آزادی ہے۔ شراب خانوں کی کثرت اور چکلوں کی زیادتی اسی سبب سے ہے۔ سنا گیا ہے کہ ساٹھ ہزار فاحشہ عورتیں مقام میریلیبون پیرش Mary labone میں سکونت پذیر ہیں۔

اور لندن میں کوئی ایسا کوچہ نہیں ہے جہاں ایسی عورتیں کے چند مکانات نہ ہوں۔ پیراڈائز اسٹریٹ Paradise street یعنی کوچہ بہشت اور مارسٹ کورٹ یعنی صحن سرائے عصمت۔ سینٹ جیمس اسٹریٹ Sant james سینٹ مارٹن لین sant Paal street سینٹ پال اسٹریٹ Sant paal street جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے منسوب ہے اور لندن اسٹریٹ وغیرہ خاص طور پر تھیٹروں کے اطراف و جوانب کے مکانات انہیں فاحشہ عورتوں کے لئے مخصوص ہیں اور ان مقامات پر مردوں کو مکانات کرایہ پر نہیں ملتے ہیں۔

گیارہویں بری عادت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کی رسوم اور پسندیدہ باتوں پر غور نہیں کرتے، اور اپنی ہر چیز کو بے عیب سمجھے جاتے ہیں چاہے حقیقت اس کے خلاف کیوں نہ ہو۔ چنانچہ جہاز رکوڈ میں کے ہم سفروں میں سے دو صاحب ایک میجر پرکس اور دوسرے بارکوان میرے پائجامہ پہن کر سونے پر ہنستے تھے۔ اور اپنے برہنہ ہو کر سونے کی خوبیاں ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اپنی اپنی عادت کی وجہ سے دونوں میں یکساں آرام ہے۔ لیکن اطمینانِ خاطر میری عادت میں داخل ہے۔ کیونکہ میں برہنگی کے خیال سے بے فکر ہو کر سو جاؤنگا اور تم کو برہنگی کی وجہ سے تشویش رہے گی۔ کہنے لگے اگر اتفاق سے ہم ننگے سو جائیں تو اس میں تشویش اور شرم کی کیا بات ہے ان کا جواب ہٹ دھرمی پر مبنی تھا۔

حالانکہ روزانہ صبح کے وقت فطری غیرت کے تقاضے سے ان کی تشویش کو میں خود دیکھا کرتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ تمہارے پاس اس بات کا کیا جواب ہے کہ اگر جہاز غرق ہونے لگے تو میں فوراً کشتی میں سوار ہو کر بشرطِ زندگی کنارے پر پہنچ جاؤں گا،

اور تم پائجامہ پہنتے رہو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اوّل تو جہاز کے ساتھ ایسا واقعہ رونما نہیں ہو سکتا ہے کہ جس میں پائجامہ پہننے کی مہلت نہ ملے اور اگر بالفرض ایسا ہوا تو ہم بیدھڑک کشتی میں ننگے بیٹھ جائیں گے۔ عقلمند لوگ اس جواب سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان جوابات میں کتنا وزن ہے۔ یہ تو انگریزوں کی خاص عادت ہے کہ جواب ہر بات کا فوراً دیتے ہیں۔ چاہے وہ کتنا ہی غلط اور بے موقع ہو۔

بعض جواب جو انگریزوں کو دیئے گئے

میں لندن کے قیام میں انگریزوں کے عادات سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد اپنے یہاں کے طور طریقے اور ان کی خوبیاں انگریزوں کو کسی دلیل سے نہیں سمجھا تا تھا کیونکہ ان کے خیالات اس وقت تک قائل نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کے عادات و رسوم کے مقابلہ میں اپنی رسوم کی خوبیاں ظاہر نہ ہو جائیں اس لیے میں ان کی رسوم و عادات کا مقابلہ اپنے یہاں سے کرتا تھا۔ اس وقت وہ فوراً خاموش ہو جاتے تھے۔ مثلاً وہ مجھ سے بعض اسلامی اعمال جیسے حج و طواف کے متعلق مذاق اڑانے کے انداز میں دریافت کرتے تھے، تو اس وقت میں ان کو جواب دیتا تھا کہ ان کا دینی مقصد ہے، جو تمھارے یہاں بچوں کو بپتسمہ دلانے کا ہے یعنی تمھارا عقیدہ ہے کہ جب تک بچہ کو گرجا میں "کلرجی مین" کے سامنے نہ لے جائیں۔ اس وقت تک وہ عیسائی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ایک انگریز نے اس بات پر بڑی نفرت کا اظہار کیا کہ مسلمان ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ علاوہ دوسرے فائدوں کے ایک بڑا فائدہ ہاتھ سے کھانے کا یہ ہے کہ کھانا گرم ملتا ہے اور ہڈیوں میں لگا ہوا لذیز گوشت آسانی سے چھڑایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ذاتی کام کے لیے آدمی کا ہاتھ تمھارے نانبائی کے پیروں سے زیادہ گندہ اور ناپاک تو نہیں ہوتا۔ جن سے وہ خمیر گوندھتا ہے غرض یہ کہ ایسے ہزاروں منھ توڑ جواب ان کو دیتا تھا جن کی تفصیل باعث طوالت ہے۔ ان میں اکثر رذیل عادات موجودہ زمانہ میں دولت کی زیادتی کے باعث پیدا ہو گئی ہیں اور ابھی تک انھوں نے اپنی خرابی کا اثر ان میں پیدا نہیں کیا ہے اور دو سبب ایسے ہیں جن کی وجہ سے اتنی جلدی نقصان پہنچا بھی نہیں سکتے۔

پہلا سبب ان کی ذاتی اور سلطنتی قوتیں ہیں کیونکہ جب طبیعت اور جسم قوی ہوتا ہے

تو پھر زہر بھی اثر نہیں کرتا۔ اور طبیعت پسینہ کی راہ سے اس کے اثر کو زائل کر دیتی ہے۔ اور صحت کی حالت میں مشہور مقولہ کے مطابق فالزہ سے دانت ٹوٹ جاتے ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اطراف و جوانب کی قومیں بھی ان عیوب سے پاک نہیں رہیں بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہیں سے

حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف
از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

انگلستان کی عام رعایا کی وافر فریاد اور افسردگی سے مجھ کو اندازہ ہو گیا کہ اگر جنگ کے دوران لوگوں کے آرام اور آسائش اور چیزوں کی ارزانی کے لئے فرانس میں کوئی نیا قانون جاری ہو جاتا ہے تو انگلستان کے اکثر لوگ فرانس چلے جاتے ہیں۔ اور جو باقی رہ جاتے ہیں ان میں طرح طرح کے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے سلطنت بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ لیکن انگریز اپنے ان عیوب کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ان کے بعض عیبوں کو دلائل سے ثابت کر دے تو ہندوستان کے کافروں اور دولت عثمانیہ (ترکی) کے بے خبر دل کی طرح دوسری قوموں کی مثالیں پیش کر کے اپنے عیوب کو معمولی ثابت کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی مثال میں عرب، ترکی اور ایران کے متقدمین کے حالات پیش کرے تو ان سے عدم واقفیت ظاہر کر کے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کبھی خواہشات نفسانی کی کشمکش سے خالی نہ تھا۔ اور ان تمام قوموں اور حکومتوں کا حال جن کو تم فرشتہ صفت کہتے ہو ایسا ہی رہا ہے۔

ان کی اس رائے کی کمزوری کو عقلمند لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً آگ اپنی خاصیت کے باعث جلانے والی ہے مگر پہاڑوں میں پھیلی ہوئی چیزوں پر کچھ دیر میں اثر کرتی ہے۔ اسی طرح برائی کا اثر بھی برائی کرنے والے کو ضرور نقصان پہونچائے گا چاہے تاخیر سے پہنچائے۔

انگلینڈ کی بری رسومات اور طور طریقے

لندن میں پھیلی ہوئی بری رسموں میں سب سے زیادہ بری رسم اخراجات کی کثرت اور غیر ضروری چیزوں کا حصول ہے۔ ان میں اکثر فضول اور محض لذت نفس کے لئے ہیں۔ اور کچھ خوراک اور پوشاک کی کثرت کے باعث اس کے علاوہ شراب و کباب اور مکان کی سجاوٹ

فیشن کی جلدی جلدی تبدیلی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ اس کے بعد گھوڑا گاڑی اور ضرورت سے زیادہ ملازم رکھنا۔ بڑے لوگوں میں میاں اور بیوی کے خدمت گذار الگ الگ ہوتے ہیں ان فضول خرچیوں کے علاوہ بال Ball روٹ Rout اور ماسکریڈ Masquerade وغیرہ کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور بعض اوقات ایک رات میں آٹھ آٹھ ہزار روپیہ صرف ہو جاتا ہے جس شخص کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار کی ہوتی ہے وہ اس رقم کو مذکورہ مدوں میں صرف کر دیتا ہے اور اگر اتفاقاً کسی عزیز یا دوست کو سو روپیہ کی ضرورت پڑ جائے تو اس کا دینا اس پر گراں گزرتا ہے۔ پھر یہ کہ ان خرچوں میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بقول حکماء یہ رسم بدکل خرابیوں کی جڑ ہے۔ ان میں ایک بد دیانتی بھی ہے۔ کیونکہ جب حلال کمائی، فضولیات کے لئے ناکافی ہوگی تو پھر چوری، ڈکیتی اور دغا بازی، دوسرے کی ایذا رسانی، اور بے غیرتی کی عادتیں آہستہ آہستہ رسم میں شامل ہو جائیں گی۔

شرفائے لندن میں سے ایک اجنبی شخص ایک بار نواحِ لندن کے سفر میں میرے ساتھ گاڑی میں سوار ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے مجھ سے ہندوستان میں چیزوں کے نرخ کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ جب میں نے اس کو نرخ بتائے تو بولا، اگرچہ نرخ کی کمی بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ روپیہ کمانے کی جدوجہد میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اور آمدنی کی کمی، اخراجات میں تنگی کا سبب بن جاتی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تجربہ کی روشنی میں تمہارا یہ قیاس درست نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ارزانی ہے اور اس کے باوجود حصول معاش میں آسانی بھی ہے، بلکہ دولت مندی میں ہندوستان کا نام ضرب المثل بن چکا ہے۔ اسی کے ساتھ خرچ میں کفایت کرنا کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ اس کے سبب سے آدمی جلد دولت مند بن جاتا ہے۔ بہرحال یہ باتیں اس پر زیادہ اثر نہ کر سکیں۔ جب ہم دن کے کھانے کے لئے سواری سے اترے تو اس نے میرے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھ کر کئی قسم کی شرابیں منگوائیں اور بہت قیمتی، مجھ سے پینے کے لئے اصرار کیا مگر میں نے کفایت شعاری کے خیال سے انکار کر دیا۔ لیکن کھانے کے بعد جب بل آیا تو اس نے تمام چیزوں کی قیمت مع شرابوں کے یکجا کر کے نصف میرے ذمہ ڈالی اور نصف خود ادا کی۔ اور اس حرکت پر اس کو بالکل ندامت نہ ہوئی۔ مجھے اس بل کو تبدیل کراتے ہوئے شرم آئی اسی طرح متواتر دو دن مجھے اپنے کھانے کے تین شلنگ ادا کرنے کے بجائے سات شلنگ روز

دینا پڑے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ جب ایسی عادتیں حاکموں اور عہدہ داروں میں پیدا ہو جاتی ہیں تو ان میں رشوت ستانی کی خصلت بھی سرایت کر جاتی ہے۔ اور ان عادتوں کی بدولت اپنی آمدنی غیر مفید کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ مثلاً آتش بازی، روشنی، مکان کی غیر ضروری سجاوٹ وغیرہ اور ملک اور قوم کے لئے جو کام مفید ہیں ان پر خرچ نہیں کرتے۔ جیسے قلعوں کی مرمت، توپخانہ اور فوج کے اخراجات میں اضافہ وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کمزور اور مجبور ہو کر اٹلی اور ہندوستان کے لوگوں کی طرح اپنے ملک کو مخالفوں کے سپرد کر دینگے اگر تاریخ کی کتابوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو سمجھ میں آجائے گا کہ کسی قوم کی دولت و عزت اس وقت تک رخصت نہیں ہوتی جب تک کہ وہ فضول کاموں اور لغویات سے دور رہتی ہے۔ اس کے علاوہ خود کو تکلیف میں اور دوسرے کو آرام میں دیکھ کر حسد کرنا اور دل میں بغض و نفاق کو جگہ دینا برا ہے۔ فرانس کی بغاوت کا اصل سبب یہی تھا جس میں عوام نے خواص کی مخالفت کی اور یہی مخالفت انقلاب کا باعث ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ دولت کی زیادتی اور اخراجات کی کثرت کے باعث محنت اور جفاکشی کو ترک کرنا یہ بھی بڑا عیب ہے۔

تیسری بری بات یہ ہے کہ نرخ اتنے گراں ہیں کہ اکثر دیہاتوں کے لوگوں کو روٹی اور گوشت دیکھنے کو بھی نہیں ملتا ہے اور صرف آلوؤں پر گزارہ کرتے ہیں۔

چوتھی بات، نئے نئے ٹیکسوں کی زیادتی۔ انگلینڈ میں زمین کی مال گذاری کے علاوہ تجارتی چیزوں پر الگ الگ محصول لیا جاتا ہے۔ جس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جاتا ہے۔ یہ تمام محصول بادشاہ کے ذاتی مصارف اور ملک کی فوج کے اخراجات کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اور جب کسی جنگ کے لئے یا رفاہ عام کے لئے کسی بڑے کام کے لئے روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے تو پارلیمنٹ وزیروں کو قرض حاصل کرنے کی اجازت دیتی ہے اور وہ لوگ مہاجنوں سے سالانہ سود پر قرض لیتے ہیں۔ یہ مہاجن حکومت کے قول و قرار پر پورا اعتماد کر کے روپیہ دیتے ہیں۔ ان کا یہ اعتماد سینکڑوں برسوں سے قائم ہے حالانکہ ان مہاجنوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سالانہ سود یا کچھ کم پر تمسک کو فروخت کر دینے کے سوا ان کے لئے روپیہ واپس ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس پر بھی بخوشی امید پر روپیہ

دے دیتے ہیں اس کے بعد سالانہ سود کی رقم کو کسی پیشہ ورانہ ٹیکس کے ذریعہ تاجروں سے حاصل کرتے ہیں اور تاجر ٹیکس میں ادا کردہ رقم خریداروں سے اشیاء کی قیمتیں بڑھا کر وصول کر لیتے ہیں۔ اس طرح یہ سارا تاوان دراصل رعایا کو ادا کرنا پڑتا ہے اور امیر و غریب کی مساوات کے لیے اس میں یہ تدبیر کرتے ہیں کہ روٹی، گوشت، پورٹر کوئلہ وغیرہ عام استعمال کی چیزوں پر ٹیکس کم لگاتے ہیں لیکن دولت مند لوگوں کے استعمال میں آنے والی چیزوں پر زیادہ ٹیکس لگاتے ہیں، جیسے چاندی کے برتن، لذیز سامانِ خوردنی، ملازمین گھوڑا گاڑی کتے وغیرہ۔ ان چیزوں کو غریب لوگ استعمال نہیں کرتے اور دولت مندوں کو ان پر زیادہ ٹیکس دینا گراں نہیں گزرتا ہے۔

ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ جو ٹیکس عام طور پر ہر شخص کو ادا کرنے پڑتے ہیں ان میں بھی مساوات رکھی گئی ہے جیسے انکم ٹیکس، یعنی ہر شخص کے مصارف پر جو آمدنی کے برابر ہوتے ہیں دس فی صدی سالانہ سرکار کو دیتا ہے گویا جو دولت مند شخص سال میں دس ہزار روپیہ خرچ کرتا ہے وہ ایک ہزار اور جو غریب سو روپیہ سال خرچ کرتا ہے وہ دس روپیہ حکومت کو دیتا ہے، چونکہ انسان صرف معاشی ضروریات پر قناعت نہیں کر سکتا ہے اس لیے غریب لوگ اُن چیزوں کے نہ ملنے سے جو امراء کو اور میسّر ہیں، غصہ میں پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ اور متوسط طبقے کے لوگ جو اپنی عزت و آبرو قائم رکھنے کے لیے ملازم اور سواری وغیرہ رکھتے ہیں ان کو یہ انکم ٹیکس دینا بہت گراں گزرتا ہے اور ان کے لیے زیر باری کا سبب بن جاتا ہے۔ ان باتوں کے جو اثرات نظر آئے ان سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا انجام خدا جانے کیا ہو گا۔ یہ بات اس قدم کے دوراندیش لوگ بھی خوب جانتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ قرض کی مقدار اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ جس کا ادا ہونا وہم و گمان سے بھی باہر نظر آتا ہے۔ اس لیے اس کا تدارک بھی مشکل خیال کرتے ہیں میرا خیال ہے کہ اگر قرض خواہوں کو مجلس پارلیمنٹ میں بلا کر معقول دلائل کے ذریعے نہایت نرمی اور اخلاق کے ساتھ سمجھایا جائے کہ اشیاء کی گرانی کا سبب اور اس کے نقصانات کا باعث ان کے سود کے بھاری ٹیکس ہیں۔ اور ان کو یہ بھی بتایا جائے کہ اگر کوئی بلوہ فساد ہو گیا تو قرض کی تمام رقم

سوختہ ہوجائے گی۔ بلکہ مال مقبوضہ اور عزت سنبھالنا بھی دشوار ہوگا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اپنے بعض قرضوں سے دست بردار ہوجاؤ اس طرح سے کہ جس کا قرض بہت پرانا ہے اور اس کو بہت سود مل چکا ہے۔ اس کو چاہیے کہ اصل رقم میں سے نصف چھوڑ دے اور جن کا قرض اوسط مدت کا ہے وہ ایک تہائی رقم اصل میں سے چھوڑے اور جن کا قرض نیا ہے وہ چوتھائی رقم سے دست بردار ہوجائیں۔ اور باقی رقم کا سالانہ سود لیتے رہتے ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ قرض خواہ انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس بات پر رضامند ہوجائیں گے۔ اور اعتبار میں بھی کوئی خلل نہ واقع ہوگا۔ اس طرح ضرورت کی چیزوں پر سے نصف ٹیکس کم ہوجائے گا اور رعایا کو کسی قدر فراغت نصیب ہوگی۔ اسی کے ساتھ فتنہ وفساد کا خطرہ بھی باقی نہ رہے گا اور قرض خواہوں کو بھی زیادہ نقصان نہ پہنچے گا۔ کیونکہ وہ سب دولت مند ہیں۔ اور اس قرض کے علاوہ بھی ان کے وسائل آمدنی موجود ہیں چونکہ جنگی اخراجات ختم ہوگئے اس لیے اس کی بچت اور زائد اخراجات میں کچھ کفایت کرکے یہ کل رقم قرض ادا کرنے کے لیے مقرر کر دی جائے تو امید ہے کہ بیس پچیس سال میں فارغ البالی حاصل ہوجائے گی۔ اور قرضوں سے نجات مل جائے گی

چوتھی خراب بات انگلینڈ کی یہ ہے کہ انگریزی عدالتوں کا نظام ذاتی بیچ پر مبنی ہے جو عجیب وغریب بات ہے۔ زیادہ تر سزائیں جرمانہ کی صورت میں دی جاتی ہیں۔ گویا عدالتیں تحصیل مال کا ذریعہ ہیں۔ ججوں کے علاوہ جن کی تنخواہیں حکومت دیتی ہے۔ عدالتوں کے دوسرے کارکن ملازم مدعی اور مدعا علیہ کا مال اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں اور ہر بہانہ سے ان کو لوٹتے ہیں۔ یہ ملازم بے رحم اور رشوت خور ہوتے ہیں اور ہر طرح کی دغابازی سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنی کاروباری مہارت سے کام لے کر جواب دعویٰ اور گواہوں کے بیانات کی تحریر میں حسب منشا رد وبدل کرکے جج کی رائے حق سے ناحق کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ انگریز جو اپنے قوانین وضوابط کی تعریف کرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے حاکم عدالت کے لیے انصاف کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ججوں کو پھانسی کی سزا دینے کا اختیار نہیں۔ یہ کام جوری انجام دیتی ہے اور جوری شہر کے چند شرفا اور امرا پر مشتمل ایک کمیٹی ہوتی ہے۔ اس کے اراکین کو عدالت میں آنے تک مقدمہ کے حالات سے کچھ واقفیت نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ مدعی یا مدعا علیہ

سے سازش نہیں کر سکتے. بہر حال یہ سب ان کی باتیں ہی باتیں ہیں. کیونکہ وہ اپنے قوانین کے علاوہ دوسرے ملکوں اور قوموں کے عدالتی قوانین سے ناواقف ہیں اگر واقف ہوتے تو اپنے ناقص نظام عدالت کی اتنی ہی تعریف نہ کرتے.

انگریزی عدالت کے طریقے

میں کئی بار اولڈ بیلی Old Baily عدالت عالیہ لندن میں حاضر ہوا اور جوری Jury کے ساتھ ججوں کا مقابلہ بہت غور سے دیکھا اور سنا. اول تو جج کا مرتبہ جوری کے مرتبہ سے اعلیٰ ہے کہ اگر جج کسی ناحق فیصلے کا ارادہ کرے تو جوری اس کی مخالفت کی ہمت نہیں کر سکتی. دوسرے یہ کہ فریقین اور گواہوں کے بیانات جوری سے پہلے جج کے سامنے ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے مقدمہ کی نوعیت اور گواہوں کا حال وغیرہ جوری کے سامنے ظاہر کرنا نہ کرنا جج کے اختیار میں ہوتا ہے. اور جوری سوا جج کے بیان کے خود حالات مقدمہ سے واقف نہیں. لہٰذا جج کی رائے ہے اس کا موافقت کرنا ضروری ہے. اور اگر کوئی جوری جج سے بے خوف ہو کر اپنی ذاتی قابلیت کی بنیاد پر مقدمہ کی اصلیت سے واقف ہو کر جج کی رائے کی مخالفت کرتی ہے تو جج دو تین بار اس معاملہ کو مختلف طریقوں سے بیان کر کے جوری کو کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے اور اگر اس سے بھی کام نہ چلا تو اجلاس کو طوالت دے کر جوری کو پریشان کر دے گا. کیونکہ جج اور تمام عدالتی عملہ کچہری کے بالاخانہ پر کھانا کھانے کے لئے جمع ہوتا ہے جس کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے. وہاں باری باری ایک دو گھنٹہ آرام بھی کرتے ہیں. لیکن جوری کے لئے یہ ہے کہ جب تک اس مقدمہ کے متعلق ٹھیک رائے قایم نہ کرلے ایک تنگ مقام میں جس کے چاروں طرف لوہے کے جنگلے لگے ہیں اور یہ مقام جج کی نشست سے نیچے ہوتا ہے. اس کا دروازہ مقفل رہتا ہے اور جوری کے اراکین اس میں بند رہتے ہیں اور اس دن فیصلہ نہ ہوا تو مقدمہ دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا جاتا ہے اور دوسرے دن جوری کو بلایا جاتا ہے. مطلب یہ ہے کہ سارے اختیارات جج کو ہوتے ہیں جوری محض تماشا ہے. جج اگرچہ بہت محتاط اور ایماندار ہیں. اگر وہ وکلاء کے داؤں میں نہ آئیں تو منصفانہ فیصلہ کرتے ہیں لیکن مقدمات کی طوالت اور مدت دراز تک فیصلہ نہ ہونا اہل معاملہ کی بے حد ذیر باری کا باعث ہوتا

بے ساختہ ہی گواہ حاکم کی جرح اور قدح سے بے حد تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح مدعی و مدعا علیہ بھول چوک سے یا اپنی کم گوئی کی عادت کے باعث حاکم کی پیچیدار تقریروں میں پھنس کر ملزم ٹھہرتے ہیں اور انصاف سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس طرح قانون داں اور دغا باز لوگ سیدھے سادے ناواقف لوگوں کو پھانس کر لوٹتے ہیں اور اس کا سبب عدالت کے پیچیدہ قوانین ہیں۔ جن کی وجہ سے ایسے حالات ناگزیر ہیں اور لاعلاج ہیں۔ حاکم کی خدا ترسی اور اگر بفرض محال سارا عملہ نیک کردار رہے تب بھی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ قوانین اور طریقۂ عمل در آمد میں نقص ہے ان باتوں کا ثبوت میرے قیام لندن کی روداد ہے کہ میں نے ایک درزی کو اپنا کوٹ سینے کے لیے دیا اور اس کی اُجرت دو گواہوں کے سامنے دس شلنگ لکھی گئی۔ جب وہ کوٹ سی کر لایا تو اس نے بیس شلنگ طلب کیے۔ میں نے وہی دس شلنگ دیئے جو پہلے طے ہو چکے تھے اس نے کہا میں عدالت میں تمہارے خلاف کارروائی کروں گا۔ اس وقت تم کو باقی رقم دینا پڑے گی اور عدالت کا خرچ بھی۔ چونکہ میرے پاس اقرار نامہ اور گواہ موجود تھے میں نے اس کی دھمکی کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اس ملعون نے عدالت سے میری طلبی کا سمن حاصل کر لیا اور اپنے پاس رکھ لیا مجھ تک نہ پہنچایا۔ کچھ عرصہ بعد عدالت میں جاکر حلفیہ بیان دیا کہ میں نے سمن پہنچا دیا تھا لیکن مدعا علیہ حاضر نہیں ہوا۔ اس کے بعد اس نے حکم قطعی حاصل کر لیا جس کے بعد مدعا علیہ کا کوئی عذر نہیں سنا جاتا۔ وہ حکم جاری کرا کے میرے پاس لایا کہ میں وہ رقم مع چھ شلنگ اخراجات کے ادا کروں میں نے ایک دوست سے مشورہ کیا جو عدالت کا اہل کار تھا، اور اس کو بتایا کہ مدعی نے پہلا حکم نامہ مجھ تک نہیں پہنچایا تھا، اور حکم ثانی دھوکہ دے کر حاصل کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اب فوراً روپیہ ادا کرنا ضروری ہے البتہ بعد میں حکم اول نہ ملنے کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ میں نے جھگڑے میں پڑنا پسند نہیں کیا اور حکم نامہ کے مطابق رقم ادا کر دی اس واقعہ سے یہ تجربہ حاصل کیا کہ جب کوئی ناحق روپیہ طلب کرتا تو میں اپنے کاغذات پر بھروسہ نہیں کرتا تھا بلکہ نصف یا تہائی پر صلح کر لیتا تھا۔ کیونکہ میرے کاغذات ان لوگوں کی ذرا سی چالبازی سے بے کار ہو جاتے، اس لیے میرے مخلص دوستوں کی بھی یہی رائے تھی کہ عدالت کے جھگڑوں میں پڑنے سے بہتر ہے کہ کچھ نقصان اُٹھا کر خود معاملہ طے کر لیا جائے۔ اس طرح دغا بازوں کے فریب سے بھی بچ سکتا ہوں۔

اس انگریزی عدالت کے کارنامے کلکتہ میں بھی بہت مشہور ہیں کہ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا کہ چند گھر ویران نہ ہو جاتے ہوں۔ سوائے انگریز وکیلوں کے سینکڑوں دغاباز قانون داں وہاں موجود رہتے ہیں۔ اور امراء کی وجہ سے ہزارہا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ یہ لوگ عملہ عدالت کے مددگار اور مقدمات کے دلال ہیں۔ ان میں سے بعض سوداگروں سے مال خرید کر بعد میں نام و مقام سکونت تبدیل کر دیتے ہیں اور جھوٹے گواہ پیش کر کے اپنی زبان کی طراریوں کی بدولت مال کی قیمت ہضم کر لیتے ہیں۔ بعض لوگوں کو عدالت میں لے جانے کی دھمکی دے کر روپیہ وصول کرتے ہیں اور اگر وہ نہ ڈرے تو عدالت میں جا کر جھوٹا حلف اٹھا لیتے ہیں کہ فلاں شخص پر میرا پچاس ہزار روپیہ قرض ہے اور وہ بھاگنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وارنٹ گرفتاری حاصل کر کے اس کو عدالت میں لے جاتے ہیں۔ اگر وہ شخص اسی روز کسی ایسے شخص کی ضمانت پیش کر دے جس کی حیثیت دعویٰ کی رقم سے دوگنی ہو تو رہا کر دیا جائے گا اور پیشی مقررہ تاریخ پر حاضر ہوگا اگر مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ بھی دیر میں پہونچے گا تو اس پر عدالت سے ایک ہزار روپیہ جرمانہ ہو جائے گا۔ چونکہ عدالت اس کی زبان نہیں سمجھتی اسی لیے کسی وکیل کے ذریعہ پیش ہونا ضروری ہے۔ تحریری جواب اور دوسرے تمام کاموں میں روپیہ کا خرچ لازمی ہے وکیل کا محنتانہ یومیہ یا ماہوار نہیں ہوتا۔ بلکہ عدالت میں اس کی گفتگو کے جملوں کے حساب سے ہوتا ہے۔ اسی لیے وکیل اپنی گفتگو کو خوب طول دیتا ہے تاکہ محنتانہ زیادہ ملے۔ مہینوں مقدمہ چلتا ہے اور جتنی رقم کا مقدمہ ہوتا ہے اس سے زیادہ عدالت کے اخراجات میں صرف ہو جاتا ہے۔ اب اگر جج کی رائے پر وکیلوں نے غلبہ نہ حاصل کیا اور فیصلہ منصفانہ ہوا تو مدعی کا دعویٰ خارج ہو جاتا ہے اور دونوں طرف کا خرچ مدعی کو ادا کرنا پڑتا ہے اب اگر وہ اس کو ادا کرنے کی حیثیت نہیں رکھتا ہے تو قید کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر مدعی غریب ہے تو مدعا علیہ کو اس کے وہ اخراجات بھی ادا کرنے پڑتے ہیں جو جیل میں اس کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات پر ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں کرتا تو پھر اس کو اخراجات کے مطالبے سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور مدعی کو رہا کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی نے ضمانت نہ کی تو مدعا علیہ کو دوسرے دن کچہری سے جیل خانہ پہنچا دیا جاتا ہے جیل کے کارکن بھی اس سے کچھ رقم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر نہ دے

سکا تو اس کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں کے متعلق سنا ہے کہ پیشی کی تاریخ سے پہلے ہی انھوں نے خودکشی کرلی۔ اگر کوئی زندہ رہ گیا تو پیشی کے دن عدالت میں لایا جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مدعا علیہ چھ ماہ جیل میں رہا اور جب اس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو پتہ چلا کہ الزام کی کوئی اصلیت نہ تھی محض مدعا علیہ کو ایذا پہونچانے کے لیے یہ حرکت کی گئی۔ اور خود مدعی روپوش ہو گیا اس طرح قیدی مدعا علیہ کو معذرت کر کے رہا کر دیا گیا۔ گواہ کے لیے اتنی پریشانی ہے کہ گواہی کی رسم ہی اس ملک سے ختم ہو گئی ہے۔ گواہ کو ہر چند کہ پورا واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ مجھ کو کچھ خبر نہیں۔ کیونکہ وہ مہینہ بھر کے سفر کے فاصلے سے طلب کیا جاتا ہے اور سال بھر یا چھ ماہ تا فیصلہ مقدمہ اس کو حاضر رہنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کے کاروبار کا بھی نقصان ہوتا ہے اور آمد و رفت کا خرچ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور جب عدالت کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو اس کو کئی گھنٹہ کھڑا رکھ کر طرح طرح کے سوالات میں الجھایا جاتا ہے۔ اگر اس کے بیان میں کوئی لغزش ہو گئی تو فوراً دروغ حلفی میں پھانس دیا جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ کسی تیز طرار عورت نے عدالت میں جا کر یہ شہادت دی کہ فلاں معاملہ میرے سامنے ہوا ہے۔ جج نے پوچھا کس جگہ؟ اس نے جواب دیا فلاں مکان میں۔ اس نے پھر پوچھا، مکان میں کس جگہ پر؟ عورت نے کہا دالان کے برآمدے میں۔ پھر جج نے مدعی کے لکھانے پر دریافت کیا کہ برآمدے میں کتنے ستون ہیں؟ عورت نے جواب میں یہ کہنے کے بجائے کہ مجھ کو یاد نہیں، کہہ دیا چار ستون ہیں۔ حالانکہ تھے پانچ ستون۔ اب حاکم نے اس کی گرفت کرنا چاہی تو عورت نے فوراً کہا کہ حضور اس بالاخانہ پر روزانہ اجلاس فرماتے ہیں اور برسوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ مہربانی فرما کر مجھ کو یہ بتایئے کہ اس کی سیڑھیاں کتنی ہیں۔ حاکم کو کبھی یہ خیال بھی نہ ہوا تھا کہ شمار کرتا۔ لاجواب ہو گیا۔ عورت نے کہا کہ اگر میں نے ستونوں کے شمار میں غلطی کی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ میں اس مکان میں ایک یا دو بار سے زیادہ نہیں گئی۔ اور آپ روزانہ اتنی سیڑھیاں چڑھتے اور اترتے ہیں۔ بہرحال اس طرح کے حیلے حوالے اور مہمل دلیلیں اور توجیہات لوگ کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو جائے۔

اگر عدالت کی رسم تحصیلِ مال کو موقوف کردیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے مخلوق کشمکش اور میعاد کے انتظار میں مبتلا رہتی ہے حکومت کو تو اس سے کوئی نفع نہیں ہوتا لیکن حرام خور وکیل اور عدالت کے اہل کار لوگوں کو خوب لوٹتے ہیں۔ اگر وکیلوں اور عملہ عدالت کو دینے کے لئے حکومت کے خزانے میں گنجائش نہیں ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس کے لئے بھی اور ٹیکسوں کی طرح کوئی ٹیکس لگا دے۔ تاکہ رعایا کے معاملات زمانہ قدیم میں اہل اسلام کے دارالقضاۃ کے مطابق بلا کسی خرچ کے طے ہو جایا کریں۔ اور سخت احکامات سے لوگوں کو نجات دلا دی جائے۔ مثلاً بلا مہلت حوالات میں رکھنا اور ضمانت میں مال دینا وقت پر نہ پہونچنے پر جرمانہ کرنا۔ مقدمات کے فیصلہ میں برسوں کی تاخیر۔ یہ باتیں موقوف ہو جائیں تو عدالت خرابیوں سے پاک ہو جائیگی اور مخلوقِ خدا خوش ہوگی۔ البتہ جن مجرموں کو جرمانہ کی سزا مناسب دی گئی ہے اس میں مجھے اعتراض نہیں۔ کیونکہ ان کا ترک کرنا خزانۂ سرکار کے نقصان کا سبب ہوگا الغرض میں جب کبھی اولڈ بیلی Old Bailey میں گیا تو لارڈ کردس اور لارڈ جیراور مسٹر روز اور انگلستان کی سب سے معمر شخصیت لارڈ الڈرمین اس عدالت میں جج تھے اور مجھ کو اپنے قریب مناسب جگہ پر بٹھاتے تھے اور بغیر کھانا کھلائے واپس نہیں آنے دیتے تھے۔ یہاں کھانے کے بعد ایک پر تکلف رسم یہ تھی کہ ہر شخص اپنا رومال گلاب میں تر کرکے ہاتھ منہ صاف کرتا تھا۔

پانچویں خراب رسم پلوں اور گذرگاہوں کا محصول۔ جس کو ادا کرنے کے لئے لوگوں کو ٹھہر کر اپنی منزل کھوٹی کرنی پڑتی ہے ہر محصول کے لئے وہاں روپیہ تڑانا یا ریزگاری ساتھ لے جانا ضروری ہے اس کے ساتھ ذلیل اور نچلے درجہ کے لوگوں سے خلاف مرضی گفتگو کرنا۔ یہ رسم لندن میں بڑھتے بڑھتے ننگ و عار کی حد تک جا پہونچی ہے۔ مثلاً سینٹ پال کی زیارت کرنے والوں سے بھی ٹکس لیا جاتا ہے حالانکہ وہ خانہ خدا ہے۔ مجموعی طور پر دو تین شلنگ دینا پڑتے ہیں۔ اگر ریزگاری نہ ہونے کے باعث وہاں روپیہ تڑایا جائے تو کھوٹے سکے ملیں گے۔ اسی طرح بادشاہی قلعہ اور اس کا سامان دیکھنے کا محصول بھی لیا جاتا ہے۔ قلعہ ونڈسر کی سیر کا محصول تھیٹروں کے محصول کی طرح مقرر ہے ہر کمرہ اور دالان کی سیر کے لئے الگ الگ رقم لی جاتی ہے اچھا تو یہ ہے کہ اس طرح کی محصول

موقوف کر کے اور سڑکوں اور پلوں کی مرمت کے نام سے لی جانے والی رقم کے بجائے رعایا پر سالانہ ٹیکس مقرر کر دیا جائے تا کہ لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے۔

چھٹی خرابی لندن میں آتش زنی کی کثرت ہے۔ اور یہ عمارتوں میں لکڑی کے زیادہ استعمال کے سبب سے ہے۔ اس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ مکانات کے چاروں درجوں کا ڈھانچہ مع چھتوں کے لکڑی اور تختوں کا ہوتا ہے۔ سب سے اوپر کی چھت پر ہندوستانی کھپریل ہوتی ہے اور باقی چھتیں تختہ کی۔ دیواروں میں بھی تختہ بندی ہوتی ہے لیکن مضبوطی اور چھتوں کے بوجھ کے خیال سے اینٹ اور چونہ کی بہت پتلی دیواریں بھی باہر کی جانب چنی جاتی ہیں اور اندر کی جانب سے تختے جوڑ کر وارنش کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہر کرہ میں آتشدان بھی ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا ذراسی غفلت یا ملازمین کی شرارت سے آگ لگ جاتی ہے اور جب تک سارا گھر جل نہیں جاتا آگ نہیں بجھتی ہے بلکہ پاس پڑوس کے بھی تین چار مکانوں کو پیٹ میں لے لیتی ہے۔

آگ بجھانے کا طریقہ

لندن میں آگ بجھانے کا طریقہ اس مثل کے مصداق ہے کہ "چور سے بچے سو رتال کر دیجئے"! وہ طریقہ یہ ہے کہ شہر کے ہر علاقہ کے دولت مندوں نے آگ بجھانے کے پمپ فراہم کر رکھے ہیں۔ جن سے پانی پچاس گز تک اونچا جا سکتا ہے۔ اس کو چلانے کے لئے معتبر کارکن مقرر ہیں۔ جو آگ کی خبر پاتے ہی پمپ گاڑی میں گھوڑے جوت کر وہاں پہنچ جاتے ہیں اور نہر کے منبع سے جس کا پتہ ہر سڑک کی دیوار پر لکھا ہوتا ہے۔ پمپ میں پانی بھر کر آگ پر چھڑکتے ہیں۔ بعض وقت آگ ایسی تیز ہوتی ہے کہ تین چار روز تک نہیں بجھتی ہے۔ اور مکان جل کر راکھ ہو جاتا ہے اور اسباب اکثر جلا بھنا اور کچھ ٹوٹا پھوٹا رہ جاتا ہے وہ بھی کچھ یاروں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری مصیبت کی فکر کرنی پڑتی ہے یعنی آگ بجھانے والا جو عملہ پہلے پہنچتا ہے اس کو سو روپیہ یومیہ کے حساب سے دینا پڑتا ہے جو بعد میں پہنچتا ہے اس کو پچاس روپیہ یومیہ کے حساب سے دیا جاتا ہے۔ یہ رقم مالک مکان کو چار و ناچار ادا کرنی پڑتی ہے۔ آتش زدگی کی اتنی کثرت ہے کہ بعض زمانہ میں ایک محلہ تین تین چار چار دن تک جلتا رہتا ہے مگر اس خرابی کا تدارک طریقہ تعمیر بدل کر نہیں کیا جاتا ہے۔ جس کے بغیر اس سے بچنا مشکل ہے۔

ساتویں خراب رسم بستر اور سونے کے سامان کی بناوٹ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے دو تین توشکیں بہت نرم نیچے اوپر بچھائی جاتی ہے کہ لیٹنے والا اس میں دھنس جاتا ہے۔ اگرچہ سردی کی شدت میں پہلے ایک گھنٹہ تک تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن آخرکار دم گھٹنے لگتا ہے اور کمر میں درد ہونے لگتا ہے کروٹ بدلنا مشکل ہو جاتا ہے اور اوڑھنے کی چیزیں کم سے کم چار ہوتی ہیں۔ ایک چادر جسم سے لپٹی ہوتی اس پر نرم کمبل پھر اس کے اوپر ایک سفید چادر ان سب کو ملا کر تین طرف سے توشک کے نیچے دبا دیتے ہیں اور تکیہ کی طرف سے کھلا رکھتے ہیں کہ سونے والا اسی سوراخ سے اندر چلا جاتا ہے۔ لیٹنے کے بعد چونکہ سرہانے کی کھلی جگہ منہ کھلا رکھنے ہیں کے باعث بند نہیں ہوتی اور اوڑھنے والی چیزیں جسم سے نہیں لگتی ہیں اس لئے جسم بہت کم گرم ہوتا ہے۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ کروٹ بہت آہستہ بدلی جاتی ہے اور جنبش بھی ہوشیاری سے کی جاتی ہے۔ ورنہ اوڑھنے والی چار چیزیں جو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں الگ الگ ہو کر تکلیف پہونچاتی ہیں اور نیند کوسوں دور بھاگ جاتی ہے۔ مجھ کو اس ملک میں اپنی کوئی عادت ترک کرنے سے تکلیف نہیں ہوئی مگر اس بستر اور لباس کی کثرت سے تکلیف ہوئی۔ حالانکہ میں نے اپنے لباس اور وضع میں زیادہ تبدیلی نہیں کی۔ ہر دو تین دن بعد کپڑے بدلتا تھا۔ لیکن اس پہننے اور اتارنے میں بھی آدھا گھنٹہ صرف ہو جاتا تھا اور میں سردی کھاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس سامان اور لباس خواب نے ہزاروں کو موت کی نیند سلا دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگ برہنہ سوتے ہیں اگر توشک کی چادر یا کمبل کے نیچے کی چادر میں کسی قدر نمی ہو جو اکثر ہوا کرتی ہے تو وہ نمی جسم میں سرایت کر کے تپ محرقہ پیدا کرتی جو موجب ہلاکت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جوڑوں کا درد اور اعضا شکنی کی تکلیفیں پیدا ہو جاتی ہیں جو انسان کو ہمیشہ کے لئے بستر مرگ پر سلا دیتی ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں نے ہندوستان کے بستروں اور توشکوں کی بناوٹ اور شہاب کی رنگین ململ کی نرمی اور لحاف کے استر کی روئی کے ساتھ چسپانی اچھی طرح سے دیکھی ہے لیکن وہ اپنے دود ہی خیالات کے باعث اپنی رسم کو ترک نہیں کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ چادریں جلدی جلدی بدلی جاتی ہیں اور لحاف دوسرے موسم تک رہتا ہے اس لئے ان کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ بدن کا میل اس میں جذب

ہو کر بیماریوں کا سبب بنے گا۔ دوسرے یہ کہ ہر سال لحاف بنانے کا جھگڑا کرنا پڑے گا لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ سال میں ایک دفعہ کا جھگڑا، روزانہ چادریں دھونے اور بدلنے کے جھگڑے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

آٹھویں بری خصلت اہل لندن کی یہ ہے کہ وہ نوجوان، خوبصورت، زرق برق لباس سجیلے خدمت گاروں کو ملازم رکھتے ہیں۔ جو خاص طور پر عورتوں کی گاڑیوں پر پیچھے بیٹھتے ہیں اور کھانے اور سیر کے وقت ان کے ہمراہ رہتے ہیں چونکہ حسن خاص طور پر پاکیزہ لباس اور باسلیقہ مرد و عورت میں طبعاً محرکِ عشق ہے اور عشق کو شاہ و گدا کی تمیز اور ننگ و ناموس کا لحاظ نہیں لہٰذا اس رسم سے بہت سی خرابیاں پیدا ہونا ممکن ہے۔

اب میں کچھ حال اس لڑائی کا بیان کروں گا جو میرے لندن پہنچنے کے زمانہ میں ہو رہی تھی اور اس کی صلح کا بارہا ذکر ہوا ہے اس کے بعد واپسی کے واقعاتِ سفر لکھنا شروع کروں گا۔

انگلینڈ اور فرانس میں جنگ اور صلح

چونکہ اس عالمِ کون و فساد کا سلسلہ ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہے، لہٰذا حالاتِ جنگ بیان کرنے سے قبل یورپ کی سلطنتوں اور اس کی زمین کی تقسیم کا حال بیان کیا جائے گا۔ شمال کی جانب جہاں سے بحرِ بالٹک، مغربی بحرِ اوقیانوس سے شروع ہو کر ختم ہوتا ہے اس قطع زمین پر بارہ سلطنتیں واقع ہیں۔ روس، پروشیا، ڈنمارک، سویڈن یہ سب باہم متفق ہیں اور روس کے بادشاہ کی پیرو ہیں۔ اور جنوبی سمت کی زمین پر کہ جس کے مغربی کنارے سے بحرِ روم بحرِ اوقیانوس سے نکل کر مشرق کی سمت جاتا ہے چار سلطنتیں قائم ہیں۔ اسپین، پرتگال، قدیم روم اور سوئزرلینڈ۔ ان دونوں کے وسط میں بھی چار حکومتیں قائم ہیں۔ فرانس، جرمنی، پولینڈ اور ہالینڈ۔ اس قطعۂ زمین کے مغرب کی طرف جزیرۂ انگلینڈ اور آئرلینڈ ہے۔ ان کے علاوہ روم قدیم اور جرمنی میں دس بارہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں اور بھی ہیں جو زیادہ طاقت ور نہیں ہیں۔ چونکہ یورپ میں ایک دوسرے کا ملک چھین لینے کی رسم نہیں اس لئے یہ چھوٹی سلطنتیں بھی طاقت ور حکمرانوں کے زیر سایہ بے فکری سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان ملکوں کا طول و عرض اور طریق حکمرانی کی تفصیل میں نے اپنی کتاب لب التواریخ میں مع اسکاٹ

کی روایت کے مطابق بیان کی ہے۔ ان تمام سلطنتوں میں بڑائی اور فوجی طاقت کے اعتبار سے حسب ذیل سب سے بڑھ کر ہیں۔ روس، اسپین، فرانس، جرمنی اور انگلینڈ، ان پانچ سلطنتوں میں صرف انگلینڈ ایسا ملک ہے جہاں امور ریاست و حکومت رعایا اور امراء کے مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ باقی چاروں میں مستقل بادشاہتیں ہیں۔ اگر استقلال سلطنت کی حالت میں بادشاہ لائق نہ ہو تو رعایا کے لیے مصیبت ہے چنانچہ اب سے تیرہ سال پہلے ۱۷۸۹ء میں فرانس کی رعایا نے سلطنت کے وزیروں سے تنگ آ کر بادشاہ کے حضور میں نالشیں کرنا شروع کیں جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت کے مطابق اپنے یہاں حکومت کا نقشہ تیار کریں۔ بادشاہ اور امراء نے ٹال مٹول کر کے اس تجویز پر کوئی توجہ نہ کی۔ یہاں تک کہ رعایا نے دو سال کی داد و فریاد کے بعد تنگ آ کر جگہ جگہ شورش شروع کی اور بعض حکام کو سرکاری کام انجام دینے سے روک دیا اور ملکی امور کی انجام دہی میں رکاوٹ پیدا کرنے لگے، اس وقت بادشاہ اور امراء کو ہوش آیا اور وہ رعایا کو خوش اور مطمئن کرنے کی فکر کرنے لگے۔ انھوں نے مخالفین کو انتظام حکومت میں مشورہ کے لیے دارالسلطنت میں بلایا لیکن باغی گروہ نے اپنی قوت کے زعم میں اپنے مطالبات میں اضافہ کر دیا اور ری پبلک (REPUBLIC) نظام حکومت کا مطالبہ شروع کر دیا۔ یعنی بادشاہ معطل محض ہو، حکام اور فوجی سردار اپنے عہدوں پر قائم رہیں مگر کوئی کام بلا مشورہ رعایا نہ کریں۔ حکام کا تقرر و معزولی بھی رعایا کی منتخب کیٹی کے اختیار میں ہو۔ امیروں اور شاہزادوں کی جاگیریں اور وثیقہ بالکل ختم کر دیا جائے۔ حکومت کا کام انجام دینے والوں کے سوا کسی کو کچھ نہ دیا جائے بادشاہ نے اس مطالبے کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا اور شورش کرنے والوں کی گرفتاری اور قید کا حکم جاری کیا۔ مگر ان لوگوں نے بھی مقابلہ کیا۔ بہت سے قتل ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارے فرانس کی رعایا نے متفق ہو کر کھلم کھلا بغاوت شروع کر دی ارا کین سلطنت اس شورش و بغاوت کو دبا سکتے تھے لیکن اپنی عافیت اور آسائش کے پیش نظر مدافعت سے کنارہ کش ہو گئے اور اکثر اپنے مال و اسباب اور اہل و عیال کے ساتھ دوسرے ملکوں میں چلے گئے خاص طور پر بہتوں نے انگلینڈ کا رخ کیا بہت سی فوج باغیوں سے مل گئی اور بادشاہ محصور ہو گیا۔ انجام کار ۱۷۹۲ء کے آغاز میں باغیوں نے بادشاہ اور ملکہ کو قتل کر دیا اور شاہزادہ کو قید کر لیا۔

بیک گردش چرخ نیلوفری   نہ نادر بجا ماند نے نادری

اس طرح فرانس میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ کمزور رعایا طاقت ور اور طاقت ور امرا بے دست و پا ہو گئے، عوام نے ری پبلک یعنی جمہوری حکومت کے اصول پر ایک کمیٹی بنا دی جس نے افسران فوج کو سرحدوں کی حفاظت پر متعین کر دیا۔ اور ملک کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اسی زمانہ میں مشہور فوجی سردار نپولین بونا پارٹ کو فوج کا کرنل مقرر کر کے قدیم روم کی سرحد پر متعین کیا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نپولین بونا پارٹ فرانس کی قوم کا فرد نہیں تھا بلکہ وہ قدیم روم کے جزیرہ کارسکا کا رہنے والا تھا۔ جہاں کے لوگ چوری ڈکیتی میں مشہور ہیں۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں اس نے انگریزی حکومت میں ملازمت کا ارادہ کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی اس کے بعد فرانس کی فوج میں ملازمت کر لی اور انقلاب فرانس میں کارہائے نمایاں انجام دے دے کر شہرت و ناموری حاصل کی اور بلند مرتبہ پر فائز ہوا۔ غرضیکہ انگلینڈ، اسپین اور جرمنی بھی اس مثل کے مطابق کہ "خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" اپنے اپنے ملکوں میں فرانس کی رعایا کے انقلاب کی تقلید میں بلوہ و فساد پر آمادہ تھے اور اسی دوران فرانس کے مقتول بادشاہ کے بعض رشتہ دار مدد طلب کرنے کی غرض سے انگلینڈ آئے۔ انگلینڈ کے اہل رائے دانش وروں نے اپنی رعایا میں شورش پھیلنے کے خوف سے یہ طے کیا کہ فرانس کے مقتول بادشاہ کے وارثوں کی مدد کے بہانے فرانس پر قبضہ کر لیا جائے۔ اسی سال کے آخر میں شاہ فرانس قتل ہوا تھا۔ انگلینڈ کی حکومت نے شہزاد ڈیوک آف یارک کی ماتحتی میں ایک بڑی فوج فرانس پر حملہ کرنے کے لیے متعین کی۔ بہت سے سلاطین فرنگ نے اس اقدام کو پسند کیا اور اسپین، ہالینڈ اور جرمنی بھی شریک جنگ ہو گئے اور بعض نے جلد شرکت کا وعدہ کیا۔ اس موقع پر پروشیا کے بادشاہ نے اپنی فوج کی درستگی کے بہانے حکومت انگلینڈ سے پچاس ساٹھ لاکھ روپیہ حاصل کر کے ہڑپ کر لیا اور جنگ میں شرکت نہیں کی، روس کے بادشاہ کے ارادہ کو بھی مسخ کرا دیا اور انگلینڈ اور فرانس کی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ پولینڈ بہت وسیع ملک تھا اور چودہ حصوں میں منقسم تھا ہر حصہ پر ایک رئیس حکمران تھا۔ یورپ کی قدیم رسم کے خلاف یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک ملک نے دوسرے پر قبضہ کر لیا ہو اور وہ ملک بادشاہ انگلینڈ

کے قدیم ملک ہنور سمیت جو جرمنی میں واقع تھا تین حصوں میں تقسیم ہو کر، پروشیا، جرمنی اور روس میں بٹ گیا۔

انگلینڈ کے بادشاہ کا قدیم ملک ہنور (HONOVER)

کنگ جارج کا جدِ چہارم ہنور کا حکمران تھا اور اس کے پاس بیس ہزار فوج تھی اور یہ ملک اس کا دارالسلطنت تھا یہاں اسی کا سکہ چلتا تھا۔ مگر وہ اپنے آپ کو جرمنی کے بادشاہ کے متوسلین میں شمار کرتا تھا۔ جب قرابت داری اور نسل کی وجہ سے اس کو انگلینڈ کی بادشاہی ملی تب بھی بادشاہ نے اپنے اس قدیمی ملک کی حفاظت پر توجہ قائم رکھی۔ جب یہ ملک ہاتھ سے نکل گیا اور اس کو واپس لینے کی قوت بھی تھی تو پارلیمنٹ نے اسی بنا پر کہ اس کی حفاظت اور انتظام پر بہت زیادہ رقم خرچ کرنا پڑتی اس کو واپس لینے کا خیال ترک کر دیا۔ اس طرح انگلینڈ کے بادشاہ کو تلخ کام اور جرمنی کو کامیاب بنایا۔

جو فوج فرانس کی تنبیہ پر مقرر کی گئی تھی اس کا یہ حال تھا کہ اس نے بحری راستہ سے خلیج فرانس میں داخل ہو کر بندرگاہ ٹورلن کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد ملک ہالینڈ سے گزر کر وسط فرانس میں پہونچ گئی اور فرانس کے مقتول بادشاہ کی حمایت کر کے اس کے بیٹے کے لئے بعض صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ فرانس کا شاہزادہ جیل میں تھا۔ اس وقت فرانس کی جمہوریت کے مدعی ہنگاموں اور اکھاڑ پچھاڑ میں مصروف تھے اس لئے فرانس کے بادشاہ کے حامیوں نے انگریزوں کی مدد شروع کر دی اور فرانس کے دارالسلطنت کو فتح کرنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ اس دوران میں فرانس کی پوری فوجوں سے خوں ریز لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں فرانس والوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ اور انگریزوں کی بہت سی فوج لڑائی میں کام آگئی اس لئے انگریزی فوج مقبوضہ بندرگاہ پر واپس آئی اور اس نقصان کی تلافی کی فکر میں لگ گئی۔ اس وقت اسپین اور ہالینڈ بھی فرانس کی دھمکیوں سے ڈر کر انگریزوں سے الگ ہو گئے، اور انگریزوں کے لئے ٹورلن TOURLON میں قیام کرنا دشوار ہو گیا۔ لہٰذا فرانس کے سولہ بڑے بڑے جہازوں کو جو بندرگاہ پر موجود تھے جلا ڈالا۔ اور نو جہاز اپنے ساتھ لے کر لندن واپس ہوئے اس واقعہ کے بعد فرانس کی جمہوری حکومت نے حفاظت کا

بہانہ کرکے ہالینڈ پر قبضہ کر لیا اور شہزادہ کو ٹھکانے لگا دیا اس کے بعد جرمنی، روس اور یورپ کے دوسرے تمام ملکوں سے جنگ پر کمر باندھی اور خوب بڑے ان لڑائیوں میں نپولین بونا پارٹ نے بہت شہرت حاصل کی۔ نپولین ایک وزیر موشیو بارا کی مدد سے روم کی افواج کا جنرل مقرر ہوا اور اس ملک کو اور سوئزر لینڈ کو اپنی ہمت و بہادری اور خداداد فراست کی مدد سے فتح کر لیا۔ ان ملکوں کے دشوار گذار پہاڑوں اور بڑے بڑے قلعوں کو اس موسم میں نشانہ بنایا جب جنگل اور پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس نے جرمنی کی نامی فوجوں کو کئی بار شکست دی اور بعض مقامات پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں ان سے صلح کر لی۔ اس واقعہ کے بعد جمہوریہ فرانس نے اپنی بحری قوت کو انگریزوں کی بحری قوت کے مقابلے میں کمزور پایا اس لئے انگلینڈ پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن دشمن کو کمزور کرنے کے لئے یہ تجویز کیا کہ پہلے اطراف و جوانب کی طاقتوں کو کمزور کرنا چاہئیے اس کے بعد اصل مقصد یعنی فتح انگلینڈ پر توجہ کی جائے۔ اس تجویز کے پیش نظر آئرلینڈ کے ان باغیوں کی مدد کے لئے کمک روانہ کی جو اپنے بادشاہ سے بغاوت کر رہے تھے اور نپولین کو چالیس پچاس ہزار فوج اور توپخانہ کے ساتھ سمندر کے راستہ مصر کی فتح پر مامور کیا تاکہ مصر پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان پر راستہ صاف ہو جائے۔ اور دکن اور بنگال کو ٹیپو سلطان کی مدد سے انگریزوں سے چھین لیا جائے اس طرح ان کو بھرپور نقصان پہنچایا جائے۔ لیکن انگریزوں کو اپنی بحری قوت پر بھروسہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ بغیر فرانس کی بحری جہازی قوت کے نپولین کا ہندوستان فتح کرنا ممکن نہیں اس لئے انہوں نے اس ارادہ سے آگاہ ہو کر کوئی فکر نہ کی اور ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوئے پہلے فرانسیسیوں کو آئرلینڈ سے نکال کر باغیوں کی گوشمالی کی۔ پھر اس اندرونی جھگڑے سے اطمینان حاصل کر کے فرانس اور اس کے مددگاروں سے بحری جنگ کا آغاز کیا اور بہت سی لڑائیوں میں فرانس کو شکست دی۔ ان میں چھ لڑائیاں بہت مشہور ہیں اس طرح فرانس کے زعم باطل کو مٹا دیا اور یہ نوبت پہونچی کہ بچے کھچے فرانسیسی جہاز قلعوں کی پناہ لے کر کسی طرف حرکت نہ کر سکتے تھے اور انگریزی جہاز ان کی جائے پناہ میں جا کر حملہ کرتے اور ان کو تباہ و برباد کر دیتے۔ اس طرح فرانس کا وہ تمام غلبہ جو خشکی میں بہت ترقی پر تھا یہاں بے کار ہو گیا اور وہ اپنے جہازوں کی کوئی مدد

نہ کر سکتے تھے۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی بحری جنگیں

پہلی بحری جنگ ۱۷۹۴ء میں انگلستان کے ساحل میں جو فرانس سے متصل ہے برپا ہوئی۔ اس کی سرداری لارڈ ہو HOWE کر رہے تھے۔ اس میں فرانس کے چھبیس ۲۶ جنگی جہاز تھے اور انگلینڈ کے پچیس، فرانس کے چھ بڑے جہاز گرفتار ہوئے اور ایک غرق ہو گیا باقی تباہ ہو کر بھاگ نکلے۔

دوسری لڑائی ۱۷۹۶ء میں زیر کمان لارڈ سنٹونسٹ STVINCENT اسپین کے ساحل سے متصل ہوئی۔ اس میں مخالف جہاز ستائیس اور انگریزی جہاز صرف پندرہ ۱۵ تھے لیکن چار بڑے اسپینی جہاز گرفتار ہوئے اور باقی نے بھاگ کر قلعوں میں پناہ لی۔

تیسری لڑائی ۱۷۹۸ء میں بحر شمالی میں ہالینڈ کے قریب ڈچوں سے ہوئی اس کی قیادت لارڈ ڈنکن lord Duncan نے کی اس جنگ میں چوبیس انگریزی جہاز تھے اور چھبیس مخالف۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی اور دشمن کے نو ۹ جہاز گرفتار ہوئے باقی نے راہ فرار اختیار کی۔

چوتھی لڑائی وسط ۱۷۹۹ء میں رود نیل کے ساحل پر ہوئی۔ اس کی قیادت لارڈ نلسن lord Nelson نے کی۔ یہ لڑائی ان جہازوں سے ہوئی جو بونا پارٹ کو مع فوج کے مصر لے گئے تھے۔ اس جنگ میں انگریزی جہازوں کی تعداد تیرہ اور مخالفین کے جہاز سترہ تھے۔ نو گرفتار ہوئے اور ایک غرق ہو گیا اور تین جل گئے۔ اس جنگ کا مختصر حال یہ ہے کہ جب فرانس کی ری پبلک حکومت اپنی بحری اور بری افواج اور جہازات جنگی کا جائزہ دے رہی تھی تو انگریزوں نے اسکو دیکھ کر خیال کیا کہ شاید انگلینڈ کے مقبوضہ ہندوستانی علاقوں پر حملہ کیا جائے گا۔ اس لئے حفظ ما تقدم کے طور پر ان کا راستہ روکنے کے لئے جبرالٹر پر جو دونوں صورتوں میں ان کی گزرگاہ تھی پچیس جہاز تعینات کر دیئے ان کی کمان ایڈمرل لارڈ سنٹونسٹ lord St Vincent کر رہے تھے۔ جب اپنے گمان کے خلاف ان کو معلوم ہوا کہ فرانسیسی جہاز شرقی بحر روم کی طرف رواں ہیں تو اس نے اپنے نائب لارڈ نلسن کو تیرہ جہازوں کے ساتھ فرانسیسیوں

کے تعاقب میں اپنے گمان کے مطابق اسکندریہ کی طرف روانہ کیا۔ اورخود دوبارہ جہازوں کے ساتھ اسپین کے چوبیس جہازوں کے مقابلے میں جو آمادۂ جنگ تھے صف آراء ہوا مگر اسپینی جہاز انگریزی جہازوں کی کمی کے باوجود حملہ کی جرأت نہ کرسکے اور لڑائی نہیں ہوئی لارڈ نلسن فرانسیسیوں سے ایک ہفتہ قبل اسکندریہ جا پہنچا لیکن وہاں ان کا سراغ نہ پاکر دوسری جانب روانہ ہوا۔ اسی تفتیش میں اس کو خبر ملی کہ فرانسیسی اسکندریہ پہنچ گئے ہیں، پھر واپس ہوا، چونکہ فرانسیسی جہازوں نے تمام خلیج ابوخیر کو گھیر لیا تھا اور وہاں لنگر انداز ہوکر مستعدِ جنگ تھے۔ لارڈ نلسن نے ہر مخالف جہاز کے مقابلہ میں اپنے ایک جہاز کو لنگر انداز کیا کہ اس طرح جہاز کا توپ خانہ دشمن کے جہاز کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اپنی تجربہ کاری اور ذاتی لیاقت سے کام لے کر ایک ایسی تدبیر سوچی کہ فرانس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ اور انگریزوں کو نمایاں فتح حاصل ہوئی۔ اس نے یہ کیا کہ اپنے چھ جہازوں کو ایک تنگ راستہ سے جو قلعہ ابوخیر اور فرانسیسی جہازوں کے بیچ میں تھا اور ایسا خراب تھا کہ اس میں جہاز بیٹھ جانے کا اندیشہ تھا، فرانسیسی جہازوں کی پشت پر بھیجا۔ اس کو یہ ہدایت کی کہ فلاں فلاں جہاز پر آگ برسانا شروع کردو ہم ادھر سے حملہ کریں گے اور ان کو تباہ کرکے پھر باقی بچنے والوں کی خبر لیں گے۔ ان میں سے ایک جہاز تو ریت میں دھنس کر قلعہ کی توپوں کی زد میں آگیا اور تباہ ہوگیا لیکن باقی پانچ جہاز بادِ مراد کی مدد سے جو اس وقت تیز چلنے لگی تھی۔ قلعہ کی توپوں سے بچ کر نکل گئے اور مقررہ تجویز کے مطابق ایک ایک جہاز کو گھیر کر تباہ کردیا چوں کہ فرانسیسیوں کو ایسے تنگ راستہ سے کسی جہاز کے گزرنے کا یقین نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنی پشت کی جانب سے بالکل بے فکر تھے اور اسی لیے توپ خانہ بھی سامنے لگایا تھا چونکہ ان کے جہاز لنگر انداز تھے اس لیے ایک دوسرے کی مدد بھی نہ کرسکے اور چاروں طرف سے گولوں کا نشانہ بن گئے۔

یہ جنگ شام کے وقت شروع ہوئی تھی اور پہر رات گئے اس وقت ختم ہوئی جب ان کے ایڈمرل کا بڑا جنگی جہاز جل گیا۔ اس لڑائی کا نقشہ پونورام PONORAMS میں جو لندن کا ایک تماشاخانہ ہے میں نے دیکھا ہے

واقعی ہنگامہ محشر نظر میں آتا تھا۔

پانچویں لڑائی وسط ۱۸۰۱ء میں فرانس اور اسپین کے ساتھ ہوئی۔ اس کی قیادت سر جیمس سمرس SIR. JAMES SAMRUS نے کی تھی اس لڑائی میں دشمن فوج کے نو جہاز تھے، اور انگریزوں کے پانچ۔ دشمن کے دو جہاز جل گئے اور ایک گرفتار ہوا۔

چھٹی لڑائی ۱۸۰۱ء میں ڈنمارک کے دارالسلطنت کوپن ہیگن COPEN HAGEN میں ہوئی اس کا ذکر پہلے بھی کیا گیا ہے۔ اس کی کمان لارڈ نلشن نے کی۔ اس جنگ میں سترہ مخالف جہاز جل گئے۔ اور ایک قید ہوا۔ اس لڑائی میں فرانس اور اس کے مددگار ملکوں کے چند مقبوضات انگریزوں کے قبضہ میں آ گئے۔

فرانس اور انگلینڈ کی برّی جنگیں

ایک جنگ کیپ جشن میں ہوئی جہاں ہالینڈ کے لوگ قیام پذیر تھے۔ اگر فرانس کی جہازی قوت اس مقام کو محفوظ رکھتی تو انگریزوں کا ہندوستان میں اپنی قوم کو مدد پہنچانے کا راستہ بند ہو جاتا۔ اس لیے ۱۷۹۵ء میں پانچ ہزار انگریزی فوج جنرل ڈنڈاس کی کمان میں کیپ جشن پر حملے کے لیے روانہ کی گئی۔ کیپ کے ایک چھوٹے شہر فالزبے میں انگریزی فوج اتری۔ ہالینڈ کے حاکم کے پاس چھ ہزار فوج اور مضبوط قلعہ موجود تھا۔ لیکن وہ انگریزوں کے حملے کی خبر سن کر اس قدر بدحواس ہوا کہ صلح کر کے شہر اور قلعہ ان کے سپرد کر دیا۔

اس کے بعد انگریزی فوج نے جزیرہ مالٹا MLTA پر قبضہ کیا جو فرانس کا مقبوضہ تھا اور پھر اسپین کے مقبوضہ جزیرہ مینار کا MINARCA پر قبضہ کیا اسی طرح سورنم SURINAM اور مارٹینک MARTINQUE جو امریکہ میں فرانسیسی مقبوضہ تھا اس کو فتح کر لیا۔

چھٹا مقام جزیرہ سیلون CEYLON جو ڈچوں کے قبضہ میں تھا لے لیا۔ مشہور ہے کہ یہاں سے دو کروڑ روپیہ کا گرم مصالحہ اور دوائیں جو ہالینڈ والوں کی ملکیت تھیں انگریزوں کے ہاتھ آئیں۔

ساتواں سب سے اہم مقام جو انگریزوں نے فتح کیا وہ دکھنی ہندوستان کا مشہور مقام سرنگ پٹنہ . وہ ہندوستانی ہے۔ جس کا مختصر حال یہ ہے کہ جب نپولین بونا پارٹ نے مصر فتح کر لیا۔ تو اس کے اور سلطان ٹیپو کے درمیان خفیہ خط وکتابت ہوئی اور یہ خیال تھا کہ اگر بونا پارٹ ہندوستان کا ارادہ کرے گا تو ٹیپو سلطان کی رہنمائی اور امداد سے اس کو راستہ مل جائے گا۔ چونکہ انگریزوں اور ٹیپو میں مصالحت تھی، انہوں نے ٹیپو کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ تم اپنے فلاں فلاں ساحلی قلعے ہم کو دیدو تاکہ ہمیں اطمینان ہو جائے اور فرانس کی جنگ یا صلح کے بعد واپس کر دیے جائیں گے۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

ٹیپو جو انگریزوں کی اصل قوت سے بے خبر تھا اور ان چند لڑائیوں کی وجہ سے جس میں اس کو انگریزوں پر فتح حاصل ہوئی تھی اپنے غرور میں تھا اس نے اس پیغام کی کوئی پرواہ نہ کی اور لڑائی کے لیے آمادہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ توقع کے برعکس نکلا یعنی لڑائی میں مجبور ہو کر قلعہ بند ہونا پڑا اور ایسے قوی دشمنوں سے سرنگ پٹن کے قلعہ میں بیٹھکر مقابلہ کرنے لگا جو قلعہ آسمان کو فتح کرنا بھی اپنی حکمت سے آسان سمجھتے ہیں۔ انگریزوں نے تھوڑے عرصہ میں گولہ باری کر کے قلعہ میں راستہ پیدا کر لیا اور چاروں طرف سے حملہ آور ہو گئے۔ جب قلعہ فتح ہونے لگا تو ٹیپو سلطان نہایت شجاعت کے ساتھ قلعہ کے دروازہ پر آ گیا اور فرار ہونے یا جنگ سے کنارہ کشی کو ننگ و عار خیال کر کے اپنے سپاہیوں کے ساتھ دشمن سے مقابلہ کرتا رہا اس دوران میں اس کے سینہ پر تین گولیاں لگیں اور وہ قلعہ کے دروازہ کے قریب گر پڑا بہت سے جانثاروں کی لاشیں اس پر گریں۔ اور قلعہ فتح ہو جانے کے بعد اس کے مارے جانے کی تصدیق ہوئی۔ انگریزی فوج قلعہ میں داخل ہو گئی۔ تقریباً سات ہزار آدمیوں کو قتل کیا اور قلعہ پر قبضہ کے علاوہ ٹیپو سلطان کے بال بچوں کو گرفتار کر لیا اور تمام مال و متاع پر قبضہ کر لیا۔ ایسی مشہور فتح اس طرح حاصل ہوئی کہ تین چار ماہ بھی لڑائی جاری نہ رہ سکی اور نہ فوجوں کو زیادہ نقل و حرکت کرنا پڑی۔

اس لڑائی کا نقشہ بھی لندن کے ایک تماشا خانہ میں بہت تفصیلات کے ساتھ دیکھنے میں آیا۔

آٹھواں ملک مصر، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب بونا پارٹ اسکندریہ پہنچا تو اس کو ایک روز میں فتح کر کے قاہرہ کا رخ کیا اور قاہرہ کے لوگ ترکمانوں کی سرداری میں بڑی تعداد میں اینٹ پتھر اور لاٹھیاں لے کر اس فوج جہاں آشوب کے مقابلے کے لیے نکلے اور توپ کے گولوں کا نشانہ بن کر پریشان حال قاہرہ واپس ہوئے۔ چونکہ شہر کی حفاظت ان کے امکان سے باہر تھی اس لیے بعض لوگ فرانسیسیوں سے مل گئے اور باقی ترکمانوں کے ساتھ قسطنطنیہ کی طرف بھاگ گئے اور قاہرہ مع دیگر مصری شہروں کے نپولین کے ہاتھ آ گیا۔ اب نپولین اپنے جنگی جہازوں کی شکست کا بدلہ لینے کے خیال سے جس کا ذکر جنگ ابوخیر میں ہوا ہے۔ اور فرانس کی حکومت حاصل کرنے کے پوشیدہ منصوبہ کے تحت اور ہندوستان کا راستہ معلوم کرنے کی غرض سے جو خیال محال تھا وقت گزاری کے لیے ملک شام فتح کرنے کے بہانے شہر عکہ کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں ترکی حکمراں جزار پاشا کی قیام گاہ تھی۔ وہ اور تمام اہل قلعہ نپولین کی فوج کے خوف سے پریشان و حیران تھے۔

سر سڈنی اسمتھ SIR. SIDNEY SMITH نے جو ایک انگریزی جہاز کا کپتان تھا اور اس زمانہ میں دو اور جہازوں سمیت بحر روم میں گشت کر رہا تھا جزار پاشا کو اطمینان دلایا اور اپنی تھوڑی سی فوج بحری لے کر قلعہ میں آیا اور جزار پاشا کے سپاہیوں کو مناسب مقامات پر متعین کر کے اپنے جہازوں کو بھی ایسے مقامات پر لنگر انداز کرایا کہ ان کی توپیں واقعی دشمن کو نقصان پہنچا سکیں۔ بونا پارٹ جو ہر جگہ فتح حاصل کرتا تھا اور اپنی شجاعت اور تدبیروں میں یکتا تھا گیارہ بار اس قلعہ پر حملہ آور ہوا لیکن اپنے پانچ چھ ہزار آدمی ضائع کر دینے کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکا۔ آخر کار پیش قدمی روک کر مصر کی طرف واپس چلا گیا۔ اس لڑائی کا نقشہ بھی جس کو دیکھ کر روز محشر کی ہولناکی کا خیال آتا ہے اور سرداران لشکر کی تصاویر بھی لندن کے تماشا خانہ میں نظر آئیں جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ معرکہ گویا لندن میں برپا ہے اور میں اس میں موجود ہوں۔

نپولین کا سلطنت حاصل کرنا اور اس کا اسباب

ری پبلک فرانس نے نپولین بونا پارٹ کے مافی الضمیر سے مطلع ہو کر اس کو فوج اور

سامان جنگ سے مدد دینا بند کر دیا اور یوں بھی مدد دینا بحر روم میں انگریزی جہازوں کے دورے اور ان سے مڈبھیڑ ہونے کی وجہ سے دشوار تھا اس دوران میں روس کے بادشاہ اور شمال کے دوسرے بادشاہوں نے جرمنی کے بادشاہ سے مدد کا وعدہ کرکے اس بات کی ترغیب دی کہ وہ فرانس سے معاہدہ توڑ دے اور اس کو فرانس سے لڑنے کے لیے آمادہ کیا۔ قدیم روم کے فرمانروا نے بھی نافرمانی کا اظہار کیا جس سے ری پبلک میں تشویش اور آپس میں مخالفت پیدا ہوگئی۔ ان میں سے ایک فریق نے بوناپارٹ کو پیغام بھیجا کہ اگر اپنے آپ کو مصر سے جلد پیرس پہنچاؤ تو تم کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ لہذا بوناپارٹ نے مونو نامی اپنے ایک فوجی سردار کو جو اس کا نائب تھا مصر کی فوج کا سردار بنایا اور خود ایک تیز رفتار جہاز میں اپنے دس بیس خاص ساتھیوں کے ہمراہ سوار ہو کر انگریزی جہازوں کی زد سے بچتا ہوا بخیر و خوبی پیرس جا پہنچا۔ ممبران ری پبلک نے اس کے آنے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ دوسرے دن ایوانِ حکومت میں حسب معمول لوگ جمع ہوئے جو بغیر ہتھیاروں اور محافظوں کے تھے۔ بوناپارٹ اپنے طرفداروں کے اشارہ پر بیس مسلح ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچا اور سب کو حراست میں لے کر بے اختیار کر دیا اور اپنے طرفداروں میں سے ری پبلک کے نئے ممبروں کو مقرر کرکے اپنے آپ کو صدر انجمن اور اپنا لقب فرسٹ کونسلر قرار دیا۔ چونکہ تمام فوج اس کی خیر خواہ تھی لہذا کوئی کان بھی نہ ہلا سکا اور وہ مستقل حکمران بن گیا اس نے جرمنی، روس اور روم قدیم کی فوجوں سے مقابلہ کا ارادہ کیا اور تھوڑے عرصہ میں سب کی اچھی طرح تنبیہہ کرکے روم اور جرمن سے ممالک مفتوحہ واپس لے لیے اور روس سے پختہ معاہدہ صلح کے بعد دارالسلطنت پیرس واپس آگیا۔ چند روز بعد روم قدیم کی فرسٹ کونسلری کو بھی اپنی کونسلری کا ضمیمہ دے دیا اور یہ عہدہ بھی ری پبلک سے عمر بھر کے واسطے منظور کرا لیا۔ اور روز بروز ری پبلک کے اختیارات میں کمی اور اپنے اختیارات میں اضافہ کرنے لگا۔ چنانچہ جس زمانے میں خود میں مارسیلز MARSILLES میں تھا جس کا ذکر کروں گا۔ تو اس زمانہ میں اس نے اپنا سکہ بھی جاری کر دیا۔ لیکن سلطنت کا نام ابھی تک اختیار نہیں کیا ہے۔ بدستور فرسٹ کونسلر کہلاتا ہے۔ یعنی صدر مجلس جمہوری۔

الغرض مصر سے بوناپارٹ کی روانگی کے بعد ترکی کے وزیر اعظم یوسف پاشا نے

مصر جاکر مونو اور فرانس کے دوسرے افسروں سے کئی بار جنگ لڑی لیکن ہر بار شکست کھاکر واپس ہوا۔ بعض لڑائیوں میں پچاس ہزار ترکوں نے ایک ہزار فرانسیسیوں سے شکست کھاکر سارے یورپ میں اپنی کم طاقتی کا اعلان کر دیا۔ ان کے گزشتہ غلبہ کے پیش نظر تمام عیسائی سلطنتیں ان سے خوف زدہ رہتی تھیں اور اسی لئے ان کے خلاف ہاتھ پیر نہیں ہلاتی تھیں۔ مگر یہ کیفیت دیکھ کر جرمنی کو بھی بادشاہ روس کی طرح جو ہمیشہ ترکی کو چت کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ ترکوں کی سلطنت میں سے حصہ لینے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ مالٹا کی فتح اور ترکوں کی مجبوری ثابت ہونے کے بعد اراکین حکومت انگلشیہ نے سر ایبر کرمبی Sir aber crombie کو پندرہ ہزار افواج کا جنرل مقرر کر کے مصر کو فتح کرانے اور فرانسیسیوں کو وہاں سے بے دخل کرنے پر مامور کیا۔ جنرل مذکور جنگ روہیل کھنڈ کے فاتح جنرل ایبر کرمبی کا بھائی تھا۔ مدراس اور بمبئی کی فوج بھی اس کی کمک کے لئے نامزد ہوئی کہ بحر قلزم کی راہ سے سوئز اور مصر پہنچ جائے۔ جنرل موصوف ہندوستانی فوج کے آنے سے قبل موقع پر جا پہنچا اور پہلے ہی حملے میں قلعہ ابوخیر کو فرانسیسیوں سے چھین لیا جنرل مونو نے کئی لڑائیاں لڑ کر اس کو پریشان کر دیا۔ ایک لڑائی میں جنرل ایبر کرمبی مارا گیا اور چار ہزار انگریزی فوج کام آئی۔ لیکن بونا پارٹ کی خاص پلٹن جو تمام لڑائیوں میں غالب رہتی تھی، تمام کی تمام لقمۂ اجل بن گئی۔ جو بچی وہ اسکندریہ میں تباہ ہوئی۔ اس دوران میں عثمانی وزیر موقع پاکر پھر مصر آیا اور انگریزی فوج کے ساتھ مل کر قاہرہ کا محاصرہ شروع کیا۔ اس وقت فرانسیسی سرداروں میں اختلافات اور جھگڑے پیدا ہو گئے تھے اور کمک ملنے کی بھی امید نہ تھی اس لئے انہوں نے صلح کر کے قاہرہ عثمانی وزیر اعظم کے سپرد کر دیا اور مصر کا تخلیہ کر کے فرانس روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد طے پایا کہ صلح اور عہد نامہ کی تکمیل تک قلعہ اسکندریہ انگریزوں کی حفاظت میں رہے گا۔ چنانچہ اب تک کچھ ہندوستانی فوج جو فتح مصر کے بعد پہنچی تھی وہاں موجود ہے۔ مالٹا اور مصر نکل جانے کے بعد بونا پارٹ دل سے تو صلح کی طرف راغب رہا لیکن ظاہر میں اپنا زور شور دکھانے کے لئے اس نے ساحل انگلش کے مقابل شہر کلس Boulogne میں بہت بڑی فوج بھیجدی اور فوج کو ساحل تک لے جانے کے لئے گن بوٹ کشتیوں کی فراہمی کا حکم دیا۔ اس طرف سے لارڈ کارنوالس ایک بھاری فوج لے کر مقابلہ پر نکلا اور لارڈ نلسن کو بھیجا گیا کہ وہ فرانسیسی گن بوٹوں کو غرق کرے لارڈ نلسن

نے بعض کشتیوں کو نقصان پہنچایا۔ مگر چونکہ وہ زنجیر بند تھیں اس لئے زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری بار ان کو بالکل تباہ کر دینے کے ارادہ سے پہونچا۔ چونکہ فرانسیسی جانتے تھے کہ لارڈ نلسن پھر آئے گا۔ اس لئے انہوں نے کشتیوں کے اندر جا بجا بہت سے فوجیوں کو پوشیدہ طور پر بٹھا دیا تھا۔ جب انگریزی سپاہی کشتیوں پر چڑھنے لگے تو کوئی نہ بولا، مگر جب داؤں پر پہنچ گئے تو شمشیر و خنجر سے جس میں وہ خوب ماہر تھیں حملہ کیا اور سات سو انگریزی سپاہیوں کو قتل کر ڈالا لارڈ نلسن ناکام اپنے ساحل پر واپس آیا۔

انگلینڈ اور فرانس میں مصالحت

ان لڑائیوں کے بعد دونوں قوموں نے اپنی اپنی جگہ پر مصلحتاً صلح کی صورت پیدا کی۔ ایک فرصت میں اپنی بحری قوت بڑھانا چاہتا تھا۔ دوسرے کو اپنے ملک کے لوگوں کی اس پریشانی کا خیال تھا جو بے حد گرانی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ گویا یہ گرگ آشتی کی بنیاد ڈالی تھی۔ لارڈ کارنواس صلح کی تکمیل کے لئے فرانس گیا۔ دو تین ماہ بات چیت اور طے توڑ کرنے میں صرف ہوئے۔ اور آخر کار ان شرائط پر صلح قرار پائی کہ:

(۱) ممالک روم قدیم، جرمنی، سوئزرلینڈ اور ہالینڈ جو فرانس نے فتح کئے ہیں وہ فرانس کے پاس رہیں۔

(۲) انگریزوں کے مفتوحہ ممالک میں سے جزیرہ سلون ان کے پاس رہے۔ کیپ ڈچوں، مصر سلطان ترکی کو اور مالٹا وغیرہ اس کے مالکوں کے سپرد کئے جائیں۔ بغرض ماہ ذی قعدہ ۱۲۱۶ھ ہجری مطابق ۱۸۰۱ء میں جنگ ختم ہوئی۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ لندن اور پیرس میں تین راتوں تک متواتر جشن چراغاں رہا۔ اور میں مدت سے ارادہ کر رہا تھا، کہ فرانس کے راستہ سے وطن واپس روانہ ہو جاؤں۔ اب موقع پا کر لندن میں دو سال پانچ ماہ پندرہ دن قیام کے بعد آج بتاریخ دس ماہ صفر ۱۲۱۷ھ ہجری مطابق سات، جون ۱۸۰۲ء دوستوں سے رخصت ہو کر شہر پیرس کی طرف روانہ ہوا۔

حصّہ دوم

واپسی کے سفر کا آغاز

لندن میں دو سال پانچ ماہ اور پندرہ دن قیام کے بعد ۱۰ ماہ صفر ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کو لندن کے دوستوں سے رخصت ہو کر پیرس کے لئے روانہ ہوا، مقصد یہ تھا کہ فرانس کے پایۂ تخت دیانہ vienna جاؤں، اور وہاں سے ملک ہنگری کے درمیان سے گزرتا ہوا خشکی کے راستے سے قسطنطنیہ پہونچ جاؤں۔ لندن سے چل کر اسی دن ستّر میل دور شہر دوور Dover پہونچا۔ دوور کے باشندے انگریز ہیں لیکن زیادہ تر انگریزی زبان سے ناواقف ہیں ان کا رہن سہن اور طور طریقے فرانس کے باشندوں کی طرح ہیں۔ بیشتر لوگ دغا باز اور فریبی ہیں۔ مسافر خانوں کے مالک لندن سے تگنا چوگنا کرایہ وصول کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی مہنگی ہیں۔ سرحد پر لندن کی حکومت کے گماشتے مقررہ ٹیکس سے کہیں زیادہ رقم وصول کر لیتے ہیں۔ مجھ سے بھی بغیر کسی سبب کے خاصی رقم وصول کی۔ میں فرانسیسی زبان سے ناواقف تھا اس لئے کچھ کہہ سن بھی نہ سکا۔ اتفاق سے گاڑی میں امریکہ کا ایک انگریز باشندہ مسٹر نیل بھی سوار تھا۔ نہایت نیک خصلت اور ملنسار شخص تھا۔ وہ اپنے ایک جہاز کو چھڑانے کی جد و جہد میں ایک سال سے حکومت فرانس کی قید میں تھا۔ اب

پیرس جارہا تھا۔ اس نے میری مجبوری کا احساس کرکے میری ترجمانی کے فرائض اپنے ذمہ لے لئے۔ اور خرچ کے معاملے میں بھی مری کفالت کی۔ پیرس تک راستہ کا سارا خرچ اس نے اٹھایا۔ پیرس پہونچکر میں نے بڑی خوشامد کرکے اس کی رقم واپس کی۔

دوسرے دن دو تین گھنٹوں میں انگلینڈ اور فرانس کے درمیانی سمندر کو عبور کرکے فرانس کے ساحلی شہر کلس calais پہونچ کر قیام کیا۔ وہاں سے آدھی رات میں ایک بھاری قسم کی گاڑی میں سوار ہوئے جس کو وہاں دلجانس diligence کہا جاتا ہے اور ہندوستان کی بیل گاڑی کی طرح سست رفتار ہوتی ہے۔ دو دن اور تین راتیں سفر میں گزریں اور دوشنبہ کے دن پیرس پہنچے۔

پیرس کے حالات

تمام ملک زرخیز ہے۔ پھل بکثرت اور آبادی گنجان ہے زمین کا بیشتر حصہ مسطح اور ہموار ہے۔ بعض مقامات پر پہاڑ بھی ہیں جو نہایت سرسبز اور شاداب ہیں۔ پانی کے چشمے اور نہریں بکثرت ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شہر اور قصبات آباد ہیں۔ لیکن اس معاملے میں لندن سے مشابہت نہیں ہے نہ جانوروں کی شکلوں کے اعتبار سے اور نہ زراعت کے لحاظ سے۔ برخلاف اسکے ہندوستان اور ایران سے وہاں کی بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں۔ وہاں گھوڑے بالکل عرب اور ایران جیسے نظر آئے ان کی ظاہری حالت بھی انگلینڈ کے گھوڑوں سے بہتر ہے سنا ہے کہ یہ انگلینڈ کے گھوڑوں کی طرح طاقت ور نہیں ہوتے۔ بیل بالکل ہندستانی بیلوں کی طرح کمزور اور لاغر نظر آئے۔ بیل گاڑی کے ذریعے باربرداری کا رواج یہیں سے شروع ہوا۔ یہاں کے کتے بہت خوبصورت اور قد میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ بعض تو بلی سے بھی چھوٹے دیکھنے میں آئے۔ جن کو وہاں کی عورتیں راہ چلتے بغل میں دبائے رہتی ہیں۔ راستے گلیاں نہایت کشادہ ہیں اور ان میں پتھروں کا فرش ہے۔ راستوں کے دونوں طرف مناسب و موزوں سایہ دار درختوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ نہروں اور گزرگاہوں پر پل بنے ہوئے ہیں۔ اکثر شہروں میں شہر پناہ اور قلعے دیکھے۔ سارے فرانس میں سایہ دار درختوں کے نیچے چلتا پھرتا رہا۔ اور جب قدیم روم کے شہروں میں پہنچا تو اس سایہ سے محروم ہو گیا۔

فرانس کے دیہات بالکل پسند نہیں آئے یہ وہاں کے شہروں سے کوئی مناسبت

نہیں رکھتے۔ عورتوں کا لباس اور انداز گفتگو نہایت ناشائستہ ہے۔ ان کو دیکھ کر وحشت اور نفرت ہوتی ہے، ان کے مقابلے میں ہندوستان کی دیہاتی عورت کا لباس کہیں بہتر ہوتا ہے۔ مسافر خانے اتنے گندے ہوتے ہیں کہ میں ساحل فرانس پر اترنے کے بعد سے پیرس پہونچنے تک رفع حاجت کے لئے جانے سے بھی گریز کرتا رہا۔ اور جب پیرس میں بیت الخلا کی وضع بھی اسی طرح کی نظر آئی تو بدرجہ مجبوری اس کو استعمال کیا۔ دیہاتوں کا کھانا اور شراب بھی خراب ہوتی ہے۔ اس طرح پیرس اور روم کے کسی بھی شہر میں کھانا اچھا نہیں ملتا ہے۔ ان کے پکوان بہت پر تکلف ہوتے ہیں گوشت میں مسالوں کی کثرت اور سبزیوں کی آمیزش کے باعث گوشت کا ذائقہ معلوم ہی نہیں ہوتا یہی حال وہاں کے کبابوں کا بھی ہے۔ ان کو آگ پر اتنا زیادہ رکھتے ہیں کہ گوشت کا لطیف خوشابہ جل جاتا ہے اور اس پر خشکی غالب آجاتی ہے۔ ابالنے والی چیزوں میں پانی زیادہ ڈال دیتے ہیں اور آنچ تیز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے گوشت کی لذت بھاپ کے ساتھ اڑ جاتی ہے اور اس کے ریشے ریشے الگ ہو جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے لندن میں ایک بار سے زیادہ گوشت کو دھویا نہیں جاتا اور اس کو پتھر کے کوئلہ کی آنچ پر پکاتے ہیں جو بہت تیز ہوتی ہے اس سے گوشت کے اوپر کا حصہ جلد پک جاتا ہے اور گوشت کے اندر کا پانی خشک نہیں ہوتا۔ مسالوں میں سوا پیاز کے کچھ نہیں ڈالتے۔ اور بعض لوگ پیاز بھی نہیں ڈالتے۔

ابالنے والی چیزوں میں لندن کے لوگ پانی کم ڈالتے ہیں اور اس کو نرم آنچ پر پکاتے ہیں۔ اور دیگ کا منہ بند کر دیتے ہیں تاکہ بھاپ ضائع نہ ہو۔ میرے لئے تین قسم کا جو کھانا تیار کرایا گیا تھا اس کے لئے خاص اہتمام کیا تھا مگر مجھ کو دسترخوان سے بھوکا ہی اٹھنا پڑا۔ کبھی پانی میں ابالی ہوئی مچھلی جو روغن زیتون میں ڈال کر محفوظ کر لی جاتی ہے یا نمک لگایا ہوا خشک گوشت تازہ پانی میں جوش دے کر کھاتے ہیں۔ میں نے اس کو کھایا تو اس وقت بہت بڑی نعمت معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس میں گوشت کی بو اور لذت باقی تھی۔ فرانس کے پورے سفر میں دو ماہ کے اندر پانچ چھ بار سے زیادہ پیٹ بھر کر لذیذ کھانا نصیب نہیں ہوا۔ یہی حال مٹھائیوں کا ہے۔ ان میں مٹھاس تو بہت زیادہ ہوتی ہے مگر اس کو ... ہ حرکاتے نہیں ہیں اس لئے دیکھ کر کراہیت معلوم ہوتی ہے یہاں گدا گر دن

کی اتنی کثرت ہے کہ ادھر مسافر گاڑی سے اترا ادھر سینکڑوں کی تعداد میں آکر اس کو گھیر لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی بھیڑ سے بچ کر نکل جاتا ہے اور آشخانہ میں پہنچ جاتا ہے تو بعض اس کے اندر بھی آجاتے ہیں اور اگر ایک لقمہ روٹی دے دو تو اس سے بھی انکار نہیں کرتے۔ ان آشخانوں کے اندر بڑے بڑے کتے آجاتے ہیں جو فقیروں سے زیادہ کھانے کی چیزوں کا نقصان کرتے ہیں۔ پیرس کے بعض قہوہ خانوں میں ان کتوں کی غلاظت جا بجا پڑی ہوئی نظر آئی۔ لوگ تمباکو نوشی میں مشغول نظر آتے ہیں یہ اس طرح کا تمباکو ہوتا ہے جس کو بنگال میں چرٹ کہا جاتا ہے۔ نہایت بدبودار۔ اس سے قہوہ خانہ کی پوری فضا متعفن ہو جاتی ہے۔

پیرس کی مشہور عمارتیں

اب پیرس کا مختصر حال درج کیا جائے گا۔ پیرس بہت بڑا اور شاندار شہر ہے اس شہر کی بیرونی وضع قطع کے مقابلے میں لندن بھی اپنی وسعت و خوبی کے باوجود ہیچ نظر آتا ہے مکانوں کے دروازے نہایت بلند، عمارتیں عالی شان، پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ کوئی عمارت سات منزل سے کم نہیں نظر آتی۔ بعض مقامات پر بارہ منزل کی عمارتیں بھی ہیں۔ شہر کے درمیان میں دریائے سین Seine بہتا ہے۔ یہ دریا شہر کے اندر کئی شاخوں میں منقسم ہو گیا ہے اور اس نے شہر کو جزیروں کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ شہر کے دونوں حصوں میں دریا کے کنارے سنگ مرمر کے بہت خوبصورت مضبوط بند بنا دیئے گئے ہیں۔ ایک جزیرے سے دوسرے میں جانے کے لئے راستے ہیں اور جزیروں سے شہر میں جانے کے لئے بھی تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بلند اور کشادہ پل تعمیر کرا دیئے گئے ہیں جن کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔ ان میں تین پل بہت بڑے اور خوبصورت ہیں اور بالکل لندن کے پلوں کی طرح بنے ہوئے ہیں بخلاف لندن کے اس شہر میں حمام خانے بہت ہیں۔ کشتیوں پر حمام بنانے کی پسندیدہ رسم فرانسیسیوں کی اختراع ہے۔

کشتیوں پر حمام

اس کی تفصیل یہ ہے ایک بڑی خوش وضع کشتی بناتے ہیں جس کے اندر دس بارہ کمرے ہوتے ہیں۔ اس طرح کی بہت سی کشتیاں دریا کے کنارے ایک قطار میں کھڑی رہتی ہیں۔ ہر کشتی کے اندر دھات کا ایک حوض ہوتا ہے اس میں دو ٹونٹیاں لگی ہوتی ہیں جن کے منہ شیر کی طرح ہوتے ہیں

ایک سے گرم پانی نکلتا ہے دوسری سے ٹھنڈا۔ پانی کا حوض کشتی کی چھت پر ہوتا ہے۔ ایک پمپ کے ذریعے دریا کا پانی حوض میں پہنچایا جاتا ہے۔ اس پمپ کو دریا کی موجیں حرکت میں لاتی ہیں۔ کسی آدمی کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ ہر کشتی کے اندر دس بارہ آدمی تھوڑی دیر میں غسل کر لیتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے غسل خانے الگ الگ ہیں۔ ملازمین میں دونوں صنفیں موجود ہیں۔ مرد پانی گرم کرتے اور فرش دھوتے ہیں اور عورتیں نہانے والوں کے کپڑے درست کرتی ہیں۔ یہ عورتیں اکثر جوان اور حسین ہوتی ہیں۔ ان کا لباس بھی خوشنما ہوتا ہے۔

دریا کے ساحل سے کشتیوں تک ایک تختہ کی چوڑان بھر کا پل بنا ہوتا ہے اس میں سہارے کے لیے کٹہرے لگے ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعے آدمی آسانی سے کشتی تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض کمروں میں ایسی کھڑکیاں ہیں جن سے زینہ تک کے ذریعہ دریا کے اندر جا کر بھی غسل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کشتی کے پتوار کی سمت ایک سطح جگہ ہوتی ہے اس پر کھانے کی میز بچھا دیتے ہیں اور نہانے کے بعد اس پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں بلکہ کھانا کھانے کے دوران میں بھی بار بار پانی میں اتر جاتے ہیں۔ اسی طرح کشتی ہی پر دھوبی کا کام بھی کر لیتے ہیں اور بڑی آسانی سے اپنے کپڑے دھو لیتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح پیرس میں بھی کپڑا بہت سفید دھلتا ہے۔ بخلاف لندن کے جہاں دھوبی اپنے گھروں میں کپڑے دھوتے ہیں اور وہ زیادہ سفید نہیں ہو سکتے۔ شہر کی ہر سمت میں اس طرح کی چند کشتیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ان میں ایک کشتی چھت والی ہوتی ہے جس کے اندر کپڑے دھونے کے آلات اور آگ سے بھاپ تیار ملتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ پیرس کے بیرونی حالات اور کیفیات میں۔ لیکن اندرونی وضع قطع اور کیفیت لندن تو درکنار کسی معمولی شہر سے بھی کوئی نسبت نہیں رکھتی ہے۔

زندگی کی آسائش وہاں مفقود ہے۔ کیونکہ زندگی کی راحت و آرام تین چیزوں پر منحصر ہے۔ اول صاف ستھرا مکان جو کشادہ اور ہوادار ہو۔ اور خلوت کی جگہ ہو۔ پیرس کے مکانات کا حال آئندہ بتایا جائے گا۔ مکان کے بعد انسان کے لئے خوش ذائقہ غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیرس کے کھانوں کی حقیقت بتائی جا چکی ہے۔ تیسری ضروری چیز شہر کی خواتین ہیں جن کے ذریعہ سے حصول مقصد میں آسانی ہوتی ہے۔ اس معاملہ شہر پیرس شاید اپنے باشندوں کے لئے لندن ہی کی طرح ہو۔ لیکن مسافروں اور غربت زدہ لوگوں کے

لیے لندن کی طرح بالکل معاون و مددگار نہیں. عمارتیں اگرچہ باہر کی طرف بہت بلند اور شاندار ہیں لیکن اندر سے بہت معمولی ہیں. کمروں کی کھڑکیاں بہت چھوٹی تکلیف دہ ہوتی ہیں. حالانکہ دیکھنے میں بہت آراستہ نظر آتی ہیں اور ان پر سنہرا کام بنا ہوتا ہے. مگر سادگی سے بہت دور بد سلیقہ. ایک مکان میں ایک صحن اور ایک دروازہ ہوتا ہے. اس کے اندر پچاس، ساٹھ مرد اور عورتیں، شرفاء اور کمینوں کی یکجا رہتی ہیں یہ عمارتیں آٹھ آٹھ منزل کی ہوتی ہیں. اس لئے گندگی اور شور و غل لازمی ہے. کمروں میں گھنٹی لگانے کا رواج نہیں ہے. کیونکہ ان مکانوں کے لازم مکینوں کی کثرت کے باعث سوا پانی پینے اور منہ دھونے کے روزانہ صرف ایک دفعہ کسی بھی وقت کمرے میں آجاتے ہیں اور اسی وقت شب خوابی کا لباس اور بستر درست کرتے ہیں. دوبارہ آنے کی زحمت نہیں کرتے ہیں. اس لئے کرایہ دار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنی خدمت کے لئے ایک اشرفی ہفتہ وار اجرت پر کوئی ملازم رکھ لے یا پھر خود اپنا کام کرے.

آتش دان اتنے میلے اور خراب ہیں کہ ان کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے. اس کے مقابلے میں لندن کے اندر ایک گھر میں دو تین آدمیوں سے زیادہ نہیں رہتے ہیں اور ایسی گندگی اور شور و غل نہیں ہوتا. اور اگر دن میں پچاس دفعہ گھنٹی بجاؤ تو ملازم ضرور حاضر ہوگا. اسی طرح آتش دان بہت خوبصورت اور گلدانوں سے سجے ہوئے ہوتے ہیں.

پیرس میں رات کو روشنی ہوتی ہے مگر بہت معمولی جو صرف تیز نگاہ والے راہ گیر کے لئے کافی ہوتی ہے. کیونکہ دوکاندار زیادہ روشنی نہیں کرتے ہیں. دوکانیں بھی شیشوں کی کمی کے باعث اور گندگی کی وجہ سے روشنی کے قابل نہیں ہیں. حکومت کی طرف سے ایک بڑی لالٹین گلی یا سڑک کے درمیان طویل فاصلہ پر جلاتے ہیں. اس کو رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیتے ہیں. ان رسیوں کے سرے لوگوں کے مکانات کی چھتوں پر بندھے ہوتے ہیں، جن کی دیکھ بھال روزانہ مشکل ہوتی ہے. روم کے شہروں میں بھی اتنی روشنی کا انتظام نہیں ہے. اسی طرح پیرس کی سڑکوں پر پیادہ اور سواروں کے لئے الگ الگ راستے نہیں ہیں، اکثر سڑکیں تنگ اور پتھروں کی بنی ہوئی ہیں اس لئے ہر وقت چلنے اور رات کی روشنی کا جو لطف لندن میں تھا وہ یہاں حاصل نہ ہو سکا.

ایک عجیب بات یہ ہے کہ لندن میں ہر شخص گرانی کی شکایت کرتا تھا اور پیرس

کی ارزانی کا ذکر ہوتا تھا لیکن میں نے پیرس کیا سارے فرانس اور روم کے شہروں کی سیاحت میں ضروری استعمالی چیزوں کے نرخ لندن سے زیادہ پائے۔

پیرس کے عمدہ مقامات میں سے ایک بولی وارڈس Bole vards ہے۔ یہ ایک کشادہ اور پر فضا راستہ ہے یہ قدیم شہر کے گرد گولائی لئے ہوئے ہے اور تین حصوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ درمیانی راستہ ۲۵ گز چوڑا ہے یہ صرف گھوڑوں اور گاڑیوں کے لئے خاص ہے۔ اور اس کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لئے راستہ ہے اور اس کے دونوں طرف نہایت موزوں سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان پر ایک نظر ڈالنے میں چار قطاریں نظر آتی ہیں۔ ہر قطار چوڑائی میں سات آٹھ گز ہے۔ اور نہایت مسطح اور ہموار اس راستہ کے ایک سمت درختوں کے نیچے پھل فروشوں، بزازوں اور مصوروں وغیرہ کی دوکانیں ہیں جو ایک قطار میں بہت ہی خوشنما نظر آتی ہیں۔ خریداروں کو رغبت دلانے کے لئے طرح طرح کی چیزیں میزوں پر پھیلا کر سجا دیتے ہیں صبح سے شام تک شہر کے مرد اور عورتیں خریداری کے لئے یہاں آتے ہیں اور ان کو ہر چیز شہر سے ارزاں ملتی ہے بہت سے لوگ صرف سیر و تفریح کے لئے جاتے ہیں۔

دوسرا مقام پلے رائل Palai Royal ہے۔ یہ پہلے بادشاہ فرانس کے بھائی کا سازشی اڈا تھا۔ آج کل عوام کی سیرگاہ ہے۔ اس کے کئی دروازے ہیں، اندر تقریباً دو سو گز طویل ایک چوکور میدان ہے جو چوڑائی میں پانچ سو گز ہوگا۔ صحن کے درمیان کیاریاں ہیں۔ جن میں اچھے اچھے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اور پھولوں کی روشیں ہیں، سارا صحن سبزے سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے گرد اونچے اونچے دالان ہیں جن کے ستون دس دس گز اونچے ہیں۔ دالانوں کے ایک سمت بیرونی دیوار سے ملحق ایک عمارت ہے جس میں شاندار دوکانیں ہیں۔ جو ہر قسم کے عمدہ سامان سے بھری ہوئی ہیں۔ دنیا جہاں کی چیزیں ان میں موجود ہیں۔ دوکانیں خوب سجی ہوئی ہیں خاص طور پر چینی کے سامان گھڑیوں اور میوہ فروشوں کی دوکانیں بہت بارونق ہیں۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ فرانسیسی چینی نقاشی اور طلاء کاری کے کام میں تمام یورپ کے اندر نامور ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان چیزوں سے مکانوں کو سجاتے ہیں۔ ان چیزوں کو سوز نہانوں کے سوا اور کسی کے لئے استعمال نہیں کرتے اس احاطے کے اندر بکثرت بے اندازہ قہوہ خانے نہایت شاندار موجود ہیں جہاں [illegible]

شام مردوں و عورتوں کا ہجوم رہتا ہے۔ خاص طور پر ایک قہوہ خانہ جو وسط میں بنا ہے بہت عمدہ ہے اس کے قریب ایک گول برآمدہ باغ کی سمت بنا ہے جس کے اندر عورتیں اور مرد ٹہلتے ہیں اور جب ان میں سے کسی کو اپنی ہم نشینی کے لائق کوئی دوست یا آشنا مل جاتا ہے تو وہ اس کو ساتھ لے کر اس قہوہ خانے میں بیٹھ کر شراب اور برف سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اس طرح یہ پلے رائل تماشائیوں کے حصول مقاصد کے لئے پیرس کا پرکشش مقام ہے کیونکہ چہل قدمی اور تفریح سے قطع نظر یہاں ہزاروں دلربا اور خوش جمال حسینوں سے ملاقات کا موقع بھی ملتا ہے جو اس بازار و باغ کے اطراف میں رہتی ہیں۔ دوکانوں کی بالائی منزل جو کبھی بادشاہوں کے اجلاس کے لئے مخصوص تھی اب وہ عیش پرست اور شوقین مزاج لوگوں کی خواب گاہ کے کام آتی ہے تماشائی مقررہ رقم ادا کر کے اپنے یار کے ساتھ وہاں جا کر اپنے مقصد میں کامرانی حاصل کرتے ہیں۔

تیسرا مقام ٹیلوری [illegible] یعنی بادشاہی عمارت کا جلو خانہ ہے اور بائیں باغ ہے۔ ان عمارتوں میں نپولین بوناپارٹ بیٹھتا تھا۔ مگر اب عوام کی تفریح گاہ ہے۔ پہلا جلو خانہ اتنا کشادہ ہے کہ اس کے اندر پانچ ہزار سوار بیک وقت کھڑے ہو سکتے ہیں۔ شہر کی جانب اس کی دیوار لوہے کے جنگلے کی صورت میں بنی ہوئی ہے۔ اس میں ایک پھاٹک لگا ہوا ہے ہر دروازے کے دونوں طرف پتھر کا ایک چوکور ستون ہے۔ اور ہر ستون پر گھوڑے کا فولادی مجسمہ نصب ہے۔ جس کو دیکھ کر قدیم اہلِ فرنگ کی مہارت پر انتہائی حیرت ہوتی ہے۔ یہ چیزیں نپولین قدیم سلطنت روما سے مال غنیمت کے طور پر لایا تھا۔ اس جلو خانہ کو طے کرنے کے بعد شاہی عمارت کے پائیں باغ میں داخل ہوتے ہیں جس کو ٹیلوری کہتے ہیں یہاں پر شہر کے ہر طرف سے یہاں آنے کے متعدد راستے ہیں۔ یہ پائیں باغ طویل اور چوکور ہے۔ اس کے اطراف کا رقبہ تقریباً دو میل ہو گا جس میں نہریں، حوض اور فوارے بھی ہیں۔ اس میں موزوں درخت لگے ہیں اور قسم قسم کے پھول نظر آتے ہیں۔ کیاریوں کے اندر قدیم ماہرین کے بنائے ہوئے مختلف قسم کے مجسمے نصب ہیں۔

قہوہ خانوں، پھلوں، اور شراب خانوں کی کثرت

اس باغ کے اندر متعدد

قہوہ خانوں اور میوہ فروشوں کی دوکانوں کے علاوہ شراب خانے بھی ہیں۔ اور یہ سب خیموں کے اندر ہیں۔ لوگ سیر و تفریح کے بعد اس جگہ بیٹھ کر قہوہ پیتے ہیں اور پھل کھاتے ہیں یہ سلسلہ پیرس میں بہت زیادہ ہے۔ کوئی ایسی سڑک نظر نہیں آئے گی جس پر بہت سے قہوہ خانے نہ ہوں۔ اسی طرح پھلوں اور شراب کی دوکانیں بھی ہیں۔ دوکانوں کے سامنے سڑک پر ایک قطار سے کپڑے کے سائبان تان کر ان کے نیچے میزیں اور کرسیاں رکھ دیتے ہیں تاکہ خریداروں کو آسانی ہو۔ یہاں سے فارغ ہو کر لوگ شاہ نشین کی عمارت کے مقابل جو بائیں باغ ہے اس کے اندر ہو کر باہر نکل جاتے ہیں جہاں ایک چوکور جلو خانہ ہے جس کے احاطہ کی دیواریں نہیں ہیں۔ یہ بہت کشادہ اور دل کش مقام ہے اس کے قریب ایک سیر گاہ ہے جس کو انگریزی میں پارک Park اور ہندی میں رمنہ کہتے ہیں۔ اس میں درخت بھی ہیں اور پانی کی نہریں بھی اور طرح طرح کے جانور بھی موجود ہیں۔ اس کا رقبہ دو میل کے قریب ہو گا۔ چاروں طرف خندق کا گھیرا ہے۔ اس جلو خانہ کے دائیں طرف شہر کی شاندار عمارتیں ایک قطار میں نظر آتی ہیں۔ بائیں طرف دریائے سین ہے اس پر پتھر کے بنے ہوئے کئی خوبصورت پل ہیں شہر کی عمارتیں دریا کے اس طرف نظر آتی ہیں۔

اس جلو خانہ کے صحن میں چند خیمے شب گذاری رقص و سرود وغیرہ کے لئے نصب ہوتے رہیں۔ ان کے اندر سازندے گانے بجانے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کچھ بازی گر اور کرتب باز بھی اپنے شعبدے دکھلاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے گرد لوگوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔

چوتھا مشہور مقام لوری Louvre ہے یہ وہ عمارت ہے جس کے اندر تصویروں کی نمائش لگائی گئی ہے۔ اور بغیر کسی معاوضے کے اس کے اندر جا سکتے ہیں۔ اس عمارت کے نچلے حصے میں بہت روشن اور آراستہ کمرے ہیں جن کے اندر غیر ملکی سامان ہے۔ پتھر کے مجسمے مناسب مقامات پر ستونوں کے اوپر نصب ہیں۔ جب اوپر کی منزل میں جائیے تو ایک بہت بڑا چوکور ہال ملتا ہے جو سو گز لمبا اور اسی گز چوڑا ہے۔ اور اونچائی پچاس گز ہے چھت کا درمیانی حصہ روشنی کے لئے کھلا ہوا ہے اور اس میں شیشے لگے ہوئے ہیں۔ جب اس کے اوپر کی منزل پر جائیں تو ایک بہت بڑا خیمہ لگا ہوا ہے جس کی چوڑائی تیس گز، اور لمبائی نصف میل ہو گی اس خیمہ اور اس سے نیچے کے بڑے ہال میں تصویریں دکھائی دیتی ہیں

تمام تصویریں سنہرے چوکھٹوں میں شیشے کے اندر محفوظ ہیں۔ بہت بڑی تصاویر صرف چوکھٹے کے اندر ہیں ان پر شیشے نہیں ہیں۔ ان تصویروں کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ ان کی صناعی کی خوبیوں اور لطافت کا بیان قلم کی طاقت سے باہر ہے۔ ان کو دیکھ کر اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ صنعت تصویر سازی اور مجسمہ تراشی قدیم زمانہ میں موجودہ دور سے کہیں زیادہ ترقی پر تھی، سارے فرنگستان میں عموماً اور روم میں خاص طور پر اس فن کے ماہر موجود تھے۔ رومیوں کی طاقت کے زوال کے بعد یہ تصاویر جو یورپ کی عمارتوں اور روم کے تمام بادشاہوں کے پاس تھیں جمع کر کے یہاں رکھی گئی ہیں۔ موجودہ دور کے مصور اور نقاش ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے ان تصاویر کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ اور ان سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کی نقلیں اتار کر لے جاتے ہیں۔ نپولین بونا پارٹ جو شہر فتح کرتا تھا وہاں کی منتخب تصاویر حاصل کر کے پیرس منتقل کر دیتا تھا۔ یہ تمام تصویریں نہایت حفاظت اور قرینے کے ساتھ رکھی گئی ہیں۔ بعض تصاویر ستر گز طویل اور تیس گز عریض ہیں۔ میں نے جو تصویریں لندن اور آئرلینڈ میں دیکھی تھیں وہ یہاں کی تصاویر کے مقابلے میں بچوں کے کھلونوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہیں۔

پیرس کے مذکورہ چار مقامات جن کا ذکر کیا گیا ہے بے مثل ہیں اور ساری دنیا میں ان کی نظیر نہیں ملے گی۔ ان کے علاوہ اچھے تماشہ گھر اس شہر میں بہت ہیں۔ آپ جس سڑک سے گزریں گے لوگوں کو سیر و تفریح یا کسی ناچ گانے کی محفل میں پائیں گے۔ ان تماشا خانوں میں ایک ہتولی باغ ہے جو اچھے درختوں، خوبصورت روشوں اور نہروں سے آراستہ ہے دوسرے فراسکاتی اور تروتونی، یہ دو لونا محل ہیں جن میں رات کو خوب روشنی ہوتی ہے اور آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ سیر و تفریح کے بعد عورتیں اور مرد عمارتوں کے اندر جاتے ہیں۔ اور میزوں پر بیٹھ کر مٹھائیاں، شراب، قہوہ اور برف وغیرہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس عمارت کے اندر متعدد فنتاس میگوریا Plantas Magoria ہیں۔ کہ ان میں قسم قسم کے فوارے اور پانی کی صنعتیں دکھاتے ہیں اور اس کے علاوہ مشہور زندہ اور مردہ لوگوں کی روحیں دکھاتے ہیں۔ میں نے اچھی طرح دیکھا کہ ایک شخص کفن میں لپٹا ہوا دو میل کی مسافت سے نمودار ہوا، اور روح کی طرح بہت تیزی سے ہماری طرف آیا اور اس قدر جھکا کہ محفل میں بیٹھی ہوئی عورتیں وہم کی وجہ سے بے اختیار رونے لگیں۔ اس شخص کا کفن

گر گیا اور صورت ظاہر ہو گئی۔ پھر وہ صورت اسی طرح واپس چلی گئی اور آہستہ آہستہ دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ کبھی ایک روح اوپر سے نازل ہوئی بالکل عکس اور سایہ کی طرح اور پہچان لی گئی پھر اچانک اوپر چلی گئی۔ ان روحوں کے دکھانے کے وقت چھت کے اوپر سے بارش اور بادل کی گرج اور چمک کی طرح سخت آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور اندر جلنے والے چراغوں اور شمعوں کی روشنی اس وقت کم ہو جاتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ تماشے واقعی حیرت انگیز ہیں۔

ان کے علاوہ پیرس میں ایک بڑا کتب خانہ ہے۔ جس کے اندر مختلف علوم و فنون کی لاکھوں کتابیں موجود ہیں اور نہایت ترتیب اور سلیقہ سے رکھی گئی ہیں۔ جو شخص مطالعہ کرنا چاہے اس کے اندر جا سکتا ہے اور پڑھنے کے علاوہ نقل بھی کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تیرہ پلے ہاؤس اور آپرہ خانہ ہیں جہاں لوگ شب گزاری کے لئے جاتے ہیں ناچ گانا سکھانے کے لئے بھی انتظام ہے۔ اس کے علاوہ شہسواری کے آداب کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اگر سب کا تفصیل سے ذکر کیا جائے تو باعث طوالت ہو گا۔ میں نے فرانس کے ناچنے اور گانے والوں کو انگلستان سے بہتر پایا۔ ان کی مہارت مسلّم ہے۔

فرانس کی خوبیاں

فرانس کے باشندے عموماً خوش اخلاق، شیریں زبان اور متواضع ہوتے ہیں اپنے مخاطب سے جواب میں ہاں یا نہیں استعمال کرتے ہیں۔ فارسی زبان کی طرح صاحب وغیرہ کا لفظ استعمال نہیں کرتے ہیں۔ اجنبی مسافر کو راستہ بتانے میں اس کی ضرورت کے مطابق نہایت خوشی سے رہنمائی کرتے ہیں اور اس کو خدا کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بخلاف اس کے انگریز اپنی نازک مزاجی اور زود رنجی کے باعث دور اندیشی سے کام لیتے ہیں۔ مجھے یہاں بعض اوقات جو پریشانی ہوئی وہ محض سلیقہ کی کمی کے باعث فرانس کے لوگ میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں اور کبیدہ خاطر نہیں ہوتے، نہایت خندہ روئی سے پیش آتے ہیں اور مجھ کو کسی تکلیف کے وقت تسلی دینے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ کھانے سے فراغت کے بعد گھروں میں نہیں بیٹھتے ہیں بلکہ آدھی رات تک سیرگاہوں میں وقت صرف کرتے ہیں۔ یہاں کے تھیٹروں اور آپروں میں لندن کے مقابلہ میں چوتھائی رقم صرف ہوتی ہے۔ ایک بُرا رواج یہ ہے کہ جو کام کرتے ہیں اس کو پورے ساز و سامان کے ساتھ انجام نہیں دیتے ہیں

اور جو کام ایک بار میں ہو سکتا ہے اس کو کئی قسطوں میں کرتے ہیں۔ مثلاً قہوہ خانہ میں ناشتہ کئی بار کر کے لاتے ہیں۔ حالانکہ انگلینڈ میں تمام چیزیں ایک ساتھ لائی جاتی ہیں۔ اور کچھ زائد کھانے کا سامان بلاطلب بھی رکھ دیتے ہیں تاکہ اگر خریدار کو ضرورت پڑے تو لانے میں تاخیر نہ ہو۔ مگر فرانس کے لوگ اس معاملے میں بدسلیقہ ہیں۔ پیرس میں میری حجامت بنانے کے لئے جو نائی آتا تھا۔ وہ تانبے کا ایک بھاری طباق ساتھ لاتا جس میں صابن گھول کر رکھتا تھا اور گھوڑے کی توبڑہ کی طرح کا ایک تھیلا اس کے ساتھ ہوتا تھا جس میں حجامت کا سامان ہوتا تھا۔ ڈاڑھی بناتے وقت وہ طباق گلے کے نیچے رکھ دیتا اور صابن اس طرح ملتا کہ میرا گلا سینہ، ناک سب صابن سے آلودہ ہو جاتے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ تو کبھی انگلینڈ گیا ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں! میں نے کہا وہاں کے حجام صرف لکڑی کا ایک بکس رکھتے ہیں جس میں صابن، برش اور دو استرے ہوتے ہیں۔ وہ برش سے صابن لگا کر سینکڑوں آدمیوں کی حجامت بنا دیتے ہیں۔ مگر نہ ان کا کوئی عضو آلودہ ہوتا ہے نہ بنوانے والے کا اس نے کہا میرے پاس بھی یہ چیزیں موجود ہیں مگر فرانس میں لوگ اس کو پسند نہیں کرتے ہیں اور مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ اس رواج کو بدل سکوں۔

ایک دوسرا واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مرسیل میں جس کمرہ کے اندر میرا قیام تھا اس سے ملحق ایک نانبائی کی دوکان تھی۔ ہر روز ایک مقررہ وقت پر شہر کے معززین میں سے پچیس تیس مرد اور عورتیں وہاں کھانا کھانے آتے۔ اس وقت ہوٹل کے ملازمین محض اپنی کاہلی کی وجہ سے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بغیر روک لگائے آتے جاتے تھے۔ اور وہ دروازے بار بار ہوا کی حرکت سے کھٹاک کھٹاک بولتے۔ ان کی آواز سے میرا کمرے میں بیٹھنا دشوار ہو جاتا۔ کئی بار ملازمین کو منع کیا، دھمکایا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ایک دن تنگ آ کر اس کھانے والے کمرے میں گیا اور سب کو مخاطب کر کے میں نے کہا! بھائیو تم لوگ اس کرخت آواز سے کیوں متاثر نہیں ہوتے ہو، اگر تم لوگوں کو احساس ہے تو پھر روک تھام کیوں نہیں کرتے۔ بعض کو میری بات پر تعجب ہوا بعض نے اس کو میری نزاکت پر محمول کیا جن لوگوں نے کہا ہم کو بھی تکلیف ہوتی ہے مگر ہم کیا کریں۔ میں نے کہا نوکروں کو منع کیوں نہیں کرتے ہو، دروازے میں آڑ لگا کوئی لگا دیں تاکہ ہوا سے ٹکرا کر آواز نہ پیدا ہو۔ اس کے بعد انہوں نے ایسا ہی کیا اس طرح مجھ کو اس تکلیف دہ آواز سے چھٹکارا ملا۔

پیرس کے دوستوں کا ذکر

پیرس کے دوران قیام میں جن لوگوں سے ملاقات کا اتفاق ہوا اور بعض سے دوستانہ تعلقات قایم ہوئے ان کا ذکر ضروری ہے۔

پہلے سر ایلجا ایمپی Elija Impey ہے جو کلکتہ میں چیف جج تھا۔ اور راجہ نند کمار اسی کے حکم سے قتل کیا گیا تھا۔ موصوف سے میرا تعارف لندن میں ہو چکا تھا۔ لیڈی ایمپی اور مس ایمپی سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے ان دونوں کے حسن و جمال کی تعریف میں ایک غزل بھی لکھی۔ یہ پیرس میں اس لئے قیام پذیر ہیں کہ انقلاب فرانس کے زمانہ میں ان کا جو مال اور دولت ضایع ہو گئی تھی اس کو حاصل کریں۔ انہوں نے مجھ کو دو بار کھانے پر مدعو کیا۔ اور بہت خاطر مدارات کی۔

دوسرے مسٹر مری Mr. Merry جو حکومت انگلستان کی طرف سے پیرس میں وکیل ہیں۔ مجھے لارڈ پلہم Lord Pelham نے ان کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا تھا میں ان سے ملا، انہوں نے پاسپورٹ حاصل کر کے مجھ کو دے دیا۔ مگر ظاہری تو اضع اور خوشامد کی باتیں خوب کیں لیکن اپنی سنگ دلی کے باعث نہ تو میرا حال پوچھا نہ میری مشکلات دور کرنے میں کوئی مدد کی۔ جبکہ پیرس میں مجھے رہائش اور خوراک دونوں میں تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ میرے ساتھ جو معمولی ظاہری سلوک کیا وہ محض لارڈ پلہم کے خط کی وجہ سے۔ ان کا حال دیکھ کر مازندرانیوں کا وہ مشہور واقعہ یاد آیا کہ مازندران کے لوگ بہت کاہل اور آرام طلب ہوتے ہیں وہ لوگ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد نہیں جاتے تھے، محتسب نے ان کی گرفت کی تو انہوں نے اپنی غریبی کا بہانہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ نان شبینہ کے محتاج ہیں۔ اگر اپنا کام چھوڑ کر مسجد جائیں تو ہمارے بچے رات کے کھانے سے محروم رہیں گے۔ یہ خبر وہاں کے بادشاہ سلطان قابوس بن وشمگیر تک پہونچائی گئی۔ وہ بہت رحم دل اور منصف مزاج تھا اس خبر کو سنکر اس کو افسوس ہوا کہ یہ گروہ غربت کی وجہ سے جمعہ کی نماز سے محروم رہتا ہے اس نے حکم دیا کہ جمعہ کے دن خزانہ سے ان کو کچھ رقم دی جایا کرے۔ اس کے بعد مازندرانی جمعہ کی نماز میں شرکت کرنے لگے۔ مگر نماز کے لئے وضو نہیں کرتے تھے، محتسب نے ان کو دوبارہ اس حرکت پر ٹوکا اور کہا کہ نماز کے لئے وضو کیوں نہیں کرتے ہو، ان لوگوں نے

جواب دیا کہ بادشاہ نے جو رقم مقرر کی ہے وہ نماز کے لئے ہے۔ وضو کے لئے نہیں ہے اگر بادشاہ وضو کے لئے بھی وظیفہ مقرر کر دے تو ہم وضو بھی کیا کریں گے۔

مسٹر مری نے جو مدد کی وہ یہ تھی کہ اس نے مجھے جرمن اور ہنگری کے راستے سفر کرنے سے ڈرایا اور مرسیلز کے راستے سے سفر کا انتظام کرایا۔ جس کی وجہ سے اکیس دن کا راستہ چار ماہ سات دن میں طے ہوا۔ جبکہ کرنل ہاکرٹ لندن سے قسطنطنیہ صرف اکیس دن میں پہنچ گئے تھے۔ میں نے جس راہ سے سفر کیا اس میں قسطنطنیہ تک سات جگہ کشتی تبدیل کرنا پڑی اور بعض مقامات پر دو دو ہفتہ کشتی کا انتظار کرنا پڑا۔

تیسرے مسٹر اکلوی جن کے ساتھ میں اکثر دن کا کھانا کھاتا تھا اور مس اکلوی کی شیریں زبانی سے لطف اندوز ہوا۔ انہوں نے میری مدد بھی کی میرے پوشیزہ pa ucla jabu cla کا انتظام کر دیا جو ایک خاص قسم کی گاڑی ہوتی ہے۔ اس پر سوار کرانے کے لئے خود ساتھ آئے۔

چوتھے کرنل ولی جن کا حال ڈبلن کے حالات میں گزر چکا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ چار سال بعد پیرس میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو فارسی زبان صحیح طور پر بول سکتا تھا۔ میرے آنے کی خبر سن کر ملنے آیا۔ اور اس نے میری دعوت کی۔ وہ عثمانی ترکوں کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ نام فرنکلن تھا۔ مذہب عیسوی کا پیرو تھا میں نے اس سے سبب پوچھا تو کہنے لگا میرا نام سید محمد ہے ایران کا باشندہ ہوں اور اب استنبول میں رہتا ہوں۔ میں نے عجم کے اکثر ملکوں کی سیاحت کی ہے۔ گیارہ زبانوں میں گفتگو کر سکتا ہوں۔ جب میں نے قسطنطنیہ پہنچ کر اس کے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ وہ یونان کا باشندہ ہے اور شہر کے غیر ملکی باشندوں کی آبادی میں رہتا ہے۔

پانچویں مسٹر لنگلی Langlay اور ان کے ساتھ مسٹر بیزی Mr. Besacy جو فرانسیسی تھے اور فارسی زبان اور عربی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایک بڑے کتب خانہ کے مالک تھے۔ میرے پیرس کے دوران قیام میں روزانہ ملنے آتے تھے۔ انہوں نے میری چار فارسی غزلوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کرایا۔ یہ لوگ فارسی عبارت تو بڑی مشکل سے سمجھ پاتے ہیں لیکن چونکہ فرانسیسی شاعری میں ماہر ہیں اور عربی نحو و لغت سے واقف ہیں اس لئے انہوں نے میری غزلوں کا ترجمہ انگریز فارسی دانوں سے زیادہ اچھا

کیا. وہ لطیف مطالب تک پہنچ جاتے تھے.

چھٹے جنرل دوبلین Bologna جو دہلی میں مہاراجہ سندھیا کے سپہ سالار رہے تھے. جنرل موصوف نے کئی بار لندن میں اور دو دفعہ پیرس میں دعوت کی.

ساتویں مسٹر گرانڈ جو کلکتہ سے کیپ ٹاؤن تک میرے رفیق سفر رہے.

نپولین کی خواہش ملاقات

ان کے علاوہ نپولین بونا پارٹ نے میرے پاس اپنا ترجمان بھیج کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی مگر وقت کی کمی کے باعث میں ان سے ملاقات نہ کر سکا. اسی طرح فرانس کے وزیر اعظم مسٹر ٹلران tall eyran نے کئی بار قاصد بھیج کر ملاقات کا شوق ظاہر کیا. لیکن میں سفر کی تکالیف کے باعث جو دو دن سے زیادہ ٹھہرنے کی تاب نہ لا سکا اور ان بزرگوں سے معذرت چاہی. یکم ربیع الاول کو جمعرات کے دن لیئن lyons کی طرف روانہ ہوا. پیرس سے لیئن تک کرایہ تین گنی طے پایا. لندن سے پیرس تک جو کرایہ پانچ گنی دے چکا تھا ربیع الاول کی پانچ تاریخ کو لیئن پہونچا. یہ سفر صبح سے رات تک کے تہائی حصہ تک جاری رہا آخر شب وہاں پہونچ کر مسافر خانہ میں قیام کیا. ان پانچ دنوں میں بہت تکلیف اٹھائی کیونکہ راستہ کی خرابی سے قطع نظر اس گاڑی کے اندر فرانس کی ایک عورت اور دو مرد بھی سوار تھے اور باہری حصے میں ایک روسی عورت بیٹھی تھی یہ سب بہت بے رحم اور خود غرض تھے ان لوگوں نے گاڑی میں اچھی جگہیں خود سے لی تھیں اور جب میں نے اپنی خراب جگہ بدلنے کے لئے کہا تو انہوں نے مری بات نہیں مانی. تیسرے دن ایک فرانسیسی عورت نے اپنی قیام گاہ سے تنگ آ کر اس کو تبدیل کرنے کی درخواست کی تو میں نے انکار کر دیا. اس عورت نے زبان دانی کی وجہ سے اچھی جگہ حاصل کر لی تھی. روسی عورت نے کبھی کبھی میری مدد کی. میں نے اشاروں سے اس کو سمجھایا کہ اگر مجھے اچھی جگہ نہ دی گئی تو میں گاڑی کے اندر لیٹوں گا اور کرایہ بھی نہ دوں گا. اس دھمکی کی وجہ سے آخر کار انہوں نے مجھے صاف ستھری جگہ دے دی.

لئنس lvons کا حال

یہ ایک بڑا اور مشہور شہر ہے. اس کے وسط میں ایک دریا بہتا ہے. اس کے دونوں طرف

بندھ بنائے ہیں اور پتھر اور لکڑی کے پل جا بجا بنے ہوئے ہیں۔ ان بندھوں کے دونوں طرف کشادہ راستے ہیں جن پر پتھروں کا فرش ہے۔ اور کنارے کنارے درختوں کی قطاریں ہیں۔ شہر کے دوسری جانب ایک دوسرا دریا ہے جو شہر کے اندر والے دریا سے دوگنا گہرا ہے اور بہت تیز و تند رفتار سے بہتا ہے۔ شہر کے باہر یہ دونوں دریا مل جاتے ہیں۔ اس شہر کے تمام عمارتیں بلند اور پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ عمارتوں کے دروازے بہت شاندار ہیں ملازموں کی قیام گاہ بھی علیحدہ بنی ہوتی ہیں۔

نئے شہر کی اکثر عمارتیں مٹی کی بنی ہوئی ہیں اور نہایت ہی خوبصورت بنائی گئی ہیں اس کے لئے پہلے مٹی کو خوب باریک کرکے نرم گوندھتے ہیں اور لکڑی کا ایک سانچہ دیوار کے ایک رقبے کے برابر اونچا بناتے ہیں اور اس سانچے کے اندر مٹی بھر دیتے ہیں جب مٹی خشک ہو جاتی ہے تو سانچے کے تختوں کو ہٹا دیتے ہیں۔ اسی طرح روزانہ ایک ردہ چڑھاتے ہیں یہاں تک کہ دیوار پوری ہو جاتی ہے۔ اور دیوار کے گوشوں کو کچی اینٹیں لگا کر درست کر لیتے ہیں یہ دیواریں بہت صاف اور سیدھی بن جاتی ہیں اور بالکل اینٹوں کی معلوم ہوتی ہیں۔ عمارت مکمل ہونے پر تختوں کے سوراخوں کو پلاسٹر کے ذریعہ بھر دیتے ہیں۔ یہ دیواریں برسہا برس ٹھیک رہتی ہیں۔ ہندوستان میں مٹی کی دیواریں جلدی بن جاتی ہیں مگر کمزور ہوتی ہیں۔ اس شہر میں رنگائی کا کام بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ میں نے اپنا صافہ رنگوایا جو نہایت عمدہ بینگنی رنگ میں رنگ دیا اور ایک دن میں مل گیا۔ صرف نصف شلنگ اجرت دینا پڑی۔ رنگ اتنا پختہ تھا کہ گرمی کے دو تین ماہ میں بھی رنگ تبدیل نہ ہوا۔ بخلاف اس کے لندن میں رنگائی کی اجرت چار شلنگ دینا پڑی۔ اور ٹھنڈی ہوا کے باوجود چند دن سے زیادہ رنگ قائم نہ رہا۔ اس شہر میں پھلوں کی کثرت ہے۔ اقسام بھی بہت ہیں اور ارزاں ہیں۔ خاص طور پر بیری [illegible] جو لندن کے پھل سے چار گنا بڑا ہوتا ہے اور نہایت لطیف۔ مچھر اور کھٹمل بھی اس شہر سے نظر آنا شروع ہوئے۔

جنرل مارٹن کا مکان

یہ نادر اتفاقات میں سے تھا کہ میری قیام گاہ کے قریب ایک اونچے چوکور چبوترے پر ایک مکان تھا جس میں جنرل مارٹن (ساکن لکھنؤ) پیدا ہوا تھا اور اب بھی اس کا بھانجہ وہاں رہتا ہے

جنرل موصوف نے اس جگہ کے اطراف میں ایک اسکول قایم کرنے کی وصیت کی تھی۔ مارٹن میرا دوست تھا۔ اس کی دوستی ہی مجھے اس جگہ لے گئی تھی۔ چونکہ اس وقت صاحبِ خانہ وہاں موجود نہ تھا۔ میں مکان دیکھ کر واپس آگیا۔ تین دن اس شہر میں بہت خوشی سے گذارے۔

مارسیلیز Marseilles کا سفر بذریعہ کشتی

میں پوشیز نامی گاڑی پر تکلیف دہ سفر کا تجربہ کر چکا تھا۔ اس لیے دریائے لیئنس سے دریائے لاربن میں کشتی کے ذریعہ سفر کیا۔ ایک گنی کرایہ ادا کر کے سات ربیع الاول کو چہارشنبہ کے دن کشتی میں سوار ہوا۔ اس کشتی میں فرانس کے معززین اور اکابرین میں سے پچیس نفر سے زیادہ سوار تھے۔ کشتی کی بناوٹ چھت دار کمروں کی شکل کی تھی۔ لیکن چھت کے نیچے مال کے بنڈل بھرے ہوئے تھے اور لوگ کشتی کی چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دھوپ کی تپش بہت تیز تھی۔ تین دن کے اندر آسمان پر بادل کا نشان بھی نظر نہ آیا۔ بڑے بڑے لوگ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے صندوقوں کے سایہ میں جگہ ڈھونڈتے تھے۔ بعض نے لبادے اور لحاف اپنے اوپر اوڑھ لیے تھے۔ اور سردی اور اوس کی گرمی میں پناہ لے رہے تھے۔ میرے پاس چھتری تھی۔ اس کے باوجود اتنی تکلیف اُٹھائی کہ اب پوشیز گاڑی کا سفر گلزارِ ارم میں سیر کے برابر معلوم ہوا۔ لندن کے قیام میں چہرہ پر جو سفیدی آگئی تھی سب زائل ہوگئی۔ پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے کشتی بہت تیز رفتار سے چل رہی تھی کہ ایک دن میں ستر اسی میل طے کر لیتی تھی۔ دوپہر کے وقت آشخانہ میں اُتر کر دن کا کھانا کھاتا تھا اور رات کو مسافر خانہ میں سوتا تھا۔

فرنگستان کا مشہور پل

دوسرے دن دوپہر کے وقت اس مشہور پل کے نیچے سے گذرا جس کا نام لیپون رسان اسپری [illegible] ہے۔ یہ سارے فرنگستان میں مشہور ہے اور زمانۂ قدیم کی تعمیر ہے۔ اسے قیصرِ روم کے سپہ سالار نے فرانس فتح کرنے کے بعد قیصر کے حکم سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تعمیر کو دو ہزار سال گذر چکے ہیں۔ مگر دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی بنایا گیا ہے۔ اس پل کے دو ستون بہت کشادہ ہیں اور آٹھ ستون چھوٹے ہیں۔ ایک ستون تو اتنا چوڑا ہے کہ اب تک کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دریا کا پاٹ اس مقام پر بہت چوڑا ہے اور بہاؤ لندن کے دریا ... ۔ ۔ دیکھ لندن کے تمام پلوں سے زیادہ شاندار ہے۔ پل کی پشت تمام

پلوں کی طرح محدّب نہیں بلکہ مسطح ہے۔ ان کشتی میں جو غیبی لطائف پیش آئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک جوان مرد آزاد شخص سے ملاقات ہوئی جس کا نام مسٹر بار نواین تھا۔ جو توپخانہ کا کپتان ہے۔ یہ مارسلیز کے گورنر کا بھانجہ ہے۔ کچھ عرصہ تک فرانس میں وزارت کے عہدہ پر بھی رہ چکا ہے۔ انگریزی خوب جانتا ہے۔ عادات و اطوار بہت اچھے ہیں۔ وہ تین دن تک کشتی میں میرا ترجمان بھی رہا۔ کھانے اور سونے کے وقت مجھ کو اچھی جگہ دلا دیتا تھا اور کسی کو مجھ پر غلبہ حاصل کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔

دوسری عجیب چیز عورتوں اور مردوں کی وضع قطع اور طرزِ عمل تھا۔ سب ایک دوسرے کے عاشق نظر آتے تھے لیکن انتہائی حیاداری اور ادب کے ساتھ گزر کر رہے تھے۔ ان تین دنوں میں ایک عاشق و معشوق کا جوڑا ایسا بھی تھا جو سوا ایک دوسرے کے کسی پر نظر نہ رکھتا تھا، دونوں کو بجز اپنے کسی سے مطلب ہی نہ تھا، نہ وہ کسی سے بات چیت کرتے تھے نہ کسی سے کوئی غرض اور مطلب تھا۔ ہمیشہ ایک دوسرے سے مل کر بیٹھتے اور سرگوشی میں گفتگو کرتے تھے۔ ہر دم نئے نئے انداز دکھاتے کبھی دوسروں کی نظریں بچا کر بوسہ بازی بھی کرتے تھے۔

اس کے علاوہ اس شہر کے اندر میرے محسنوں میں مارسلیز کا گورنر بھی تھا جس سے میری شناسائی اسی نوجوان مسٹر بار نواین کی معرفت ہوئی تھی۔ گورنر کا نام مسٹر ونکرفا ہے۔ نہایت بلند قامت خوش اندام اور بزرگ منش شخص ہے۔ اس کا ایک لڑکا، مسٹر ہنری ولکرفا ہے جس کی عمر پندرہ سال ہے۔ نہایت خوبصورت اور خوش اطوار ہے۔ فرانس کے لوگ عموماً خوبصورت ہوتے ہیں مگر اس نوجوان سے زیادہ کوئی خوبصورت جوان نظر نہیں آیا۔ آج کل وہ انگریزی زبان کی تحصیل میں مصروف ہے۔ وہ ہر دن مجھے دیکھنے آتا تھا۔ مجھے باغات اور مشہور مقامات کی سیر کراتے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کی ماں بھی بہت خوش اخلاق ہے مرسیلز کے تمام باشندے ان تینوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں سکوں پر نپولین کی تصویر نئی نئی ڈھالی گئی ہے اس لیے اس کی خوشی میں مارسیلز میں راتوں کو چراغاں ہوتا تھا۔ گورنر جنرل اور تمام روسا گرجا گھر میں جا کر نغمہ و ساز سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کی بڑی تعداد تماشا دیکھنے وہاں جاتی تھی۔ گورنر مذکور نے اس موقع پر دو راتوں کو اپنے گھر پر جشن منایا اور دعوت کی۔ میں دن کا کھانا اسی کے ساتھ کھاتا تھا۔ اور چاشت کے بعد محفل رقص و سرود میں شرکت کرتا تھا اور صبح سورج نکلنے کے وقت تک اس محفل میں رہتا تھا۔ مارسیلز کی تمام ممتاز عورتیں وہاں جمع

ہوتی تھیں ۔جب رقص و سرود کی سے لوگ اکتا جاتے تھے تو رات کے آخری حصے میں دسترخوان بچھتا تھا جس پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے تھے اور طرح طرح کے عمدہ مشروبات ہوتے تھے ۔ تھوڑا تھوڑا کھا پی کر لوگ پھر محفلِ رقص و سرود میں چلے جاتے تھے ۔ لندن سے نکلنے کے بعد مجھے اتنی اچھی محفل میں شریک ہوکر مسرّت حاصل کرنے کا گمان بھی نہ تھا۔ اس شفیق دوست کی عنایت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، مارسیلز کی عورتیں حسن میں پیرس کی عورتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔

مصری خواتین کا حسن اور لباس

وہ مصری عورتیں جو اس شہر میں رہتی ہیں اور بکثرت ہیں ان کا لباس اور وضع قطع بہت پسند آئی۔ ان کی آنکھوں اور قد و قامت میں ایسی دلکشی ہے کہ ان کو دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت کہہ سکتا ہوں ۔ ان مصری عورتوں میں جن سے شناسائی ہوئی ان میں ایک مسز لالا ماآرپی تھیں۔ ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا ۔ یہ بحیثیت طالب علم انگلینڈ سے اس ملک میں آئی تھی ۔ اس نے میرے کاموں میں امکان بھر مدد کی۔ اس کے علاوہ امریکی انگریزوں کی ایک جماعت قابلِ ذکر ہے جس میں ایک شخص مسٹر ٹامس شوبرٹ سے ایک اسٹیمر میں ملاقات ہوگئی تھی۔ اس نے میرا ذکر اپنی جماعت کے لوگوں سے کر دیا تھا۔ اس لیے وہ سب مجھ سے ملنے آئے ۔ دوسرے دن ان لوگوں نے "فرنکلن ہوٹل" میں میری پُر تکلف دعوت کی ۔ یہ ہوٹل امریکہ والوں کے لیے مخصوص ہے ۔ کھانے کے دوران گفتگو میں اس جماعت کے بڑا امیر ترین لوگوں نے مجھ سے امریکہ چلنے کی خواہش ظاہر کی اور بہت زیادہ اصرار کیا ۔ اور سفر کے تمام اخراجات کی کفالت کی پیش کش کی ۔ میں نے معذرت کی، بہت منّت سماجت کے بعد انھوں نے میرا عذر قبول کیا۔ انھوں نے وعدہ لیا کہ جب دوبارہ سفر کا ارادہ کروں تو پہلے امریکہ آؤں ان لوگوں کے نام یہ ہیں ۔ مسٹر ولیم جالی ۔ کپتان جونز ارل، کپتان جان ہنری ۔ مسٹر ٹمل لی ۔ اور مسٹر جونز لی ۔

میں ابھی مارسیلز ہی میں تھا کہ میرا یگانہ دوست مسٹر ہارلو سفر پر روانہ ہوگیا ۔ اس کے بعد میں بھی ۲۵ ربیع الاول کو شنبہ کے دن فرانس کے ایک چھوٹے جہاز پر سوار ہوکر جنیوا روانہ ہوا ۔

اٹلی کا سفر بحر روم میں

اٹلی جانے کے لیے میں نے بحرِ روم میں پہلی بار سفر کیا۔

یہ سب سے بڑا سمندر ہے، جس کا طول دو ہزار چار سو میل اور چوڑائی اکثر مقامات پر ساٹھ میل تک ہے اور جہاں چوڑائی کم ہے، جیسے جبرالٹر کے قریب ۲۰ میل چوڑائی ہے۔ یہاں اس سے دو شاخیں اور نکلی ہیں۔ ایک بحر ونیس سے صندھا جو شمال کی سمت قدیم روم اور جرمنی کے درمیان واقع ہے۔ اور دوسرا بحر یونان جو شمال کی جانب یونان کی طرف چلا گیا ہے۔ اور بحر روم کی ایک چھوٹی شاخ قسطنطنیہ تک گئی ہے۔ جو بحر اسود سے مل گئی ہے اور اس کو بحر روم سے ملاتی ہے۔ اور خود بحر روم مغربی بحر اوقیانوس سے شاخ کی صورت مل کر مشرق کی طرف جاتا ہے۔ اور حلب اور شام کی سرحدوں کے نزدیک ختم ہو جاتا ہے۔ جنوب کی جانب شہر تیونس EEZ واقع ہے جو افریقہ میں شامل ہے یہ سمندر ممالک فرنگ سے ہو کر پرتگال۔ استنبول فرانس۔ جرمنی۔ گریک، ترکی اور ممالک روم میں مشترک ہے۔ لیکن اس میں داخلہ اور خارجہ کے تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں۔ یہاں ان کے جنگی جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔ مخالفین کے جہاز ان سے چھپ کر وہاں سے نہیں نکل سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ چار دن اس بدصورت اور گندے جہاز پر گذرے۔ پانچویں دن یعنی ۹ ربیع الاول کو جمعرات کے دن جینوا پہنچ گیا۔ اس دوران میں کھانے پینے کی بہت تکلیف رہی کیونکہ میرے پاس کھانے کا جو سامان تھا وہ لوگوں نے چرا لیا تھا۔ دوسرے دن تھوڑا سا گوشت اور روٹی دے دی تھی تیسرے دن معذرت کر لی۔ جینوا تک ہماری خوراک کلچہ، سرکا اور پیاز تھی جو نہایت بدبودار تھی۔ اس کے باوجود اس کی قیمت تین شلنگ یومیہ وصول کی گئی۔

طاعون سے حفاظت

یہ جاننا ضروری ہے کہ شہر جینوا اور روم کے تمام ممالک میں یہ طریقہ رائج ہے کہ مسافروں کو بغیر صحت کا سارٹیفیکٹ دکھائے شہر کے اندر نہیں جانے دیا جاتا ہے۔ اگر کسی کے پاس سارٹیفکٹ نہیں ہے تو اس کو طاعون کی بیماری کے خوف سے شہر کے باہر ایک خاص مکان میں چالیس دن تک روکا جاتا ہے۔ یہ مکان اسی واسطے تعمیر کیا گیا ہے اگر کسی نے اس حکم کی پابندی نہ کی اور شہر میں داخل ہو گیا تو اس کو گولی مار دی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جب ہم وہاں پہنچے تو ایک معزز شخص صحت کا سارٹیفکیٹ دیکھنے آیا۔ اتفاق سے وہ خود بہت دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کا رنگ بھی زرد تھا۔ جہاز کے مسافر تندرست اور توانا تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا اور بغیر سارٹیفکیٹ دیکھے سب کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد میں دونوں امریکی دوستوں کے ساتھ شہر کے اندر گیا اور بڑلٹن ہوٹل میں قیام کیا۔

شہر جنیوا کا حال جنیوا نہایت صاف ستھرا شہر ہے۔ مکانات بہت خوبصورت اور فرحت افزا ہیں۔ شہر کے گرد ایک مضبوط قلعہ بنا ہوا ہے۔ جو جہاز ندلا اور زبردست فوجوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ تمام عمارتیں پتھر کی ہیں اور بہت بلند ہیں۔ گلیاں کشادہ ہیں مگر بعض مقامات پر بہت تنگ ہیں اور اس قدر زیادہ تنگ ہیں کہ دن میں وہاں دھوپ کا اثر بہت کم پہونچتا ہے۔ بہت ہموار ہیں۔ مٹی کیچڑ کا ان میں کوئی اثر نہیں ہے چلنے والا اندھیرے میں بھی بے فکر ہوکر تیزی سے چل سکتا ہے۔ یہاں کی عمارتوں میں سنہرا کام اتنا زیادہ ہوا ہے کہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ صفائی اور ستھرائی میری طبیعت کے موافق تھی۔ عمارتوں کے باہری حصے عموماً سادہ رنگ کے ہیں۔ لیکن بعض عمارتوں کا باہری حصہ سبز و سرخ منقش پتھروں سے بنا ہوا ہے جو دیکھنے میں بہت دلکش ہے۔ اور اپنی اس نوعیت کے باعث ساری دنیا پر فوقیت رکھتا ہے۔

رومیوں کی موسیقی اور ساز اس شہر میں ایسے باجے بھی نظر آتے جو اس سے قبل میں نے کہیں اور نہیں دیکھے تھے۔ یہاں کے لوگ کھانے کے وقت گھر آکر تھوڑی دیر باجے بجاتے ہیں۔ ایک رات جب میں بستر میں لیٹا ہوا تھا آدھی رات کے وقت باجے کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ اس کی آواز کا دل پر اتنا اثر ہوا کہ بستر سے اٹھ کر فوراً نیچے جانے کا ارادہ کیا۔ مگر دروازہ بند تھا۔ اس لیے اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ مگر آواز سن کر دیوانگی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دل چاہا کہ کھڑکی سے نیچے کود جاؤں۔ مگر اس دوران گانے بجانے والے چلے جا چکے تھے۔

میں نے لندن میں سنا تھا کہ روم میں علم موسیقی تمام دنیا سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ بلکہ رومیوں میں یہی ایک علم باقی رہ گیا ہے۔ اس بات کی سچائی یہاں آکر ظاہر ہوگئی۔ بلکہ یہاں کی موسیقی کا بھرم کھل گیا اور جو کچھ ہندوستان، ایران اور انگلستان کے باہر میں نے سنا تھا۔ اس کے مقابلے میں یہ رومی موسیقی چکی کی آواز کی طرح دردِ سر پیدا کرنے والی ہے۔ ایک نیا طریقہ جو میں نے اس جگہ دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ فاحشہ عورتیں پکڑ دھکڑ کے خوف سے راستوں سے نہیں گذرتی ہیں اور اپنے ٹھکانے کو کبھی نہیں چھوڑتی ہیں۔

دلالی اور فحشہ پروروں کی رسم جنیوا میں جوان لڑکے دلالی کا پیشہ کرتے ہیں۔ رات کے وقت گلی کوچوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ بڑی خوشامدیں کرکے لوگوں کو فاحشہ عورتوں کے مکانوں میں لے

جاتے ہیں۔ اگر تماشا بین ایک کو پسند نہیں کرتا تو دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ وہ شخص ان کے ساتھ اونچی منزلوں والے مکانات میں زینہ کے راستے سے جاتے ہیں۔ میں بھی کئی بار امریکی دوستوں کے ساتھ اس جگہ گیا۔ مگر میں نے کسی کی صورت پسند نہ کی۔ ان کی صحبت اور گرمی کی شدت کے باعث وہاں ٹھہر بھی نہ سکا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ تمام ممالکِ روم میں شرفا کی عورتیں شہروں اور دیہاتوں میں کھلم کھلا دو شوہر کرتی ہیں اور دوسرے شوہر کو تفریحِ طبع اور وقت گزاری کے لیے مخصوص کرتی ہیں۔ اس کے دن رات دونوں شوہروں کے درمیان تقسیم ہوتے ہیں۔ اگر پہلا اصل شوہر عورت کے ساتھ مشغول ہے اور دوسرے کے آنے کا وقت ہو جائے اور وہ آ کر دروازہ کھٹکھٹائے تو اس وقت پہلا شوہر باہر چلا جاتا ہے اور عورت کو دوسرے شوہر کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔ اولاد سب اصل شوہر کی ہوتی ہے۔ وہی ان کی کفالت کرتا ہے اور دوسرا شوہر بیوی کی فرمائشات اور ہوس رانی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور اکثر یہ شوہر نا کتخدا ہوتا ہے اور آغازِ شباب میں ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معمر کتخدا آدمی بھی دوسری عورت کو جو اپنے شوہر کے گھر ہوتی ہے وقت گذاری کے لیے رکھ لیتا ہے۔ جنیوا کے خربوزے، سردہ، گرما، شفتالو، زردآلو اور امرود ممالکِ فرنگ کے میووں سے بہتر اور بہت ارزاں ہیں۔

جینوا کے دوست

دوسرے دن مسٹر سمدریٹ کا خط لے کر مسٹر واکن سے ملاقات کی جو اس شہر میں امریکہ کا قنصل CONSUL ہے اور بہت بڑا تاجر بھی ہے۔ وہ بھی اپنے دوست کی طرح بہت خوش اخلاق اور عالی ہمت جوان ہے۔ تھوڑے عرصہ میں دو بار ملنے کے لیے آیا اور دو بار کھانے پر بلایا۔ اور طرح طرح کے کھانے کھلائے۔ اسی کے ساتھ نہایت مستعدی سے ایک تجارتی انگریزی جہاز پر دو گنی کرایہ ادا کر کے میرے لیگہارن LEGLARN جانے کا انتظام کر دیا اور سوار بھی کرا دیا۔ اور یہ وعدہ لے لیا کہ لیگہارن سے فلارنس جاؤں اور وہاں سے روم کے قدیم دار السلطنت نیپلس کی سیر کروں۔ اور وہاں سے مالٹا جاؤں۔ اور اس بات کے لیے بہت خوشامد کی کہ ان ممالک کی سیر و سیاحت کے بغیر اپنے ملک واپس نہ جاؤں۔ کیونکہ یہ سب قابلِ دید مقامات ہیں۔ اور سفارش کے طور پر ہر مقام کے لیے اپنے اعزا کو خطوط لکھ کر عنایت کیے لیکن لیگہارن پہنچنے کے بعد لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس موسم میں ان شہروں میں

خشکی کے راستے سے سفر کرنا ہلاکت کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر مجھے تامل ہوا چنانچہ میں لیگھارن سے مالٹا MALTA چلا گیا جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا۔

۴ ماہ ربیع الثانی کو دو امریکی دوستوں میں سے ایک کے ساتھ بحر روم میں جہاز پر سوار ہوا۔ جہاز کا کپتان مسٹر اسٹن تھا جو ایک خوش اخلاق اور با مروت آدمی ہے۔ اس نے اپنا کمرہ اور بستر مجھ کو دے دیا۔ اور دن میں دو تین بار عمدہ غذا کا انتظام بھی کر دیتا تھا۔ ماہ ربیع الثانی کے پہلے چار شنبہ کو لیگھارن پہنچا اور صحت کا سرٹیفکٹ دکھانے کے بعد اجازت ملنے پر مسٹر جاآئی کے ساتھ ایک ہوٹل میں قیام کیا جس کا نام کینی ہوٹل ہے۔

لیگھارن کا حال

یہ ایک تجارتی مقام ہے اور شہور بندرگاہ ہے۔ جہاں روم عرب اور فرنگستان کے مختلف ممالک کے لوگ جمع ہوتے ہیں لیکن جو شہر کا حصہ شہر پناہ کے اندر ہے بہت چھوٹا ہے۔ اگر آپ وسط میں کھڑے ہوں تو شہر میں آنے جانے کے چاروں دروازے وہاں سے نظر آتے ہیں۔ یہ دروازے شام کے وقت بند ہو جاتے ہیں۔ چہار دیواری بہت مستحکم ہے۔ تمام عمارتیں بلند ہیں اور پتھر کی بنی ہوئی ہیں لیکن ان کی بناوٹ اچھی نہیں ہے۔ اس کے اندر مچھر کھٹمل اور مکھیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ ہوا گرم اور پانی بدمزہ ہے۔ نلوں کے سوراخ بہت تنگ اور بدشکل ہیں۔ رات دن نلوں پر خلقت کا اژدہام رہتا ہے۔ کیونکہ پانی تھوڑا تھوڑا آتا ہے۔ بعض اوقات پانی کے لیے آپس میں لڑائیاں بھی ہونے لگتی ہیں۔

چونکہ گھر کے اندر ٹھنڈا پانی میسر نہیں ہوتا۔ اور گرم ہوا کی وجہ سے بھی میں کئی بار نلوں کے پاس گیا۔ مگر تازہ پانی نصیب نہ ہوا۔ ابھی ایک پہر دن باقی تھا کہ گھر میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور میں باہر نکل گیا۔ کبھی دیواروں کے سائے میں اور کبھی قہوہ خانوں میں جا کر وقت گزارا اور رات کی تاریکی میں ایک کشادہ گرجا گھر کے احاطہ میں جا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ یہ گرجا گھر وسط شہر میں واقع ہے۔ ایک پہر رات تک وہاں بیٹھ کر کاٹتا تھا۔ اور اس شہر اور اس کے رہنے والوں پر لعنت بھیجتا تھا۔ یہ لوگ مالدار ہونے کے باوجود اتنے کینہ صفت اور دغاباز ہیں کہ بوڑھا آدمی بھی ایک ایک پیسہ کے لیے دغابازی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک رات کو میں عادت کے مطابق اسی گرجا گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ پیچھے سے ایک شخص آیا اور میرے سر سے ململ کا پرانا صافہ اتار لیا اور بھاگنے کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے صافہ کا ایک سرا میرے ہاتھ میں پڑ گیا۔ میں اس کو پکڑنے کے لیے اٹھا تو اس نے دونوں ہاتھوں

سے صافہ کے دو تین ٹکڑے کر ڈالے اور بھاگ گیا۔ حالانکہ اس شہر میں اس صافہ کی قیمت دو تین پیسہ سے زیادہ نہ تھی۔ جب میں نے یہ ماجرا اپنے انگریز دوستوں کو بتایا تو اُنھوں نے گرجا گھر میں تنہا بیٹھنے سے منع کیا اور رات کے وقت بالکل باہر نہ نکلنے کی تاکید کی۔

رومیوں کی فریب کاری اور یہودیوں اور ایرانیوں کا حال

مذکورہ شہر کے علاوہ روم قدیم کے تمام شہروں میں مسافروں کو مذہبی تعصب کی بنا پر دھوکہ دے کر قتل کر دیتے ہیں۔ رات کے وقت راہ چلتے چھری یا چاقو مار دیتے ہیں۔ آپس میں بھی اسی طرح کی حرکتیں کرتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں۔

اس شہر کی خاص چیزوں میں تربوز اچھا ہوتا ہے۔ بے حد میٹھا اس کے بیج زرد ہوتے ہیں میں نے بہت عرصہ ہوا اس کا ذکر سنا تھا۔ اور یہاں گرمی کی شدت تھی اس لیے تربوز خوب کھائے الہ آباد اور یورپ کے تربوز ان کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے ہیں۔

لیگھارن کے اکثر تاجر اور معتبر لوگ یہودی یا ارمنی ہیں۔ نہایت بد اخلاق اور کمینہ صفت میرا ایک انگریز دوست جو میرا دل بہلانے میں بہت دلچسپی لیتا تھا مجھ کو ایک ارمنی کے گھر لے گیا تاکہ مجھ کو اس سے متعارف کرائے۔ اور زبان دانی کی وجہ سے میری مدد کرے۔ جب ہم اس کے گھر پہونچے تو وہ کمرے کے اندر کھانا کھانے میں مصروف تھا بےچین ہو کر اس نے اپنے لڑکے کو جلدی سے باہر بھیجا۔ اس نے آکر کہا کہ باپ بیمار ہے اور فارسی زبان بھی بھول گیا ہے۔ اور میں خود اس ملک میں پیدا ہوا ہوں اس لیے فارسی بالکل نہیں جانتا۔

ایک اور ارمنی کو دیکھا جس کا نام خواجہ رفائیل تھا۔ اگرچہ اس نے فارسی جاننے سے انکار نہیں کیا اور میرے گھر بھی آیا اور ہر روز قہوہ خانہ میں بیٹھ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی کسی کام میں میری مدد نہیں کی۔ بلکہ کسی کام میں مشورہ لیتے وقت وہ مشکلات کا اظہار کرتا تھا۔ رفائیل بہت معمر شخص ہے۔ بہت جہاندیدہ اور کئی زبانیں جانتا ہے۔ کیونکہ وہ صورت کی بندرگاہ پر گیا اور وہاں سے دکن کی راہ لی اور بنگال بھی گیا اور وہاں سے انگلینڈ روس اور دیگر ممالک میں عرصہ تک رہا۔ اور اب لیگھارن میں موت کا انتظار کر رہا ہے۔

لیگھارن کے دوستوں کا ذکر لیگھارن پہنچنے کے دوسرے دن مسٹر ڈنمن کا خط لے کر مسٹر گرانٹ سے ملاقات کی جو یہاں انگلستان کے قنصل ہیں۔ اُنھوں نے وعدہ کیا کہ کپتان منوار کا

شاہی جہاز جو مالٹا سے یہاں آنے والا ہے۔ اس میں تم کو جگہ دلادوں گا۔ اس نے دوسرے دن میری پر تکلف دعوت کی۔ دستر خوان پر معززین شہر کی ایک جماعت موجود تھی۔ تین گھنٹہ تک محفل گرم رہی اور نہایت لطف سے وقت گزرا۔

اس شہر میں میرے دوسرے ہمدرد اور محسن مسٹر ڈربی DERBY ہیں۔ یہ تاجر ہیں اور مدّت ہوئی انگلینڈ کی سکونت ترک کر کے یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ نہایت خوش اخلاق اور مسافر نواز ہیں۔ میرے معاملات میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔ تفریح کے لیے مجھے اپنے باغ میں لے گئے جو لیگہارن سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے اور بہت تواضع کی۔ انھوں نے وہاں کے لوگوں کی مکاریوں اور دوسری خرابیوں کو اپنی پُر لطف باتوں کے ذریعہ میرے دل سے دور کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن میں نے دورانِ گفتگو میں بہت سخت باتیں کیں۔ اس نے تحمل اور بردباری سے کام لینے کا مشورہ دیا۔

آخر کار سولہ دن کے بعد مسٹر گرانٹ نے شاہی جہاز وکٹوریز VICTRIEUSE کے آنے کے بعد مجھ کو خبر نہ دی اور نہ میرے لیے کپتان سے کوئی بات کی۔ بلکہ اس کے بدلے میں ایک دوسرے انگریزی سرکار کے جہاز پر میرے سفر کا انتظام کیا۔ یہ جہاز بھی کپتان منوآر مذکور کے ماتحت تھا اور مالٹا جا رہا تھا۔ جب میں سفر کے ارادے سے مکان چھوڑ کر کرایہ کی کشتی میں جہاز تک پہنچا تو جہاز کا کپتان جو مسٹر گرانٹ کے سامنے مجھے لے جانے کی ذمہ داری لے چکا تھا۔ اپنے وعدہ سے مکر گیا اور کہنے لگا کہ رچرڈ ساکن مکان نمبر ۳۲ برترس اسٹریٹ لندن کی اجازت کے بغیر مجھے نہیں لے جا سکتا ہے۔ اور لے جانے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے جہاز مذکورہ پر جا کر پھر واپس آگیا اور یہ ظاہر کیا کہ کپتان رچرڈسن نے اس کو منع کیا اور اپنی طرف سے نصیحت بھی کی۔

کپتان رچرڈسن

میں خود جہاز پر گیا تاکہ اس سے گفتگو کروں۔ شاید مان جائے۔ میں نے کپتان رچرڈسن سے اجازت کی درخواست کی۔ اس نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ممکن ہے دوسرے کسی جہاز سے اس جہاز کا سامنا ہو جائے اور وہ اس کو لندن جانے کا حکم دے دے۔ اس صورت میں تم کو بھی مجبوراً لندن واپس جانا پڑے گا یہ سن کر میں نے کہا کہ وکٹوریز یقیناً مالٹا جائے گا۔ اگر آپ کے لیے کوئی زحمت نہ ہو تو مجھے اس جہاز میں سوار ہونے کی اجازت دے دیجیے۔ اس نے میری پریشانی کو دیکھ کر ترس کھایا اور از راہ مہربانی میری بات مان لی اور کہا کہ صندوق اس جہاز سے وکٹوریز میں لے آؤ اور میرے ساتھ دن کا

کھانا کھاؤ جو تیار موجود ہے۔ جب تک میں شہر سے واپس آجاؤں گا۔

جب میں صندوق لینے کے لیے اس جہاز پر گیا تو اس جہاز کے کپتان نے رچرڈسن کی بداخلاقی اور دغا بازی کی باتیں بتائیں جو دراصل غلط تھیں۔ مگر میں گھبرا گیا اور اپنا صندوق لے کر شہر واپس آگیا۔ اور سفر سے ناامید ہو گیا۔ اور لیگہارن کے لوگوں کی مکاری پر افسوس کرنے لگا لیکن جب کپتان رچرڈسن اپنے جہاز پر واپس آیا اور اس نے میرے شہر واپس جانے کا حال سنا تو بہت متاثر ہوا اور اسی وقت شہر میں واپس آیا۔ مسٹر ڈربی کو لے کر میری قیام گاہ پر پہنچا اور مجھ کو سامان سمیت اپنے جہاز پر لے گیا۔ چند دن بعد جب اس کو میرے حالات کا علم ہوا۔ اور انگریزوں سے میرے گہرے تعلقات اور دوستی کا حال معلوم ہوا۔ اور میرے نام یا میرے متعلق بادشاہ کے خطوط دیکھے تو پھر اس نے مجھ سے دوستی بڑھائی اور ہر طرح سے غم خواری کرنے لگا۔ اور بالکل بھائیوں جیسا سلوک کیا جس کا حال آئندہ معلوم ہوگا۔ اس نے میری خواہش سے زیادہ میری مدد کی اور کبھی میری حالت سے غفلت نہیں برتی۔

الغرض یکم ربیع الثانی ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء جمعہ کے دن لیگہارن سے مالٹا کے لیے روانہ ہوا۔ یہ سفر بھی بحرِ روم میں تھا۔ راستہ میں جزیرہ کرسیکا بھی پڑا جو نیپولین کی جائے پیدائش ہے۔ اس کے بعد جزیرہ سردینا SARDINA ملا جو بہت بڑا جزیرہ ہے۔ اس پر ایک بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ اس کے آگے بحر روم کا سب سے بڑا جزیرہ سسلی SICILY ملا۔ یہ نیپلس کے بادشاہ کے زیر اقتدار ہے۔ یہ جزیرہ مالٹا کے لوگوں کے لیے معاش کا بڑا مرکز ہے۔ وہاں سے گزر کر یکم جمادی الاول کو مالٹا پہنچ گیا۔

جزیرہ مالٹا

مالٹا ایک بڑا جزیرہ ہے۔ بہت سے مشہور فلاسفر اس سرزمین سے پیدا ہوئے۔ ان میں ممتاز فلسفی طالیس بھی تھا۔ اس کے محاصل کم ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد وہاں کے بادشاہ گرانڈ ماسٹر کہلاتے ہیں اور ان کی حیثیت حضرت عیسیٰ کے خلیفہ کی مانی جاتی ہے۔ اور وہ پوپ POPE سے اتحاد رکھتا ہے اس لیے ہر فرنگی ملک سے اس کو امداد ملتی ہے۔ اوقاف اور جاگیریں ملی ہوئی ہیں، جن کی آمدنی بہت ہے۔ گرانڈ ماسٹر اپنی آمدنی مالٹا کے گرد حصار بنانے میں صرف کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک طویل مدت میں ایسا حصار بن گیا جو اونچائی اور مضبوطی میں آسمانوں کے حصاروں پر طعنہ زنی کرتا ہے۔ بعض کو تعمیر ہوئے ہزار سال ہو چکے ہیں۔ مگر دیکھنے میں نئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور خیال ہے کہ ہزاروں سال تک ایسے ہی رہیں گے۔

مالٹا کا قلعہ اتنا مستحکم ہے کہ ساری دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملے گی۔ اس کو مضبوط بنانے میں جو صناعی مہارت صرف کی گئی ہے اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ بغیر دیکھے اس کی خوبیوں کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مختصر طور پر یہ بتانا مناسب ہے کہ انگریز جو قلعہ فتح کرنے کا سامان مہیا ہو جانے کے بعد سے کسی قلعہ کو ناقابلِ تسخیر نہیں سمجھتے ہیں وہ بھی مالٹا کے قلعہ کو فتح کرنے سے عاجزی ظاہر کرتے ہیں اور بغیر وافر غلہ فراہم کیے ہوئے اس کو فتح کرنا محال خیال کرتے ہیں۔ اس جزیرے کے اندر سمندر کی کئی شاخیں اور نشیب ہیں۔ بعض شاخوں میں پہاڑی چٹانیں نکلی ہوئی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک پر کلکتہ کے قلعہ کے برابر قلعہ بنا دیا گیا ہے اس طرح کے قلعہ شہر پناہ کے اندر تیس سے زیادہ ہیں۔ ان کی دیواریں پچاس ساٹھ گز سے کم چوڑی نہیں ہیں۔ اس طرح مالٹا کے ہر شہر میں ایک قلعہ ہے جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر برج بنائے گئے ہیں۔ جو دیکھنے میں پہاڑ کی طرح پرشکوہ نظر آتے ہیں۔ شہر پناہ کی دیوار کا قطر دس میل ہوگا۔ دیکھنے والے اس کا نظارہ حیرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اتنے مضبوط قلعہ کو نپولین نے اس وقت فتح کرلیا تھا جب وہ فرانس سے مصر جا رہا تھا۔ راستہ میں اپنی سپہ سالارانہ تدبیروں اور بڑی رقم کے خرچ سے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔ اور تھوڑی فوج انتظام کے لیے وہاں چھوڑ دی تھی۔ اور خود مصر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد جب لارڈ نلسن نے فتح حاصل کی اور فرانس کے جہازوں کو گرفتار کیا اور جلا دیا۔ تو فرانس کی جہازی قوت بحرِ روم میں ختم ہوگئی۔ اس وقت فرانس والے مالٹا میں اپنی قوم کی مدد کرنے سے مجبور ہوگئے۔ تب انگریزوں نے اپنے جنگی جہازوں کو مالٹا کے قلعہ کے سامنے کھڑا کردیا۔ اور سسلی سے ملنے والے غذائی ذخیرے اور دوسری امداد روک دی فرانسیسی اس قلعہ میں دو سال سے مالٹا والوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور کھانے کا ذخیرہ ان تک نہیں پہنچتا تھا۔ اب نو ماہ کے محاصرہ کے بعد ان کا غلہ ختم ہوگیا تو انھوں نے قلعہ انگریزوں کے حوالے کردیا جو توپوں اور دوسرے جنگی سامان سے بھرا ہوا تھا اور خود اپنے ملک واپس چلے گئے اس بات پر صلح ہوگئی کہ مالٹا والوں کی حکومت مالٹا والوں کے سپرد کردی جائے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تک انگریزوں کی پانچ چھ ہزار فوج مالٹا میں موجود ہے۔

مالٹا کے انگریز

مالٹا کے انگریزوں میں قابلِ ذکر سر الگزنڈر بال گورنر مالٹا ہے جو نہایت خوش اخلاق اور نیک دل آدمی ہے۔ اس کے حسنِ سلوک سے لوگ بہت سے لوگ بہت متاثر ہیں اور سب اس کے بہی خواہ ہیں۔

دوسرے جنرل آکنزا ہے جو فوج کا سپہ سالار ہے۔ ہر بات میں گورنر کا پیرو ہے تیسرے

سر رچرڈ بگرٹن۔ یہ بحری فوج کا اڈمرل ہے۔ اس کے ماتحت سولہ بحری جنگی جہاز تھا۔ جو بحر روم کے دہانے سے حاب تک سارے بحر روم میں گشت کرتے ہیں اور ساحلی ملکوں پر نگرانی کرتے ہیں۔ چوتھے مسٹر ہسکالی، جو ایک متر شخص ہے۔ اور بہت تجربہ کار۔ دس برس ہندوستان میں رہا ہے یہاں گورنر کی ماتحتی میں کام کرتا ہے۔ پانچویں مسٹر ولکی ایک فلسفیانہ طبیعت کا آدمی ہے۔ اور جہازوں کی مرمت اور ان کے سامان کی تیاری کا کام کرتا ہے۔ مختلف قسم کے کام کرنے والوں کی یکجائی اور دوستی سے ایسی صاف ستھری صحبت سوائے ٹاؤن کے اور کہیں نظر آئی۔ مالٹا پہنچنے کے بعد کپتان رچرڈسن نے خشکی میں اتر کر پہلے میرا تعارف گورنر سے کرایا۔ اس کے بعد دوسرے افسروں سے۔ گورنر بہت خوش ہوا۔ اور اس دن کھانے پر اپنے یہاں مدعو کیا۔ رچرڈ نے مجھے سکھایا تھا کہ جب کھانے کے لیے گورنر کے یہاں جاؤں تو ویانا کے وکیل کا خط لے جا کر اس کو دکھا دوں۔ کیونکہ وہ راستہ بھی بند ہے اور خط کا مضمون دیکھ کر گمان غالب ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور ممکن ہے کہ مجھ کو حکم دیدے کہ تم کو قسطنطنیہ پہنچا دوں۔ اس طرح تم اس طرف کے جہازوں کی تکلیف سے بچ جاؤ گے۔ اس لیے میں خط ساتھ لے گیا اور گورنر اور اڈمرل کو دکھایا۔ انھوں نے مدد کا وعدہ کیا۔ چند گھنٹے بہت خوشی کے ساتھ گذرے۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے وافر مقدار میں موجود تھے۔ خاص طور پر برف، تربوز اور نارنگی جو دوسرے ملکوں سے بہت بہتر ہوتی ہیں۔ خوب کھانے میں آئیں۔

مالٹا کے حالات پھل اور برف

مالٹا میں برف بہت ہوتی ہے اور ارزاں ہے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے شربت، شراب اور پھلوں وغیرہ کو برف میں ٹھنڈا کر کے استعمال کرتے ہیں۔ صبح سے آدھی رات تک ہر جگہ برف کا پانی اور شربت دستیاب ہوتا ہے۔ گورنر کی دعوت کے دوسرے دن اڈمرل نے دعوت کی۔ اس کے بعد مسٹر مکالسٹا اور مسٹر ولکی نے مدعو کیا۔ مالٹا کے قہوہ خانوں میں چائے مکھن اور ناشتہ کا انتظام بہت کم ہوتا ہے اور آشخانے بھی شہر میں کم ہیں۔ اس لیے گورنر جنرل نے مجھ سے کہا کہ کھانا میں اس کے یہاں یا اڈمرل کے یہاں کھایا کروں۔ اس معاملے میں ان لوگوں نے اس قدر خیال رکھا کہ دو ہفتے کے قیام میں مجھے اپنے گھر کے اندر کھانے یا ناشتہ کا انتظام نہیں کرنا پڑا۔ ہمیشہ کسی ایک جگہ مدعو ہوتا تھا۔ اور وہ لوگ دن میں کئی بار مجھ کو دیکھنے آتے تھے۔ جب میں نے مالٹا کے افسروں کے اس کردار کا پیرس کے مسٹر مرکی کے کردار سے موازنہ کیا تو خواجہ حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد آگیا۔

غلام پیر مغانم ز من مرنج اے شیخ   چرا کہ وعدہ تو کردی واد بجا آورد

میں اپنے ساتھ انگلستان کے وزیر کا خط لایا تھا جو بادشاہ کے حکم سے لکھا گیا تھا کہ انگریز حکام میری مدد کریں۔ اس کے باوجود مسٹر مرّی نے اپنی سخت دلی اور نااہلی کے باعث صرف ظاہری چاپلوسی کر دی کہ بظاہر شاہی حکم کی عدم تعمیل کا الزام نہ آئے۔ اس نے پروانہ راہ داری حاصل کر کے مجھے روانہ تو کر دیا مگر کسی قسم کی مدد نہیں کی نہ میرے ساتھ کوئی محافظ اور مددگار مقرر کیا۔ برخلاف اس کے مالٹا کے انگریز دوستوں کے بغیر کسی خط کے محض انسانیت کے رشتہ کی بنا پر میرا بہت خیال کیا اور اپنی فطری رحمدلی اور ویانہ کے وکیل کی خط کی بنا پر میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور اس کتاب میں اپنا نیک نام درج کرنے کا موقع فراہم کیا۔

مالٹا میں میرے قیام کا انتظام سوتر ہوٹل میں کیا گیا تھا جو ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر گرمی اور مچھروں کی زیادتی خاص طور پر نظر نہ آنے والے سفید مچھروں کے باعث بہت پریشانی اٹھانا پڑی۔ اکثر راتوں کو دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکا۔ مالٹا کی سڑکیں اور راستے اگرچہ ہموار اور کشادہ ہیں لیکن سور اس کثرت سے ہیں کہ ان کی وجہ سے راہ چلنا دشوار ہوتا ہے۔ ہر طرف ان کی گندگی نظر آتی ہے۔ سوا ایک سڑک کے جو گورنر ہاؤس کی طرف جاتی ہے۔ باقی ہر سڑک پر گندگی نظر آئی ایک بار مالٹا کے حاکم نے سڑکوں پر سوروں کا پھرنا بند کرنے کا حکم جاری کیا تو وہاں کے باشندوں نے اپنی فطری گندگی کے باعث اس کے خلاف حملہ کا ارادہ کر لیا تھا میرے دوران قیام میں مالٹا والوں کا ایک تہوار پڑا تھا جس میں انھوں نے آتش بازی خوب چھڑائی۔

مالٹا کی محفلیں

ایک دن میں گورنر کے ساتھ مالٹا کی ایک بڑی محفل میں شریک ہوا۔ مالٹا کے معززین اور تاجروں کا ایک گروہ وہاں موجود تھا اور طرح طرح کے کھانے دسترخوان کی زینت ہوا۔ مالٹا کی حسین عورتوں کا مجمع تھا جو دلکش باجے بجا رہی تھیں اور غم انگیز نغمے سنا رہی تھیں۔ یہ مجلس نہایت شاندار اور پرکیف تھی۔ مالٹا کی مقامی زبان بھی عجیب و غریب قسم کی ہے۔ الفاظ اور لب و لہجہ بالکل عربوں جیسا ہے۔ مثلاً صاد ضاد اور طا وغیرہ بالکل عربوں کی طرح ادا کرتے ہیں لیکن ان کی زبان میں روم اور یونان کے الفاظ بہت زیادہ ہیں اور ان میں ایسا رد و بدل کر دیا ہے کہ ایک علیحدہ زبان بن گئی ہے۔ اس محفل میں بعض لوگ فصیح عربی بولنے والے بھی موجود تھے انھوں نے مجھ سے گفتگو کی۔ اسی طرح جینوا اور بار سیلزا اور لیگہارن وغیرہ میں عربی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ عوام کی زبان ہی عربی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اندلس میں عرب سرداران کے قیام

کے وقت اور خلفائے نبی آمیہ کے عہد حکومت میں یہ ممالک عربوں نے فتح کر لیے تھے بلکہ ان اطراف کے بعض شہر عربوں ہی کے آباد کیے ہوئے ہیں۔ اب سے چند سال پہلے عثمانی سلطان نے مالٹا فتح کرنے کے لیے اپنی فوج بھیجی تھی۔ چونکہ اس زمانہ میں مالٹا کا قلعہ ابھی نامکمل تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے مالٹا کے سب شہروں پر قبضہ کر لیا۔ صرف ایک شہر مالٹا والوں کے قبضہ میں رہا۔ انھوں نے ترکوں کے حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور طویل محاصرہ کے باعث بے شمار سپاہی قتل ہو گئے۔ اس قلعہ کی مضبوطی کی وجہ سے جو مالٹا والوں کے قبضہ میں تھا۔ ترک فوج تنگ آ گئی اور اپنے وطن واپس چلی گئی۔ ان کے جانے کے دن کو مالٹا کے لوگ بطور عید مناتے ہیں۔ دو ہفتہ کے بعد کپتان رچرڈسن کا خیال اور مشورہ درست ثابت ہوا۔ گورنر اور اڈمرل نے دوستی کی رعایت سے رچرڈ کے ملازمین کو حکم دیا کہ مجھ کو وکٹوریز جہاز پر سمرنا SAMARNA میں انگریز قنصل کے مکان پر پہنچا دیں اور وہاں سے قسطنطنیہ جس کا فاصلہ پانچ دن کا ہے۔ اس لیے ۱۹ رجمادی الاول کو دوسری بار وکٹوریز میں سوار ہو کر سمرنا روانہ ہوا۔

ایک طوفان کا مقابلہ

وکٹوریز پر سوار ہونے کے چوتھے دن شام کے قریب زبردست طوفان آیا جس سے جہاز کا ایک مستول اور بادبان کی کچھ لکڑیاں ٹوٹ گئیں اور بہت سی کٹ گئیں۔ چونکہ سارے بحر روم میں چھوٹے چھوٹے جزائر کی کثرت ہے۔ اور وہ خطرناک چٹانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور رات دن شدید بارش کی وجہ سے دس جہاز ٹوٹ گئے تھے جن کی اطلاع بعد میں ملی تھی۔ ہم لوگ بھی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ مگر ہمارا جہاز محفوظ رہا۔ نصف دن کے بعد ہوا موافق چلنے لگی۔ ۲۲۔ ذی قعدہ کو جمعہ کے دن صبح کے وقت جہاز نے جزیرہ میلو MELO کے ساحل پر لنگر ڈالا یہ مشہور بندرگاہ ہے۔ اس سفر میں جزیرہ کندیہ KENDRIYA اور بعض دوسرے جزائر بھی ملے جن کا ذکر اسلامی کتابوں میں موجود ہے اور ان کا جزائر یونان کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

طوفان کی وجہ سے جہاز کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی مرمت کے سلسلے میں گیارہ دن جزیرہ میلو میں ٹھہرنا پڑا۔ اس لیے ان اطراف کے شہروں کی سیر بھی کر لی۔ سب شہر اور قصبات اونچے اونچے ٹیلوں پر آباد ہیں اور یونانی باشندوں کی کثرت ہے۔ ان مقامات کے لوگ ترکوں کے خوف سے اور مسلسل تذلیل کے باعث جو کہ اسلامی قانون[1] کے مطابق حربی کفار کی تذلیل کے عمل میں

[1] ابو طالب کا یہ خیال غلط فہمی ہے اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی بنا پر۔ (مترجم)

آتی ہے ان لوگوں کی حالت کمزور اور زندگی ناخوشگوار ہے بخلاف ہندوستان کی رعایا ان کے مقابلے میں بادشاہ کہی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کاہلی اور محنت وریاضت کی کمی کے باعث یہاں کے باشندے اس حد تک دبلے پتلے اور بیمار صورت نظر آتے ہیں کہ ان کی حالت دیکھ کر مجھ کو رونا آگیا۔

سہ شنبہ کو وہاں سے روانہ ہوئے اور سرزمین اٹلینہ ATLENA کے قریب سے گزرے جس کا ذکر رومی کتابوں میں جزیرۂ حکماء کے نام سے ملتا ہے۔ یہ افلاطون اور دیو جانس کلبی اور دوسرے بہت سے فلسفیوں کی جائے ولادت ہے۔ یہاں اس مشہور گرجا گھر کی عمارت بھی دیکھی جس کی چھت غائب ہو چکی ہے۔ اور انتہائی سفید سنگ مرمر کے بلند ستون کھڑے ہیں اور چمک رہے ہیں ان کو دوربین کے ذریعے دیکھا۔ شنبہ کو سمرنا پہنچے۔ خیال رہے کہ اٹلینہ جزیرہ نہیں ہے بلکہ ملک یونان کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس وقت وہاں ترکی سلطان اور فرانس کا اقتدار ہے۔

شہر سمرنا

سمرنا بہت بڑا اور خوبصورت شہر ہے آبادی مسلمانوں اور یونانی تاجروں کی زیادہ ہے۔ یہ فرنگستان کے شہروں کا مرجع ہے۔ یہاں کے بازاروں میں ہر قسم کا سامان مل جاتا ہے۔ یہاں پھلوں میں انگور، خربوزے، انار، تربوز بکثرت ہوتے ہیں، بعض خربوزے تربوز سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ یہی بہت بڑی اور تروتازہ ملتی ہے جو کہیں اور دیکھنے کو نہیں آئی۔ کپتان رچرڈسن نے مجھ کو انگریز قنصل مسٹر دیری کے مکان پر ٹھہرایا۔ اسی دن شام کے وقت کپتان مذکور کے ساتھ شہر کی سیر کے لیے نکلے۔ اور عثمان آقا سے اس کے باغ میں ملاقات کی جو شہر سے باہر واقع ہے۔ وہ بہت گرمجوشی سے ملا۔ قہوہ اور حقّہ پیش کیا اور شام کو کھانے پر مدعو کیا چونکہ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے، اس لیے معذرت کرلی۔ اس نے کپتان کی معذرت قبول کرلی۔ لیکن لیکن میری شرکت ضروری قرار دی میں نے اس کے ساتھ تھوڑا سا کھانا کھایا۔ رخصت کے وقت اس نے دوسرے دن کھانے کی دعوت دی جس کو میں نے قبول کرلیا۔ اس کے بعد ہم مسٹر دیری کے ساتھ واپس آگئے۔ دوسرے دن مقررہ وقت پر اس کے آدمی سواری لے کر آگئے اور اسی باغ میں لے گئے۔ مسلمانوں کے طرز کا کھانا ترکوں کے طریقے پر کھایا۔ کھانا نہایت خوش ذائقہ تھا۔ چار سال بعد ایسا کھانا کھایا تو بہت خوشی ہوئی نصف شب تک طرح طرح کے شربت پلاتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ اس نے ایک سفارشی خط قسطنطنیہ میں اپنے ایک دوست کے نام لکھ دیا جو سلطان کے چھوٹے وزیروں میں سے ہے۔ عثمان آقا نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک سمرنا میں میرا قیام ہے اس کے گھر پر رہوں اور کھانا بھی اس کے ساتھ کھاؤں۔ میں نے مسٹر دیری کی دعوت کے باعث اس سے معذرت کرلی۔

اس نے اپنی چھوٹی کشتی پر مجھ کو چند ملازموں کے ساتھ مسٹر ویری کے گھر پہنچا دیا۔ دوسرے دن مسٹر ویری کے ہمراہ میجر پولیس کے یہاں کھانا کھایا۔ جو ایک شریف انگریز ہے۔ اس کے دوسرے دن عثمان آغا خود مجھ سے ملنے آیا اور اپنے ساتھ لے گیا اور بہت خاطر تواضع کی نصف شب تک اس کے یہاں رہا۔ چونکہ دوسرے دن مجھ کو اگلے سفر پر روانہ ہونا تھا اس لیے رخصت کرتے وقت عثمان آغا نے اپنے ایک ملازم سے کہا کہ سو دانہ خربوزے، ایک ٹوکرا انگور، پچاس روٹیاں، دو بھیڑیں اور ایک گائے کا بچھڑا صبح سویرے زادِ سفر کے طور پر میرے جہاز پر پہنچا دے۔ مگر جہاز اندھیرے میں لنگر انداز تھا اس لیے یہ سامان مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ عثمان آغا خود مکان کے دروازے تک مجھ کو رخصت کرنے آیا اور اس کے ملازم مجھ کو کشتی تک پہنچانے آئے۔

۱۷ تاریخ کو جمعہ کے دن تیسری بار رچرڈ کی عنایت سے وکٹوریز جہاز پر سوار ہو کر قسطنطنیہ روانہ ہوا۔ باوجود اس کے کہ اڈمرل کی اجازت نہیں حاصل کی گئی تھی محض کپتان رچرڈ کی محبت اور مہربانی کے باعث یہ انتظامِ سفر ممکن ہوا۔ ورنہ خشکی کے راستہ سے یا دوسرے جہازوں سے سفر کرنا دشوار اور خطرناک تھا۔ یہ جہاز اس بہانہ سے قسطنطنیہ روانہ کرایا گیا کہ طوفان میں اس کے مستول ٹوٹ گئے تھے ان کی مرمت قسطنطنیہ ہی میں ہو سکتی تھی اگر یہ بہانا نہ ہوتا تو پھر یہ جہاز قسطنطنیہ نہ جاتا میرا سفر اب یونان کے سمندر میں تھا۔ راستہ میں جزیرہ میٹلین MITYLENE سے گزرا جو یونان کے بہت سے فلاسفروں کا مسکن رہا ہے۔ ساحل پر اتر کر شہر کی سیر کی اس طرف کے شہر چاہے بڑے ہوں یا چھوٹے پہاڑوں کے دامن میں آباد ہیں اور بہت شاندار اور خوبصورت نظر آتے ہیں مگر جب ان کے اندر داخل ہو تو ظاہر سے ان کو کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ بازار انگور کی بیلوں اور ان کو پھیلانے کے لیے لگی ہوئی لکڑیوں کی چھت کی طرح ہیں۔ اور اس کی وجہ سے اندھیرا رہتا ہے اکثر انگور کی شاخیں اندر لٹکی رہتی ہیں۔ راستے تنگ اور گندے ہیں۔ پتھروں کا ناہموار فرش ہے باہر کی عمارتیں بازار کے اندر سے بالکل نظر نہیں آتی ہیں جس سے راہ چلنے والوں کی طبیعت میں انقباض پیدا ہوتا ہے۔ ۱۸ تاریخ کو دوشنبہ کے دن، ہوا کی ناموافقت کے باعث جہاز جزیرہ ٹنڈس TENDOS میں لنگر انداز ہوا۔ اس جزیرہ کی سیر کرتے ہوئے حاکم جزیرہ عمر آغا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کھانے کی دعوت دی چونکہ دوسرے دن کا سفر ہوا کی موافقت پر موقوف تھا اس لیے معذرت کر لی۔ پنجشنبہ کے دن ہوا نے کچھ موافقت کی تو جہاز آگے روانہ ہوا اور بحرِ مرمورہ کے دہانے پر پہنچا۔ یہ بحرِ یونان کی شاخ ہے اور قسطنطنیہ تک گیا ہے۔ اور اس کے بحرِ اسود میں مل

جاتا ہے جہاز وہیں لنگر انداز ہو گیا۔ کیونکہ اس جگہ بحرِ مرمورہ کا پانی بحرِ یونان سے ملتا ہے۔ اس جگہ پانی اس قدر پُرجوش ہوتا ہے کہ بہت تیز ہوا کے بغیر بحرِ اسود کے دہانے میں داخل ہونا مشکل ہے تقریباً پچاس جہاز مختلف ملکوں کے اس جگہ لنگر انداز تھے اور بعض پچاس پچاس دن سے انتظار کر رہے تھے۔

بحرِ مرمورہ کی ساحلی زمین

بحرِ مرمورہ زنگستان اور عجم کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ جو عثمانی کو جدا کرتا ہے۔ شمال مغرب کی سمت اس سمندر کا دہانہ زنگستان میں شامل ہے۔ اور جنوبی مشرقی سمت میں یونان واقع ہے۔ جو سکندرِ اعظم مقدونی کا وطن ہے۔ ایران کے بادشاہ لہراسپ نے جو کیخسرو کا جانشین تھا۔ اس نے رہام بن گودرز کی سپہ سالاری میں اس کو فتح کیا تھا۔ اسی رہام کو اہلِ عرب بخت نصر کہتے ہیں۔ اسی جگہ کے لیے داراب بن بہمن نے فیلقوس سے جنگ کی تھی۔ روم کے قیصر اور ایران کے اشکانی اور ساسانی اس سرزمین کے لیے مدتوں برسرِ پیکار رہے۔ اگرچہ ان واقعات کی تفصیل اسلامی کتابوں میں نہیں ملتی ہے۔ کیونکہ قبل از اسلام کے واقعات کی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ کہیں بھی اس زمانہ کے حالات تحریر میں موجود نہیں ہیں۔ جیسا کہ فردوسی طوسی نے کہا ہے۔

زاشکانیان بجز نشنیدہ ام نہ در نامۂ خسرواں دیدہ ام

لیکن یونانی زبان کی ایک مستند کتاب جو دو ہزار سال قبل لکھی گئی تھی۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہے۔ وہ میرے پیشِ نظر تھی۔ اس میں ان واقعات اور محاربات کا ذکر موجود ہے۔ جو قیاصرہ روم اور سلاطینِ عجم کے درمیان واقع ہوئے تھے۔ ترکی کے عثمانی سلطان چونکہ ان دونوں ملکوں پر حکومت کرتے تھے۔ یعنی یورپ و ایشیا اور ان دو سمندروں (بحرِ یونان و بحرِ اسود) پر۔ اس لیے ان کو سلطان البرین و خاقان البحرین کا لقب دیا گیا ہے۔ بحرِ یونان کے ساحل پر ایک مقام کا نام طرائے troy ہے۔ مشہور یونانی شاعر ہومر وہیں کا باشندہ تھا۔ سمندر کے کنارے ان مشہور سلاطین کے مقبرے ہیں۔ جو ہومر کے ممدوح تھے۔ اور آپس کی جنگ میں مارے گئے۔ یہ مقبرے بلند ٹیلوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

۲۰ تاریخ کو جمعہ کے دن موافق ہوا کی مدد سے سمندر کے دہانے میں داخل ہو گئے اور چند میل جہاز نے سفر کیا تھا کہ ہوا کم ہو گئی۔ اور پانی کی کشش مخالف نہ تھی۔ ایک مقام پر جہاز لنگر انداز ہوا جس کو درۂ دانیال Dardanelle کہتے ہیں۔ اس مقام پر

بحر مورہ بہت تنگ ہو گیا ہے۔ دونوں طرف کناروں پر مضبوط قلعے بنے ہوئے ہیں۔ جن کے اندر بڑی بڑی توپیں نصب ہیں اور لڑائی کے تمام ہتھیار موجود ہیں۔ تاکہ اگر کسی مخالف ملک کا جہاز بلا اجازت ہوا کی مدد سے گزرنا چاہے تو اس کو گولوں کا نشانہ بنا دیا جائے۔ اسی لیے اس مقام کا نام درہ دانیال رکھا ہے۔ ورنہ اس میں کوئی شہرت نہیں ہے۔ اسی طرح قسطنطنیہ کے اس طرف جہاں بحر مزورہ بحر اسود میں مل جاتا ہے۔ انتہائی تنگ جگہ ہے۔ وہاں کشش آب اور مضبوط قلعے اس طرف سے زیادہ ہیں یہ چیز یہاں سے گزرنے والوں پر گراں گزرتی ہے کہ ان کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ترکی حکومت اس کو بہت اچھا خیال کرتی ہے کیونکہ یہ قسطنطنیہ کی حفاظت و استحکام اور سمندری آفات سے محفوظ رہنے کا باعث ہے۔ دشمنوں کے جہاز یہاں سے بمشکل گزر سکتے ہیں۔

۲۰ تاریخ کو جمعہ کے دن سے ماہ رجب کے چوتھے جمعہ تک چودہ دن مذکورہ رکاوٹ کے سبب سے انتہائی پریشانی کے ساتھ درہ دانیل میں گزارے۔ اور اس نام کی وجہ تسمیہ بھی سمجھ میں آئی یعنی درد معنی درد اور نیل معنی پانا۔ مطلب یہ ہے کہ مقصد پانے کے لیے درد رہنا "تکلیف اٹھانا"۔ پانچ تاریخ کو شنبہ کے دن ہم قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ ان چند دنوں میں تقریباً سو جہاز درہ دانیال میں جمع ہو چکے تھے۔ اور جب سب ایک ساتھ روانہ ہوئے تو سارے سمندر کی سطح پر چھا گئے یہ ایک ایسا نظارہ تھا جو میں نے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔

قسطنطنیہ پہنچنے کے دوسرے دن مقام تلات colata میں جو قسطنطنیہ کا ایک حصہ ہے اور اس میں فرنگستان کے بادشاہوں کے سفیر رہتے ہیں۔ میں نے انگلستان کے سفیر لارڈ الگن کی تجویز پر ایک کرایہ کا مکان لے لیا۔ جب میں جہاز سے اتر کر مع سامان مکان جانے لگا تو کپتان رچرڈسن نے از راہ مہمان نوازی و احترام ایک توپ داغ کر قسطنطنیہ کے رہنے والوں کو میری آمد کی اطلاع دی۔ اس کے بعد میں مکان پر پہنچا جو بہت صاف ستھرا تھا اور شہر کے اچھے مکانات میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس میں چار خوبصورت عیسائی لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ جو میرے ناشتہ اور کھانے کا انتظام کرتی تھیں اور خالی اوقات میں اپنی شوخی و ذہانت سے میرا دل بہلاتی تھیں۔ ایک ماہ بہت آرام سے گزرا۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اور آرام لارڈ الگن اور لیڈی الگن کی موجودگی کے سبب سے تھا۔ لارڈ موصوف ایک معزز خاندان کا دولت مند شخص ہے۔ قسطنطنیہ سے لے کر بغداد اور بصرہ تک جتنے انگریز کلائے حکومت ہیں سب اس کے ماتحت ہیں۔ یہ نہایت خوش اخلاق آدمی ہے اس کی بیوی بھی نہایت حسین

اور شیریں سخن خاتون ہیں اور علم و دانش میں ممتاز ہیں۔ میں نے ان کی شان میں ایک غزل بھی لکھی ہے۔

شہرِ استنبول

اب استنبول کا مختصر ذکر کیا جائے گا۔ دراصل قسطنطنیہ تین شہروں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ بحرِ ماورہ کے دہانے پر واقع ہے اور بڑا حصہ جس کے اندر بادشاہ، وزرا، امرا اور ان کے لواحقین اور مسلمانوں کے تمام معزز خاندان رہتے ہیں، اس کو استنبول کہتے ہیں اور دوسرا شہر جو اس کے مقابل دوسری طرف واقع ہے، اس کا نام غلاطہ ہے۔ استنبول سے غلاطہ تک خشکی کا راستہ ہے۔ اگر اس کے پیچ و خم برداشت کریں تو بیس اکیس میل چل کر وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اس شہر کے باشندے عیسائی ہیں اور ان کی خاص پہچان یہ ہے کہ ان کے مکان کے اندر یا باہر سرو کا درخت نہ ہوگا۔ اور مسلمان اپنے مکانات کے سامنے سرو کا درخت لگاتے ہیں۔ عیسائیوں کے لیے اس کی ممانعت ہے۔ تاکہ پہلی نظر میں مسلمان اور نصرانی کے مکان کی پہچان ہو جائے۔

تیسرا شہر بحرِ ماورہ کے اس طرف برِاعظم ایشیا کی سرزمین پر واقع ہے۔ اور اس کا نام اسکودار ہے۔ استنبول سے بغیر سمندر پار کیے ہوئے وہاں پہنچنا مشکل ہے ان تینوں شہروں کے ایک سمت سمندر ہے اور دوسری سمت پر پہاڑ۔ چنانچہ ان شہروں کی لمبائی کی طرف چلو تو سڑکوں کی زمین مسطح ملے گی۔ اور اگر چوڑائی کی راہ چلو تو سڑک کی زمین نیچے سے اوپر کی طرف اونچی ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ جاؤ۔ اس شہر کی بناوٹ و قوع سمندر کی جانب سے اتنی عالی شان اور دلفریب ہے کہ اگر کشتی میں خلیج کے وسط میں کھڑے ہو کر تماشا دیکھو تو معلوم ہوگا کہ تمام دنیا میں اس کا مقابل کوئی شہر نہ ہوگا۔ لیکن جب شہر کے اندر جاؤ تو اتنا دلچسپ معلوم نہیں ہوتا استنبول کی ہوا بہت سرد ہوتی ہے۔ جاڑوں میں برف بکثرت گرتی ہے۔ مکانات کے اندر عمدہ آتش دان بنے ہوئے ہیں لیکن ترک لوگ آتش پرستوں سے مشابہت

کے خیال سے روزانہ قطعی آگ نہیں جلاتے ہیں۔ شام کے وقت آگ کو کم کرتے ہیں۔ مغرب اور عشاء کی نماز کے وقت ایک بڑی سینی جو حرارت کو روک لیتی ہے اور آگ کو چھپا دیتی ہے آتش دان پر رکھ دیتے ہیں۔ اور سردی دور کرنے کے لیے اس کے بدلے اوڑھنے بچھانے کے سامان میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

گرمی کے موسم میں مچھر کھٹمل پسو بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ طاعون تو کم و بیش ہمیشہ اس شہر میں پھیلا رہتا ہے۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ کے تمام شہروں میں یہ وبا ملتی ہے۔ خاص طور پر مصر، حلب، بغداد وغیرہ میں۔ شہر کی وسعت اور آبادی کی کثرت بیان کرنے سے زبان آدم عاجز ہے۔ ان تینوں شہروں کے امراء کے باغات اور جاگیریں بحر مامورہ کے ساحل کے دونوں طرف واقع ہیں۔ اور ان کا پھیلاؤ بحر اسود کے دہانے تک ہے۔ اس طرح کہ اگر بحر اسود کے دہانے سے دریا کے راستے استنبول جانے کا ارادہ کریں تو بحر مرمورہ کے دونوں کناروں پر تیس میل تک سارا راستہ آباد اور ایک دوسرے سے ملا ہوا نظر آئے گا۔ اگر کوئی شخص خشکی کے راستے سے شہروں کی لمبائی طے کرے تو وہ تین دن تک شہر کے اندر چلتا رہے گا۔ اسی لیے وہاں کے لوگ جب ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتے ہیں تو کھلی ہوئی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ جاتے ہیں۔ جو بہت خوشنما ہوتی ہیں۔ اکثر سنہری اور منقش ہوتی ہیں۔ ان میں مخملی سوزنیاں بچھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس طرح ہزاروں کشتیاں ہر وقت آتی جاتی رہتی ہیں۔ بعض پر تین ملاح ہوتے ہیں اور بعض پر صرف دو۔ یہ کشتیاں وہاں کے باشندوں کے لیے بہت مددگار ہیں۔ سمندر کے کنارے جہاں لوگ کشتیوں سے اترتے ہیں۔ وہاں زین لگام سے تیار گھوڑے مل جاتے ہیں جو کرایہ پر چلتے ہیں۔ اگر کوئی پیدل نہ چلنا چاہے تو تھوڑا سا کرایہ ادا کر کے گھوڑے پر جا سکتا ہے اور واپس بھی آ سکتا ہے۔ ان شہروں کے راستوں اور سڑکوں پر پتھر کا فرش ہے۔ لیکن بہت ناہموار شہروں کی آبادی اور وسعت کے مقابلے میں سڑکیں کم چوڑی ہیں۔ بارش میں اتنی کیچڑ ہو جاتی ہے کہ چلنا دشوار ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر تو پانی اور کیچڑ زانو تک پہنچتا ہے۔ قہوہ خانوں

اور حجاموں کی دکانوں کا کوئی شمار نہیں۔ جس سڑک پر بھی چند قدم چلو ایک قہوہ خانہ اور حجام کی دکان نظر آئے گی۔ چونکہ عثمانی ترکوں اور عربوں میں غور و فکر کی عادت نہیں ہے اس لیے اپنے اوقات زیادہ تر بیداری، گپ شپ اور ملنے ملانے میں صرف کرتے ہیں یہ قہوہ خانے ان کے دیوان خانوں کا کام دیتے ہیں۔ صبح بیدار ہونے کے بعد ناشتہ کر کے عموماً قہوہ خانوں میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور گپ شپ ہانکنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ گفتگو بہت بلند آوازسے کرتے ہیں، اگر دس آدمی ساتھ بیٹھتے ہیں تو سب ساتھ ہی بولتے ہیں۔ اس لیے اس جماعت کی مجلس عام شور مچانے والے جانوروں کے جمگھٹ کی طرح ہوتی ہے۔ اجنبی شخص حیران سب کی ملی جلی آوازوں کو سمجھ نہیں پاتا ہے۔ ان کی صحبت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔ یہ قہوہ خانے عموماً بہت تاریک اور گندے ہوتے ہیں۔ سوا تلخ قہوہ اور چرپٹ کے وہاں کوئی چیز نہیں ملتی ہے۔ آشخانے بھی عموماً کمینہ لوگوں سے بھرے رہتے ہیں اور شرفا کے بیٹھنے کے لائق قطعی نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن غلاطہ میں متعدد فرانسیسی اور انگریزی آشخانے ہیں جن میں نہایت اچھا کھانا ملتا ہے۔ وہ بیٹھنے کے لائق بھی ہیں۔ حمام بھی بہت ہیں مگر نہایت گندے، عورتوں اور مردوں کے لیے مشترک ہیں۔ صبح سے دوپہر تک مرد جاتے ہیں اس کے بعد عورتیں۔ استنبول کی خاص چیزوں میں جن کو عقل بھی پسند کرتی ہے۔ ایک تو کشتیاں ہیں جن کا حال لکھا جا چکا ہے اور کرایہ پر ملنے والے گھوڑے۔ دوسری چیز سقہ خانے ہیں۔ سڑکوں پر ہر چار قدم کے فاصلے پر پانی کی ٹنکی لگی ہے۔ اس کے ساتھ ایک تانبے کا گلاس لوہے کی زنجیر سے بندھا ہوا ٹنکی کی ٹونٹی کے قریب لٹکا رہتا ہے۔ راہ چلتے جو شخص پیاسا ہوتا ہے وہ ٹنکی سے گلاس میں پانی لے کر پی لیتا ہے۔

تیسری خوبی یہ ہے کہ ایک قسم کے سامان کی دکانیں ایک ہی قطار میں واقع ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے خریدار کو بہت آسانی ہوتی ہے۔ تھوڑی سی کوشش سے دل پسند چیز دستیاب ہو جاتی ہے۔ قیمتی چیزوں میں تاتم، مخمل اور سمور کے سوا کوئی چیز بازار میں

نظر نہیں آتی۔ ہاں مذکورہ چیزیں بکثرت ہیں اور ارزاں ہیں۔

استنبول میں بڑے لوگوں کا لباس دنیا میں سب سے زیادہ گراں قیمت ہوتا ہے اور زیادہ تر فرنگستان کے بنے ہوئے کپڑے سے تیار کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر بانات اطلس اور خارا استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان کے بنے کپڑوں میں شال، چھینٹ اور ایک قسم کا سفید کپڑا پسند کرتے ہیں۔ ایرانی کپڑے میں کرمان کی شال، زربفت اور کمخواب استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی شلوار بانات کی ہوتی ہے جس کی مہری تنگ اور گھیر کشادہ ہوتا ہے۔ نیچے پہنی ہوئی دو تین عباؤں کے دامن اس کے اندر دبا لیتے ہیں جو شخص شلوار کی عادت نہ رکھتا ہو اگر وہ پہن لے تو اپنی جگہ سے بمشکل حرکت کر سکے گا۔ ان کی ٹوپی بہت اونچی ہوتی ہے جس کو قادرق کہتے ہیں۔ یہ بانات سے تیار کی جاتی ہے اور چھ سات سیر سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ ایک ساتھ چار پانچ عربی عبائیں پہن لیتے ہیں جن کے اوپر کا حصہ بانات کا بنا ہوا ہوتا ہے اور نیچے کا حصہ کرک سے بنتا ہے۔ مجموعی طور پر ایک گدھے کا بوجھ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہاں کے امراء لوگ جہاں تک ممکن ہوتا ہے چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ صحت کے لیے چلنا پھرنا اور تازہ ہوا ضروری ہے استنبول کے راستے سے گزرتے ہوئے پاشاؤں کے دیوان خانے میں مہمان ہونے کا اتفاق ہوا۔ تین چار جگہ ٹھہرنا پڑا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ اپنے زنانہ مکان سے نکل کر مہمان خانے میں آئے اور نصف شب تک وہیں بیٹھے رہے۔ پھر اسی دروازے سے حرم کے اندر چلے گئے۔ اس مدت میں وہ صحن اور دیوانہ کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھ پاتے ہیں تو بھلا دروازے کے باہر اور شہر کے اندر کیا پہنچتے ہوں گے۔

شتب کشتی کا رواج

ترکوں میں شتب کشتی کا رواج بہت زیادہ ہے۔ کسی وقت بھی شتب ان کے ہاتھ سے جدا نہیں ہوتا ہے۔ تمام لوگ اس قدر عادی ہیں کہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اور تیز رفتار سواریوں پر چلتے ہوئے بھی شتب کو نیچے کا

طرح ہاتھ میں پکڑے رہتے ہیں۔ چقماق اور پرانا کپڑا بغل میں رکھتے ہیں۔ سوار ہونے کی حالت میں بھی پتھر کی آگ سے شتب جلا لیتے ہیں۔

اگر کوئی بہت ضروری کام پیش آجائے تو شتب کو چمڑے کے غلاف میں جو چلم کی طرح ہوتا ہے تھوڑی دیر کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ اسی سبب سے نادر شاہ کی یہ بات بہت مشہور ہے کہ ترکوں سے لڑائی کے وقت وہ اپنے سپاہیوں سے کہا کرتا تھا کہ اس قوم سے خوف نہ کرو۔ کیونکہ لڑائی کے وقت دشمن اپنے دو ہاتھوں سے مدافعت کرتا ہے اور انسان کے دو ہی ہاتھ ہوتے ہیں۔ اور اس قوم کے ایک ہاتھ میں حقہ اور دوسرے میں تلوار ہوتی ہے اور ان کے لیے تیسرا ہاتھ شتب کے لیے درکار ہوتا ہے جو میسر نہیں ہے۔ پھر یہ کس ہاتھ سے لڑائی لڑیں گے۔

ترکوں کی ٹوپیاں

ترکوں میں قادوق نام کی ایک خاص قسم کی ٹوپی ہوتی ہے جو بزرگ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں مختلف قسم کی ٹوپیوں کا رواج ہے۔ قوم کے مختلف طبقوں کی شناخت کے لیے ان کے یہاں امتیازی نشان ٹوپیاں ہیں۔ ایک اس قسم کی ٹوپی پر سبز رنگ کا صافہ باندھنا صرف سادات کے لیے مخصوص ہے۔ ٹوپی کی کوئی قسم بڑائی اور وزن میں قادوق سے کم نہیں ہے بلکہ بعض تو اس سے دوگنی اور چوگنی وزنی ہوتی ہیں۔ استنبول کے لوگ عیش و آرام، شان و شوکت عمدہ لباس، انواع و اقسام کے کھانوں، عورتوں، اچھی سواریوں اور زیادہ خادموں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ امیروں سے قطع نظر یہ وبا معمولی لوگوں میں بھی پھیل گئی ہے۔ اس طرح ملک کی آمدنی ضروری کاموں کے بجائے عیش پر صرف کرتے ہیں۔ اور جب آمدنی کافی نہیں ہوتی تو رشوت خوری، دھوکہ بازی کے ذریعہ روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ بری خصلت ان کے اندر اس قدر پھیل گئی ہے کہ اب اس کے نقصانات بھی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کوئی شخص بھی ان حرکتوں سے باز نہیں رہتا۔ رشوت لیے بغیر کسی قسم کی بات

سننا پسند نہیں کرتے ہیں۔ اسی لیے شاہی کاروبار، مثلاً توپ خانہ، دفاتر، ڈاکخانہ، فوج کا نظام بالکل معطل ہے۔ سرکاری ملازم اپنی ذاتی اغراض کی بناء پر کارخانوں اور دفتر والوں کی خرابیاں اپنے افسروں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اور ان کارخانوں کو محض اپنے نفع کے لیے چلاتے ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس میں خورد برد کرتے ہیں۔ یہ باتیں مجھ کو اسوقت معلوم ہوئیں جب میں نے وہاں کا ڈاک بنگلہ دیکھا جس کو وہاں منزل خانہ کہتے ہیں جب میں استنبول سے براہِ خشکی بغداد آیا تو ان باتوں کی پوری تصدیق ہو گئی۔

صورتِ حال یہ ہے کہ ہر ۲۰ میل کے فاصلے پر ایک ڈاک بنگلہ تعمیر کیا گیا ہے جس کے اندر ایک قہوہ خانہ ہوتا ہے اور ایک محافظ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک نگراں جو ڈاک کے گھوڑوں کا انتظام کرتا ہے اور اس کے ماتحت نعل بند اور سائس ہیں۔ یہ سب حکومت کے ملازم ہیں۔ یہ طریقہ پرانے زمانے سے جاری ہے کہ منزل کا محافظ ڈاک بنگلہ کی قیام گاہ کو قاصدوں کے لیے صاف ستھرا رکھے گا تاکہ قاصد وقت مقررہ تک وہاں آرام کر سکیں۔ اکثر امراء بھی بطورِ قاصد سفر کرتے ہیں۔ اور منتظم ان کے لیے تازہ دم گھوڑوں کا انتظام کرتا تھا اور دورانِ قیام ان کے کھانے پینے کا اہتمام بھی اس کے ذمہ رہتا۔ رخصت ہوتے وقت لوگ اپنی خوشی سے منتظمین اور دیگر ملازمین کو حسبِ حیثیت انعام دے دیا کرتے تھے۔ ان تمام اخراجات اور گھوڑوں کی تبدیلی کے لیے حکومت ہر ماہ تیس ہزار قرش ہر ڈاک بنگلہ کے لیے دیتی ہے۔ مگر اب یہ ڈاک بنگلے قہوہ خانوں کی طرح غرباء کا مسکن بن گئے ہیں۔ اور اس قدر گندے ہیں کہ ان میں کسی بھی بھلے آدمی کے لیے قیام کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے مچھروں کھٹملوں کے علاوہ نجاست بہت ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہوا کہ سو میل کا سفر طے کر کے جب کسی ڈاک بنگلے میں قیام کیا تو تکان کے باوجود مچھروں اور کھٹملوں کی کثرت کے باعث آرام سے نیند نہ آسکی۔ جب گھوڑا تبدیل کرنے کے لیے کہا تو گھنٹوں کے بعد مل سکا۔ قہوہ اور کھانا ایسا ملا جو کھانے کے قابل نہ تھا۔ اسی طرح بعض ڈاک بنگلوں میں تین تین دن گھوڑے کے انتظار میں ٹھہرنا پڑا۔ چلتے وقت ڈاک بنگلے کے ملازمین نے زبردستی

انعام وصول کرنے کی کوشش کی اور نہ دینے کی صورت میں شور وغل مچایا اور گالیاں بھی دیں نہ معلوم کس طرح جان بچاکر آگے روانہ ہوئے۔ یہ حالت ہے وہاں کے ڈاک بنگلوں اور منتظمین کی جو سرکاری ملازم ہیں۔ ان لوگوں کی بددیانتی کا یہ حال ہے کہ قاصد سرکاری سواریوں پر تاجروں کا مال لاد کرلے جاتے ہیں اور ان سے کرایہ خود وصول کر لیتے ہیں۔ ان تاجروں کو ڈاک بنگلے میں ٹھہراتے ہیں اور منتظم ڈاک بنگلہ قاصد کی شکایت حکومت سے اس لیے نہیں کرتا کہ وہ خود خلاف قاعدہ کام کرتا ہے۔ دونوں ہی اپنا حساب کتاب دل میں رکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور حکومت کو ان باتوں کا علم نہیں ہوتا۔ اس طرح اس سلطنت کا نظام معطل رہتا ہے۔

ترکوں کے کھانے | ترکوں کے کھانوں میں چند چیزیں قابل ذکر ہیں۔ دو قسم کے کباب پنیر اور چاول ملا ہوا شوربہ۔ اور میوہ پڑا قلیہ۔ یہ ایرانی کھانوں کی تبدیل شدہ صورتیں ہیں زیادہ لذیذ نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں پلاؤ گوشت کے بغیر ہوتا ہے۔ محض خشکہ ہوتا ہے جس پر گرم گھی ڈالتے ہیں۔ اس پلاؤ کو لکڑی کے چمچوں سے کھاتے ہیں جن میں گہرائی نہیں ہوتی ہے۔ حلوے بہت مقوی ہوتے ہیں۔ کئی قسم کی میٹھی روٹیاں پکاتے ہیں۔ جو روغن میں پکی ہوئی ہوتی ہیں۔ پھلوں میں انگور خربوزہ اور تربوز کاٹ کر دسترخوان پر رکھتے ہیں اور ان سب کو ملا کر کھاتے ہیں۔

دسترخوان لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک اونچی میز بچھاتے ہیں۔ اس کے قریب شمع دان رکھتے ہیں۔ اس کے بعد میزبان کے قریب ایک بڑی سینی رکھ دیتے ہیں۔ تمام مہمان اس سینی کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ کھانے والوں کی تعداد کے برابر ملازم موجود رہتے ہیں۔ کھانے کی ایک قاب ملازم سینی کے اندر رکھ دیتا ہے۔ حاضرین ہاتھ بڑھا کر اس قاب سے کھاتے ہیں اور ختم ہونے پر ملازم اس کی جگہ دوسری قاب رکھ دیتا ہے۔ جتنی چیزیں پکائی جاتی ہیں۔ سب قابوں میں بھر کر دروازے کے قریب رکھ دیتے ہیں اور حسب ضرورت لا کر

سینی میں رکھتے ہیں ۔ مجھے اس دسترخوان پر کھانے میں چار سبب سے مشکل پیش آئی۔ ایک سبب یہ تھا کہ مہمانوں کی کثرت کے باعث قاب تک ہاتھ پہنچنا مشکل ہوتا تھا۔ اور ایک چیز چند بار سے زیادہ ہاتھ نہ آتی تھی ۔ دوسرے یہ کہ ملازم جلد بازی کرتے ہیں۔ اگر قاب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ملازم نے اسے اٹھالیا تو شرمندگی ہوتی ہے ۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ قابوں کی تبدیلی بے موقع کرتے ہیں ۔ ایک چیز جو مجھے پسند تھی جب دوسری بار لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ قاب اٹھالی گئی ۔

چوتھی بات یہ ہے کہ وہ لوگ کھانا بہت جلدی جلدی کھاتے ہیں ۔ عام طور سے ورزش نہ کرنے اور قہوہ زیادہ پینے کے باعث ان لوگوں کی خوراک بھی کم ہوتی ہے۔ اس لیے جلدی فارغ ہوجاتے ہیں ۔ مجھے ان کے دسترخوان پر سے ہمیشہ بھوکا اٹھنا پڑا ۔

استنبول کے تمام کھانوں میں خاص چیز مچھلی ہے ۔ جو کئی قسم کی ہوتی ہے اور نہایت لذیذ ہوتی ہے ۔ کھانا عموماً بعد مغرب کھاتے ہیں ۔ صبح کے وقت روٹی کے ایک ٹکڑے سے ناشتہ کرتے ہیں اور دن کے وقت عموماً بازار کی روٹی، سبزی اور کباب کھاتے ہیں جو گھر سے بہتر ہوتے ہیں ۔

استنبول کی عمارتیں اور مسجد آیا صوفیا

استنبول کی تمام عمارتیں لکڑی کی بنی ہوئی ہیں ۔ صرف مسجدیں پتھر کی ہیں ۔ سب بازار لکڑی کے بنے ہوئے ہیں ۔ باہری جانب کچھ حصہ پتھروں سے بناتے ہیں ۔ دروازوں اور بعض دوسرے حصوں کو اس طرح رنگتے ہیں کہ دیکھنے میں اینٹوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ عمارتیں نہ تو ہندوستانی عمارتوں کی طرح خوبصورت ہیں اور نہ انگلستان کی طرح آرام دہ ۔ جب کبھی ایک مکان میں آگ لگتی ہے تو سارا محلہ متاثر ہوجاتا ہے ۔ آتش زدگی کی اتنی کثرت ہے کہ کوئی مکان ایسا نہ ملے گا جو تیسری یا چوتھی بار نہ بنا ہو۔ کہتے ہیں کہ لکڑی کے مکانات بنانے کا سبب زلزلے کا خوف ہے ۔ جو اس شہر میں بہت

آتا ہے۔ لکڑی کے مکانات کو زلزلہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہاں کے باشندوں کی کوتاہ فہمی اور کام چوری کی عادت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اینٹ کے مکانات بہت مضبوط ہوتے ہیں اور ان پر مصارف زیادہ ہوتے ہیں! اور لکڑی کے مکان پر خرچ کم ہوتا ہے۔ لیکن لکڑی کے مکانات کئی کئی بار بنانے میں خرچ بہت زیادہ ہو جاتا ہے پھر مکان کا سامان بھی جل جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے اخراجات دس گنا ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اینٹ اور پتھر کے بنے ہوئے مکانات استنبول میں ایسے موجود ہیں جن کو بنے ہوئے ہزاروں برس ہو چکے ہیں۔

ترکوں کے مکانات اندر سے بہت آراستہ ہوتے ہیں اور فرش بہت پرتکلف اور نرم ہوتا ہے۔ امیروں کے یہاں فرش اتنے نرم ہوتے ہیں کہ آدمی ان کے اندر دھنس جاتا ہے۔ غریبوں کے یہاں معمولی فرش ہوتا ہے اور مکانات کے اندر مچھر اور کھٹمل بہت ہوتے ہیں یہ لوگ اس کے عادی ہیں ان سے پریشان نہیں ہوتے۔

مساجد

ان تینوں شہروں میں مساجد کی تعداد بیش از بیش ہے۔ جو پتھروں اور اینٹوں سے بنائی گئی ہیں اور ان میں چونے کا استعمال ہوا ہے نہایت مضبوط کشادہ اور وسیع ہیں۔ ان کی رنگ آمیزی اور سجاوٹ نہایت دلکش ہے۔ خاص طور پر مسجد ایا صوفیہ جس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے۔ بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اتنی شاندار اور خوبصورت عمارت تمام دنیا میں موجود نہیں ہے۔ نہ میں نے کسی جگہ دیکھی ہے۔ سینٹ پال کا مشہور گرجا اور فرنگستان کی دوسری مشہور عمارتیں اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہیں۔ اس مسجد کی پوری عمارت رنگ برنگ کے پتھروں سے بنائی گئی ہے درمیانی گنبد کے نیچے کا صحن سو گز مربع ہوگا اور اس کے چاروں طرف والانوں کے طاق جو چوکور ہیں۔ چالیس گز سے کم نہیں ہیں۔ ان چھتوں کے اوپر شہ نشین بنائے گئے ہیں جو پتھروں کے ستونوں پر قائم ہیں اور اکثر سنگ سماق، سنگ سبز، اور سنگ سرخ کے

ہیں۔ یہ مسجد قیصر روم قسطنطنیہ بانی قسطنطنیہ کے حاکم نے ۳۱۴ھ میں ظہور اسلام سے قبل تعمیر ہوئی تھی۔ اسلام سے قبل یہ کلیسا تھا۔ سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ نے اسے مسجد بنا دیا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی حال میں تعمیر ہوئی ہے۔ اس عظیم مسجد کے علاوہ دوسری بڑی اور خاص مساجد میں مسجد سلطان احمد، مسجد سلطان محمد فاتح، مسجد سلطان بایزید، مسجد سلطان محمود، بہت اچھی ہیں۔ میں نے ان کو بھی دیکھا۔ باہر سے بہت شاندار نظر آتی ہیں۔ لیکن اندر سے مسجد ایا صوفیہ کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ سب کے صحن کشادہ ہیں۔ طہارت اور وضو کے لیے ہر مسجد کے اندر حوض اور پانی کے چشمے موجود ہیں۔ غسلخانے ایک قطار میں بنے ہوئے ہیں۔ صحن کے باہر بہت کشادہ جلوخانے ہیں۔ جو تین طرف سے مسجد کی دیوار سے گھرے ہوئے ہیں۔ دونوں طرف کافی جگہ ہے اور اندر کی طرف دوکانیں ہیں۔ جن میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ چند قہوہ خانے بھی ہیں جن کی آمدنی مسجد کی ضروریات کے لیے وقف ہے۔ بعض مساجد سے ملحق مدرسے بھی ہیں۔ ان کے علاوہ عام مساجد بہت ہیں جو اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں اور ان کی چھتیں لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔

سلطان بایزید کی مسجد میں ایک قندھاری افغان سے ملاقات ہوئی جو فارسی اچھی جانتا تھا اور تحصیل علم کے لیے اس مدرسہ میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ غریب طلبہ تحصیل علم کے لیے سندھ، پنجاب، قندھار اور ہندوستان کے مختلف مقامات سے یہاں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں سے قریب ایک مقام ہے جہاں تین سو ہندوستانی فقراء رہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو وہ جگہ تم کو دکھاؤں۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ جماعت رذیل لوگوں کی ہوگی۔ اس لیے وہاں جانے کی رغبت نہ ہوئی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ترکی کے فقراء کو استنبول میں بڑا اعتبار حاصل ہے۔ ان کا ہر گروہ خاص قسم کی ٹوپی لگاتا ہے۔ ہندوستانی فقراء کرامات کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لباس بہت آگ میں کود جاتے ہیں اور طرح طرح کے دوسرے شعبدے دکھاتے ہیں۔ رقص کرتے ہیں اور وجد میں آتے ہیں جو شخص ان کے شعبدے دیکھنے کی خواہش کرتا ہے اس سے معقول رقم وصول کرتے ہیں۔ غیر ممالک کے فقراء کو مکان اور

کھانا آسانی سے مل جاتا ہے۔

استنبول کی دوسری عمدہ عمارتوں میں ایک بازار ہے جس کا نام میں اس وقت بھول گیا۔ نصف میل کے رقبہ میں چوکور آباد ہے۔ اس کے کئی دروازے ہیں ظہر کے بعد دوکاندار دوکانیں بند کرکے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اس وقت بازار کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور دوسرے دن صبح کے وقت کھلتے ہیں۔ جمعہ کے دن دوکانیں نہیں کھولی جاتی ہیں اس بازار کے طول وعرض میں چھت دار خیابان بنے ہیں۔ ان کے دونوں طرف دوکانیں ہیں۔ دوکانوں کی چھتیں مسطح ہیں اور خیابان کی چھت گنبد نما، اور گنبدوں میں شیشے کے روشن دان لگے ہوئے ہیں جن کو رسی کے ذریعہ سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے۔ اس بازار میں کاریگر اور پیشہ ور صناع بھی بیٹھتے ہیں۔ اس سے اچھا بازار سارے استنبول میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے ایران کے بعض لوگوں کی زبان سے اس طرح کے بازار کی بہت تعریف سنی تھی لیکن تجربہ کرنے کے بعد اس میں بہت سی خرابیاں نظر آئیں۔ اول روشنی کی کمی جس کی وجہ سے خریدار غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے اور مال کے رنگ اور خوبی کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ میں نے ایک بانات خریدا۔ عینک لگانے کے باوجود رنگ کا صحیح اندازہ نہیں کرسکا۔ جب باہر نکلا تو اس کا رنگ اور ہی نکلا۔ جو مجھے نہایت کریہہ معلوم ہوا۔ دوسری خرابی ہوا کی کمی اور تعفن، جس سے انقباض اور دل تنگی پیدا ہوتی ہے۔ تیسری خرابی نمی کی کثرت ہے۔ جو کہتے موسم برسات میں رطوبت کی زیادتی کی وجہ سے کیچڑ میں پاؤں لت پت ہوجاتے ہیں۔ سورج کی گرمی بازار کے اندر نہیں پہنچتی جس کی وجہ سے پانی دیر میں خشک ہوتا ہے۔

پھلوں کے اقسام میں یہاں خربوزہ، تربوز، سیب، آلو بخارا، انار، لیموں اور کئی قسم کے انگور ملتے ہیں۔ خشک پھلوں میں مویز منقی، کشمش، بادام اور پستہ، خشک آلو بخارا بہت ہوتا ہے۔

اہل استنبول کے محاسن

عیب بھی جملہ گفتی ہنرش نیز بگو کے مصداق اہل

استنبول کے محاسن کا ذکر بھی ضروری ہے۔ استنبول کے لوگ خاص طور پر ترک عموماً سنجیدہ مسافر نواز، نرم دل اور مہمان دوست ہوتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے قوانین بہت کچھ مٹ جانے کے باوجود، اسلامی ریاستوں کے قوانین میں سب سے زیادہ منصفانہ ہیں۔ اگرچہ مجھے ان کے اصول و قوانین کی زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی لیکن جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ بادشاہ بے وجہ خونریزی اور لالچ و ہوس سے دور رہتا ہے اور اپنے وزیروں کے مشورے ——— کے بغیر کسی اہم کام میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا، امراء ہمیشہ امید و بیم کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ خلافِ شریعتِ اسلامی کوئی کام کرے۔ ہمیشہ اس سلسلے میں اپنی جان کے ڈر سے کانپتے رہتے ہیں۔ امراء اپنی بھلائی کے خیال سے کسی بغاوت اور سرکشی پر آمادہ نہیں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص سرحدی علاقوں میں اقتدار حاصل کر کے سرکشی کرتا ہے تو بادشاہ اور وزیر اس پر قابو پانے کے بعد معاف کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی سرکشی اور دشمنی عام طور پر ظاہر نہیں ہوتی۔ اور اس پر قابو پا کر مکمل تدارک کر دیا جاتا ہے۔ چھ سو سالہ عثمانی حکومت نے سینکڑوں بغاوتوں کو اسی طرح دلجوئی اور دفع الوقتی کے ذریعہ ختم کر دیا۔

عدالتی احکامات کی تعمیل میں سختی اور زنانہ قوانین

ان کے یہاں جج اگرچہ رشوت خور ہیں اور اکثر بے علم ہیں۔ لیکن ان کے احکامات اور فیصلے بہت سخت ہوتے ہیں۔ حکام کو ان کے فیصلوں میں دخل اندازی کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ جو بھی فیصلہ غلط یا صحیح کر دیتے ہیں اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ججوں کو مقرر اور معزول صدرِ اعظم کرتا ہے جو عثمانی خلیفہ کی طرف سے دارالسلطنت میں رہتا ہے۔ جج کا تقرر صرف ایک سال کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہٹا دیا جاتا ہے۔ اگر اس نے نیک نامی حاصل کی ہے تو کسی دوسرے شہر میں جج بنا دیا جاتا ہے اور اگر بدنامی کے ساتھ الگ ہوا تو پھر اپنے گھر بیٹھتا ہے۔

اسی طرح عورتوں سے متعلق ترکوں کے اصول وضوابط، ہندوستان اور ایران کے مقابلہ میں زیادہ منصفانہ ہیں۔ کیونکہ امیروں اور معزز لوگوں کی خواتین برقع اوڑھ کر چہرہ کھلا رکھتی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے ملنے کے لیے باغات اور تفریح گاہوں میں جاتی ہیں، سڑکوں اور بازاروں میں گھومتی ہیں۔ ان کے ساتھ میں پندرہ سال کی عمر تک کے لڑکے بطور خادم جاتے ہیں۔ ترک عورتیں ہندوستانی عورتوں کی طرح مقید نہیں رہتی ہیں۔ اور نہ دنیا کے حالات سے بے خبر ہوتی ہیں۔ اور نہ ہی مردوں کے دیدار کی پیاسی ہوتی ہیں۔

ترکوں کے حرم سرا میں عورتوں کی کثرت ہوتی ہے۔ مگر نکاحی عورت ایک ہی ہوتی ہے۔ باقی گرجستان، چرکس کی حسین وجمیل کنیزیں ہوتی ہیں جن کا حسن مشہور ہے۔ ان کنیزوں کا لباس اور خوراک تو ویسی ہی ہوتی ہے۔ جیسی ان کی منکوحہ بیوی کی۔ مگر وہ سب منکوحہ بیوی کے احکامات کی پابند ہوتی ہیں۔ سلطان کی لڑکیوں اور بہنوں کی بھی شادیاں کی جاتی ہیں۔

اگر سلطان کے یہاں کوئی لڑکا کسی کنیز کے بطن سے پیدا ہوتا ہے تو سلطان کی مقرر کی ہوئی دایہ اس کو مار ڈالتی ہے اور اس کی اجازت ماں باپ دونوں مجبوراً دیتے ہیں اس قبیح رسم کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔ کیونکہ اگر اس بات سے ڈرتے ہیں کہ سلطنت کی شرکت میں جھگڑا ہوگا تو چاہیئے کہ عثمانی شاہزادوں کے ساتھ بھی یہی عمل کیا جائے۔ اس کے بجائے ان کے لیے صرف قید کا حکم ہوتا ہے۔ کنیزوں کو قید نہیں کیا جاتا۔ اگر وہ مالک کی نظر سے گر گئی تو کسی غلام کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

غلاموں کی کثرت اور لونڈیوں کی افراط کے باعث اکثر ترک لواطت کی عادت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ اس کی برائی کا اثر بھی ان پر ظاہر نہیں ہوتا اور آنکھوں سے حیا بھی مٹ جاتی ہے۔ ایسے امرد استنبول کے اکثر محلوں میں رہتے ہیں اور تجربہ خانوں کی طرح لوگ دلالوں کی مدد سے روپیہ خرچ کر کے ان کے گھروں میں جاتے ہیں اور عشق و محبت کے تذکروں سے مشغول کرتے ہیں۔ ان کے ایک گانے

کا ترجمہ یہ ہے:

"عیش و نشاط کی محفل گرم کرو۔ اس کے حسن کا ذکر کرو جس کو ہم چاہتے ہیں اور جس کو غیر عرب بچہ کہتے ہیں اور عجم والے جوان۔"

لیکن معزز اور شریف لوگ اس ناشائستہ کام سے دور رہتے ہیں اور شرع کی پابندی کرتے ہیں۔ پانچوں وقت کی نماز نوافل کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ۔ ماہ رمضان میں روزے رکھتے ہیں۔ چاہے سفر میں ہوں، اور سفر کی نماز کبھی ترک نہیں کرتے۔

استنبول کے واقعات

اس شہر میں میری مصروفیات یہ رہی ہیں کہ جب انگریزی سفیر لارڈ النگن نے عثمانی وزیر رئیس آفندی کو میرے یہاں پہنچنے کی اطلاع دی اور حالات بتائے تو اس نے ملاقات کا شوق ظاہر کیا۔ دوسرے دن ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔

میں نے اس سے ملاقات کی۔ اس نے نصف قد سے جھک کر میری تعظیم کی اور قہوہ اور حقہ سے تواضع کی۔ چونکہ وہ فارسی نہیں جانتا تھا اور اس کی طبیعت صاف نہ تھی۔ اس لیے اس سے مل کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے ترکی کے وزیر اعظم یوسف پاشا سے ملنے کی درخواست کی۔ اس نے اسی وقت ایک آدمی مجھے بلانے کے لیے بھیجا جب میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک عالی شان ایوان کے اندر داخل ہوا جس میں نفیس فرش اور آئینہ لگی ہوئی کرسیاں بچھی تھیں۔ ایک اونچے مقام پر وزیر اعظم کی نشست تھی چالیس پچاس غلام اور کنیزیں صف بستہ کھڑی تھیں۔ مجھے عزت کے ساتھ بٹھایا اور قہوہ سے تواضع کی۔ کچھ دیر گفتگو ہوئی۔ اس کی ڈاڑھی بہت لمبی تھی اور میری ڈاڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر اسی پر باتیں ہوئیں۔ اس نے مجھ کو داڑھی رکھنے کی ترغیب دی۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد کبھی داڑھی نہیں منڈھوائی۔ جب میں وزیر اعظم کے دربار سے واپس ہوا تو

احمد آفندی معروف بہ کچا بیگ وزیر داخلہ نے آدمی بھیج کر مجھ کو بلوایا۔ میں اس سے مل کر بہت خوش ہوا کیونکہ وہ حسن صورت کے ساتھ ساتھ کمال باطنی بھی رکھتا ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کی محبت ہر ملاقاتی کے دل پر اثر کر جاتی ہے۔ میں نے تمام عمر میں مسلمانوں کے ایسا خوش اخلاق اور خوش اطوار شخص نہیں دیکھا۔ اب تک اس کی مبارک صورت میری نگاہوں میں پھرتی رہتی ہے۔ اس کی شیریں کلامی اور مہربانی کی یاد دل میں باقی ہے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے میرے ساتھ ایک آدمی کو مقرر کر دیا کہ وہ مجھ کو مسجد ایا صوفیا اور دیگر خاص مقامات کی سیر کرائے زیارت گاہوں میں خاص مقامات بھی تھے۔ یعنی حضرت ابوایوب انصاری صحابی رسول ؐ اور حضرت ابوسعید خدری صحابی ؓ کے مزارات۔ یہ دونوں صحابی عبدالملک بن مروان کی فوجوں کے ساتھ فرنگیوں سے لڑنے کے لیے آئے تھے اور یہیں شہید ہو گئے تھے۔ اسی جگہ ان کے مزارات ہیں۔

دوسری بار جب میں سلطان کے دربار میں حاضر ہوا تو قاموس لغت کے فارسی ترجمے کی دو جلدیں ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔ جو میں نے بہت گراں قیمت پر خریدی تھیں ساتھ میں یہ شرط بھی لگا دی کہ ان کو کتب خانہ کی زینت نہ بنایا جائے۔ بلکہ اس کی طباعت کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے تاکہ دوسرے لوگ استفادہ کر سکیں۔ سلطان نے میری باتوں کو لکھوا کر دستخط کر دیئے اور یادداشت کے طور پر دفتر بھیج دیا۔ میرے لیے خلعت اور انعام کا حکم ہوا۔ مگر میں نے قبول نہیں کیا۔ اور عرض کیا کہ کتابیں پیش کرنے کا مقصد حصول انعام ہرگز نہیں بلکہ مقصد آخرت کا ثواب ہے۔ مجھے کسی قسم کا لالچ نہیں ہے۔

تیسری ملاقات کے بعد جب مجھے رخصت کیا تو میرے لیے ایک مہماندار مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مجھ کو استنبول سے بغداد تک قاصد کی حیثیت سے پہرہ میں آرام سے پہنچایا دیا جائے اس کے علاوہ تین فرمان عطا کیے۔ ایک فرمان راستہ کے تمام گورنروں اور حاکموں کے نام تھا کہ راستہ کے ڈاک بنگلوں میں جہاں میں ٹھہروں، وہاں کا حاکم میری خاطر کرے اور رہنے اور کھانے کا اچھا انتظام کر دے۔ قاصد کے ملنے میں دو گھوڑے ایک سواری کے لیے اور دوسرا سامان رکھنے والی گاڑی کے لیے دیے جاتے ہیں۔

دوستانِ استنبول

معلوم ہونا چاہیے کہ حکومت عثمانیہ کے جن امرا اور وزرا کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ استنبول کے معززین میں سے کسی کے ساتھ میری ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کے کئی سبب تھے۔ اوّل یہ کہ مدّتِ قیام کم تھی۔ اس ملک میں میرا قیام آٹھویں ماہ رجب سے پانچویں شعبان تک کل ۲۸ دن رہا۔ چونکہ برف باری کا زمانہ قریب تھا۔ اور برف باری کے زمانہ میں بغداد کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اس لیے سفر میں عجلت کی۔ دوسرے یہ کہ میں ایرانی لباس پہنتا تھا جس کو ترک پسند نہیں کرتے تھے اور میں نے اپنا لباس ترک کرنا پسند نہیں کیا۔ ان لوگوں کو ایرانی ملک و ملت سے اس درجہ عداوت ہے کہ ان کا چہرہ دیکھنا بھی مکروہ خیال کرتے ہیں۔ اور ان کے خون کو حلال مانتے ہیں تیسرے یہ کہ میں سنّتِ رسول کے مطابق چاہتا تھا کہ ملاقات کے وقت پہلے وہ لوگ سلام کریں۔ لیکن وہ اپنے غرور جاہ و حشم کے باعث مجھ سے سلام میں سبقت کی توقع کرتے تھے۔ لیکن اوسط طبقے کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ بعض غریب ایرانی اور ہندوستانی بھی ملے۔ خاص طور پر پشاور کے افغانی اور قندھاری جو طلبِ علم یا سیاحت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ پنجاب کے کچھ لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی، ان سب کا ذکر موجبِ طوالت ہے۔ ان میں سے اکثر کو میں نے غدار، ترس اور مددگار پایا۔

اسی طرح کچھ ارمنیوں کا ذکر کرنا ہے کہ ان میں سے بعض حلب کے رہنے والے ہیں اور بعض توقات اور امانیہ وغیرہ کے جو آرمینیا کے علاقہ ہیں اور سلطنت عثمانیہ کے زیرِ نگیں ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر غلاطہ میں رہتے ہیں۔ ترکی اور ارمنی زبانیں بولتے ہیں اور تجارت پیشہ ہیں۔ بعض دولت مند تاجر مجھ سے ملنے آئے اور مجھ کو اپنے مکانوں پر بھی لے گئے۔ اگرچہ ان لوگوں نے اپنی فطری کنجوسی کے باعث کبھی دعوت نہیں کی۔ لیکن ان کی رات کی محفلوں میں شرکت کرکے خوبصورت لڑکیوں کے حسن و جمال کو دیکھ کر محظوظ ہونے کا موقع ملا۔

میرے ملاقاتیوں میں سے ایک مسٹر لوک ہیں جو کمپنی کی ملازمت میں چالیس سال سے اس جگہ مقیم ہیں۔ انھوں نے انگریزی اخلاق کو بالکل فراموش نہیں کیا ہے۔ اسی

یہ میری بڑی خاطر کی۔ یعنی میری کوئی بھی مدد نہیں کی۔ حالانکہ مجھ کو ان کی مدد درکار تھی۔ میں استنبول سے بغداد تک سفر کے لیے ایک قاصد چاہتا تھا۔ تاکہ مجھ کو عثمانی حکومت سے مدد طلب نہ کرنا پڑے۔ عام طور پر قاصد مقررہ اخراجات پر مل جاتے ہیں۔ مگر مسٹر ترک نے مجھ سے کہا کہ خود کمپنی ڈیڑھ ہزار قرش قاصد کی اجرت ادا کرتی ہے۔ اس لیے اتنا ہی تم کو دینا پڑے گا۔ میں وہاں کے حالات سے ناواقف تھا۔ اس لیے پریشان ہو کر دربارِ سلیمانی سے مدد طلب کی۔ اور بغداد پہنچا۔ مسٹر ترک نے جو اجرت بتائی تھی تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی بات بالکل غلط تھی۔ بعض لوگ ڈیڑھ دو سو قرش دے کر استنبول سے بغداد آئے تھے۔

دوسرا ملاقاتی مسٹر پہانی ہے یہ لارڈ ڈانگن کا ترجمان ہے اور یونان کا باشندہ ہے۔ اس نے بہت سی دولت جمع کر لی ہے۔ وہ لارڈ ڈانگن کے نام سے لوگوں کے بہت سے کام حکومت عثمانی سے کرا لیتا ہے

اور لوگوں سے اس کا معاوضہ حاصل کرتا ہے۔ اکثر مسافر مجبور اور پریشان ہو کر، جو کچھ مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ چونکہ اس کو مجھ سے کوئی چیز حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے دل میں حسد اور کینہ رکھے ہوئے تھا۔ میرے خلاف بھی لارڈ ڈانگن کے کان بھرے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

ایک تیسرا ملاقاتی مسٹر ہمر تھا یہ آزاد خیال نوجوان حسنِ ظاہری کے علاوہ باطنی کمالات سے بھی آراستہ ہے نہایت ذی فہم اور خوش اخلاق ہے۔ جرمنی کا رہنے والا ہے۔ لیکن انگریزی۔ فرانسیسی عربی اور فارسی زبانیں بھی خوب جانتا ہے۔ اس سے قبل سر سڈنی کا ترجمان رہ چکا ہے۔ عکہ کی لڑائی میں اس کے ساتھ تھا۔ آج کل جرمنی کے سفیر مقیم استنبول کا ترجمان ہے۔ جرمنی کا سفیر استنبول میں بہت شان و شوکت سے رہتا ہے۔ مسٹر ہمر ہر روز مجھ سے ملنے آتا تھا۔ اس نے میری چند غزلوں کا انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ کیا اور ان کو شائع کرا دیا۔ اس کی نقلیں لندن، پیرس، اور جرمنی کے دارالسلطنت ویانا بھیج دیں۔

ایک دن میں مسٹر ہمر سے ملنے گیا ہوا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت جرمنی سفیر

کے یہاں شطرنج ، گنجفہ اور چائے کی محفل گرم تھی۔ جس میں ارمنی، یونانی اور فرنگی خواتین بھی شریک تھیں۔ سفیر موصوف کو معلوم ہو گیا کہ میں مسٹر ہمر کے یہاں موجود ہوں۔ وہ محفل سے اٹھ کر مسٹر ہمر کے گھر آیا اور مجھ کو اپنے ساتھ اس محفل میں لے گیا۔ اور اپنی جرمنی بیوی سے تعارف کرایا۔

دونوں آزاد مشرب اور عقلمند ہیں۔ ان کے چہرہ کی چمک خوبی گفتار اور شان و شوکت سے اندازہ ہوا کہ جرمن قوم فرنگستان کے بہترین باشندے رہے ہوں گے میں نے لندن میں بھی جرمنی کے چند آدمی دیکھے تھے جو اچھی صفات سے آراستہ تھے۔

اب میں بغداد کے سفر کے واقعات اور راستے کے حالات روزنامچہ کے طور پر تحریر کروں گا۔ تاکہ آئندہ دوسرے مسافروں کے کام آئیں۔

استنبول سے بغداد تک روزنامچہ

چار شعبان ۱۲۱۷ھ کو یکشنبہ کے دن شہر قلاتہ سے کشتی پر سوار ہو کر استنبول پہنچا مسجد محمود پاشا کے پاس ایک منزل میں قیام کیا۔

پانچ ماہ شعبان کو دوشنبہ کے روز استنبول سے روانہ ہوا اور بحر مورہ کو عبور کر کے شہر اسکودار میں قیام کیا۔ یہ شہر بغداد کی سمت بحر مذکور کے کنارے آباد ہے۔

۶ شعبان کو سہ شنبہ کے دن (۱۴ دسمبر ۱۸۰۲ء) اسکودار سے پہر دن چڑھے روانہ ہوا۔ اور رات کا تہائی حصہ گزار کر مقام کبنرہ پہونچا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ منزل قافلوں کے لیے ۱۲ گھنٹے کے سفر میں طے ہوتی ہے۔ گویا قافلہ ایک گھنٹہ میں ایک فرسخ راہ چلتا ہے۔ ایک فرسخ چار انگریزی میل کے برابر ہوتا ہے اور ہندوستان کے دو کوس کے برابر[1] شعبان کی ۷ تاریخ کو چہار شنبہ کے دن صبح گھوڑے پر سوار ہوا اور ۲۶ میل کا

[1] مصنف نے ہر جگہ فاصلہ فرسخوں میں لکھا ہے ترجمہ میں فرسخ کو میلوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے (مترجم)

سفر طے کر کے ایک پہر دن رہے۔ شہر اشت پہنچا جو اصفیت کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں کے اکثر باشندے عیسائی ہیں۔ بازاروں میں ہر چیز مل جاتی ہے۔

۸ شعبان کو پنجشنبہ کے دن صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہوا اور قصبہ طلانچہ پہنچا جو نہایت گندی جگہ ہے اور اصفیت سے ۲۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں پر گھوڑا تبدیل کیا اور ۴۰ میل کا سفر کر کے خندق نامی گاؤں میں قیام کیا۔ ان دو منزلوں کی کل مسافت ۶۸ میل تھی۔ نصف شب کے بعد ڈاک بنگلے پر پہنچا۔ صاف ستھری جگہ تھی لوگ بھی اچھے تھے۔ سڑک کے وسط میں صاف پانی کی نہر جاری تھی۔ یہاں مجھ کو آرام ملا۔ اس منزل سے برف باری شروع ہو گئی اور نہروں کا پانی منجمد ہونے لگا اور راستہ رطوبت کی وجہ سے خراب ہو گیا۔

یہاں سے جمعہ کے دن صبح جلدی روانہ ہوا اور مقام دوزجہ میں جو ۴۸ میل پر واقع ہے۔ گھوڑا تبدیل کیا اور آگے روانہ ہوا۔ دو تہائی رات گذرنے کے بعد مقام پولی میں قیام کیا۔ اس دن بھی دو منزلوں کو ایک کیا اور ۹۶ میل کی مسافت طے کی۔ پولی ایک گاؤں ہے جس کے مغرب میں ایک پہاڑ ہے جو کہیں بہت اونچا اور کہیں بہت نیچا ہے۔ تقریباً ۲۰ میل لمبا ہوگا۔ اس کی ایک چوٹی بہت بلند ہے اس کے اندر جو راستہ ہے وہ چیونٹیوں کے راستہ کی طرح پیچ و خم رکھتا ہے۔ اس خطرناک راستہ کو رات کی تاریکی اور بارش کی شدت اور ٹھنڈی ہوا میں طے کیا۔ اندھیرے کی وجہ سے ہاتھ اور لگام بھی نظر نہیں آتی تھی۔ گھوڑے کی لگام اس کی مرضی پر چھوڑ دی تھی۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ اگر گھوڑا چار انگل راستہ سے ہٹے تو کئی میل گہرے کھڈ میں پہنچ جائے۔ مسافروں کو چاہیے کہ کبھی رات میں یہ راستہ طے نہ کریں۔ دوزجہ کے لوگ چڑچڑے اور سگ صفت ہیں۔ ہاتفی کا یہ شعر انہی کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ ع:

ہمہ زود خشماں، دیر آشتی
سرشتہ بخشم اند پندا شتی

شنبہ ۱۰ شعبان کو ایک تہائی دن رہے۔ کرہ گاؤں میں پہنچا۔ گویا ۴۰ میل کی مسافت طے کی۔ اور یہ ارادہ تھا کہ کھانا کھا کر آگے روانہ ہو جائیں گے۔ مگر ڈاک بنگلہ کا نگران میرے ساتھ کے قاصدوں میں سے ایک کے ساتھ بہت مراسم اور دوستی رکھتا تھا۔ اس نے اصرار کر کے روک لیا اور سب کو بہت لذیذ کھانا کھلایا۔ یہاں قاز کا بہت لذیذ گوشت کھانے کو ملا۔

۱۱ شعبان یکشنبہ کے دن صبح سویرے روانہ ہوا پہلے ۳۲ میل کا فاصلہ طے کیا اور مقام باسیدر پہنچا۔ بعد ازاں مقام فراحلہ تک ۴۰ میل کی مسافت طے کی۔ اور ایک تہائی رات گزار کر گھوڑے تبدیل کیے۔ اس کے بعد دو تہائی رات سفر کر کے مقام فراجلہ پہنچے یعنی بارہ میل طے کیے۔ اور کھٹملوں اور مچھلوں کے درمیان رات گذاری۔ اس دن کل تین منزلیں طے کیں، جن کی مسافت ۹۲ میل تھی۔

۱۲ شعبان کو دوشنبہ کے دن مقام فتح حصار میں گھوڑے تبدیل کیے۔ یہاں کا ڈاک بنگلہ بہت گندہ ہے اور اس کے ملازم زاہد نما چور ہیں۔ یہاں دو گھنٹے گھوڑوں کی نعل بندی میں صرف ہوئے۔ یہاں نصف شب گزار کر روانہ ہوئے اور ۴۰ میل کا سفر کر کے مقام تونیہ سے پہنچے۔ تونیہ بڑا شہر ہے مگر اس کا ڈاک بنگلہ بہت خراب ہے جس کو دیکھ کر متلی ہونے لگتی ہے۔ وہاں کے لوگوں پر خدا کی لعنت ہو، بے حد لالچی اور درندہ صفت ہیں۔ ان کا حال لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ دوسرے دن انھوں نے گھوڑے بدل کر دیئے۔ اور انعام کے لیے اس قدر اصرار اور دیر گردی کی کہ کئی بار حاکم کے پاس جانا پڑا۔ ایک پہر دن اس کشمکش میں گذر گیا۔ ۱۳ تاریخ کو سہ شنبہ کے دن ۲۶ میل کا فاصلہ طے کر کے مقام حاجی حمزہ، پہونچے اور گھوڑے تبدیل کیے، اور نصف شب کو عثمان جرق نامی گاؤں میں گزر ہوا۔ یہ بہت گندہ مقام ہے، تھوڑی دیر سونے کا موقع ملا۔ یہ دونوں منزلیں سب سے زیادہ سخت تھیں۔ کیوں کہ راستے میں اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ان کے راستے ایسے زینہ نما ہیں کہ گویا آسمان کی چھت پر چڑھنے کے لیے بنائے گئے ہوں

۱۴ شعبان کو چہارشنبہ کے دن شام کے وقت مرسوان پہنچا۔ یہ ۵۶ میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہاں گھوڑے تبدیل کیے اور نصف شب کو بمقام اماتیہ پہنچا جو ۴۴

میل ہے۔ مرسوآن ایک بڑا قصبہ ہے جو میدان میں واقع ہے۔ یہاں کا ڈاک بنگلہ بہت صاف ستھرا اور آرام دہ ہے۔ لوگ سلیقہ مند ہیں۔ کھانا اچھا ملا اور گھوڑے بھی جلدی تیار کر دیئے گئے۔ بخلاف اس کے اماآیہ ایک بڑا شہر ہے۔ پانی اور ہوا کے چرخ اور دوسری چیزوں کی کثرت ہے۔ آبادی بھی زیادہ ہے۔ لیکن اس کا راستہ بہت خطرناک ہے۔ گلیاں تنگ اور گندی ہیں۔ ڈاک بنگلہ بھی ردی ہے۔ باشندے دغاباز ہیں۔ مسافروں کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ کھانا بھی خراب ملا۔ یہ خرابیاں اس راستے کے تمام بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ البتہ چھوٹے دیہاتوں میں بہت کم ہیں۔

اماسہ کی تاریخ اماسہ وہ مقام ہے جہاں سلطان بایزید یلدرم نے حفاظت کے خیال سے پناہ لی تھی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب امیر تیمور گورگان نے سیواس کے مقام پر سلطان بایزید کو شکست دی تھی اور اس کو گرفتار کر لیا تھا۔ تمام امرا اور شہزادے ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے۔ امیر تیمور نے سلطان محمد پر حملے کے لیے فوجیں روانہ کیں مگر ان فوجوں کو شکست ہوئی۔ اور تیمور اس پر قابو نہ پا سکا اور سمرقند واپس چلا گیا۔ اس کے بعد سلطان محمدؒ نے بیس سال تک اس مقام کو اپنا دارالسلطنت بنائے رکھا اور عثمانی شہزادوں سے جنھوں نے طوائف الملوکی اختیار کر رکھی تھی جنگ کی اور بارہ سال بعد استنبول کو بھی اپنے بھائی سے چھین لیا۔ اس طرح وہ اپنے باپ کی مانند ساری سلطنت عثمانیہ کا حکمران بن گیا۔

۱۵ رشعبان کو پنجشنبہ کے دن ترخان نام کے ایک گاؤں میں قیام کیا۔ اپنے خرچ سے گھوڑوں کو جو کھلایا۔ کیونکہ ڈاک بنگلوں کے علاوہ کہیں اور ٹھہرنے پر حکومت عثمانیہ سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ یہ گاؤں بہت صاف ہے اور لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔

۱۶ رشعبان کو جمعہ کے دن ہم نے توقات میں منزل کی۔ اماسیہ سے توقات کا فاصلہ ۶۰ میل ہے۔ اور یہ ارمنیوں کا مشہور شہر ہے۔ پھل بہت سی اقسام کے ملتے ہیں مثلاً انگور ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ سفید رنگ کا ایک انگور ایک انگلی تک لمبا ہوتا ہے۔ اس کا چھلکا بہت سخت ہوتا ہے۔ مگر اتنا باریک کہ شمع کی لو بھی اس کے آرپار نظر آتی

ہے۔ اس کے بیج ماش کے دانہ کے برابر ہوتے ہیں۔ قیمت میں بہت ارزاں ہیں۔ یہاں ڈاک بنگلہ بہت گندہ ہے۔ باشندے بڑے خراب، کھانا نہایت بدمزہ ملا۔ ڈاک بنگلہ کے منتظم نے گھوڑے دینے میں اتنی تاخیر کی کہ ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ تاریخ وہیں گذر گئی آخر کار حکام نے ان مکاروں کے خچر اور گھوڑے زبردستی پکڑ کر ہمارے حوالے کیے۔ جب ہم سوار ہونے لگے اس وقت ڈاک بنگلہ کا سارا عملہ بھاگ گیا۔

اماسیہ اور توقات کے درمیان کا تمام راستہ پہاڑی کوہستانی اور پُرپیچ ہے۔ اور نہایت دشوار گذار۔ یہ پہاڑ اس پہاڑ سے ملا ہوا ہے جس میں سونے اور چاندی کی کانیں اس سے استنبول میں سکے قرش وغیرہ ڈھالے جاتے ہیں۔ توقات سے برف باری شروع ہو گئی۔

توقات سے سیواس تک ۹۶ میل کی ایک منزل ہے۔ برف باری کے خوف سے دو منزلیں کر دیں تاکہ رات تک راستہ پورا کر لیں۔ اور اگر برف زیادہ گرے تو اس وقت آبادی سے زیادہ دور نہ ہوں تاکہ وہاں قیام کر سکیں۔ ان دو دنوں میں خوب برف گری اور ہوا اس قدر تیز تھی کہ دو کوز ور خچر پہاڑ کی چوٹی سے گر پڑے اور ان کی ہڈیاں چور ہو گئیں سیواس بڑا شہر ہے اور استنبول اور بغداد کے تہائی راستہ پر واقع ہے۔ مگر گندہ بہت ہے۔ راستوں میں پانی اور کیچڑ، اتنا ہوتا ہے کہ پاؤں دھنس جاتے ہیں۔ وہاں ہم جس پاشا کے مہمان ہوئے اس کا مکان بھی بہت گندہ تھا اور مچھروں کی بھرمار تھی تو خیال کیجئے کہ ڈاک بنگلے کا کیا حال ہوگا۔ توقات سے سیواس تک تمام راستہ کوہستانی اور دُشوار گذار ہے۔ برف باری کی وجہ سے زمین آسمان سفید نظر آرہے تھے۔ یہ سارا علاقہ ارمنیہ میں شمار ہوتا ہے۔ پہاڑ کے اس طرف کوہستان قارص اور ارزن ہیں۔ ارمنیہ کا دارالسلطنت روم سے منسوب ہے۔ وہ ہم سے چار میل دور بائیں سمت واقع تھا یہ قارص اور ارزان وہ ہیں جن کا ذکر نظامی کی مثنوی میں موجود ہے۔

۲۲ر تاریخ کو پنجشنبہ کے دن ایک گاؤں میں قیام کیا جس کا نام ولاش تھا اور جمعہ کو لوالسلاش پہنچا۔ شیواس سے اس کا فاصلہ ۸۰ میل ہے۔ یہاں کشمش اور منقے خوب کھائے جو یہاں بہت افراط سے ملتے ہیں اور اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ میں نے عمر

پھر بھی اور کہیں نہیں کھائے۔ بالبراتسلاش گاؤں برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ گاؤں کے اندر جانے کا راستہ بڑی مشکل سے ملا۔

۱۴ تاریخ کو شنبہ کے دن ہچو نامی گاؤں میں قیام کیا۔ ۱۵ تاریخ کو حسن چلبی میں ٹھہرے۔ ۱۶ تاریخ کو دوشنبہ کے دن ۴۴ میل طے کر کے احسن بدری نام کے گاؤں میں اترے۔ یہ مقام توقات سے زیادہ سرد ہے۔ برف باری کی کثرت ہے۔ یہاں کے سب باشندے داغستانی ہیں۔ اور مسلک شیعہ کے پیرو ہیں۔ نادرشاہ کے خوف سے بھاگ کر یہاں پناہ لی ہے۔ عموماً گندہ طبیعت ہیں۔ مسافروں کو خوب لوٹتے ہیں۔ جب تک مسافرت دوگنی قیمت وصول نہیں کر لیتے۔ کوئی چیز کھانے کے لیے نہیں پکاتے ہیں۔ اور جب دسترخوان بچھایا جاتا ہے تو پہلے خود اس پر ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ان کی عورتیں میوے وغیرہ فروخت کرنے کے لیے لاتی ہیں اور ان کا خریدنا لازمی قرار دیتی ہیں۔ اور فروخت کرنے کے بعد وہ ہر ایک کے گھر کے اندر جا کر فروخت کی ہوئی چیزیں واپس لے آتی ہیں۔ اگر کوئی واپس کرنے میں تامل کرے تو یہ لوگ گالیاں دیتے ہیں۔ اور صبح رخصت ہوتے وقت شور و غوغا کر کے لڑائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اکثر رات کے اندھیرے میں لوٹ بھی لیتے ہیں۔ یہ چند منزلیں برف باری کی وجہ سے اور اس گروہ کی غارت گری کے ڈر سے بہت سست رفتار سے طے ہوئیں۔ چنانچہ جب تہائی دن باقی ہوتا تھا تو ہم منزل پر پہنچ پاتے تھے۔ یہ دن مجھ پر بہت سخت گذرے۔ کیوں کہ اس مقام پر جو لوگ اپنے ناہمدردوں سے ملنے آتے۔ وہ میرے پاس بھی آکر بیٹھتے اور قہوہ اور حقہ پیتے۔ اس طرح میری روح کو گھلاتے تھے۔

شہر ملاطیہ شنبہ کے دن ۸۸ میل کا سفر کر کے دوپہر کے وقت شہر ملاطیہ پہنچ گئے۔ یہ بہت بڑا شہر ہے۔ مگر نہایت گندہ۔ استنبول کے قریب راستہ پر واقع ہے۔ استنبول کی سمت ہر میل پر پتھر کے نشان نصب ہیں۔ جو مسافر کے مردہ دل کو اور نیم جان کر دیتے ہیں۔ اس شہر میں ایک متعلم کے گھر مہمان ہوا اور اس سے قاصد کی شکایت کی۔ اس متعلم کی سفید داڑھی ایک ہاتھ بھر لمبی تھی۔ اور جس وقت میں اس سے

باتیں کر رہا تھا۔ اس کے بچے ہماری باتوں پر ہنس رہے تھے اور گفتگو میں دخل اندازی کر رہے تھے۔ اور وہ بزرگ شرمندہ ہو کر لڑکوں کو منع کر رہا تھا اور ان کو جھڑک رہا تھا۔ خدا کی لعنت ہو اس پر اس کے گھر والوں پر۔

ملاطیہ سے برف باری کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن بارش ہوئی۔ ماردین اور سرحد بادیہ تک بلند پہاڑوں پر برف باری نظر آتی تھی۔ کہتے ہیں ان اطراف میں کبھی کبھی بارش ہوتی ہے۔ لیکن بادیہ کی سرحد سے موصل اور بغداد تک کبھی کسی نے برف کی صورت بھی نہیں دیکھی

دریائے فراط کو عبور کیا

چار شنبہ کو ملاطیہ سے ۲۸ میل کے فاصلے پر مقام ایزاد علی؁ میں قیام ہوا۔ ملاطیہ سے ۸ میل کے فاصلہ پر دریائے فراط نظر آیا۔ جو دو پہاڑوں کے درمیان بڑی شان کے ساتھ نہایت تیز رفتار بہہ رہا تھا۔ گھاٹ پر پہنچ کر کشتی لی اور اس میں بیٹھ کر دریا عبور کیا۔ ایزاد علی کردوں کا قصبہ ہے۔ ان کا سردار ایک مغرور اور بدخود غلط آدمی ہے۔ مسافروں کو اونٹ کے گوشت کا بدمزہ کھانا کھلاتا ہے۔ چونکہ یہاں ڈاک بنگلہ نہیں ہے۔ اس لیے یہاں کا معمول ہے کہ خواہ مخواہ گھوڑے بدلے جائیں۔ حالانکہ وہ لوگ گھوڑوں کا کرایہ اتنا گراں کر دیتے ہیں کہ وہ کھانے سے دس گنا ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ گاؤں دریائے فرات کے کنارے واقع ہے۔ یزیدیوں کی سنت کے مطابق لوگوں کو پیاسا رکھتے ہیں۔ آدھی رات تک پانی ہم کو کم ملا۔ اور اس کے بعد غائب ہو گیا۔ صبح کو بغیر منہ دھوئے وہاں سے کوچ کیا۔

۲۹ تاریخ کو پنجشنبہ کے دن ۴۸ میل کا سفر کر کے شام کے وقت خرپوت پہنچے۔ ایزاد علی سے ۱۶ میل تک راستہ دریائے فرات کے کنارے اور پہاڑ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اس کے بعد فراط سے دور ہو جاتا ہے۔ اور پہاڑوں پر سے ہو کر گزرتا ہے۔ راہ میں ایک بہت بلند پہاڑ بھی ہے۔ اس کے راستے اتنے اونچے نیچے ہیں کہ گھوڑے کی پشت سے کئی بار زین الٹ گیا اور میری برساتی جو زین کے ساتھ بندھی تھی اور سردی اور بارش سے میری حفاظت کرتی تھی ایک جگہ گر کر غائب ہو گئی۔ اس لیے چند منزلوں تک مجھے بہت زحمت اٹھانی پڑی۔ مختصر یہ کہ خرپوط کا ڈاک بنگلہ بہت پاکیزہ تھا۔ اور وہاں کے لوگ

بہت خوش اخلاق تھے۔ یہ راستہ کے چند اچھے ڈاک بنگلوں میں سے ایک ہے۔ یہاں کھانا بھی اچھا ملا۔ اور چلتے وقت عمدہ تیز رفتار گھوڑے ملے۔ اپنے ساتھیوں کے غلط مشورے کے باعث ایسی اچھی جگہ کو چھوڑ کر اندھیری رات میں خطرات میں پڑ کر اور راستے کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے آگے روانہ ہو گئے۔ اور اس کاروان سرائے میں پہنچے، جو آبادی سے دور اور پہاڑوں کے درمیان خربوت سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں نصف شب میں پہنچے۔ سرائے کے ملازم مہذب اور خدمتگزار تھے۔ بیچارے سو رہے تھے جب ہم پہونچے تو جاگ اُٹھے۔ اور جو کھانا اس وقت ممکن تھا مہیا کیا۔

خربوت اور اس کاروان سرائے کے درمیان میں ایک جھیل ہے جس کا پانی کھاری ہے۔ اور گہرائی بحرِ محیط سے ملی ہوئی ہے۔ اس کا رقبہ تیس چالیس میل ہے۔ اور اس کا راستہ بہت خطرناک ہے۔ کبھی پانی کے اندر سے ہو کر گذرتا ہے کبھی کنارے کنارے، پہاڑ کی تنگی بعض مقامات پر اتنی ہے کہ دو چار گھوڑے پھسل کر جھیل میں گر گئے۔ اور او پنچ نیچ کے باعث ان کو بچانے کے لیے پہنچنا بہت مشکل تھا۔ اس لیے ہم نے تلاش بھی نہیں کیا۔ اور بخیریت آگے بڑھ گئے۔ اس مقام سے تاریک رات اور بارش کی حالت میں گذرنا موت کے راستہ سے گذرنے کے برابر ہے۔

دریائے دجلہ کا منبع اور شہر ارغنہ

یکم رمضان المبارک سنہ ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کو جمعہ کے دن ۳۲ میل کا فاصلہ طے کر کے ارغنہ پہنچے۔ خربوت سے ارغنہ تک ۶۴ میل کا فاصلہ ہے۔ جس کو گذشتہ نصف شب اور آج نصف دن میں طے کیا۔ سارا راستہ پہاڑی ہے۔ جس نے گزشتہ تمام پہاڑی راستوں کی سختیوں کو بھلا دیا۔ ان پہاڑوں کے درمیان ایک پہاڑ ہے جبل محراب، بلندی میں ضرب المثل ہے۔ اس کے راستے میں تانبے کی کان ہے۔ اور دجلہ کا منبع بھی ہے۔

ہم نے دن میں کئی بار دریائے دجلہ کو عبور کیا۔ ہر جگہ پانی کم نظر آیا۔ اور بالکل زرد رنگ کا کیچڑ ملا ہوا تھا۔ لیکن بہنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ جوں جوں آگے بڑھتا ہے ترقی کرتا جاتا ہے۔ دیار بکر سے چند میل کے فاصلے پر ایک بڑے دریا کی صورت میں نظر

اور متعدد کاروان سرائے بھی ہیں۔

اسی شہر میں حضرت خالد بن ولیدؓ فاتح شام کا مزار بھی ہے۔ ان کی وفات یہیں ہوئی تھی۔ اس شہر کے پھلوں میں خربوزے، اور سردے بہت مشہور ہیں۔ یہاں کے خربوزے کی ایک قاش ڈیڑھ بالشت لمبی اور چھ انگل موٹی ہوتی ہے۔ نہایت میٹھا اور شاداب کھانے میں آیا۔ مگر وہاں کا ڈاک بنگلہ بدتر نظر آیا جس میں قیام کرنا مشکل معلوم ہوا۔ اس لیے بارش کی حالت میں احمد آفندی متعلم کے مکان پر قیام کیا۔ اور مسلسل بارش کی وجہ سے شنبہ سے پنجشنبہ تک اس مقام پر قیام کرنا پڑا۔ احمد آفندی نہایت خوش اخلاق شخص ہے اس نے اچھی طرح مہمان نوازی کی۔ میری برساتی راستہ میں گم ہوگئی تھی۔ اس نے مجھ کو ایک چھتری دی دیار بکر سے بغداد تک اس چھتری نے بہت آرام پہنچایا۔ البتہ اس نے قاصد کی تبدیلی کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اس سلسلے میں اس کو کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ البتہ ایک ملازم ماردین تک اپنی طرف سے مہمانداری کے لیے ساتھ کر دیا۔ پنجشنبہ کے دن راستہ میں ایک گاؤں آرام کرنے کے لیے ملا تھا۔ مگر قاصد کی خود غرضی کے باعث وہاں ٹھہر نہ سکا۔ نصف شب تک ۵۶ میل کی مسافت طے کر کے ایک سرائے میں رات گزاری۔ جو پہاڑوں کے درمیان اور آبادی سے دور واقع ہے۔ اس میں بخاری نہ تھی۔ آگ مکان کے وسط میں جلائی گئی تھی۔ اس کے دھوئیں اور کھٹملوں، مچھروں نے رات بھر سونے نہ دیا۔ نہ کھانے کے لیے کوئی چیز مل سکی۔ ارغنہ سے اس سرائے تک کئی بار لٹیرے سواروں کو دیکھا بلکہ ان سے مڈبھیڑ بھی ہوئی۔ مگر ہر بار کسی نہ کسی طریقے سے محفوظ رہے۔

۷، رمضان المبارک کو جمعہ کے دن۔ اس سرائے کے اطراف میں برف باری بہت ہوئی۔ اس لیے ڈر ہوا کہ اس مکان سمیت برف کے اندر سب دب نہ جائیں۔ دوبارہ سوار ہوئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے بہت تیزی کے ساتھ ۱۶ میل کا فاصلہ طے کر کے ماردین پہونچ گئے۔

بغداد کا انگریزی سفیر مسٹر جونسن بیان کرتا تھا کہ بغداد آنے کے وقت وہ اسی سرائے اور ماردین کے درمیان تھا کہ برف باری ہونے لگی۔ برف بہت تیز گر رہی تھی۔ اس نے گھوڑوں کی رفتار بہت تیز کر دی۔ کل ۱۱ گھوڑے تھے۔ بعض پر سامان تھا۔

کچھ فالتو تھے۔ اس نے اور ایک قاصد نے بڑی مشکل سے یہ طویل راستہ طے کیا اور ماردین پہنچے اور باقی تمام گھوڑے اور آدمی مع سامان کے برف کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے۔

شہر ماردین یہ شہر بھی ارضنہ کی طرح ایک بلند پہاڑ پر اس طرح آباد ہے کہ اوپر سے دامنِ کوہ تک تبدریج چلا گیا ہے۔ قلعہ اور اس کے برج پتھر اور چونے کے ہیں۔ اس کو بغداد کے گورنر سلیمان پاشا نے تعمیر کرایا ہے۔ وسط شہر میں یہ قلعہ ایک چھوٹی پہاڑی پر بنایا گیا ہے اور اتنا بلند ہے کہ اس کو دیکھنے کے لیے سر اٹھاؤ تو دستار گر پڑے۔ اس کے علاوہ اس کے چاروں طرف کئی میل تک پہاڑوں پر جانے کے راستے ہیں جو بہت دشوار گذار ہیں۔ قابلِ گذر راستے صرف دو طرف ہیں۔

عوام کی زبان عربی ہے اور کردی ہے اور خاص لوگ ان دو زبانوں کے علاوہ ترکی اور فارسی بھی جانتے ہیں۔ استنبول سے ملاطیہ تک سوائے ترکی زبان کے کوئی اور زبان نہ سنی تھی۔ ملاطیہ سے دیارِ بکر تک بعض لوگ عربی سے واقف ہیں۔ دیارِ بکر سے اس طرف فارسی زبان بھی ملتی ہے اور ماردین سے بغداد تک چاروں زبانیں رائج ہیں۔

ماردین پہنچنے کے بعد عبداللہ آغا کے مکان پر اترا۔ شنبہ سے سہ شنبہ تک قاصدوں کے جھگڑے کی وجہ سے اس جگہ ٹھہرنا پڑا۔ عبداللہ آغا بہت عقلمند اور چالاک حاکم ہے لا یہ وہ گورنر بغداد کا نائب ہے۔ لیکن اس کو سلطان اور وزیر اعظم سے براہِ راست بھی ملاقات کی خصوصیت حاصل ہے۔ اس نے برسوں سلیمان پاشا کی طرف سے بصرہ پر حکمرانی کی ہے۔ اور وہاں اپنی اچھی یادگاریں چھوڑی ہیں جو اس کی نیک نامی کی باعث ہیں۔ اس جگہ چھوٹے بڑے اس کے خیر خواہ ہیں۔ وہ فارسی زبان سے بھی خوب واقف ہے۔ اس کے ساتھ اچھا وقت گذرا اور نصف شب تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے اچھی طرح میری خاطر تواضع کی۔ یہ اصرار بھی کیا کہ رمضان المبارک اسی مقام پر گذاروں لیکن میں وہاں کی شدید سردی کا متحمل نہیں ہوا اور اس سے اجازت حاصل کر لی۔ کیوں کہ نماز اور تراویح کی زحمت بھی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے ایک رہنما میرے ساتھ کر دیا اور کہا کہ خلیفہ عثمانی کی باز پرس کے ڈر سے یہ تمہارا ساتھ نہ چھوڑیگا

اور تمہاری خدمت کرے گا۔ چونکہ نصیبش سے موصل تک سارا راستہ بیابان ہے جو گزرتا ہے۔ اور اس کو خطرناک ترین راستہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے عبداللہ آقا نے سلطان کی طرف سے مجھے حفاظت کے ساتھ اس خطرناک مقام سے گذارنے کا انتظام کیا۔ اور مجھ کو ایک بڑے قافلہ کے ساتھ روانہ کیا۔ اور قافلہ کے سرداروں کو ہدایت کر دی کہ وہ اچھی طرح میری دیکھ بھال کریں۔

۱۲ رمضان المبارک کو چہارشنبہ کے دن نصیبش میں قیام کیا۔ ماردین سے یہاں تک کا فاصلہ ۲۰ میل ہے۔ اتفاق سے بغداد کا قاضی تحت رواں پر استنبول سے واپس آرہا تھا۔ ماردین سے میرا ہم سفر ہو گیا۔ اس کے ساتھ چند گھوڑے، بیس سوار اور کچھ بندوق بردار سپاہی تھے۔ بڑی شان و شوکت سے سفر کر رہا تھا۔ اس سے میری ملاقات ہوئی۔ جس جگہ وہ پڑاؤ ڈالتا، وہیں میں بھی ٹھہر جاتا تھا۔ ڈاک بنگلے سے میرا کھانا اسی کے ساتھ لاتے تھے۔ اس لیے موصل تک خوب وقت گذرا۔ موصل سے وہ جدا ہو گا۔

شہر نصیبش اور مزار سلمان فارسیؓ

یہ مشہور شہر ہے۔ اس سے قبل یہ صدیوں تک روم کے قیصروں کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ صدر اسلام میں بھی یہ شہر بہت شاندار تھا۔ لیکن اب حالت بہت خراب ہے۔ اس کا ڈاک بنگلہ کسی قدر امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ کھانا یہاں اچھا ملا۔ گھوڑے بھی عمدہ ملے۔ یہ خدا نے بڑا احسان کیا۔ کیوں کہ نصیبش سے موصل تک دو سو میل کے راستہ میں گھوڑے تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ گھوڑا راستہ کی مسافت اور زحمت برداشت کر کے بچ گیا تو سوار بھی بچ گیا۔ اور اگر گھوڑا راستہ کی تکلیف نہ برداشت کر سکا اور راستہ ہی میں رہ گیا تو پھر سوار کو بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اکثر مقامات غیر آباد ہیں اور رہزنوں کے ٹھکانوں سے بھرے ہوئے ہیں جو دشمنِ اسلام ہیں۔ نصیبش میں دو قبروں کی زیارت کی۔ ایک سید السجاد زین العابدینؑ اور دوسری حضرت سلیمان فارسیؓ کی۔ لیکن تاریخی اعتبار سے ان دونوں کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ کیوں کہ سلیمان فارسیؓ کی قبر مدائن میں ہے جو اطراف بغداد میں واقع ہے اور سید سجاد کی قبر مبارک مدینہ میں واقع ہے۔ میرا خیال ہے کہ بجائے سلمان فارسیؓ

کے یہاں سلیمان خزاعی کی قبر ہے جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے صحابی تھے۔ اور حضرت امام حسین رضی کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے نصیبش کے صحرا میں ابن زیاد کی فوج سے لڑ کر شہید ہوئے تھے دوسری قبر نہ معلوم کس کی ہے۔ جس کو سید سجاد کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔ لیکن بلاشبہ یہ قبر کسی متبرک و برگزیدہ شخص کی معلوم ہوتی ہے۔

۱۳ ر رمضان المبارک کو پنجشنبہ کے دن نصیبش سے نکل کر ماردین سے ۱۴ میل پر واقعہ کردی گاؤں میں قیام کیا۔ جہاں کا نگراں خاقان گویا یہاں کا بادشاہ ہے۔ اس کے بیٹے آبادی سے نکل کر آئے ہم کو دیکھا۔ اور قافلہ والوں سے سختی کے ساتھ کچھ ٹیکس وصول کیا اور واپس چلے گئے۔ ہمارا میزبان ایک عرب بڑھئی تھا۔ جس نے کھانا اچھا دیا اور بستر بھی بہت پاکیزہ دیئے۔

۱۴ ر رمضان المبارک کو جمعہ کے دن، عنیزہ نامی گاؤں میں، حیدر آغا کے مکان پر قیام کیا جو قبیلہ کا سردار ہے۔ یہ منزل ۲۴ میل کی تھی۔ یہی منزل ٹیکس ادا کرنے کے باعث کم مسافت کی تھی۔ اور دوسری سب سے مختصر تھی۔ کیوں کہ اس مقام سے پھر آبادی ختم ہو جاتی ہے۔ مذکورہ مقام پر آبادی زیادہ تر کردوں کی تھی جو فارسی زبان جانتے ہیں۔ مجھ کو ایرانی اور اپنا ہم قوم جان کر بہت خدمت کی اور بہت عزت کے ساتھ پیش آئے۔ یہ دونوں منزلیں اگرچہ جنگل کی شمار کی جاتی ہیں۔ مگر پانی قدم قدم پر ملتا ہے۔ اور قصبات اتنے آباد ہیں کہ اس راہ میں کہیں اور نظر نہیں آئے۔ نصیبش اور موصل کے درمیان دو سو میل کا فاصلہ ہے۔ جس سے میں بہت ڈرا۔ اگرچہ استنبول سے نصیبش تک کبھی نہ گھنٹہ سے زیادہ ہموار زمین پر چلنا نصیب نہیں ہوا۔ اور وہ بھی دو پہاڑوں کے درمیان۔ کوئی ایسی جگہ جہاں پہاڑ نظر سے غائب ہوئے ہوں۔ دکھائی نہیں دی۔ اس مسافت میں جو زمین ملی وہ ہندوستان اور ایران کی طرح ہموار ہے۔ پانی کی افراط بھی نہیں ہے۔ البتہ چند میل کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی نہر مل جاتی ہے۔ اور حد یہ ہے کہ اس پر درختوں کا سایہ تک نہیں ہے موسم گرما میں اس راہ کا سفر خطرناک ہے۔ اس وادی کی خاص بات یہ ہے کہ ملک شام کو درمیان سے کاٹ کر حجاز اور یمن سے ملا دیا ہے۔ اور تمام جزیرۂ عرب کے طول میں شامل کر لیا ہے۔ اس کا رقبہ ہزاروں میل ہے اور زمین قابل کاشت ہے۔ مگر ایک

دوسرا فرمان عبداللہ آغا حاکم ماردین کے نام تھا۔ اس کو ہدایت تھی کہ میرے ہمراہ حفاظت کے لیے کچھ سوار کر دے تاکہ ماردین اور موصل کے درمیان جو جنگل پڑتا ہے اُس کے اندر سے بحفاظت نکال دیں۔

تیسرا فرمان، علی پاشا کے نام تھا کہ وہ عتبات عالیہ کی زیارت کے سلسلہ میں میری مدد کرے اور ایک مہماندار ساتھ کر دے جو مجھے بغداد سے بصرہ پہونچا دے۔ چونکہ بعض ڈاک بنگلے آبادی سے دور واقع ہیں اور قاصد کا کھانا جو وہاں کا معمول ہے وہ رکھی ہے۔ چھ سو قرش حکومت عثمانیہ نے میرے کھانے پینے وغیرہ کے لیے حاجی علی کو دیئے تھے (جو میرا مہماندار مقرر ہوا تھا) تاکہ ان جگہوں پر میرے کھانے کا انتظام کرے۔ کُنج بیگ نے اس کو میرے سامنے بلا کر سفارش کی اور کہا۔ بالفرض اگر میں بطور قاصد تیرے ساتھ سفر کروں تو میرے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا تجھ کو چاہیئے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر۔ اور چلنے میں ان کی رفتار کی پیروی کرنا چاہیے یہ ایک منزل کو تین کر دیں یا تین کو ایک کر دیں، تم اسی کے مطابق کرنا۔ اگر تو نے ایسا ہی کیا اور ان کی خوشنودی کا سارٹیفکیٹ بغداد سے لے آیا تو تجھ کو ہیڈ قاصد بنا دوں گا۔ اس ملعون نے جواب دیا۔ "بسر و چشم"۔ اور وزیر کے دامن کو رسم کے مطابق بوسہ دے کر باہر چلا گیا۔

قاصد کی بدسلوکی

اس بدذات قاصد نے انتہائی لالچ کے باعث نہایت بخوفی کے ساتھ عثمانی ملازمین کی عادت کے مطابق تمام رقم اپنی تحویل میں لے لی اور ابتداء سے آخر تک سو قرش بھی خرچ نہیں کیے۔ اس کے علاوہ اس نے مجھ کو ایسے ڈاک بنگلوں میں ٹھہرایا جہاں مچھروں اور کھٹملوں کی افراط تھی اور وہ خود اس کا عادی تھا۔ حالانکہ حکام کے سامنے خوب باتیں بناتا تھا، اس نے راستہ طے کرنے میں بھی احکام کی پابندی نہیں کی اور مجھ کو بہت سی زحمتوں میں مبتلا کیا۔ جبکہ نصف راستہ خطرات سے خالی تھا۔ اس نے خرچ میں کفایت کے خیال سے اور دوسرے قاصدوں کا ساتھ دینے کے لیے۔ روزانہ دو اور تین منزلیں طے کرائیں۔ جس کی وجہ سے دو گھنٹے سے زیادہ سونے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اور نا وقت منزل پر پہنچنے کے باعث اچھا کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے علاوہ مچھروں اور کھٹملوں سے بھرے ہوئے ڈاک بنگلے میں سونا پڑتا تھا۔ اور باقی راستہ جو

آتا ہے۔ اور شہر موصل کے نیچے تمام سال اس پر پل بنے رہتے ہیں۔ بغداد پہنچکر اس کی چوڑائی دریائے گنگا کے برابر نظر آتی ہے۔ اکثر پل کو توڑ بھی دیتے تھے۔

مختصر یہ کہ دجلہ یہاں سے سطح زمین پر بہنا شروع ہوتا ہے۔ عرب اُن کو بلاد جزیرہ کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے دو طرف دو دریا ہیں۔ ایک کا نام فرات ہے دوسرے کا دجلہ۔ بصرہ کے قریب دونوں مل جاتے ہیں۔ شہر ارمنہ ایک بہت اونچے پہاڑ پر اس کے دامن سے لیکر چوٹی تک درجہ بدرجہ واقع ہوا ہے۔ چنانچہ شہر کے دامن سے اس کے آخری حصہ تک ایک میل چوڑا ہے۔ بلندی بتدریج نہیں ہے، بلکہ سپاٹ ہے۔ یہاں کے باشندوں کے سوا شہر کی چوڑائی میں کوئی شخص پیدل آجا نہیں سکتا ہے۔ وہاں کا ڈاک بنگلہ بہت گندہ ہے اور ملازمین نہایت کمینہ صفت ہیں۔ اس لیے میں نے ایک متعلّم کے گھر میں قیام کیا۔

یکم رمضان کو شنبہ کے دن راستہ کے خطرات کے باعث ایک آنے والے قافلہ کے انتظار میں ٹھہر گئے۔ کیوں کہ دیار بکر کے اکثر ارمنی اس زمانہ میں ترکی سلطان سے باغی ہو گئے تھے اور قافلوں کا راستہ روکتے اور لوٹتے تھے۔ یکشنبہ کے دن ارمنہ سے ایک قافلہ کے ساتھ ہم بھی روانہ ہوئے اور راستہ میں ایک ویران سی سرائے میں قافلہ والوں کے ساتھ کی وجہ سے ٹھہر گئے۔ وہاں صرف ایک لکڑی فروش کا مکان تھا۔ چونکہ قافلہ ایک دن میں ۲۰ میل سے زیادہ سفر نہیں کرتا اس لیے ہمیں بھی ٹھہرنا پڑا۔ اس دن بارش کی تیزی اور ہوا کی وجہ سے سارا سامان بھیگ گیا۔ بھیگے ہوئے صندوں کو سرائے کی راکھ کے ڈھیروں پر ڈال کر دیا اور آگ جلا کر وقت گذارا۔ دوشنبہ کا نصف دن گذار کر شدید بارش کی حالت میں دیار بکر پہنچے۔ ارمنہ سے دیار بکر ۶۸ میل کے فاصلہ پر ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کا مزار

دیار بکر اس راستہ کا سب سے اچھا شہر ہے۔ وہاں کے لوگ بہت نیک اور سچے ہیں۔ اطراف کے پہاڑ بہت بلند ہیں۔ ان کی چوٹیوں پر زمین مسطح ہے اور سب پہاڑ سرسبز و شاداب ہیں۔ یہاں کے دیہات اور قصبات صاف ستھرے ہیں۔ ہوا بہت خوشگوار ہے۔ یہ مقام سیرگاہ نظر آتا ہے۔ شہر کے گرد خندق ہے۔ شہر پناہ کی دیوار اور اس کے برج پتھر اور چونے سے بنائے گئے ہیں۔ یہاں کی مسجدیں

کانٹے دار جھاڑی کے سوا جو ایک ہاتھ اونچی ہوتی ہے کوئی اور چیز وہاں اگائی نہیں جاتی ہے۔ گرمی کا موسم یہاں بہت سخت ہوتا ہے۔ یہاں کی منزلوں اور مقامات کے نام ٹیلوں سے منسوب ہوتے ہیں۔ اس منزل پر قبیلۂ طئی کے شیخ ہلال کے آنے کا انتظار کیا گیا جس نے عبداللہ آغا کے خوف سے قافلہ کو اس مقام سے آگے لے جانے کا ذمہ لیا تھا۔ جب وہ نہیں آیا تو حیدر آغا نے اس قبیلہ سے سو سوار کرائے پر لیے اور قافلہ آگے روانہ ہوا۔ جس کے ساتھ دو تین ہزار مرد اور کئی سو بندوقچی اور سوار بھی تھے۔ اس ساری احتیاط کا سبب یہ تھا کہ اس بیابان کے سیدھے ہاتھ کی جانب بیس میل کے فاصلہ پر اونچا نیچا پہاڑی ناہموار راستہ ہے جس کو سنجار کہتے ہیں۔ اس جگہ اس جماعت کی آبادی ہے جو یزیدی کے نام سے مشہور ہیں اور کفر اور اسلام دشمنی میں مشہور ہیں۔ سنا گیا ہے کہ یہ عرب قوم کے لوگ ہیں اور یزید اور بنی اُمیّہ کے خاندان سے ہیں اور بنو عباس کے خوف سے بھاگ کر اس جگہ محفوظ مسکن بنا لیا ہے۔ یہ لوگ یزید کو اپنا امام مانتے ہیں اور اس کے خلاف بات کرنے والے کو قتل کر دیتے ہیں۔

۱۷ رمضان کو قریہ حمیدیہ پہونچے جو شیخ فارس سے منسوب ہے۔ شیخ شلال یہاں تک ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے گھر سے حمیدیہ تک ۲۶ میل کا فاصلہ ہے اور عجرہ سے حمیدیہ تک ۴۸ میل کی مسافت ہے اور وہاں سوا شیخ شلال کے خیمہ کے اور کوئی آبادی نہیں ہے سارا قافلہ شیخ شلال کے مقرر کردہ شخص کو ٹیکس دینے کے لیے میدان میں اترا میں تین رات اور تین دن سے سویا نہیں تھا۔ اس لیے قریب کے گاؤں میں گیا اور ایک عرب کے گھر روغن میں تلی ہوئی روٹی کھجور کے ساتھ خوب مزے لے کر کھائی اور دو تین گھنٹہ سویا۔ اور شام کو قافلہ کی روانگی سے قبل سوار ہو کر روانہ ہوا۔

۱۲ میل کا سفر طے کر کے موصل پہنچا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیخ شلال بعد میں اپنے قبیلہ کے سو سواروں کے ساتھ آ کر قافلہ میں شامل ہو گیا تھا۔ صورت یہ رہی کہ میرے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والا سائیس پہلی ہی منزل میں بیمار ہو گیا تھا۔ اور نصیبین واپس چلا گیا تھا۔ جو اور گھاس کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ دوسری منزل یعنی عجرہ جنگل میں واقع تھی اس لیے وہاں کچھ نہ ملا۔ یہ گھوڑے بیچارے نصیبین سے موصل تک پانچ روز تک

سواری میں رہے۔ ان کی کاٹھی کھولی تک نہیں گئی۔ چار دن بغیر گھاس اور دانہ کے رہے جز تھوڑی سی ہری گھاس چر لیتے تھے۔ اسی پر گذر کیا۔ میری سواری کا گھوڑا اپنے جثہ کے اعتبار سے چھوٹے ٹٹو کی طرح دُبلا پتلا تھا۔ اس کے باوجود جب میں موصل میں گھوڑے کے اوپر سے اُترا تو اس وقت بھی وہ ایک منزل اور چلنے کی طاقت رکھتا تھا۔ بلکہ اس کی طبیعت میں فرحت تھی اور اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگام سے کھیل رہا تھا۔

موصل | یہ بھی جزیرہ العرب میں واقع ہے۔ اور ماردین اور دیار بکر کی طرح یہاں بھی قلعہ اور مضبوط بُرج موجود ہیں۔ جو پتھر اور چُونے کے بنے ہوئے ہیں۔ شہر پناہ کے ایک گہری خندق ہے۔ وہاں میں نے مشہور پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت جرجیس نبیؑ کے مزارات کی زیارت کی گھوڑے سے اُترنے کے بعد محمدؐ پاشا گورنر موصل کے مکان پر پہونچا۔

۱۸ رمضان سے ۲۲ رمضان تک قاصد کی تبدیلی کے لیے ہم موصل میں ٹھہرے۔ کیوں کہ عبداللہ آغا نے اپنے آقا سے نافرمانی یا سرکشی کے باعث جو عثمانی ملازمین کی عادت ہے۔ ماردین سے نکلنے کے بعد ہمارا کام دوبارہ اس ملعون قاصد کے سپرد کر دیا اور اس بے حیا شخص نے مجھ سے راضی نامہ لکھوانے کے لالچ میں بقیہ چند منزلوں میں اپنی غلطیوں کی تلافی کا ارادہ کیا تھا۔ مگر اس کے ہاتھوں بہت اذیت اُٹھا چکا تھا۔ اس لیے اس کی ہمراہی پر راضی نہیں ہوا۔ اور میں نے اس کی شکایت اور تبدیلی کے لیے محمد علی پاشا سے درخواست کی۔ اس نے حکم دیا کہ وہ موصل کو چھوڑ دے اور جہاں چاہے چلا جائے۔ اور اپنے خاص چوبدار قاسم کو مقرر کیا کہ وہ مجھے بغداد تک پہنچا دے۔ وہ نازمان قاصد مجبور ہو کر مجھ سے دو دن پہلے ہی بغداد روانہ ہو گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مقام کرکوک میں جہاں اُس کا گھر تھا۔ دو تین روز میرا انتظار کرے اور جب میں وہاں پہنچوں تو خواہ مخواہ میرے ساتھ ہو جائے۔ لیکن میں نے کرکوک پہنچکر اس کی خبر سنی کہ وہ راہ، راہ داروں کے سپرد کر چکا ہے۔ مجھے اطمینان ہوا کہ اب بغداد تک اس کی منحوس صورت نظر نہ آئے گی۔

محمدؐ پاشا | محمد پاشا استنبول کے تیموروں کی نسل سے ہے۔ بہت معتبر وزیروں میں شمار ہوتا ہے۔ لوگوں سے بہت کم ملتا ہے۔ لیکن مجھے اس نے اپنی محفل

میں شرکت کا موقع دیا اور رواجی آداب سے معاف رکھا۔ مثلاً اُس کی عبا کا دامن وغیرہ کا چومنا اس نے قہوہ اور تحفہ سے تواضع کی اور اپنے نائب محمود بیگ کے مکان پر میرے قیام کا انتظام کردیا۔ محمود بیگ ایک خوش اخلاق نوجوان ہے اور بہت ہنس مکھ ہے۔ روزانہ مجھ کو روزہ کے افطار میں شریک کرتا تھا۔ اپنے خاص گھوڑوں پر اطرافِ شہر کی سیر بھی کرائی۔ اس کے تمام ملازمین مجھ سے ملنے آتے تھے۔ محمد پاشا ہی پر موقوف نہیں موصل کے عام باشندے بھی بہت خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ تازہ معلومات اور نئی چیزوں کے بہت شوقین ہیں۔ عثمانیوں کی نیک عادات ان سب کے اندر موجود ہیں۔ فرد مکلّف نہیں ہے۔ فرانس کے شہروں کو چھوڑنے کے بعد سے ایسے ذہین اور بیدار مغز لوگوں سے ملاقات نہیں ہوئی کاش استنبول کے لوگ ان جیسی چوتھائی عادات واخلاق بھی رکھتے، تو حکومتِ عثمانیہ کے زوال کا خوف دل سے دور ہو جاتا۔

موصل کا گوشت اور روٹی بہت اچھی ہوتی ہے اور سارے اطراف میں مشہور ہے خشک میوے کی افراط ہے۔ اور خوب کھاتے ہیں۔ مگر اس کی وجہ سے اکثر لوگ بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ طبیب کے بہت کم طلبگار ہوتے ہیں۔ مگر بہت مانگتے ہیں۔ مجھ کو طب سے بھی معمولی دلچسپی رہی ہے۔ اس واقفیت کے باعث تمام لوگ دوا لینے میرے پاس آنے لگے۔ چونکہ دو تین آدمیوں کو شفا حاصل ہو گئی تھی۔ اس لیے ہر منزل پر لوگ آنے لگے اور بغداد تک یہی حال رہا۔ خاص طور پر قبائلِ عثمان میں جب اترا تو یہ اذیت بڑھ گئی۔ اسی طرح موصل میں کردستان کے حاکم سلیم خان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے نام کی مناسبت سے بہت سلیم الطبع، خوبصورت اور خوش اخلاق ہے اور فصیح فارسی میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کے ساتھ عثمانی فوج کے تمام اچھے سپاہی اور سوار ہیں۔ ابتدا میں اس نے چاہا تھا کہ بغداد میں علی پاشا پر حملہ کرکے سلیمان پاشا کے ایک دوسرے عزیز کو اس ملک کی مسندِ حکومت پر بٹھائے۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ علی پاشا کامیاب ہوئے اور سلیم بیگ موصل بھاگ گیا اور وہاں پناہ لی۔ اس کا بھائی عبدالرحمٰن پاشا گرفتار ہو گیا اور وہ خود کردستان کا حاکم مقرر ہوا۔

دوسرا نجف قلی خان، حاکم ایروان، جو فتح علی شاہ بادشاہِ ایران سے موصل میں قیام کی اجازت لے کر رہنے لگا تھا۔ وہ بھی سلیم بیگ کی طرح خوش رو، خوش اخلاق اور بہادر

زیادہ سامان ساتھ لے کر چلنے والوں کے لیے خطرناک تھا۔ اس کرایہ دار سوداگروں کے قافلے کے ساتھ طے کرتا تھا۔ مجھ کو کبھی مجبوراً ان کے ساتھ ناوقت ویران سراؤں میں ٹھہرنا پڑا۔ سب سے زیادہ جان لیوا تکلیف ان لوگوں کی صحبت تھی کہ بقیہ دن سے نصف شب تک روح گھٹتی تھی۔ پہلی چند منزلوں تک زبان سے واقف نہ ہونے کے باعث اس قاصد کی غداری مجھ پر ظاہر نہ ہو سکی۔ اس کی غلط معذرتوں کو میں سچ سمجھتا رہا۔ لیکن جب اس کی حرکتیں بے پردہ ہو گئیں تو میں نے اس کی پرواہ نہ کی اور حکام کے گھر جا کر سلطان کا فرمان دکھایا۔ وہ بسر و چشم کہہ کر بہت مہربانی سے پیش آتے تھے۔ اور مہمان داری کے فرائض اچھی طرح انجام دیتے تھے۔ دیار بکر سے پاشا کی جانب سے دوسرا مہماندار مقرر ہوتا تھا۔ چنانچہ دیار بکر کے حاکم احمد آفندی نے مجھ کو ماردین پہنچا دیا۔ اور عبداللہ آغا حاکم ماردین نے موصل تک پہنچایا اور وہاں سے محمد پاشا گورنر موصل نے بغداد پہونچایا۔

اس ملعون قاصد نے جو میری مدد کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ حکومت کے خوف سے کسی جگہ بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ مگر مجھے اب اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ میں نے اس سے بات کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بغداد پہنچ کر اس نے مجھ سے صفائی کرنا چاہی اور کئی لوگوں کو درمیان میں ڈال کر، نہایت بے حیائی کے ساتھ مجھ سے صلح کی درخواست کی۔ میں نے قطعی قبول نہیں کیا۔ میں اس بات کے لیے آمادہ تھا کہ اس کی شکایت علی پاشا سے کروں اور اس کی بدسلوکی اور بدکرداری کی سزا دلاؤں۔ اس نے بغداد کے ایک ایلچی کو جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا کام بھی کرتا تھا۔ اور مسٹر جونسن وکیل کمپنی سے گہرے مراسم رکھتا تھا۔ درمیان میں ڈالا، اور اپنے کو بے خطا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے دلائل کے ساتھ اس کی باتوں کو رد کیا۔

چونکہ میں نے مسٹر جانسن کے مکان پر قیام کیا تھا۔ اور عثمانی حکومت نے میری مہمانداری کا جو سلسلہ جاری کیا تھا وہ بغداد پہنچ کر ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس ملعون کی بدکرداری کی سزا ضروری تھی۔ میں نے صلح کے متعلق مسٹر جونسن کی سفارش رد کر دی جس سے ان کو بہت ناگواری ہوئی مگر میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔

ہے۔ اس کے ساتھیوں اور غلاموں کا لباس ایرانی کردوں کی طرح ہے۔

۲۲ر رمضان المبارک کو یکشنبہ کے دن دوپہر کے وقت موصل سے نکل کر دریائے دجلہ کے پل کو پار کیا اور مقام فراقوش میں قیام کیا جو موصل سے ۱۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور گھوڑے تبدیل کرنے کی جگہ ہے۔

۲۳ر رمضان کو دوشنبہ کے دن عنکورہ میں منزل ہوئی جو فراقوش سے ۴۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ دونوں مقامات کے درمیان ایک بہت بڑا دریا ہے۔ جس کو زاب کہتے ہیں۔ اس کو کشتی کے ذریعہ عبور کیا۔ یہ دریا موصل اور بغداد کی حد ہے۔ محمود پاشا کے دس سوار یہاں تک ساتھ آئے۔ اگرچہ اس نواح میں امن تھا۔ لیکن انھوں نے ازراہ مہمان نوازی اور احتیاط کے خیال سے آدمی ساتھ کر دیے تھے۔ یہاں سے وہ واپس گئے۔ یہ دونوں منزلیں عیسائی عربوں کا مسکن ہیں اور قبیلہ بنی غسان سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ یہاں کا ڈاک بنگلہ گندہ تھا۔ قاسم چوغدار مجھ کو ایک بڑے رئیس کے گھر لے گیا۔ وہیں قیام ہوا اور اچھا کھانا ملا۔

۲۵ر رمضان المبارک کو سہ شنبہ کے دن التن کوپری میں قیام کیا جو ۴۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ ایک بڑا قصبہ ہے۔ ویری ترکی زبان میں پل کو کہا جاتا ہے۔ یہاں دریا پر آٹھ بڑے بڑے پل بنے ہوئے ہیں، یہ نام پڑ گیا۔ یہ ایک ستون والے پل اس قدر اونچے ہیں کہ ان کو پار کرنا جبل محراب کی طرح مشکل ہے۔ جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

۲۶ر رمضان المبارک کو چہارشنبہ کے دن ۳۶ میل کے فاصلہ پر مقام کرکوک میں آرام کیا اور سویا۔ ان دو تین دنوں میں، بلکہ بغداد پہنچنے تک بارش کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ یہ راستہ بہت دشواری سے طے ہوا۔ حالانکہ راستہ ہموار تھا۔ لیکن قوقاز اور سیواس کے برف پوش راستوں سے بھی زیادہ سرد تھا۔

کرکوک یہ بڑا شہر ہے۔ عمارتیں قلعہ سے باہر ہیں۔ قلعہ مٹی کا بنا ہوا ہے اور اندر کی طرف دیواریں اینٹ اور پتھر کی ہیں۔ برج پتھر اور چونے کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ قلعہ ہموار میدان میں واقع ہے، اس لیے دور سے شاندار معلوم ہوتا ہے۔

۲۷ر رمضان المبارک کو پنجشنبہ کے دن ۳۶ میل کا فاصلہ طے کر کے کچھ دن رہے تاروخ پہنچے۔ یہاں کا ڈاک بنگلہ صاف ستھرا ہے اور باشندے بھی اچھے ہیں۔ بارش

کی شدت بھی کم ہو چکی تھی۔ مجھے یہ خیال تھا کہ حاجی علی صبر عثمانی کرکوک میں میرا منتظر ہوگا اور میری سست رفتاری کا اندازہ کر کے، بے وقت گھر سے نکل کر اس جگہ مجھ سے مل جائیگا۔ اس لیے اگر آگے جاتا ہوں تو بارش کی شدت کے باعث اور رات کے اندھیرے کی وجہ سے یہاں سے آگے نہ بڑھ سکے گا اور اگر دوسرے دن دو منزلوں کو ایک کر کے سفر کرے گا تب بھی میرے پاس نہ پہنچ سکے گا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ بغداد تک اس کی نحس صورت نہ دیکھوں۔ اس لیے میں نے گھوڑا تبدیل کیا اور وہاں ٹھہرا نہیں، بلکہ وہاں سے ۲۸ میل کے فاصلہ پر مقام قراپتہ، میں جا کر سویا، قراپتہ بغداد کی جانب پہاڑ کے نیچے واقع ایک قصبہ ہے۔ یہاں نہایت کشادہ اور ہموار میدان ہے اور ایران کی سرحد سے قریب واقع ہے۔ اس کے اس طرف موصل ہے۔ میرا تمام سفر عجم کی سمت رہا۔ قراپتہ کا میدان نادر شاہ کی جنگ کے باعث مشہور ہے۔ نادر شاہ کو کرکوک کے میدان اور ارزن کے صحرا کے اس طرف توتمات کے پہاڑوں میں عثمانی لشکر پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس لڑائی کے آثار اب تک باقی ہیں۔ مثلاً توپ خانہ کے دمدمے اور خندقیں، جو ضرورت کے مطابق بنائی گئی تھیں۔ اور نادری لشکر کی کثرت استعمال کے باعث برباد ہو گئیں۔

قراپتہ کا ڈاک بنگلہ، نہایت گندہ، کوڑے اور کیچڑ سے بھرا ہوا ملا۔ اس کا منتظم مصطفیٰ بیگ نامی ایک ترک ہے۔ کفری سے بغداد تک چار ڈاک بنگلے اس کی نگرانی میں ہیں مگر وہ مسافروں کو ڈاک بنگلے کے بجائے رعایا کے مکانوں پر ٹھہراتا ہے اور ان کے اخراجات بھی انہی پر ڈالتا ہے۔ چونکہ اس کے حکم کو رعایا کے لوگ ٹال نہیں سکتے ہیں۔ اس لیے وہ خود زبردستی مسافروں کو اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بیچارے مسافر کا جو حال ہوتا ہے اس کو نہ بیان کرنا ہی اچھا ہے۔ کھانا تو ردی ملتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ گھر والوں کی سخت سست باتیں بھی سننا پڑتی ہیں۔ ان چاروں ڈاک بنگلوں کے گھوڑے خستہ حال اور زخمی نظر آئے۔ اتنے بھوکے رہتے ہیں کہ ذرا سی گھاس دیکھ کر دوڑتے ہیں اور بے اختیار اس پر گرتے ہیں۔

صبح کے وقت جب قراپتہ سے روانہ ہوئے تو اس بولہب خصال سے ملاقات کی۔ اس پر خدا کی لعنت ہو۔ میں نے اس کے طرز عمل پر تنبیہ کی اور کہا کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ عثمانی حکومت سے تم کو خرچ ملتا ہے اور تم مسافروں کا بوجھ غریب رعایا پر ڈالتے ہو اور

ساری رقم خود ہضم کر جاتے ہو۔

مختصر یہ کہ استنبول سے موصل تک گھوڑے کی خوراک خشک گھاس اور جو ہوتی ہے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس سفر کی تکلیف اور راستہ کی دشواری کے باوجود گھوڑے سست نہیں ہوئے۔ موصل سے اس طرف کفری تک گھوڑوں کی خوراک ہری گھاس اور بھیگے ہوئے جو تھے۔ اصیل گھوڑے بڑے ہوتے ہیں اور ضرورت بھر خوراک پاتے ہیں۔ لیکن ان چار منزلوں میں ہم پر جو کچھ بیتی سو بیت گئی۔

۲۹ رمضان المبارک کو شنبہ کے دن ۲۶ میل کا سفر کر کے بارش کے باعث دلیاس میں قیام کیا۔ یہ ایک بڑا گاؤں ہے اور اس کا ڈاک بنگلہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اگر اس کا پورا عملہ بدبخت مصطفیٰ کے ماتحت نہ ہوتا تو مسافروں کو آرام ملتا۔

یکم ماہ شوال ۱۲۱۷ھ مطابق جنوری ۱۸۰۳ء کو بغداد پہنچا۔ دولیہ سے بغداد تک ۲۸ میل کا فاصلہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن میرے اندازے کے مطابق ۳۰ میل سے زیادہ ہے۔ تمام راستہ میدانی ہے اور بغداد کی شہر پناہ کے دروازے تک کسی جگہ کوئی گاؤں اور آبادی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ درختوں کے سائے کی پناہ بھی نہیں ملی۔ اس منزل میں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ گھوڑے بہت کمزور تھے۔ ہوا کا مقابلہ کرتے کرتے عاجز آگئے تھے۔ میرے پاس دو گھوڑے سواری کے لیے اور چار سامان کے لیے تھے۔ بغداد سے آٹھ میل کے فاصلہ تک بدل بدل کر سوار ہوتے رہے۔ ہم لوگ بہت تھک گئے تھے۔ آخر کار آٹھ میل کا راستہ پیدل طے کیا اور بغداد میں داخل ہوئے۔ شہر پناہ کی دیوار سے ملا ہوا ڈاک بنگلہ تھا۔ وہاں سے میں نے گھوڑا لیا اور شدید بارش میں سوار ہو کر مسٹر جونسن کے مکان پر پہنچا جو بغداد میں انگلستان کا سفیر ہے۔

اگر آغاز سفر میں بارش تیز ہو جاتی تو اس کیچڑ اور پانی والے راستے سے گزرنا مشکل ہوتا اور رات بغیر کھانے کے اسی جگہ گذارنا پڑتی۔

یہ بات عجیب ہے کہ بغداد جیسے شہر کے قریب کی منزل میں اتنی دشواریاں پیش آئیں کہ لوگوں کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے۔ سنا گیا ہے کہ اکثر ایسا ہی ہوا ہے۔

اس سفر کی مدت ۷۶ دن تھی۔ اس میں پندرہ جگہ قیام کیا اور ۱۲ منزلیں طے کیں۔

کل مسافت ۱۰۰۰ میل طے کی۔ پچاس ہولناک جنگل راہ میں پڑے۔ قافلے اس راستہ کو خشک موسم میں حفاظت کے ساتھ تین ماہ میں طے کرتے ہیں اور بہت تیز رفتار قاصد بعض اوقات بارہ دن میں طے کر لیتے ہیں۔ اگر راستہ کی رکاوٹیں نہ ہوتیں تو ہم بھی ایک ماہ یا ۲۵ دن میں یہ راستہ طے کر لیتے۔

شہر بغداد

شہر بغداد تین حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ دریائے دجلہ کے مشرقی سمت جو نیا بغداد کہلاتا ہے جس میں گورنر اور تمام ترک حکام رہتے ہیں۔ دوسرا قدیم بغداد، یہ دجلہ کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ اس شہر میں اینٹوں کی عمارتیں بہت ہیں۔ اور شہر پناہ دونوں حصوں کی پتھروں سے بنی ہوئی ہیں۔ اس کے گرد گہری خندق ہے جو بہت چوڑی ہے۔ اب اس کے اندر کھیتی کرتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں اس کے اندر دجلہ کا پانی بھر دیا جاتا ہے۔ بغداد میں پرانا قلعہ اور شہر پناہ کی عمارت سلطان ایلکانی نے بنوائی تھی۔ جو سلمان ساؤجی مشہور فارسی شاعر کا ممدوح تھا۔ اس کا دائرہ آٹھ میل کا ہوگا۔ اور پرانے بغداد کی شہر پناہ سلیمان پاشا کے حکم سے تعمیر ہوئی تھی۔ جو اس نے دہابیوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے بنوائی تھی۔ بغداد میدان میں واقع ہے اور اس کی زمین ہموار ہے۔ اس کی ظاہری شان و شوکت بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن اندر سے شہر بہت گندہ ہے۔ خاص طور پر پرانا بغداد جو موسم برسات میں بنگال کے پرانے شہروں کی طرح کیچڑ اور گندگی سے بھر جاتا ہے۔

نئے بغداد کے بازار چھت دار ہیں اور اینٹوں اور چونے سے بنے ہوئے ہیں لیکن بہت تنگ اور تاریک ہیں۔ معزز لوگوں کے مکان اور سرکاری عمارتیں اینٹ گارے کی بنی ہوئی ہیں اور ایرانی عمارتوں کے مقابلے میں کمزور ہیں۔ نقش و نگار اور بناوٹ سب دیہاتی رنگ کی ہے۔ جو دیکھنے میں اچھی نہیں معلوم ہوتی امیروں اور گورنر کی عمارت لکھنؤ کے متوسط طبقہ کے مکانات کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں پھر آصف الدولہ اور حسن رضا خاں کی بنوائی ہوئی شاندار عمارتوں کی کیا برابری۔ بغداد، بصرہ، نجف اور ایران کے شہروں کی خوبصورتی کا جو شہرہ ہندوستان کے اندر سننے میں آتا تھا۔ اس کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ دور کے ڈھول سہانے" استنبول سے بصرہ تک کوئی ایسا مکان نہ ملا جو لکھنؤ کے کسی اوسط درجہ کے مکان کے بھی برابر ہو اور اس میں رہ کر انسان کو سکون حاصل

ہو سکے۔

قہوہ خانوں کا رواج یہاں بھی بہت ہے۔ سگار نوشی کی کثرت ہے۔ استنبول کی طرح قہوہ خانے بہت گندے ہیں۔ صرف چند ایک بیٹھنے کے لائق ہیں۔ یہاں پھلوں میں میٹھا انار، لیموں، آلو بخارا بہت ہوتا ہے۔ اور یہاں کے یہ تینوں پھل دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

کاظمین کا ذکر

میں نے بغداد کے اطراف میں جن مقدس مزارات کی زیارت کی ان میں ایک کاظمین ہے۔ قدیم بغداد سے چار میل کے فاصلہ پر مغربی و شمالی سمت جہاں امام موسیٰ کاظمؓ اور محمد تقی جوادؒ مدفون ہیں۔ اس مقام پر ایرانی اور ہندوستانی غرباء کی بڑی تعداد آباد ہے۔ احاطہ کی دیوار مٹی کی ہے اور کمزور ہے۔ بغداد اور کاظمین کے درمیان آمد و رفت بکثرت ہوتی ہے۔ جب دریا کا پل پار کرتے ہیں، تو سینکڑوں گدھے، گھوڑے اور گاڑیاں کھڑی نظر آتی ہیں۔ ہر ایک سے ٹیکس کے طور پر ایک سکہ لیا جاتا ہے۔ جو ہندوستان کے ادھنے کے برابر ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کشتی پر سوار ہو کر آتا ہے تو وہ ٹیکس سے بچ جاتا ہے۔ کاظمین کے دروازے پر مسافروں کے لیے گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔

عہد خلفاء میں بغداد کی آبادی اور رقبہ

خلفاء کے عہد میں بغداد سے سامرہ تک چوبیس میل کی مسافت میں ایک شہر آباد تھا۔ اور اس کی آبادی اس طرح ملی جلی تھی کہ ایک مرغ بغداد سے سامرہ تک مکانات کی ایک چھت سے دوسری چھت پر جاتا ہوا پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ اس وقت تک قدیم شہر کی عمارتوں کے آثار، اینٹوں، ٹوٹے برتنوں اور ٹھیکروں کی شکل میں راستوں پر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی جگہ گنبد علی الہادی بھی جس کو احمد خان زنگی نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ کربلا، نجف، اور کاظمین کے گنبدوں سے زیادہ مستحکم اور بلند ہے۔ لیکن آرائش اور سنہرے نقش و نگار سے محروم ہے۔ اس کے اندر لکڑی کا ایک کشادہ صندوق ہے۔ جس کے اندر چار قبروں کے نشانات نظر آتے ہیں۔ ایک امام مذکور کی قبر ہے جو امام نقی کے نام سے مشہور ہے دوسری امام حسن عسکری کی، تیسری حضرت مہدی آخر الزمان کی والدہ نرگس خاتون کی قبر ہے اور چوتھی قبر علی الہادی کی ایک صاحبزادی کی ہے۔

سُرمن رائی

مقبرہ مذکورہ سے کچھ فاصلہ پر ایک غار ہے جس کے اندر امام مہدی روپوش ہوئے تھے جن کی واپسی کا فرقہ شیعہ کو اعتقاد ہے۔ یہ غار اب تک قدیم حالت پر ہے۔ اور اس کی مرمت کی کوئی ضرورت نہیں پڑی۔ نہ اس میں کسی قسم کا اضافہ کیا گیا۔ البتہ اس کی حفاظت کے خیال سے اس کے اوپر ایک گنبد تعمیر کر دیا گیا تھا جب وہ پرانا ہو گیا تو حسین خان پسر احمد خان مذکور نے اس کو توڑ کر ایک بہت اچھا کشادہ گنبد تعمیر کرایا۔ اور اس کی تعمیر علی الہادی کے گنبد سے بہت بہتر ہے۔ جب دیوار کی اونچائی گنبد تک پہنچ گئی تو اس خاندان باسعادت پیمان کے اندر پریشانی اور تباہی آگئی اور گنبد نامکمل رہ گیا۔

سلطان محمد خان قاچار کی والدہ نے اپنے بیٹے کی وفات کے بعد سامرہ کی زیارت سے مشرف ہو کر اس کو مکمل کرانے کا ارادہ کیا اور حسین خان کی والدہ سے اجازت طلب کی اس نے اجازت نہیں دی اور کہا! انشاء اللہ ہم خود جس صورت سے ممکن ہو گا۔ اس کام کی تکمیل کی سعادت حاصل کریں گی۔ مرزا محمد تبریزی جو علی الہادی کے مزار کا مہتمم ہے اور حسین خان کے عہد سے یہ خدمت انجام دے رہا ہے اور حسین خان کی ماں کی ہدایت پر سامرہ میں مقیم ہے اور اس مقبرے کی تکمیل کے انتظام کا اب تک انتظار کر رہا ہے۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا اور متولی کے یہاں میری دعوت میں شریک تھا۔

یہاں پہنچنے کے دوسرے دن سامرہ کا متولی سید خلیل جو سنی المذہب ہے اور نہایت خوش اخلاق ہے اور میری رہنمائی کے لیے علی پاشا کی طرف سے متعین کیا گیا تھا مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے دن اور رات دونوں وقت میرے کھانے کا بھی انتظام کیا۔ تیسرے دن جب ہوا خوشگوار تھی۔ میں ہجوم اور خدام کی ایذا رسانی سے تنگ آکر واپسی کا ارادہ کرنے لگا۔ جیسے ہی چند میل کا فاصلہ طے کیا دوبارہ شدید بارش شروع ہو گئی اور مسلسل جاری رہی اور بغداد تک کسی جگہ کم نہ ہوئی۔ بارش کی شدت کے باعث دو دن دجیل میں قیام کرنا پڑا۔ حالت یہ تھی کہ کھڑکی کے باہر سر نکالنا مشکل تھا۔ اس وجہ سے جو راستہ چھ دن میں عام طور پر طے ہو جاتا ہے وہ بارہ دن میں طے کر پایا۔

۲۷ رشوال کو مطابق جنوری ۱۸۰۳ء کو دوبارہ بغداد واپس آیا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ قیام کر کے سفر کی تکان دور کی۔ اس کے بعد نجف اور کربلا کی زیارت کے لیے تیار ہوا۔ اور

علی پاشا کے مقرر کیے ہوئے مہماندار کو خبر کیے بغیر ایک گاڑیبان کی رفاقت اختیار کی جس کی گاڑی کرایہ پر حاصل کی تھی۔ چند گھوڑے سامان کے لیے ساتھ تھے۔

۴ ذی قعدہ مطابق یکم مارچ کو کربلا روانہ ہوا۔ میں راستے سے واقف نہ تھا۔ تاہم یہ مرحلہ شروع سے آخر تک بعافیت طے ہوا۔ جہاں کہیں گیا لوگوں نے میری تعظیم کی چنانچہ ابھی کاظمین سے دس بارہ میل سے بھی آگے نہیں گیا تھا کہ کربلا کے مفتی محمد عثمان سے ملاقات ہو گئی جو ایک آزاد مشرب اور خوش اخلاق آدمی ہیں۔ کاظمین سے وطن واپس جا رہے تھے بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ کربلا تک میں ان کا مہمان رہوں اور وہاں پہنچ کر ان کے مکان پر قیام کروں۔ لیکن میرا مقصد روضہ کے قریب رہنے کا تھا اس لیے دوسری بات سے معذرت کر لی۔ اور ساری راہ ان کا مہمان رہا۔ ان کی رفاقت میں راستہ آسانی سے طے ہو گیا۔ بغداد سے نجف تک ہر دو میل کے فاصلے پر ایک کاروان سرائے اور چھ کا ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا ہے۔ جس کو "خان" کہا جاتا ہے۔ اکثر میں آبادی نہیں ہے۔ اس روز بغداد سے چالیس میل آگے خان مرزا آقچی میں قیام کیا۔ دوسرے دن بعد نماز ظہر اور قبل نماز عصر کربلا پہنچ گیا۔ اور سید حمزہ کے مکان پر قیام کیا جو سید احمد کربلائی کے چچا زاد بھائی ہیں۔ ان سے تعارف مرشد آباد میں ہوا تھا۔ سید احمد سے ملنے کی خواہش بھی تھی لیکن وہ چند ماہ قبل وفات پا چکے تھے۔ ان کے چچا زاد بھائی نے خاطر داری کی اور زیارت میں میری مدد کی۔ اس سعادت آثار شہر میں پانچ دن قیام رہا۔ ترکی کے مقرر کردہ حاکم کربلا امین آغا کو بغداد کے پاشا نے ہدایت کی تھی کہ وہ میرا خیال رکھیں اور مدد کریں۔ اس نے دو بار میری دعوت کی اور خوش اخلاقی اور خاطر داری میں کوئی کمی نہ کی۔ رخصت کے وقت سواری اور گھوڑوں کا کرایہ طے کرا دیا۔ تاکہ نجف جا سکوں۔ اس نے نجف تک سواری اور بار برداری کا کرایہ خود ادا کرنے کی پیشکش کی مگر میں نے سختی سے انکار کر دیا اور عذر پیش کیا کہ زیارت کے لیے کرایہ میں اپنی ذاتی آمدنی سے ادا کرتا ہوں۔

کربلا میں اپنے خاندان سے ملاقات

کربلا میں میری ملاقات اپنی خالہ کربلائی بیگم اور خاندان کی قدیم کنیزوں سے ہوئی۔ جو سب کی سب

میری طویل جدائی سے تنگ آکر کربلا آگئی تھیں ۔ بہت ضعیف اور خستہ حال ہیں۔ وہابی تحریک کے جھگڑے کے سبب سے سب کو غریب اور پریشان حال پایا۔ میں نے امکان بھر ان کی مدد کی۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اصل گنبد اور روضہ کا صحن مستقبل قریب میں محمد خان قاچار کے حکم سے دوبارہ تعمیر کرایا گیا تھا۔ چھت سونے کے پانی سے رنگی گئی تھی۔ اندر کی اینٹیں جو دیواروں میں لگی ہیں وہ بھی سنہری ہیں۔ مشہور نقاشوں نے بہت اچھے نقش و نگار بنائے ہیں۔ باہر کی سمت اور صحن کے مکانات سب منقش ہیں اور ان پر بہت نازک رنگین کام بنا ہے۔ یہ کاظمین اور نجف کے روضوں سے بہتر ہے۔ اس میں صرف ایک نقص یہ ہے کہ محمود خاں کی وفات کے باعث دوسری منزل مکمل نہ ہو سکی۔ وسط میں ایک بہت خوبصورت فولادی صندوق رکھا ہوا ہے۔ جس کے اندر سید الشہدا حضرت امام حسینؓ اور حضرت علی اکبرؓ کی قبریں ہیں۔ گنبد کے ایک صحن میں ان ۷۲ شہیدوں کی قبریں ہیں جو حضرت امام حسینؓ کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عباسؓ اور حضرت حبیب بن مظاہرؓ کی قبریں بھی انہی میں ہیں۔ لیکن بظاہر حبیب بن مظاہر کی قبر گنبد کی غلام گردش میں بنی ہوئی ہے اور حضرت عباسؓ کی قبر وہاں سے چوتھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

حضرت امام حسینؓ کی زیارت کے بعد حضرت عباس کی قبر پر جاتے ہیں۔ حبیب بن مظاہر کی قبر کے پاس ایک غار ہے جس کو قتل گاہ کہا جاتا ہے۔ جہاں سے لوگ تبرک کے طور پر مٹی اٹھاتے ہیں۔ شہر سے چوتھائی میل کے فاصلہ پر خیمہ گاہ ہے۔ اور وہیں مقام زین العابدین واقع ہے۔ نواب آصف الدولہ حکمران صوبہ اودھ کی بیگم نے اس پر ایک شاندار عمارت بنوا دی ہے۔ اس کے قریب ایک کاروان سرائے کی تعمیر شروع کی تھی جو نواب آصف الدولہ کی وفات کے باعث نامکمل رہ گئی ہے شہر سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر شہید حر کی قبر ہے جو دور سے نظر آتی ہے۔ چونکہ اس نواح کے وہ عرب جو وہابی کہلاتے ہیں لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے سوا بڑے قافلوں کے اس طرف کوئی نہیں جاتا ہے۔ اس لیے میں بھی اس مردِ خدا کی زیارت سے محروم رہا۔ شہر کربلا کے گرد ایک دیوار بنی ہوئی ہے جس کی چوڑائی بھی کم ہے اور مضبوط بھی نہیں ہے۔ وہابی اس میں نقب لگا کر داخل ہو جاتے ہیں اور لوٹ مار کرتے ہیں۔ یہ شہر اس سے قبل بڑے بڑے دولت مند تاجروں کا

مسکن تھا اور بہت آباد تھا۔ مگر وہابی تحریک کے باعث لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔

کربلا پر وہابیوں کا حملہ

مختصر طور پر واقعہ یہ ہے کہ ۱۸ر ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۸۰۲ء کو عیدِ غدیر کے دن کربلا کے اکثر باشندے نجف کی زیارت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اس وقت تقریباً پچیس ہزار گھوڑے سوار عرب وہابی کربلا کے اطراف میں پہنچ گئے۔ ان میں سے پہلے چند تو زائرین کے لباس میں شہر کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ حاکم شہر عمر آغا جو سنی المذہب تھا تعصب کے باعث حملہ آوروں کو زبان دے چکا تھا۔ پہلے حملے میں وہ لوگ شہر کے اندر داخل ہو گئے اور آوازیں بلند کیں کہ کافروں کو ذبح کر دو۔ عمر آغا خود محض دکھاوے کے لیے بھاگ گیا اور بعد میں سلیمان پاشا کے حکم سے قتل کیا گیا۔ قتل و غارت کے بعد ان لوگوں نے چاہا کے گنبد کی طلائی اینٹوں کو اکھاڑ کر لے جائیں مگر انتہائی مضبوطی کے باعث اکھاڑ نہ سکے۔ اس لیے قبروں اور گنبد کے اندرونی حصہ میں قبر کو توڑا اور چیزوں کو توڑ پھوڑ کر شام کے وقت نہایت بے خوفی کے ساتھ اپنے وطن واپس چلے گئے۔

پانچ ہزار سے زیادہ آدمی قتل ہوئے اور زخمیوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ مقتولین میں ایرانی شہزادہ مرزا حسن، مرزا محمد طبیب لکھنوی، علی نقی خاں رامپوری اور ان کا بھائی مرزا تقی علی اور ان کا خادم اور خادمہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کا سامان بھی لوٹ لے گئے۔ مزار کا سونا چاندی نکال لیا اور تمام شہر کو غارت کر کے جھاڑ و پھیر دی۔ مقدس صحن میں مقتولین کا خون بہہ رہا تھا۔ مقبرہ اور حجرے مقتولین کی لاشوں سے بھرے ہوئے تھے۔ سوا محلہ حضرت عباسؓ اور اس سمت کے گنبد کے، کوئی اس آفت سے محفوظ نہیں رہا۔ اس حادثہ کی شدت یہاں تک پہونچی تھی کہ میں اس حادثہ کے گیارہ ماہ بعد اس شہر میں پہنچا تو اس وقت تک تازہ حادثہ معلوم ہوتا تھا۔ اور سارے شہر کے لوگوں کا موضوع گفتگو یہی تھا۔ بیان کرنے والے بیان کرتے وقت روتے جاتے تھے۔ واقعات سن کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس حادثہ میں قتل ہونے والے بزدلی اور نامردی سے قتل ہوئے۔ بلکہ بھیڑ بکریوں کی طرح اپنے آپ کو بے رحم قصابوں کے حوالے کر دیا۔

وہابیوں کے چلے جانے کے بعد ان اطراف کے بدوؤں نے شور مچایا کہ وہابی پھر واپس آئیں گے۔ جب شہر کے لوگ مقابلے کے لیے باہر نکلے تو وہ بدو شہر میں داخل ہو گئے اور ہیکل

سامان اور دوسرا بھاری سامان جو وہاں چھوڑ گئے تھے۔ وہ ایک دن اور ایک رات لوٹتے رہے اور جو شخص بھی شہر میں داخل ہوا۔ اس کو قتل کر دیا۔ وہابیوں کے حسب نسب اور ان کے رہنما کے متعلق میں نے بہت جستجو کی۔ مگر کسی سے مفصل حال نہ معلوم ہو سکا کیونکہ اس ملک کے لوگ ترکی امرا کے بھڑکانے اور اپنی کم عقلی کے باعث ان سے کوئی مدد نہیں لیتے تھے اور اس کے حکم و ہدایت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے بہت چھان بین کے باوجود تھوڑی سی معلومات حاصل ہوئیں۔

وہابیوں کا حسب و نسب اور عقائد

اس فرقہ کا بانی عبدالوہاب نامی ہے جو حِلّہ HILLA کے نواح کا رہنے والا ہے۔ اس کو ابراہیم نام کے ایک عرب نے جو قبیلہ بنو حرب سے تھا اپنا منہ بولا بیٹا بنا کر اس کی پرورش کی تھی۔ عبدالوہاب اپنے ہم عمروں اور ساتھیوں میں ذہانت اور طاقت میں بہت مشہور ہوا۔ فہم و فراست میں ممتاز تھا۔ ساتھ ہی بہت سخی تھا۔ جو کچھ ہاتھ آتا اپنے ساتھیوں اور مددگاروں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اس نے اپنے وطن میں عربی زبان اور فقہ و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے اصفہان چلا گیا۔ وہاں حکمت اور دیگر علوم نامور علماء کے حلقۂ درس میں حاصل کیے۔ اس کے بعد خراسان، عراق اور غزنی کے علاقوں کی سیاحت کی اور وطن واپس آگیا۔ ۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۵۷ء یا اس سے ایک دو سال قبل یا بعد اس نے اپنے نظریات کی اشاعت شروع کر دی۔ ابتدا میں وہ امام ابوحنیفہؒ کا مقلد تھا۔ اور اصول و فروع میں اُنہی کی رائے پر عمل کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اُن کی تقلید کا جوا گردن سے اُتار دیا۔ اور جو اصول خود پسند کرتا تھا اُن کو ہمت کے ساتھ بلا خوف و تامّل بیان کرتا تھا اور لوگوں کو اس پر عمل کی دعوت دیتا تھا اور اپنے نظریات کے علاوہ دوسرے نظریات کو باطل قرار دیتا تھا۔ اس کے نزدیک دوسرے تمام اسلامی فرقے مشرک اور کافر تھے بلکہ وہ ان کو لات و ہبل کی پوجا کرنے والوں سے بھی بدتر قرار دیتا تھا۔ اس کی جماعت کے لوگ بے اختیار و بلا واسطہ پروردگار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور عام مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اور حادثہ کے وقت آنحضرت صلعم اور صحابۂ کرام کے سوا کسی کا نام نہیں لیتے۔ اور عام مسلمان جو تعظیم رسول اللہ کی قبر اور ائمۂ اربعہ کی قبروں کی کرتے ہیں اور اُن کے وسیلہ سے خدائے تعالیٰ سے اپنی فلاح کی درخواست کرتے ہیں۔ ان باتوں کو یہ وہابی بُت پرستی قرار دیتے ہیں۔ اور یہی حال یہودیوں اور نصرانیوں کا ہے جو حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کی

تصاویر کی پوجا کرتے ہیں۔ اصل خدا پرستی یہ ہے کہ خدا کی ذات کی پرستش بغیر کسی کو شریک ٹھہرائے ہوئے کریں اور مدد اور ہدایت اسی سے طلب کریں۔

علاقہ نجد کے قبائل میں سے ایک جماعت اس کی معتقد ہو گئی۔ آہستہ آہستہ اس علاقہ میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ روضہ خیر الانام حضرت صلعم اور صحابۂ کرام اور ائمہ کرام کے مزارات کو منہدم کر دے۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا۔ مگر موت نے اس کو فرصت نہ دی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمدؐ امام اور مفتی ہوا۔ وہ دونوں آنکھوں سے اندھا ہے اور ابھی زندہ ہے۔ اب اپنے مکان میں گوشہ نشین ہے۔ اس لیے عبدالوہاب کی خلافت اور جانشینی عبدالعزیز بن سعود کو ملی جو ابراہیم مذکورہ کا پروردہ ہے اور اس کو امیر المومنین کا لقب ملا ہے۔ وہی فوج کا سپہ سالار ہے اور حاکم ہے۔ یہ ایک بلند قامت اور قوی ہیکل اور بہادر شخص ہے۔ اس کی آواز بہت کرخت ہے۔ حالانکہ اس کی عمر اس وقت ۸۰ سال سے زیادہ ہے لیکن بظاہر اس کے قویٰ میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آتی۔ چالیس سال کے عرصہ میں اس کے خاندان میں کسی کا انتقال نہیں ہوا۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک یہ مذہب حق (وہابیت) استحکام نہیں حاصل کرے گا۔ میرے خاندان کا کوئی شخص نہیں مرے گا۔ عوام اس کے بہت معتقد ہو گئے ہیں۔ اس کا ایک لڑکا ہے بہت بہادر اور مدبر جس کا نام سعود بن عبدالعزیز ہے۔ وہ اس کا قائم مقام ہے اور لشکر کشی میں ماہر ہے۔ اس وقت ابن عبدالعزیز ہفتہ میں دو بار محمدؐ بن عبدالوہاب کی خدمت میں حاضر ہو کر دینی مسائل کی تحقیق کرتا اور ہر قسم کے مسائل اور معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔ اسی کی ہدایت پر دوسرے شہروں پر فوجوں کو حملے کے لیے بھیجتا تھا۔ ہر معاملہ میں اس کی پیروی کرتا تھا۔

اس نے نئے طریقے اور اصولوں میں وہ عبدالوہاب سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس نے صرف نواح نجد ہی میں اپنی جدوجہد پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دوسرے شہروں میں بھی اپنی دعوت پہنچائی۔ اور اپنے پیروں کے لیے تمام دوسرے فرقوں کے خون اموال اور اجناس کو مباح قرار دیا۔ اور ان سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ جنگ میں مارے جائیں گے تو ان کے اہل و عیال کی کفالت وہ خود کرے گا۔ اور آخرت میں وہ جنت کے مستحق ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنے مجاہدین میں سے ہر ایک کو رخصت کے وقت ایک حکم نامہ دارو غہ جنت کے نام لکھ کر دیتا ہے۔ جس کو وہ مجاہد گردن میں لٹکا لیتا ہے کہ جب روح جسم سے جدا ہو جائے گی تو بغیر سوال و جواب

سیدھے جنت میں جائیں گے۔ اس کے نافذ کردہ احکامات اور واقعات سن کر لوگ حیران ہو جاتے ہیں۔

وہ خود اور اس کے پیرو زمین پر بیٹھتے ہیں۔ وہ لوگوں کی معاش کا انتظام بھی کرتے ہیں اور رعایا کے ساتھ عدل و انصاف بھی۔ ملک کی تمام آمدنی فوج کے، عمارت اور دوسرے ضروری کاموں میں لگاتے ہیں۔ اس کی فوج صدر اسلام کی فوج کی طرح لاتعداد بدوؤں پر مشتمل ہے جو اس کے حکم پر حصول ثواب کے لیے اور مال غنیمت کے لالچ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ خود لیتا ہے اور باقی لوٹنے والوں پر تقسیم کرا دیتا ہے۔ جو لوگ کمزور اور زحمت کش ہیں وہ ایک کمبل کی عبا میں سارا سال گذار دیتے ہیں۔ ان کے گھوڑے نجدی ہیں اور مشہور نسل کے ہیں۔ وہ نجد کے گھوڑوں کو کہیں اور نہیں جانے دیتے ہیں۔ اس وقت تک انھوں نے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، اور مسقط کو چھوڑ کر باقی سارے عرب جزائر پر تسلط قائم کر لیا ہے۔

حرمین کو چھوڑ دینے کا سبب یہ ہے کہ وہ بیت اللہ کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔ حاجیوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ چاہے وہ کسی جگہ کے ہوں۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ دوسرے ملکوں کے حاجی ان کے علاقے سے گزریں۔ اگر کوئی دوسرے علاقہ سے گذرتا ہے تو علم ہونے پر اسے راستہ سے لوٹا دیتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ شریف مکہ (مکہ کا گورنر خلیفۂ ترکی کا مقرر کردہ) اپنے کو اس کے متوسلین میں ظاہر کرتا ہے۔ اس دوران اس نے استنبول کے امراء کے لالچ دلانے پر، اپنی آزادی کا اظہار کیا ہے۔ اسی بناء پر عبدالعزیز نے ان شہروں کو فتح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے سعود کو بے حساب لشکر دے کر روانہ کیا ہے پہلے اس نے طائف میں قتل و غارت گری کی۔ چونکہ حج کا زمانہ تھا۔ اس لیے وہیں ٹھہر گیا اس کے بعد بلائے ناگہانی کی طرح مکہ معظمہ پہنچا اور اس کو فتح کیا۔ اور بعض مقدس مقامات کو توڑ دیا۔ اور جدہ کا محاصرہ کر لیا۔ شریف مکہ ایک جہاز پر سوار ہو کر بحر قلزم کی طرف بھاگ گیا جدہ کے باشندوں نے تاوان جنگ دے کر صلح کر لی۔ چونکہ سعود عمان پر حملہ کرنا چاہتا تھا اس لیے صلح پر اکتفا کر کے عمان کی طرف چلا گیا۔ شریف نے دوبارہ مدینہ منورہ پر قبضہ کر لیا سعود کے تھوڑے سے آدمیوں کو جو وہاں انتظام کے لیے رہ گئے تھے قتل کر دیا۔ بھگا دیا۔

سعود نے جدہ اور مسقط پر حملہ کیا اور وہاں کے سلطان سے جنگ کی۔ مسقط کے نواح کے تمام باشندوں نے وہابی مسلک اختیار کر لیا اور اپنے سلطان سے بغاوت کر دی۔ سلطان کا بھائی جو کہ سلطنت کا دعویدار تھا۔ اس نے وہابی مسلک اختیار کر لیا اور وہابیوں سے امام المسلمین کا لقب پایا۔ اس وجہ سے سلطان نے سوا قلعہ کے کچھ بھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھا۔ اور سعود جانتا تھا کہ آخر کار یہ خود بخود ہاتھ آ جائے گا۔ اس لیے حملہ نہیں کیا۔

بصرہ اور حلہ کے لوگوں کو وہابیوں کے خوف سے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ کربلا اور نجف میں لوگ رات بھر حقہ اور چرٹ پیتے اور جاگتے رہتے تھے۔ روضہ کا قیمتی سامان انھوں نے لے جا کر کاظمین میں محفوظ کر دیا تھا۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب وہابی بصرہ کو فتح کریں گے۔ ان کے حملے اکثر بصرہ سے ۴۰ میل کے فاصلے پر ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ فن جہاز رانی کے ماہر قبائل قطیب پر جو خود بھی چھوٹے جہاز رکھتے ہیں۔ دو سال میں قابو پا کر اور بحری طاقت بڑھا کر بصرہ فتح کریں۔ اس کے بعد بغداد فتح کر کے ممالک عثمانیہ کا رخ کریں۔

یہ حقیقت ہر ایک پر واضح ہے کہ کربلا پر حملے کے واقعات سلطان روم اور بادشاہ عجم تک بار بار پہنچے۔ مگر کسی نے ان کی روک تھام کی فکر نہ کی۔ اس لیے وہابی دلیر ہو گئے اور ان کی ہمت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے حضرت محمد صلعم کی تقلید میں سلاطین عالم کو خطوط ارسال کیے۔ چنانچہ شاہ ایران کو جو خط لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"ترجمہ نامۂ وہابی' بنام شاہ ایران"

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور نہایت رحم والا ہے

عبدالعزیز امیرالمومنین کی طرف سے فتح علی شاہ ملک عجم کے نام، چونکہ رسول خدا حضرت محمد بن عبداللہ کے بعد شرک اور بت پرستی امت کے اندر پھیل گئی ہے۔ چنانچہ لوگ کربلا اور نجف کے مزارات مثلاً کی بنی ہوئی اور پتھر وں کی قبروں پر کہ جو انھوں نے خود بنائی ہیں، سجدہ کرتے ہیں اور حاجات طلب کرتے ہیں۔ یہ اللہ بہت کمزور بندہ جانتا ہے کہ سیدنا علی اور سیدنا حسین

ان افعال سے راضی نہیں۔ اس لیے میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ دلوں کی صفائی کے لیے حق تعالیٰ کی توفیق سے بغداد اور اکثر بلادِ عرب کو ان آلائشوں سے پاک کروں۔ یہ صلاح ٹھہری کہ ان مزارات کو منہدم کر دیا جائے۔ اس لیے کربلا کی طرف ایک فوج بھیجی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہوا ہوگا۔ وہ ان کو مناسب سزا دے گی۔ اور اگر ملک عجم بھی اس عقیدہ پر قائم ہے تو چاہیے کہ اس سے توبہ کرے۔ کیونکہ ہر وہ شخص جو کفر و شرک کرے گا اس کے ساتھ وہی ہوگا جو کربلا والوں کے ساتھ ہوا ہے۔ اور سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔"

مختصر یہ کہ جب میں شہر کربلا کی زیارت سے فارغ ہوا تو حلہ کے راستے سے جو یہاں سے ۴۰ میل ہے۔ نجف اشرف کے لیے روانہ ہوا۔ جنگل کا راستہ اگرچہ کم فاصلہ کا ہے مگر چوروں اور رہزنوں کی وجہ سے خطرناک ہے اور نجف پر وہابی حملہ کا خوف اس وقت سے پھیلا ہوا ہے جب سے میں نے کاظمین چھوڑا۔ ان اطراف میں ہر طرف اس خطرہ کا چرچا تھا۔ منجملہ ان سعادتوں کے جو مجھ کو کربلا میں حاصل ہوئیں۔ ایک یہ کہ میں نے ایک قصیدہ سیّد الشہداء کی مدح میں لکھا۔ یہ قصیدہ استنبول سے بغداد تک کے دشوار گذار راستہ میں لکھا۔ جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اور ایک بڑے قطعہ پر نہایت اچھے خط میں سنہرا لکھوا کر رواقِ مبارک پر جو روضہ میں داخلہ کی جگہ ہے۔ لٹکایا گیا۔ الغرض پہلے دن عراق کے مشہور شہر حلہ میں ٹھہرا۔ جو عباسی خلفاء کے دور میں برسوں سلاطین کا دارالخلافہ رہا ہے راستہ میں دو نہروں کے پُل عبور کیے۔ ایک نہر کربلا کے نزدیک ہے جو نہر حسینیہ کہلاتی ہے۔ جس کو روم کے سلطان مرادؔ نے بنایا تھا اور یہ نہر دریائے فرات سے نکالی گئی تھی اس نہر کی وجہ سے سلطان کو نیک نامی نصیب ہوئی۔ دوسری نہر آصفیہ عرف ہندیہ کہلاتی ہے جو مرحوم نواب آصف الدولہ بن شجاع الدولہ سے منسوب ہے۔ یہ بہت بڑی نہر ہے اور دریا کی طرح چوڑی ہے۔ اس وقت تک اس پر دس لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے اگرچہ ابھی تک نجف نہیں پہنچی ہے۔ کیونکہ گورنر بغداد کی یہ خواہش ہے کہ اس نہر کو شہر کوفہ اور اس کے قریب کے دیہاتوں اور قصبوں سے گذارا جائے۔ تاکہ زراعت وغیرہ کو بھی فائدہ پہنچے۔ صرف نجف کے لوگوں کو پانی پہنچانا ہی مقصد نہ ہو۔ ابھی نہر مکمل ہونے

میں چند میل باقی ہیں ۔ جب یہ مکمل ہو جائے گی تو اس کے ذریعہ سے فرات کا پانی ایک
پرانے خشک دریا میں گرے گا جو نجف کی دیوار سے ملا ہوا بہتا تھا ۔ اور اس کے بعد دریائے
فرات میں گرے گا ۔ اور ہمیشہ اس میں باقی رہے گا ۔ اور راستوں پر متعدد پل تعمیر ہو جانے
سے لوگوں کو آرام ملے گا ۔ اور آصف الدولہ کا جو روپیہ اس کار خیر میں صرف ہو گا یا ہو چکا ہے
عام لوگوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو گا ۔

معلوم ہونا چاہیے کہ نواب آصف الدولہ کے نیک کاموں کے نشانات عرب کے
علاقوں میں بہت ہیں ۔ خاص طور پر عتبات عالیہ میں اس کو بہت شہرت حاصل ہے جو
اس سے قبل کسی امیر یا بادشاہ کو حاصل نہیں ہوئی اور نہیں معلوم اس کے بعد بھی کسی
کو حاصل ہو گی یا نہیں ۔ میں نے پندرہ سال قبل اپنے قیاس کی بنا پر ایک مثنوی کے ضمن
میں آصف الدولہ کی شان میں ان خوبیوں کا حال جو بچشم خود دیکھیں اور کانوں سے سنیں
بیان کیا تھا ۔

غرض یہ کہ شہر حلہ بغداد کی طرح دریائے فرات کے دونوں طرف واقع ہے ۔ مغربی
کنارے پر امرا و معززین اور ترک گزر رہتے ہیں اور دوسری سمت ریگستان ہے ۔ لیکن
باغات دونوں طرف بکثرت ہیں ۔ حلہ کی مشہور عمارتوں میں ایک مسجد شمس ہے جو اس مقام
پر بنی ہوئی ہے ۔ جہاں آنحضرت صلعم نے حضرت علی کی نماز عصر کے لیے آفتاب کو لوٹایا
تھا ۔ دوسری طرف منارۂ سر علیؓ ہے ۔ جس کے لیے عوام میں مشہور ہے کہ اگر وہاں کھڑے
ہو کر کوئی کہے کہ بحق علیؓ حرکت کر تو وہ ہلنے لگتا ہے اور اگر کہے کہ بحق عمرؓ حرکت کر تو حرکت
نہیں کرتا ہے ۔ مگر یہ بات قابل اعتبار نہیں ہے ۔ لیکن اس منارہ کا حرکت کرنا ثابت ہے کیونکہ
معتبر لوگوں نے بیان کیا ہے کہ منار کا حرکت کے وقت ایک آدمی کو اس منار کے سایہ کے
سرے پر کھڑا کر دیا گیا تو منار کی حرکت کے وقت سایہ دو گز آگے پیچھے ہو گیا ۔ اس کے علاوہ
یہاں حضرت عقیل بن ابی طالب کا مزار بھی ہے جو حضرت علیؓ کے بھائی تھے ۔ دوسرے دن
راستہ میں حضرت ذوالکفل نبی کا مقبرہ دیکھا ۔ یہ مشہور مقام ہے ۔ کنویں کے اندر قبر ہے اور یہ
امام مہدی کا مقام ہے ۔ اور نجف کے قلعہ سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے ۔ اس کے بعد واعظ کا
دارالسلام کے راستہ سے شہر میں داخل ہوا ۔ حضرت ذوالکفل کا گنبد ایک چھوٹے گاؤں میں
ہے ۔ جہاں کے باشندے تمام یہودی اور عیسائی ہیں ۔ اس کے گرد حلیو ظاہر ہے ۔ یہ

تمام عرب شام اور استنبول کے یہودیوں کی زیارت گاہ ہے۔ ان کے لیے بیت المقدس کے بعد اس جگہ سے زیادہ متبرک کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔ نجف کے اطراف کی زمین ریتیلی اور مسطح اور بہت دلکش ہے۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور رنگ برنگ کے خودرو پھول بکثرت نظر آتے ہیں۔ اس معاملہ میں نجف کی زمین کو کیپ حبش کی طرح پایا جس کا ذکر شروع کتاب میں کر چکا ہوں۔

نجف میں سراب نجف کے اطراف میں سراب بہت نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر خشک ندیاں بہت دکھائی دیتی ہیں۔ ہندوستان میں جس کو میں سراب سمجھتا تھا، وہ غلط تھا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ سراب کیا ہے۔ یہ سراب سو قدم کے فاصلے سے بہتی ہوئی ندی معلوم ہوتا ہے۔ شہر نجف کی دیوار پناہ اپنے برجوں کے ساتھ بہت مضبوط ہے۔ مگر اس کے ساتھ خندق نہیں ہے۔ اس دوران میں نواب وزیر آصف الدولہ کی طرف سے ایک رقم غربا و مساکین میں تقسیم کرنے کے لیے آئی تھی لوگوں نے طے کیا کہ اس رقم کو شہر پناہ کے گرد خندق کھودنے میں صرف کیا جائے تاکہ وہابیوں کے حملے سے محفوظ رہ سکیں۔

عمارتِ روضۂ نجف نجف میں حضرت علیؓ کے روضہ کی عمارت کا گنبد، اس کا صحن اور متعلقہ مکانات تعمیر کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں۔ گنبد کے دونوں طرف دو مینارے ہیں اور سب سنہری اینٹوں (ٹائلس) سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ان کی تعمیر نادر خاں کے اخلاص کی یادگار ہے۔ گنبد کا اندرونی حصہ دروازے اور دالانوں کے اندرونی حصے نقش و نگار سے مزین ہیں اور نہایت خوبصورت ہیں۔ مگر کربلا کے نقش و نگار سے کم درجہ ہیں۔ گنبد کے سامنے ایک بہت کشادہ اور خوشنما ہال ہے جو کربلا کے ہال سے زیادہ بڑا ہے۔ گنبد کے دروازے اور قبر کا صندوق چاندی سے منڈھے ہوئے ہیں۔ اس روضہ کا بہت سا سامان کاظمین میں محفوظ ہے مگر اس کے باوجود ابھی نفیس قالین، جھاڑ، فانوس چین کے بنے ہوئے اور بہت سا قیمتی سامان موجود ہے۔

حضرت علیؓ کے مزار کی زیارت سے فارغ ہو کر اس گوشہ کی طرف گیا جس کو زیارت حسینؓ کہا جاتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ امام زین العابدین نے شام سے واپسی کے بعد سر مبارک اس جگہ دفن کر دیا تھا۔ اس زیارت سے فارغ ہو کر مقبرے کے نیچے جا کر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کی قبروں کی زیارت کی۔ دونوں نبی اس

جگہ دفن ہیں۔ گنبد کے باہر غلام گردش سے متصل اندر داخل ہونے کے دروازے میں شاہ عباس صفوی کی قبر ہے، جونظر نہیں آتی۔ غلام گردش کے دوسری جانب نماز کے لیے جگہ مقرر ہے۔ اس کے قریب ایک حجرہ ہے۔ جس میں محمد خاں قاچار کی قبر ہے اور سنگ مرمر کا ایک چبوترہ بنا ہوا ہے جس پر ہمیشہ عود سلگا کرتا ہے۔ اور رات کو کافوری شمعیں چاندی کے شمع دانوں میں روشن کی جاتی ہیں۔ اس جگہ قاری ہمیشہ تلاوت قرآن کرتے رہتے ہیں۔ یہ شاندار انتظام محمد خاں کی قبر کے لیے روضۂ مبارک کے اندر بالکل نامناسب معلوم ہوتا ہے، اور یہ اس کے وارثوں کی نادانی اور گنوار پن کی علامت ہے۔

ایک بدّو کا واقعہ

جس وقت میں زیارت کی دعائیں پڑھ رہا تھا۔ میرے ساتھ چار مقرب خدّام کھڑے تھے اور میں صاحب روضہ کی ہیبت سے کانپ رہا تھا۔ اس وقت ایک بدّو عرب اندر داخل ہوا۔ اس کی سفید داڑھی بہت لمبی تھی اور الجھی ہوئی تھی۔ اور گرد و غبار سے زرد ہو رہی تھی۔ وہ ایک لمبی قمیض پہنے ہوئے تھا اور پائجامہ کے بدلے لنگوٹ باندھے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راستہ کی گرد سے لت پت ہے۔ اس نے روضہ کے گرد چکر لگایا اور ایک جگہ کھڑے ہو کر زیارت کی دعا پڑھنے لگا۔ اس نے کہا: "اے ابوالحسن تم پر سلامتی ہو" اس نے خدّام کی کوئی پروا نہ کی۔ انتہائی خلوص و عقیدت کے باعث اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ اسی طرح بغیر کسی گمان کے دروازے سے اندر آیا اور قبر مبارک کو ہلایا۔ یہ دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ شاید ابوالحسن اس کے کسی دوست کا نام ہو گا جو روضہ کے اندر سو رہا ہو گا اور یہ اس کو جگا رہا ہے۔ میں اس کی عقیدت کے اس مشاہدہ پر بہت متعجب ہوا۔ اور اپنے اور اس کے راسخ عقیدہ میں بہت فرق پایا۔ اور مجھ کو اس کے مرتبہ پر حسد ہوا۔

روضۂ مبارک کے باہر جو مقدس مقامات ہیں۔ ان میں ایک "مقام زین العابدینؑ" ہے اور دوسرا صفہ صفا۔ آج کل موصل کے ان فوجیوں نے جو نجف والوں کی مدد کے لیے آئے ہوئے ہیں اور ان مقامات کے بہت قریب رہتے ہیں۔ اسے بہت گندہ کر دیا ہے۔

مُلّا محمود متولی

یہ روضۂ مبارک کا خاندانی کلید بردار ہے۔ اور آج کل نجف کا حاکم بھی ہے۔ نہایت خوش سلیقہ، بااخلاق اور صاحب علم

شخص ہے۔ یہ دوسرے متولیوں کے مقابلے میں زیادہ توجہ سے خدمت کرتا ہے چنانچہ عصر کے وقت جب عثمانی شرفا اپنے حرم سرا سے باہر آتے ہیں۔ وہ روضہ پر حاضر ہو جاتا ہے اور نماز سے فراغت کے بعد صفہ مذکورہ کے ایک طرف فرش بچھا کر بیٹھ جاتا ہے۔ گویا یہ اس کا آتشدان ہے۔ اس کے بعد مغرب کی نماز روضہ کے اندر ادا کر کے اپنے گھر چلا جاتا ہے جو تھوڑے فاصلے پر ہے اور کھانا کھاتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں سے ملاقات کرتا ہے۔ عشاء کے وقت پھر روضہ پر آتا ہے اور نماز کے بعد روضہ اور صحن کے دروازے میں قفل لگا کر اپنے مکان پر واپس چلا جاتا ہے اس کو علی پاشا، گورنر کی طرف سے میری دیکھ بھال کی ہدایت ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے مجھ کو صحن مبارک میں ایک حجرہ دیدیا۔ اور چند آدمی میری خدمت کے لیے مقرر کر دیئے۔ کھانا مجھے اپنے ساتھ کھلاتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ میں استنبول سے بصرہ تک میں نے یہاں سے زیادہ لذیذ کھانا کہیں اور نہیں کھایا۔ اس کے پاس پُرانے ہندوستانی باورچی ہیں۔ ہاتھ دھونے کے لیے لیموں کا چھلکا ملا ہوا بیسن لائے جس کو دیکھ کر مجھ کو حیرت ہوئی کہ یہ فرق کیوں ہے۔ جبکہ عثمانی گرم پانی سے ہاتھ دھوتے ہیں اور بعض لوگ بدبودار صابن سے۔ چونکہ وہ فارسی زبان جانتا تھا اس لیے اس کے ساتھ خوب صحبت گرم رہی۔ میں نے اپنا وہ قصیدہ جو حضرت علیؓ کی شان میں استنبول کے راستہ میں کہا تھا۔ اس کو سنایا۔ اس نے بہت پسند کیا۔ اس نے وہ قصیدہ بہت خوشخط لکھوا کر ضریح مبارک کے قریب لٹکا دیا اور مجھ سے کہا کہ تمہاری یہ یادگار برسہا برس اس جگہ قایم رہے گی۔

مشہد علی کی زیارت کی سعادت حاصل کر کے دو دن بعد ملا محمود کے ذریعہ سواری کے ٹٹو اور خچر کرایہ پر حاصل کیے اور بغداد واپس روانہ ہوا۔ اس روز دوبارہ حلہ میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ راستہ میں مسجد کوفہ کی زیارت کی۔ اور گنبد ناقہ اور گنبد حنانہ کو دیکھا۔ کہتے ہیں جب حضرت علی کی نعش اُٹھانے والی اونٹنی ادھر سے گذری تو قریب کے پہاڑ کے سامنے کا حصہ اونٹنی کے سامنے تعظیم کے لیے جھک گیا۔ اس کے جھکنے کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اس لیے اس مقام کا نام حنانہ رکھا گیا۔ اور دوسرا مقام جو نجف کے قریب ہے جہاں ناقہ بیٹھی تھی اس جگہ پر آنجناب کو دفن کیا گیا۔ دوسرے دن آخری

تھی۔ اس راستہ پر پہنچ گئے جس سے گئے تھے۔ تیسرے دن تیسری بار بغداد پہنچا۔

بغداد میں میری حالت

اب بغداد میں اپنے قیام کا حال لکھ رہا ہوں۔ موصل کے گورنر محمد پاشا نے رخصت کے وقت انتہائی نیک نیتی اور پاک طینتی کے ساتھ مجھے تاکید کی تھی کہ بغداد میں گورنر کے گھر قیام کرنا اور کسی دوسری جگہ ٹھہرنے کا ارادہ نہ کرنا۔ اس صورت میں پاشا تمھارے کاموں میں اپنی ذمّہ داری محسوس کرے گا اور ہر کام میں مدد کرے گا۔ نہ صرف بصرہ بلکہ بمبئی تک اس کی مدد شامل حال رہے گی۔ سلطان روم کا جو حکم نامہ تمھارے پاس ہے اور پاشا کے نام ہے، وہ اگرچہ کافی ہے۔ تاہم میں خود ایک خط پاشا کے نام لکھ دوں گا تاکہ وہاں پہنچتے ہی وہ تم کو پاشا تک پہنچا دے۔ یہ رائے مجھ کو بہت معقول نظر آئی۔ لیکن میں استنبول سے یہاں تک سفر میں عام ترکوں اور پاشاؤں کے مکانات کی گندگی، ناراحتی اور کھانے کے طریقوں سے بہت تکلیف اٹھا چکا تھا۔ بغداد پہنچنے والے دن تیز بارش ہو رہی تھی۔ میرا سارا سامان بھیگ گیا تھا۔ جوتے، مٹی اور کیچڑ میں لت پت تھے اور رات کا وقت تھا۔ میں نے مسٹر جونسن کو عام انگریزوں کی طرح سمجھ کر ان کے یہاں قیام کیا۔ وہیں کھانے کا انتظام کرایا۔ محمد پاشا گورنر کے مقرّر کردہ رہنما نے مجھے بہت منع کیا مگر میں نے اس کی بات نہ مانی اور اسی جگہ قیام کر لیا۔ اس کے سبب سے علی پاشا مجھ سے آزردہ ہو گئے اور میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اس لیے کہ میرے پہنچنے سے قبل ایک مکان میری سکونت کے لیے درست کرا دیا تھا۔ اور شیخ عبدالقادر؈ کے احاطہ مزار سے ایک ہندوستانی کو میری ترجمانی کے لیے بلا لیا تھا۔ اور مہمان داری کے لوازمات فراہم کر دیئے تھے۔ دو دن بعد جب مسٹر جونسن انگریزی سفیر نے ان سے ملاقات کی، اور سلطان سلیم کا فرمان ان کو دکھایا تو اس نے بہت ترش روئی سے باتیں کیں۔ اور چند دن تک ملاقات سے معذرت کی۔ اور عذر یہ کیا کہ کرد قوم پر لشکر کشی کے انتظام میں مصروف ہوں۔ اس لیے وقت نہیں ہے۔

ملاقات کے مقرّر کردہ دن اس نے مجھ کو دو گھنٹہ ایک خیمہ میں انتظار کرایا تب ملاقات کی چونکہ مسٹر جونسن سے ناراض تھا۔ اس لیے اس کی تعظیم نہیں کی۔ اور میں اس کے ساتھ تھا۔ اس نے میری بھی مناسب تواضع نہیں کی۔ لیکن سلطان کے حکم کی رعایت سے عقبات کے متولّی کے نام سفارشی خطوط لکھ کر دے دیئے۔ اور ایک مہماندار سفر میں رفاقت کے

لیے مقرر کر دیا اور مجھے رخصت کیا۔ اسی طرح بغداد کے دوسرے معززین اور شرفا نے بھی علی پاشا کی طرح میری اس حرکت کو ناپسند کیا۔ بعض لوگ مسٹر جانسن کے مکان پر آنا پسند نہ کرتے تھے اس لیے مجھ سے نہیں ملے۔ البتہ حاجی حسین تاجر اور خواجہ عبدالباری و حاجی حسین کرم علی باشندگان اصفہان اور شیخ یعقوب اور چند عرب جو اس مکان میں آتے جاتے تھے انھوں نے میرا بہت وقت ضائع کیا۔ سوائے بےلطفی، ناگواری اور نفرت کے کوئی لطف ان کی صحبت میں حاصل نہ ہو سکا یہ لوگ طویل مدت سے بغداد میں مقیم ہیں اور یہودیوں جیسی عادات اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ایرانی طور طریقے بھلا رکھے ہیں۔ اور اپنے اندر ترکوں کی خصوصیات بھی پیدا نہ کر سکے۔ مشہور مقالہ کے مطابق کہ کوا ہنس کی چال چلا تو اپنی چال بھی بھول گیا۔

چونکہ کوتاہی خود میری تھی اس لیے کسی کی شکایت نہیں کی۔ خلاف توقع اتفاق یا بد اتفاقی یہ تھی کہ زندگی کا آرام اور پاکیزگی و صفائی جو عام طور پر انگریزوں میں ہوتی ہے مسٹر جانسن کے گھر میں وہ بھی نہ تھی کیونکہ جانسن ایک سرکش، خود رائے، مغرور اور بے سلیقہ شخص ہے۔ وہ ترکوں اور عربوں سے قریب اور انگریزوں سے دور ہو گیا ہے۔ اس کا گھر اور گھر کا سامان ان ممالک کے لوگوں کی طرح گندہ اور میلا ہے۔ مدت قیام بھر میں پریشان رہا۔ زیادہ تکلیف کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کے ناشتہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا کبھی نو بجے ناشتہ ہوتا، کبھی بارہ بجے، یہی حال کھانے کا تھا۔ پھر باتیں بھی فضول قسم کی کرتا تھا۔ مثلاً بازار کے نرخ، بغدادیوں کی کہانیاں اور دوسرے واقعات، لوگوں کی دولت کے تخمینے وغیرہ، بس یہی ذکر کرتا تھا۔ اس کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ کوئی اس کی محفل میں ہنسی مذاق کی گفتگو کرے۔ ہمیشہ ہر قسم کے آنے جانے والوں کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ حکومت عثمانیہ نے استنبول سے یہاں تک جو میرے سفر کے اخراجات اپنے ذمہ رکھے تھے ان کا سلسلہ جاری رہے۔ وہ کہتا تھا کہ اب تمھاری رہنمائی میرے ذمہ ہے۔ لیکن خود اس نے اپنی نازک مزاجی کے باعث اس معاملہ میں دکوئی مدد کی نہ اس کی فکر کی، بلکہ میرے معاملات اصفہان کے ایک ارمنی کے سپرد کر دیئے جو اس کے مکان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے رہتا تھا اور نرا گاؤدی اور بے اصول آدمی تھا۔ چونکہ اس کے بتلائے ہوئے طریقے پر میں سفر کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس سے قطع تعلق کر کے، اپنے پیش آمدہ کاموں کو وہاں کے بعض دوسرے لوگوں کے مشورہ اور اپنی صوابدید کے مطابق کیا۔ اس

لیے اس گروہ کے لوگوں نے میری طرف سے بے رخی اختیار کر لی ۔ اور ان لوگوں کی مکاری کے باعث بصرہ کے سفر میں مجھ پر جو کچھ گزرا وہ ناقابل بیان ہے ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں خرچ میں کفایت کے خیال سے اور رفقائے سفر کی موانست کی غرض سے اس بات پر آمادہ ہوا تھا کہ بصرہ جانے کے لیے دو تین شریف آدمیوں کی رفاقت اختیار کروں جو بصرہ جا رہے تھے ۔ اس کے لیے ایک کشتی کرائے پر حاصل کروں اور روانہ ہو جاؤں۔ چونکہ یہ بارش کا موسم ہے اور دجلہ میں طغیانی ہوتی ہے ۔ اس لیے دو شہروں کے درمیان کشتیوں کی آمد و رفت مسلسل رہتی ہے ۔ اس لیے یہ سفر آسان ہوتا ہے ۔ مگر بدبخت ارمنیوں اور یہودیوں نے اس بات کو مجھ سے چھپایا ۔ جس دن میں نجف کے سفر سے واپس لوٹا ۔ وہ یہ خبر لائے کہ کمپنی کی ایک کشتی کسی کام سے بصرہ جا رہی ہے ۔ مسٹر جاقسن کا ملازم رہنمائی اور حفاظت کے لیے وہاں موجود ہے ۔ اگر میں اس کشتی میں سوار ہو جاؤں تو بغیر روپیہ خرچ کیے آرام سے بصرہ پہنچ جاؤں گا۔ چونکہ اتنا وقت نہ تھا کہ میں کشتی کو دیکھ سکوں اور میں یہ بات سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مسٹر جاقسن میرے لیے بغیر چھت کی ایک نہایت گندی اور کھٹملوں اور مچھروں سے بھری ہوئی کشتی انتخاب کرے گا جس پر ہندوستان والے جلانے والی لکڑیاں لادنا بھی پسند نہ کرتے ۔ ان لوگوں کی باتوں میں آ کر میں بغداد سے رخصت ہوا ۔ اور دریا کے کنارے پہنچا ۔ کشتی کو دیکھا جو نہایت گندی اور سامان کے صندوقوں سے بھری ہوئی تھی ۔ اس کا فرش اونچا نیچا تھا ۔ ملاح درندہ صفت نظر آئے ۔ میں نے یہ دیکھ کر سوچا کہ سفر کا ارادہ ملتوی کر دوں اور بغداد واپس جاؤں ۔ مگر پھر خیال آیا کہ ان بدبختوں کی منحوس صورتیں دیکھنا باعثِ کراہیت اور دل تنگی ہو گا ۔ اس لیے جان بوجھ کر موت کو ترجیح دی اور اس کشتی میں سوار ہو گیا۔

بغداد میں میرا قیام مع سفر عتبات عالیات کل ۴۴ روز رہا ۔ ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۱۷ ہجری کو مطابق فروری ۳-۱۸۰۲ء کو سہ شنبہ کے دن شام کے وقت یہ کشتی بصرہ کی طرف روانہ ہوئی ۔ جسم کو ہلکا پھلکا رکھنے کے لیے اور کچھ خست کے باعث اس سفر میں غذا اور شراب کے استعمال میں بہت احتیاط اور اعتدال کا خیال رکھا ۔ چوتھے دن بے حد تکالیف کے سبب سے بخار آ گیا جو ایک ماہ تک باقی رہا ۔ بصرہ میں بھی بستر پر پڑا رہا ۔ کشتی اپنے معمول کے مطابق رات دن چلتی رہی اور ملاح اپنی بداخلاقیوں کے مظاہرے بھی کرتے رہے ۔

قبائل منتیفغ MONTEFAKN | شنبہ ۲۰ ذی قعدہ کو سوق الشیوخ پہنچا جو بصرہ

کے نصف راستہ پر واقع ہے مسوسون سے چند میل اس طرف سے بصرہ تک قبائل منتفغ کا مسکن ہے۔ ان کے مکانات اور خیمے اور بازار کی آبادی قبیلہ کے شیخ کے نام سے منسوب ہے۔ وہی تمام لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا ذمّہ دار ہے۔ یہ شیخ ایک شاندار شخص ہے تیس چالیس ہزار کارآمد سوار اور پیادے اس کے فرمانبردار ہیں۔ وقت پڑنے پر بصرہ کے حکاّم کی مدد بھی یہی شیخ کرتا ہے اس وقت وہ بصرہ والوں کی امیدگاہ ہے اور وہابیوں کے حملوں میں شہر کا نگہبان ہے۔ بازار کے گرد اگرچہ دیوار بنی ہوئی ہے لیکن ایک دیوار دجلہ کا پانی ہے۔ کیونکہ دجلہ کا پانی ہر جگہ سطح زمین سے اونچا بہتا ہے اور بندھوں کے ذریعہ اِدھر اُدھر پھیلنے سے رکا ہوا ہے جیسے ہی اس قبیلے کے لوگ کسی دشمن کے آنے کی خبر سنتے ہیں بند کا تھوڑا حصّہ کاٹ دیتے ہیں۔ میلوں تک دجلہ کا پانی ان کے مکان کو سیلاب کی صورت میں گھیر لیتا ہے اور وہ اس سے خندق کا کام لیتے ہیں۔ آخر کار کریم خان کے عہد میں جب بصرہ ایران کے قبضے میں آگیا تھا۔ تو علی مراد برادر زادہ کریم خان حاکم بصرہ نے جو بہت بہادر تھا۔ شیخ منتفغ پر لشکر کشی کی۔ شیخ نے اسی طرح دجلہ کا پانی کاٹ دیا علی مراد خان نے بہادری اور ہمت سے کام لے کر فوج کو پانی میں اتار دیا۔ شیخ نے گھبرا کر علی مراد خان کو قتل کر دیا اور اس کی فوج کا بیشتر حصّہ بھی قتل ہو گیا۔

دوشنبہ کے دن ۲۲ رذی قعدہ ۱۲۱۷ھ کو شہر قرنہ KORNA پہنچا۔ اس مقام پر دجلہ اور فرات آپس میں مل جاتے ہیں۔ اور ان دونوں کا پاٹ دریائے گنگا سے دوگنا ہو گیا ہے۔ جیسا طغیانی کے وقت ہوتا ہے۔ اور اس کا نام شط العرب ہو جاتا ہے اور یہ خلیج فارس میں گرتا ہے۔

آٹھویں دن بتاریخ ۱۳ ذی قعدہ کو مقام مخقل پہنچا۔ یہ فاصلہ تکالیف سفر کے باعث ایک سال کا معلوم ہوتا تھا۔ اس مقام کو انگریزی میں مارکیل MARKILE کہا جاتا ہے۔ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک عمارت بنوائی ہے۔ اس کے گرد چار دیواری ہے۔ اس کے اندر کمپنی کا سفیر رہتا ہے۔ اس مقام کو کوٹ فرنگی کہا جاتا ہے۔ بصرہ سے یہاں تک کا فاصلہ آٹھ میل ہے۔ عرب کے لوگ چھوٹے قلعہ کو کوت کہتے ہیں اسی سبب سے ہندوستان میں انگریزوں کے مکانات کو کوٹھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ ہندوستانیوں نے 'کوت' کو اپنی زبان کے لفظ کوٹھی کا ہم معنی قرار دیا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر میں اس بات کا امیدوار تھا کہ بصرہ کا انگریز ریزیڈنٹ مسٹر منشی ذاتی طور پر میرا استقبال کرے گا۔ اور اس کے ساتھ یہاں کے معزز انگریزوں سے ملاقات ہوگی۔ اور ان کے ساتھ رہ کر آرام حاصل ہوگا اور دل بھی بہل جائے گا۔ میری یہ توقع بے جا نہ تھی لیکن ہوا اس کے برعکس مسٹر جانسن کی مہربانیوں کا وہ سلسلہ جو راستہ بھر رہا ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور میں بصرہ کی مکروہات سے دوچار ہوا جن کا ذکر آگے آئے گا۔

بمبئی میں حاجی خلیل سفیر ایران کا قتل

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دو تین ماہ قبل حاجی خلیل سفیر ایران کی لاش بصرہ لائی گئی۔ جو بمبئی کے اندر ایک خانہ جنگی میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش بنگال کے گورنر جنرل کے حکم سے بصرہ لائی گئی تھی۔ مسٹر منشی کو حکم دیا گیا کہ اس اعزاز کے پیش نظر جو مرحوم کو ان کی زندگی میں دیا جانا طے ہوا تھا۔ اس کی لاش کو بغداد سے لے جا کر وہاں سے نجف اشرف پہنچائیں اور وہیں دفن کیا جائے۔ اور اس کام کے سلسلہ میں عتبات عالیات کے خادموں کو خیرات وانعامات دیئے جائیں۔ یہ کام کمپنی اور شاہ ایران کی طرف سے انجام دیا جائے اور اخراجات کی پرواہ نہ کی جائے۔ مسٹر منشی نے مدّت کی طوالت کے خیال سے تابوت کے ساتھ جانا ضروری نہ خیال کیا اور جنازے کو مسٹر دی تال کے ساتھ روانہ کر دیا جو خود کو بصرہ کا وزیر کہتا ہے، اور کہہ دیا کہ جب لاش کربلا پہنچ جائے تو اس کو مطلع کرے تاکہ وہ دریائے فرات کے راستے سے نجف پہنچ جائے اور اپنے سامنے لاش دفن کرائے۔ مسٹر دی تال لاش کو کشتی کے ذریعہ بغداد لایا اور نہایت تبرک واحتشام سے کاظمین بھیج کر خود بغداد میں ٹھہر گیا اور اس فکر میں تھا کہ صاحب کے حکم کے مطابق لاش کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرے۔

جب یہودی صفت عجمیوں نے نعش کی ایسی تعظیم دیکھی تو جو لوگ اُن میں مسٹر جانسن کے گھر آتے جاتے تھے انھوں نے جا کر اس سے کہا کہ اگر ایک رافضی کی لاش کی ایسی تعظیم عیسائیوں کی طرف سے مملکت عثمانی میں ہوگی تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ مفتی اور قاضی اس کے خلاف فتویٰ نہ جاری کر دیں گے اور اس کام سے روک دیں گے اور اس کام کا منتظم مسٹر دی تمہارے گھر میں قیام کرے گا تو اس کی وجہ سے تمہاری بھی بدنامی اور توہین ہوگی۔ مسٹر جانسن خفقانی مزاج کا آدمی تھا، کسی پریشانی کی بات کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے لوگوں سے

یہ بات سن کر مسٹر دی کو نعش کی زیادہ تعظیم سے منع کیا اور ساتھ جانے سے بھی روک دیا اور کہا کہ لاش کی تدفین کا کام کسی مسلمان کے سپرد کر دیا جائے۔ اور مسٹر دی بصرہ واپس چلا جائے۔ مسٹر دی خود اگرچہ طویل بحری سفر کر کے بمبئی سے آیا تھا اور تھکان سے پریشان تھا اور ابھی مزید دو ماہ اور اس کام میں صرف ہونے کے خیال سے دل برداشتہ تھا مگر چونکہ گورنر جنرل کا حکم تھا اس لیے اس کام سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا تھا اور جانسن چاہتا تھا کہ مسٹر دی ساتھ نہ جائے۔ اس لیے اس نے مصلحت کے پیش نظر یہ مشہور کر دیا کہ بغداد اور ان تمام شہروں میں بھی جدھر سے لاش گزرے گی، طاعون کی وبا پھیل گئی ہے تاکہ اس طرح مسٹر دی کو واپس لوٹنے کا عذر ہاتھ آجائے۔ کیونکہ انگریزی رائج قانون کے مطابق، طاعون پھیلنے کے باعث مسٹر دی گورنر جنرل کے حکم پر عمل نہ کرنے کا مجاز تھا۔ اس لیے اس نے بصرہ واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور لاش کو آقا نظر علی کے سپرد کر دیا جو بصرہ کے مشہور تاجر آقا بنی کا داماد تھا۔ وہ پہلے ہی سے مسٹر منشی کی درخواست پر لاش کے ساتھ تھا۔ مسٹر دی واپس آیا جب اس مکان میں پہنچا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا اور مسٹر منشی نے اس سے طاعون کی خبر سنی تو اصلیت کی تحقیق کیے بغیر میرے بارے میں بھی یقین کر لیا کہ میں مسٹر دی کے ساتھ ہوں اور ڈرا کہ کہیں میں طاعون اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ شام کے وقت جب مسٹر منشی اس مکان میں آیا تو مجھ سے بہت دور کے فاصلے سے ملاقات کی۔ قریب نہیں آیا۔ اور طاعون کے خوف کا عذر کیا۔ اور مجھ کو وہاں ٹھہرانے کے بجائے آقا بنی کے مکان پر بھیج دیا۔

دوسرے دن میں آقا بنی کے مکان پر پہنچ گیا اور آقا بنی شاہ ایران کی طلب پر طہران چلا گیا۔ اور مکان اپنے داماد آقا نظر علی کے سپرد کر گیا۔ شاہ ایران اس کو حاجی خلیل کا عزیز دار ہونے کی وجہ سے خطاب اور اعزاز دے کر ہندوستان میں اپنا سفیر مقرر کرنا چاہتا تھا۔ آقا نظر علی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے لاش کے ساتھ بغداد میں تھا اور وہ مکان فضل علی نام کے ایک بھینگے آدمی کے سپرد کر گئے تھے جو ایک کوتاہ قد اور کم عقل آدمی تھا۔ اور بصرہ کے لوگ اسے حاجی فرزین کہا کرتے تھے۔ ایک دو دن اس نے میری خاطر کی اس کے بعد میرا کام ایک دھوکہ باز شخص کے حوالے کر دیا۔ وہ میرے لیے ایسا کھانا لایا جو کھانے کے لائق ہی نہ تھا اور ضروری کاموں کو آج کل پر ٹالتا رہا۔ دھوبی اور درزی وغیرہ کا انتظام بھی نہ کر سکا چونکہ میں ایک مسلمان کی شکایت جو میرا ہم قوم تھا ایک نصرانی کے سامنے

پیش کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لیے میں نے اس معاملے میں مسٹر منسٹی سے کچھ نہ کہا اور خود بصرہ کے بازار سے روٹی اور کباب لے کر کھالیتا تھا جو اس شخص کے لائے ہوئے کھانے سے بہت بہتر تھا۔ میں صرف دن کے کھانے پر اکتفا کرتا تھا اور رات کا کھانا ناغہ کر دیتا تھا۔ میں نے بعض دوسری ضروریات بھی ترک کر دیں۔ اس طرح اس شخص کا سامنا کرنے سے نجات مل گئی۔ جب دل گھبراتا تھا تو بالاخانے کے دروازے پر آتا تھا۔ جہاں حاجی فزین اور بصرہ کے لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا اور خرید و فروخت، اور کپڑے کے نرخ کی باتیں سنائی دیتی تھیں چیخ پکار اور جھگڑے ہوتے تھے۔ اس لیے پھر اپنے ٹھکانے پر واپس آجاتا تھا۔ بالاخانہ کا وہ حصّہ جس میں میرا قیام تھا مکڑی کے جالوں اور چراغ کے دھوئیں سے سیاہ تھا اور نہایت متعفن تھا۔

کبھی کبھی بصرہ کے شرفا مجھ سے ملنے آتے تھے اور بہت زحمت دیتے تھے بصرہ کے لوگ علمِ کیمیا کے بہت شوقین ہیں ان کو یہ خیال تھا کہ میں نے فرنگستان کے قیام میں یہ علم سیکھا ہے۔ اس لیے جب تک بیٹھتے اسی کا ذکر کرتے تھے، اس لیے میں تنگ آکر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتا تھا۔

ایک بار میں بصرہ کا چھت دار بازار دیکھنے گیا جو بصرہ میں سب سے بہتر جگہ ہے مگر کسی جگہ بیٹھا نہیں۔ کیوں کہ ہر جگہ کھٹملوں اور مچھروں کی افراط تھی۔ گھر واپس آیا تو کپڑے تبدیل کرنے سے قبل بخار آگیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ بصرہ کی سب سے اچھی عمارت دیکھوں۔ تو معلوم ہوا کہ سب سے اچھی وہی عمارت ہے جس کے اندر میرا قیام ہے اور جہاں رہ کر میں جان سے عاجز ہوں۔ میں نے اس زمانے کی پریشانیوں کا ذکر اپنی ایک غزل میں کیا ہے جو اسی زمانے میں لکھی تھی۔ اور اس میں لندن کی پُر لطف محفلوں کو بھی یاد کر لیا ہے۔

بصرہ کے دوستوں میں ایک حاجی محمدؐ صالح پسر محمد علی خان ہے۔ جس کو کلکتہ میں اس کے باپ کی درخواست پر میں نے "خلاصۃ الحساب" کا سبق پڑھایا تھا چونکہ وہ ایک آرام طلب جوان تھا اس لیے دورانِ تعلیم میری نصیحت اور سختی کو مصیبت سمجھتا تھا اور پڑھنے پر خاص توجہ نہ کرتا تھا۔ اس لیے یہاں اس نے بالکل میرا خیال نہ کیا۔

دوم، حاجی امین آتا ہے۔ وہ اپنی غربا پروری اور عجیب چیزوں کی تلاش کی وجہ سے

بہت مشہور ہے۔ اس کا باپ عبداللہ آغا کے عہد میں بصرہ کے جہازوں کا افسر اور بحری حاکم تھا اب علی پاشا کی فوج میں داخل ہونے کے لیے امیدوار ہے۔

سوم محمود آقا تفنگچی باشی۔ اس نے مسافر نوازی کے خیال سے میری خبر گیری کی اور کئی بار کھانے کی دعوت کی۔

چہارم، خالد محمد پدر محمد علی خان شوستری، اس نے کئی بار کھانے پر بلایا بلکہ رات کے وقت عموماً مجھ کو اپنے دسترخوان پر بلالیتا تھا۔ ایران کے لوگوں میں سے محمد خان زند کئی بار مجھ سے ملنے آیا۔ وہ ترکی خان کا بیٹا ہے اور کریم خان کا بھائی ہے۔ ایک مدت تک سلطنت ایران میں رہ چکا ہے۔ حکومت زندیہ کے ختم ہونے کے بعد اس نے فتح علی شاہ قاچار پر حملہ کیا تھا اور بہ ہزار خرابی شہر اصفہان فتح کر کے بادشاہ بن گیا تھا۔ مگر قسمت کی ناموافقت کے باعث گرفتار ہوا۔ آخر ایک خوشی کی تقریب کے موقع پر رہائی حاصل ہوئی۔ اب بصرہ میں زندگی گذار رہا ہے۔

ایک دوست صالح محمد خاں یہ بھائی ہے نیک اور خوش اطوار شخص ہے۔ اس کا چچازاد بھائی دس بارہ ہزار افراد کے ایک قبیلہ پر حکومت کرتا ہے۔ ایک اور شخص سے ملاقات رہی جس کا نام محمد قاسم خان ہے۔ یہ فتح علی شاہ قاچار کے بھائی حسین قلی خان کا وزیر ہے۔ اس نے اپنے بھائی کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا اب اس کی قید میں زندگی گذار رہا ہے۔ مگر قاسم خان، شاہ ایران کے خوف سے بھاگ نکلا۔ اب رات دن مسلح رہتا ہے اور ہر روز کسی نئی جگہ قیام کرتا ہے۔ بہت دردمند اور صاحب ذوق شخص ہے۔ اس کی صحبت میں جو وقت گذرا بہت پُرلطف رہا۔ مشہور ہے کہ وہ علم کیمیا میں مہارت رکھتا ہے اور سونا بنالیتا ہے۔ وہ خود اس بات کا انکار کرتا ہے۔ مگر لوگ یقین نہیں کرتے۔

منجملہ مذکورہ ناگواریوں کے ۵ محرم ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۲ء تک صبح سے آقا باجی کے گھر سے انگریزی سفیر کی کوٹھی میں منتقل ہوا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۵ دن گذر گئے مقصد کے حصول میں کامیابی نہ ہوئی۔

مسٹر منشٹی کی بدسلوکی

چونکہ ہندوستان جانے کا سیدھا راستہ بصرہ سے سمندر کے ذریعہ ہے اور مسٹر منشٹی کی امداد پر منحصر تھا۔ اس کام کے لیے لندن کے وزیر لارڈ ہلم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اس کو تحریری حکم دیا تھا لیکن اس کے اندر چونکہ اہل بصرہ کی صحبت کے اثر سے غرور اور خوشامد طلبی اثر کر چکی تھی۔ اور مجھ کو

اس کی خبر نہ تھی۔ میں اس کی طرف سے مطمئن رہا اور انگلینڈ والوں کے طور طریقوں کے قیاس پر اس شخص کا بھی اعتبار کر لیا تھا مگر وہ دل میں مجھ سے کبیدہ تھا۔ اس لیے اس نے چاہا کہ مجھ کو انتظار کرا کے تکلیف پہنچائے۔ اپنی اس روش کی وجہ سے اس نے ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ مجھ سے یگانگی کا تعلق ختم ہو گیا۔ وہ مجھ کو اپنا محتاج جتانا چاہتا تھا۔ پہلے تو کمپنی کے ڈائریکٹروں کی سفارش کی وجہ سے زبانی چاپلوسی کرتا رہا اور کھلانے کی دعوت اس نے عام دستر خوان پر کی تاکہ میں کوئی بات نہ کر سکوں اور نہ بمبئی جانے والے جہاز کے کپتان سے کوئی رابطہ قائم کر سکوں۔ جہاز کا کرایہ طے کرنا بھی مجھ پر چھوڑ دیا۔ جہاز کا کپتان جانتا تھا کہ اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چارہ نہیں اس لیے اس نے بھی سخت گیری اختیار کی اور بمبئی تک کا کرایہ پانچ سو روپے طلب کیا۔ میں نے اس سے بہت کچھ کہا اور بتایا کہ فرنگستان کے سفر میں کتنے فاصلے کا کتنا کرایہ میں نے ادا کیا ہے۔ اور بصرہ والوں کے معمول کے مطابق پچاس قرش پیش کیے۔ مگر وہ نہیں مانا۔

دوسرے دن مسٹر منسٹی سے ملاقات کی تو اس کو بھی ویسا ہی سخت پایا۔ مجبوراً میں نے بمبئی تک تین سو روپیہ دینا قبول کر لیا۔ جب کرایہ کا فیصلہ ہو گیا تو اتفاق سے موافق ہوا چلنے لگی اور جہاز لنگر اٹھانے پر آمادہ ہوا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ دو گھنٹہ کی مہلت دو، میں اپنا سامان لے آؤں اور جہاز پر سوار ہو جاؤں، مگر اس نے قبول نہ کیا اور عذر کیا کہ دو گھنٹہ کے اندر ہوا کا رخ بدل جانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے جہاز فوراً روانہ ہو جائے گا تاکہ کمپنی کا ایک ضروری کام وقت پر پورا ہو جائے۔ تم اطمینان رکھو تم کو عنقریب دوسرے جہاز پر روانہ کر دیں گے۔ میں مجبوراً خاموش ہو گیا۔

دس دن بعد دوسرا جہاز ہندوستان بھیجا گیا۔ مگر مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں دی گئی۔ جب معلوم ہوا تو میں نے پھر درخواست کی، جواب ملا کہ مذکورہ جہاز صرف بنگال تک جا رہا ہے اور تم کو بمبئی جانا ہے۔ اس لیے خبر نہیں دی گئی۔ اسی طرح تیسرے جہاز کے لیے بھی بہانہ کر دیا۔

یہ خاص بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ سب جہاز مسٹر منسٹی کی ذاتی ملکیت ہیں۔ ان میں کمپنی کی ڈاک جاتی ہے اور کمپنی معقول کرایہ مستقل طور پر ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ پہلے انگریز تاجروں کو نصف اجرت دے کر خطوط ان کے ہاتھ بصرہ سے بمبئی بھیجتا تھا۔ اب

اس نے نصف رقم بھی دوسروں کو دینا بند کردی ہے۔ اور چھ سات چھوٹے چھوٹے جہاز خود خرید لیے ہیں جن کی ساری آمدنی وہ خود لیتا ہے۔ کیونکہ بصرہ والوں کا مال بھی اسی کے جہاز لاتے اور لے جاتے ہیں۔ اس لیے ان جہازوں کے کپتان اسی کے ملازم ہیں۔ ہر ماہ ان کو ایک قلیل رقم دیتا ہے۔ یہ کپتان بصرہ والوں سے خوب کام لیتے ہیں مگر ان کو مناسب اجرت نہیں ادا کرتے۔ مسٹر منشی مجھ جیسے آدمی سے اور بعض دوسرے انگریز معززین سے جو مجبوراً اس کے جہازوں پر سفر کرتے ہیں زیادہ سے زیادہ کرایہ وصول کرتا ہے۔

مذکورہ وجوہات کی بنا پر میرے اور مسٹر منشی کے درمیان رنجش اور اختلاف پیدا ہو گیا اور کئی بار زبانی تکرار بھی ہوئی۔ میں مذاق کے انداز میں اس کو متنبہ کرتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ تم نے مدت ہوئی انگلستان کو چھوڑا ہے اور اس ملک میں رہتے ہو۔ اس لیے تمھارے عادات و اطوار اسی ملک کے لوگوں جیسے ہو گئے ہیں۔ تم نے انگریزی اخلاق کو بالکل بھلا دیا۔ اسی مضمون کی ایک غزل لکھی تھی جو ہمیشہ اس کو سنایا کرتا تھا۔ وہ مجھ کو بہت بے صبرا کہا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ لندن چھوڑنے کے بعد تمھارے دل کو قرار نہیں ہے۔ تم کو کوئی خوش نہیں رکھ سکتا تو پھر میں کس طرح خوش رکھ سکتا ہوں۔ وہ بصرہ کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں کی تعریف کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار اس سے اور بصرہ والوں کے درمیان مخالفت پیدا ہو گئی تو وہ میری بات کی تائید کرنے لگا اور اس کو یہ خوف ہوا کہ اس سے تعلق کے سبب مجھ کو شہر میں کوئی تکلیف نہ پہنچے، جو لندن میں اس کی بدنامی ہو اور مخالفت کی جائے۔ اس لیے اس نے شہر میں میرا قیام پسند نہ کیا اور اور مجھ کو اپنے مکان میں جگہ دی۔

۵ محرم سے ۱۹ محرم کو جمعرات کے دن تک، جب میں بمبئی روانہ ہوا۔ میرا وقت آرام سے گزرا۔ کیوں کہ صبح دو گھنٹے گھوڑے کی سواری کا شغل رہتا تھا اور تین چار گھنٹہ دسترخوان پر ناشتہ اور کھانے میں گذر جاتے تھے اور اس کے بعد کچھ خاص لوگوں کی محفل جم جاتی تھی۔ جس میں وقت خوب گذر جاتا تھا۔ خاص طور پر ڈاکٹر جان بل اور کپتان اسپنس کو جو نہایت دلچسپ اور آزاد مشرب تھے۔ رات کے وقت چھت کے اوپر جو بہت کشادہ تھی بیٹھتے تھے۔ وہاں کی ہوا اور فضا بہت اچھی تھی۔ رات کو بھی اسی چھت پر سوتا تھا۔

مسٹر منسٹی اور اہل بصرہ کا جھگڑا

مسٹر منسٹی بصرہ میں بہت غرور اور تکبر کے ساتھ رہتا تھا کیونکہ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار پر اس کو بڑا زعم تھا۔ بصرہ کے جو شرفا اس سے ملنے آتے تھے ان کو دو دو گھنٹے چوکیداروں کے حجروں میں بٹھا کر انتظار کراتا اور اس کے بعد ان کو ملنے کا موقع دیتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ لوگ پندرہ سولہ میل سے چل کر آتے اور بغیر ملاقات ان کو واپس کر دیتا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ملازمین بھی شہر کے اندر بدعنوانیاں کرتے تھے، اور لوگوں کو پریشان کیا کرتے۔

ایک بار اس کی عورت جو بصرہ کے ارمنی خاندان کی تھی۔ برقعہ اوڑھ کر نہایت اچھی وضع قطع میں بصرہ سے براہ شط محفل آرہی تھی۔ کشتی میں سوار ہوتے وقت مجمع زیادہ ہو گیا۔ اتفاق سے اس وقت عتوب کے شیخ کی کشتی راہ میں حائل ہو گئی۔ شیخ مذکور نواحِ بصرہ میں سرحدِ ایران کے قریب ایک بڑے قبیلہ کا سردار تھا۔ مسٹر منسٹی کے ملازمین جو اس کی عورت کے ساتھ تھے۔ انھوں نے لکڑی لے کر شیخ کی کشتی میں سوار لوگوں کو خوب مارا۔ شیخ اس کی شکایت لے کر مسٹر منسٹی کے پاس گیا۔ مگر اس نے کوئی اثر نہیں لیا نہ کوئی کارروائی کی۔ بلکہ اسی کے ساتھ شیخ کے تجارتی گھوڑے جو وہ بغداد سے خرید کر بصرہ لا رہا تھا۔ ان کو بھی اپنے ملازمین کے ذریعہ روک لیا اور اس سلسلہ میں بہت پریشان کیا۔ شیخ کی شکایت پر کوئی کارروائی بھی نہ کی۔

جب بصرہ کے معززین اور اکابرین کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو ان کو بہت افسوس ہوا۔ اور انھوں نے مسٹر منسٹی کو متنبہ کا ارادہ کیا۔ بعض لوگوں نے مجھ سے بھی اس کی شکایت کی اور مشورہ طلب کیا۔ میں نے کہا۔ سب مل کر اس کے پاس جاؤ اور شکایت کرو اور کہہ دو کہ آئندہ ایسی حرکتیں ہرگز نہ ہوں۔ ورنہ اس کی شکایت گورنر جنرل کو لکھ کر کلکتہ بھیجی جائے گی۔ اگر اس نے اس دھمکی کا اثر لیا تو بہتر ہے ورنہ میں اس سے ملنا جلنا چھوڑ دوں گا۔ اس قدر کارروائی کافی تھی مگر وہ اپنی حماقت کے باعث اس بات پر آمادہ ہوئے کہ ان کی طرف سے صریح زیادتی مسٹر منسٹی کے خلاف ظاہر ہو۔ حالانکہ اس کا اچھا اثر نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ بغداد کے پاشا اور استنبول کے امراء اس کی طرفداری کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ذلیل ہو رہے تھے۔ بے چارے بصرہ کے لوگ مجبور تھے ان کی بات کوئی نہیں سنتا تھا۔

اس درمیان میں ایک واقعہ پیش آگیا تھا جس کی وجہ سے تعلقات بہت خراب ہو گئے تھے، وہ یہ کہ کسی نے کپتان وائیٹ کی طرف سے ایک رقعہ لکھ کر سڑک پر گرادیا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور مصر کی رہنے والی ہوں۔ فرانس کی جنگ کے زمانے میں اس نصرانی (کپتان وائٹ) کے قابو میں آگئی اور اب اسی کے گھر میں رہتی ہوں۔ بصرہ کے مسلمان غیرت ملی کا ثبوت دیں اور مجھ کو اس کے ہاتھ سے چھٹکارا دلائیں۔ ایک گروہ نے گواہی دی کہ ہم کپتان مذکور کے گھر آتے جاتے ہیں۔ ہم نے یہی بات اس عورت کی زبانی سنی ہے۔ قاضی نے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ اس عورت کو عدالت میں لاکر معاملہ کی تحقیق کی جائے۔ بصرہ کے بہت سے لوگ خاص طور پر قبیلہ عتوب کے لوگ اس واقعہ سے آگاہ ہو کر قاضی کے فرستادہ آدمی کے ساتھ کپتان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کپتان بھی اتفاق سے بعض معاملات کے سلسلہ میں شہر کے اندر موجود تھا۔ اس نے لوگوں کو آتے دیکھا تو گھر کے دروازے بند کر لیے اور مسٹر منشی کو اطلاع دی۔ اس نے آدمی بھیج کر قاضی صاحب سے استدعا کی کہ میں کل آپ سے ملنے آؤں گا اور عورت کو بھی عدالت میں حاضر کردوں گا۔ اگر واقعی اس کو اسلام سے رغبت ہے تو آپ کے حوالے کردی جائے گی۔ آج اس معاملہ کو ملتوی کر دیا جائے۔ قاضی نے آدمی بھیجکر لوگوں کو منتشر کرادیا۔ لیکن اسی وقت دوسرے کپتان نے جو اسی مکان میں رہتا تھا۔ دو لاکھ روپے کی رقم جو وہ جہاز کے کرائے وغیرہ کی جمع کیے ہوئے تھا نکال کر حفاظت کے خیال سے جہاز پر بھیج دی۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید عورت کو بھی جہاز پر پہنچا دیا ہے۔ اس لیے سب نے مل کر کپتان کے مکان پر حملہ کیا اور عورت کو نکال کر باہر لے آئے اور قاضی کے یہاں پہنچا دیا۔ وہاں اس عورت نے رقعہ لکھنے سے انکار کیا اور کہا کہ میں باپ دادا کے وقت سے عیسائی ہوں۔ اور اسلام سے مجھ کو کوئی رغبت نہیں ہے۔"

مجمع میں سے بہت سے لوگ بول اٹھے کہ ہم نے اس کی زبان سے کلمہ سنا ہے تو قاضی نے کہا۔ تیرا اسلام گواہی سے ثابت ہے، پھر انکار کا کیا سبب ہے۔ اب تجھ کو مرتد سمجھا جائے گا اور اگر تو نے ارتداد سے توبہ نہ کی تو تیرے قتل کا حکم دوں گا۔ تجھ کو دو تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کو مفتی کے حرم سرا میں بند کر دیا گیا۔ چونکہ مفتی کے دروازے پر کوئی پہرہ دار نہ تھا۔ اس لیے وہ عورت موقع پاکر نکل بھاگی۔ اور مسٹر منشی کے مکان پر

جانے کے لیے روانہ ہوگئی۔ راستہ سے ناواقفیت کے باعث دوبارہ گرفتار ہوئی۔ قاضی نے کہا کہ اگر تو فوراً اسلام قبول نہ کرے گی تو تجھ کو قتل کا حکم دیا جائے گا۔ مجبور ہو کر اس نے کلمہ پڑھا اور اسی وقت اس کا نکاح ایک نومسلم شخص کے ساتھ کر دیا گیا۔ مسٹر منسٹی کو اس واقعہ سے بہت رنج ہوا اور اس نے اس نومسلم کو پیغام بھیجا کہ اس عورت کا عیسائی ہونا ثابت ہے، اس لیے اسے میرے حوالے کر دو، اور اپنی اس حرکت پر معافی مانگو، ورنہ میرے اور تمہارے درمیان صلح کا راستہ بند ہو جائے گا اور اس حرکت کی جو سزا مجھ سے بن پڑے گی تم کو دوں گا اسی کے ساتھ اس نے شہر سے اپنی قیام گاہ کی طرف آنے والا راستہ پتھروں سے بند کرا دیا ترکی حاکم نے اس کے پاس آکر معذرت کی اور کہا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو شہر میں عام بلوے کا خطرہ تھا۔ اور فیصلہ شرعی حکم کے مطابق کرنا ضروری تھا۔ میں خود اس معاملے میں بے اختیار ہوں اور اب جب کہ وہ عورت ایک مسلمان کے نکاح میں ہے تو اس کا واپس ملنا مشکل ہے۔ مسٹر منسٹی نے اس واقعہ کی اطلاع بغداد میں مسٹر جانسن کو دی اور قسطنطنیہ میں مسٹر لڈک کو لکھا کہ اگر سلطان روم بھی اس معاملہ میں کارروائی نہ کرے تو میں کمپنی کی فوج کی مدد سے بصرہ والوں کو مناسب سزا دوں گا۔ کسی طرح بھی اس واقعہ کو نظر انداز نہ کیا جائے اور نہ ہی اس میں غفلت برتی جائے۔

جس وقت یہ کشمکش جاری تھی میں بصرہ سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ مجھے خیال ہوتا ہے کمپنی کے اہل کار اس حالت میں مسٹر منسٹی کا بصرہ میں رہنا پسند نہ کر کے اس کا تبادلہ کر دیں گے اور بصرہ کے حکام مسٹر منسٹی کی طرفداری کریں گے۔ بہر حال جہاں تک مجھے علم ہوا، کوئی کارروائی نہ ہوئی صرف اتنا ضرور ہوا کہ گورنر بغداد نے مسٹر منسٹی کی دھمکی کے پیش نظر بصرہ کے قاضی کو معزول کر دیا اور بعض حکام کو جو اس بلوے میں شریک تھے نکال دیا۔ اور اس عورت کو نئے شوہر سے چھین کر مسٹر منسٹی کے حوالے کر دیا۔

جب کپتان وہائٹ کمپنی کے کام سے بنگال آیا ہوا تھا تو مسٹر منسٹی نے اس عورت کو ایک دوسرے جہاز پر سوار کر کے بنگال بھیج دیا۔ اس وقت میں کلکتہ میں موجود تھا۔ میرے سامنے وہ کپتان وہائٹ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اہلِ بصرہ کی حماقت کے باعث ایسی شرمندگی اٹھانا پڑی اور لوگوں نے والئ بغداد کو برا بھلا کہا۔ یہ حکایت اس لیے لکھی گئی کہ ہوش مند لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔

شہر بصرہ بصرہ وسعت اور آبادی میں بغداد سے بہت بڑا ہے اور ایک بڑا تجارتی مرکز ہے۔ ہر ملک اور قوم کے تاجر یہاں آتے جاتے ہیں۔ یہاں ہندوستان، ایران اور عرب کے بندرگاہوں سے مال لایا جاتا ہے اور آسانی کے ساتھ اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے معاملات خرید و فروخت میں مبالغہ اور دورخی باتوں کی گنجائش نہیں۔ یہاں تک کہ تمسک اور اقرارنامے بھی ایک دوسرے سے نہیں لیتے ہیں۔ بصرہ کے گرد دیوار اور مضبوط خندق ہے۔ اس خندق میں شط العرب کا پانی داخل ہوتا ہے۔ حصار کے اندر کھجوروں اور دوسرے پھلوں کے باغات بہت ہیں اور نصف سے زیادہ ویران ہیں۔ ایک نہر شط العرب سے کاٹ کر وسط شہر سے نکالی گئی ہے۔ اس کا پانی نالیوں کے ذریعہ ہر باغ بلکہ ہر درخت کی جڑ تک پہنچتا ہے۔ انگور بکثرت ہیں شہتوت، زردآلو، امرود، انار خوب پیدا ہوتا ہے لیکن یہاں کا سب سے اچھا پھل کھجور ہے جو ہر جگہ سے بہتر ہے۔

کھجوروں کی کثرت کے باعث بصرہ کی آب و ہوا بہت خراب ہے اور طاعون پھیلنے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ عمارتیں اکثر مٹی کی ہیں اور بے سلیقہ بنی ہوئی ہیں بصرہ والوں کے لیے ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس کے اطراف میں شط العرب کے کنارے ایسے عرب قبائل آباد ہیں جو جان بوجھ کر دریا کے بند کو کبھی کبھی کاٹ دیتے ہیں اور فاضل پانی صحرا میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر بصرہ میں طاعون پھیل جائے اور وہاں کے باشندے مکانات چھوڑ کر اطراف میں چلے جائیں تو وہ ان کے گھروں کے اندر جا کر قیمتی سامان لوٹ لیں۔ یہ اعرابی مستقل طور پر بصرہ والوں کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ ان کے باغات سے رات کو کھجوریں اور دوسرے پھل چرا کر لے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ قبیلہ منفخ کے اعراب زمانہ قدیم سے بصرہ کی زمین میں کچھ حصہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے نگہبان باغات میں مقرر کرتے ہیں۔ لیکن اپنے حصے کے نام پر نصف سے زیادہ پیداوار پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ عبداللہ آغا نے ان کی روک تھام کے لیے ساٹھ میل لمبی دیوار بنوا دی ہے تاکہ بصرہ والوں کے باغات چوری سے محفوظ رہیں لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے اور اعراب اپنے کام سے باز نہیں آتے ہیں۔ اس دیوار کے علاوہ عبداللہ آغا نے اس شہر کے لوگوں کے لیے اور بھی بہت سے مفید کام کیے ہیں۔ بصرہ کے باشندے اس سے بہت خوش ہیں۔ میں نے اس کے انصاف اور کارگزاریوں کے بہت سے واقعات سنے ہیں۔

بصرہ کے نواح کے مشہور مقامات میں ایک قصبۂ زبیر ہے۔ جہاں مشہور اصحابِ نبیؐ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے مزارات ہیں۔ چونکہ اعراب آنے جانے والوں کو لوٹ لیتے ہیں اور وہابیوں کے حملے بھی بعض وقت وہاں تک ہو گئے ہیں۔ حالانکہ بصرہ سے صرف چار میل کا فاصلہ ہے اس لیے میں اس مقام کی زیارت سے محروم رہا۔

مختصر یہ کہ پچپن دن بصرہ میں ضائع کرنے کے بعد ۹ محرم الحرام ۱۲۰۸ھ کو جمعرات کے دن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، نصف شب میں چھوٹے اسٹیمر پر سوار ہوا۔ یہ اسٹیمر بھی مسٹر منٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے کپتان کا نام بیکاک ہے۔ ہوا موافق تھی نصف شب اور نصف دن میں شط العرب کو طے کر لیا جس کا فاصلہ نوّے میل ہے اور شط العرب کے دہانے سے نکل کر خلیج فارس میں داخل ہو گئے۔ اگرچہ خدا کے فضل سے بصرہ اور اہل بصرہ سے نجات حاصل ہو گئی، لیکن اپنی غفلت اور کاہلی پر بے حد افسوس ہے جس کی وجہ سے مسلسل پریشانی میں مبتلا رہا کیونکہ اگر بصرہ پہنچنے کے بعد ہی میں مسٹر منٹی کی بے التفاتی سے واقف ہو جاتا اور اس کی مہربانی کی توقع نہ کرتا تو خشکی کے راستہ بصرہ سے شوستر اور وہاں سے شیراز چلا جاتا۔ اس کے بعد ایران کے کسی بندرگاہ سے جہاز میں سوار ہو کر بمبئی پہنچ جاتا۔ اس طرح ایران کے بعض شہروں کی سیاحت بھی کر لیتا اور مسٹر منٹی کی زیادتی کا تدارک بھی کر سکتا۔

خلیج فارس کا حال

خلیج فارس، بحر عمان سے اور بحرِ عمان بحرِ ہند سے ملا ہوا ہے۔ اور شمال و مغرب کے درمیان جا کر شط العرب پر ختم ہو گیا ہے اس کے مغربی سمت جزیرۃ العرب ہے اور مشرق کی جانب مملکت ایران۔ اس کا طول پانچ سو میل اور عرض ایک سو پچاس میل ہے۔ اور مقام اتصال میں چوڑائی ۳۶ میل ہے بحرِ عمان طول میں ساڑھے تین سو میل اور عرض میں ڈھائی سو میل ہوگا۔ عمان کی آخری حد سے بمبئی تک ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ہے۔

جمعہ کے دن ہم جزیرہ خارک کے پاس سے گزرے اور شنبہ کے دن بوشہر کے مقابل سے جو فارس کا مشہور بندرگاہ ہے۔ جزیرہ خارک کا طول نو میل اور عرض تین میل ہے۔ یہاں ہالینڈ کے فرنگیوں نے ایک قلعہ اور ایک کوٹھی بنائی ہے۔ عرب کے شیخ زادوں میں سے ایک مشہور شیخ نے چند سال قبل اس کو اجاڑ دیا تھا اور ہالینڈ والوں کی آمد و رفت بند کر دی تھی۔ عرب کی سمت کا ساحلِ سمندر کی گہرائی کی وجہ سے اس جگہ سے نظر نہیں آتا

ہے۔ کہتے ہیں جزیرۂ بحرین اسی طرف کے ساحل پر واقع ہے۔ ہوا موافق نہ ہونے کے سبب سے چند دن بوشہر کے اطراف میں گزر گئے۔ یہ افسوس رہا کہ اس مدت میں ساحل پر اتر کر بوشہر کی سیر کیوں نہ کرلی۔

۲۵ رمحرم کو چارشنبہ کے دن جزیرہ بوشعیب کے پاس سے گزرے جس کا طول ڈیڑھ سو میل اور عرض پانچ میل ہے۔ اس دن جہاز پانی لینے کے لیے جزیرہ قیس میں لنگر انداز ہوا۔

۲۷ رمحرم جمعہ کے دن جزیرہ ہرمز کے مقابل سے گزرے جس کی لمبائی ۹ میل اور چوڑائی تین میل ہے۔

۲۸ رمحرم کو شنبہ کے دن جزیرہ کشمی کے پاس سے گزرے جو بحرِ فارس کا بہت بڑا جزیرہ ہے۔ ساٹھ میل لمبا اور ۲۳ میل چوڑا۔

۳۰ رمحرم کو دوشنبہ کے دن بحرِ عمان میں داخل ہوئے۔ دونوں سمندروں کے سنگم کے مقام پر بحرِ فارس کے دونوں کنارے دکھائی دیتے ہیں۔ ایران کی سمت کے گوشہ کو انگریزی میں کیپ خسک اور عرب کی سمت کے گوشہ کو کیپ مسلان کہتے ہیں۔

بحرِ فارس میں متعدد اور جزیرے بھی ہیں جو زیادہ تر غیر آباد ہیں۔ ان میں دو جزیرے مشہور ہیں۔ جن کو ٹوم ٹوم کہتے ہیں۔ یہ لفظ انگریزی میں مقبرے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر رومی کے سرداروں میں سے کوئی ایک وہاں دفن ہے۔ اس سمندر کی خصوصیت یہ ہے کہ جو مچھلی اس میں پیدا ہوتی ہے وہ چاندی کی طرح سفید رنگ کی ہوتی ہے۔ اور اتنی چمکدار ہوتی ہے کہ پانی میں اچھلنے کودنے کے وقت اس کی چمک جہاز سے نظر آتی ہے۔

اسی طرح اس مقام پر گول جسم کا مچھلی جیسا جانور ہوتا ہے۔ جس کو انگریزی میں سمندر کا ستارہ کہتے ہیں۔ وہ رات کے وقت ستارے کی طرح چمکتا ہے اور جب بہت سے ایک ساتھ چمکتے ہیں تو وہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔ بعض راتوں میں ان کا اس قدر اچھا تماشا دیکھنے میں آیا کہ میں دو دو پہر دیکھتا رہا۔ کہتے ہیں اس جانور کا جسم اگر انسان کے بدن سے لگ جائے تو اتنی کھجلی ہوگی کہ جسم میں زخم پڑ جائیں گے۔

بحرِ عمان میں دو تین روز مخالف ہوا بہت تیز چلی۔ ہم پر طوفان جیسی حالت گزر گئی۔ چونکہ بارش نہ تھی اس لیے زیادہ اثر نہیں پڑا۔ میں نے اپنے اس طویل سفر کے درمیان، بحرِ ہند، بحرِ اوقیانس، بحرِ روم، بحرِ یونان، بحرِ قسطنطنیہ، بحرِ فارس سب کو عبور کیا۔ اور ان سب سمندروں

میں کشتیوں پر بیٹھا اور ہر ایک میں کسی نہ کسی طوفان سے مقابلہ کیا۔ بعض کا ذکر گزر چکا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک طوفان وہ تھا جو بحر روم میں آیا تھا۔ اور سب سے آسان طوفان یہ ہے جس کا ابھی ذکر کیا ہے۔

ماہ صفر کے اوائل میں دوشنبہ کے دن مسقط کے محاذ سے گذرا۔ مگر مسقط کا ساحل نظر نہیں آیا تھا۔ ایران کی طرف کا ساحل بھی نظر نہیں آیا۔

۱۶ صفر کو یکشنبہ کے دن بحر عمان سے دوسری بار بحر ہند میں داخل ہوا۔ اسی نواح میں جہاں سے سفر لندن کے آغاز میں گذرا تھا۔ سفر کا دائرہ اس جگہ ختم ہو گیا۔ جہاں بحر عمان اور بحر ہند کا سنگم ہے۔ یہاں سے ملک عرب کا وہ گوشہ جو جزیرۃ العرب کے شمال مشرقی سمت میں ہے نظر آتا ہے۔ انگریزی میں اس کو کیپ روزالگٹ کہتے ہیں۔ مسقط سے اس مقام تک ایک سو بیس میل کا فاصلہ ہے۔ دوشنبہ کے دن سے زمین نظر نہیں آئی تھی۔

۱۱ ماہ صفر ۱۲۱۸ھ مطابق ۳ جون ۱۸۰۳ء کو پنجشنبہ کے دن بمبئی کا ساحل نظر آیا۔ سورج طلوع ہونے کے ایک گھنٹہ بعد ساحل پر پہنچے۔ آج وہی دن تھا، جس دن گذشتہ سال لندن سے فرانس کا قصد کر کے نکلا تھا۔ یہ اسٹیمر جس پر سفر کیا۔ اگرچہ بہت چھوٹا تھا اور آرام سے رہنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ لیکن اس کا کپتان بہت محنتی، خوش اخلاق اور باشعور آدمی ہے۔ اس کے اندر غرور اور خود رائی بالکل نہیں۔ اس لیے وقت بہت خوشی سے کٹ گیا۔ باوجود کہ ہوا بہت گرم تھی۔ اس نے سفر میں تاخیر گوارا نہ کی۔

شہر بمبئی اور اس کی خصوصیات

شہر بمبئی ۱۷ درجہ شمالی عرض البلاد میں واقع ہے۔ اس کی آب و ہوا معتدل اور صحت مند ہے۔ ہندوستان کے تمام پھل وہاں مل جاتے ہیں۔ ان میں آم سب سے ممتاز ہے۔ انگریزوں کا مسکن قلعہ کے اندر ہے۔ تمام مکانات اور دکانیں تین اور چار منزل کی ہیں۔ جو عموماً اینٹوں اور رنگین لکڑیوں سے بنائی گئی ہیں۔ البتہ چھت صندوق نما کھپریل کی ہوتی ہے۔ بمبئی کے باشندے اکثر گبر ہیں۔ جن کو پارسی کہا جاتا ہے۔ کچھ انگریز اور تھوڑے سے پرتگالی ہیں۔ اور باقی ہندوستانی۔ پارسی، عجم کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اسلامی حملوں کے زمانہ میں اب سے گیارہ سو سال پہلے یہاں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اب ان کی تعداد بمبئی اور سورت اور ان کے نواح میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان مقامات پر تاجر، باورچی، خدمتگار اور دوسرے پیشہ ور

زیادہ تر پارسی ہیں۔ ان میں سے بعض اس قدر مالدار ہیں کہ ان کی روزانہ آمدنی ایک لاکھ روپے تک ہے۔ یہ لوگ زردشتی، ہندی اور انگریزی زبانیں جانتے ہیں۔ اور ان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور شادی بیاہ آپس ہی میں کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی صورتیں، عادتیں اور رنگ روپ ویسا ہی ہے۔ جیسا وہ ہزار بارہ سو سال پہلے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ ہندوستان کی آب و ہوا نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا۔ انگریز کہتے ہیں کہ آفتاب کی قربت اور دوری سے لوگوں کے رنگ روپ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ پارسی اور ارمنی جو سالہا سال سے اس ملک میں آباد ہیں اب تک اپنے اصل رنگ میں موجود ہیں۔ لیکن ہم ان سے کہتے ہیں کہ اس کا کیا سبب ہے کہ فرنگی سفید، حبشی سیاہ اور ہندوستانی گندمی رنگ کے ہوتے ہیں۔ پارسیوں کے پاس آٹھ سو سال سے جلتی ہوئی آگ موجود ہے۔ ان کے بعض آتشکدوں میں وہ آگ اب تک موجود ہے جو وہ اپنے ساتھ ایران سے لائے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یزداں نیکی کا خدا ہے اور اہرمن بدی کا خدا ہے۔ دونوں اپنے اپنے کاموں میں مستقل ہیں۔ ان کی خاص عبادت اہرمن کے لیے ہوتی ہے کیوں کہ ان کے نزدیک یزداں کو بجز نیکی کے اور کسی کام میں دخل نہیں ہے۔ اور اس سے کوئی خوف بھی نہیں ہے۔

پارسی اپنی عورتوں کے معاملے میں بہت غیرت مند ہیں۔ اگر کسی عورت پر بدکاری کا شبہ ہو جائے تو اس کو خفیہ طور پر کسی بہانے سے ہلاک کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے فارسی زبان کو بھلا دیا ہے۔ اور اچھے اخلاق بھی ترک کر دیئے ہیں۔ ان میں سے کوئی مجھ سے ملنے تک نہیں آیا تو دعوت اور ضیافت کا کیا ذکر۔ چونکہ وہ میرا مرتبہ اپنے سے بہت زیادہ بلند سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کو یہ خیال بھی تھا کہ میں ان کی دعوت قبول نہ کروں گا۔ پارسیوں کا ایک بڑا صاحب علم اور برگزیدہ شخص ملا فیروز ہے۔ اس سے ایک دوست کے گھر پر میری ملاقات ہو گئی تھی یہ ایک سنجیدہ اور عقلمند شخص ہے۔ ایران کا سفر کر چکا ہے۔ اور مدتوں وہاں زردشتی مذہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ نجوم اور ریاضی کی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ فارسی میں خوب بات چیت کرتا ہے۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ مگر مجھے اس کی آزمائش کا موقع نہیں مل سکا۔

بمبئی شہر کا دوسرا حصہ قلعہ کے باہر شمال کی سمت واقع ہے۔ اس میں پختہ اور بلند

عمارتیں تو کم ہیں، لیکن بہت وسیع اور کشادہ ہے۔ ضروریات زندگی کی تمام چیزیں یہاں ملتی ہیں۔ قلعہ والے حصّے کے لوگ خرید و فروخت کے لیے یہاں آتے ہیں۔ باشندوں کی اکثریت ہندو ہے۔ کچھ پارسی اور پرتگالی بھی آباد ہیں۔ دونوں شہروں کے امراء کے باغات بھی اسی طرف ہیں۔ اطراف میں چھوٹے پہاڑوں کا سلسلہ نمایاں ہے۔ اس شہر میں ناریل کے درختوں کی اتنی کثرت ہے کہ شہر میں ہوا کا گذر بمشکل ہوتا ہے۔ ان دونوں شہروں میں حسن جمال برائے نام بھی نہیں ہے۔ بمبئی میں پینتالیس دن قیام رہا۔ اس دوران میں ایک بھی حسین چہرہ نظر نہ آیا۔ ہندوؤں کی عورتیں جنوں کی طرح ہیں۔ سب کوتاہ قد سیاہ رنگ اور انتہائی دُبلے پتلے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہڈیوں پر چمڑا منڈھا ہوا ہے۔ پارسی عورتوں کا رنگ تو گورا ہے لیکن ملاحت کسی میں نظر نہ آئی۔ پستان لٹکے ہوئے چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور لباس کشمیریوں جیسا ہے۔

بمبئی پہنچنے سے پہلے وہاں کے حسن کی بہت تعریف سُنی تھی۔ لوگوں نے یہاں کے حسن کی تعریف میں کچھ اشعار بھی سُنائے تھے، مگر وہ سب خلاف حقیقت معلوم ہوئے۔ بتلانے والوں نے پارسیوں کی سفید رنگت کے باعث دھوکہ کھایا ہوگا اور غلط باتیں مشہور کر دیں میں جب کبھی سواری پر باہر نکلا راستہ بھر بدصورتوں کو دیکھنے کی اذیت سے بچنے کے لیے نگاہیں زمین پر رکھیں اور کسی طرف نہیں دیکھا۔ یہ گویا ہزاروں لعنتیں ان کی صورتوں پر بھیجنا تھا۔ بنگال کی عورتوں کو ان کے مقابلہ میں بہشت کی حوریں کہہ سکتے ہیں۔ اس شہر اور قلعہ والے شہر کے درمیان سیر و تفریح اور سپاہیوں کی پریڈ کے لیے نصف میل لمبا اور اسی قدر چوڑا ایک میدان ہے۔ یہ جگہ بہت پُرفضا ہے اور پورے سال سرسبز و شاداب رہتی ہے۔ ایک جانب وسیع بحرِ ہند کا منظر ہے اور اس کے برعکس شاداب پہاڑیوں کا سلسلہ ہے اور باقی دونوں جانب شہر اور قلعہ واقع ہے۔

بمبئی کا قلعہ کلکتہ کے قلعہ سے بڑا اور اس سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس کی ایک سمت سمندر سے ملی ہوئی ہے اور باقی تین طرف گہری خندق ہے جس میں سمندر کا پانی دیا جا سکتا ہے۔ قلعہ کی دیواروں پر ویسے ہی بُرج بنے ہیں۔ جیسے کلکتہ کے قلعہ میں ہیں۔ اندر کا حصہ مٹی کے تودوں کی شکل کا ہے۔ اس کے آگے اینٹوں کی دیوار بنا کر اس کو مستحکم کر دیا ہے تاکہ بارش میں مٹی بہہ نہ جائے۔ یہ قلعہ پرتگال کے فرنگیوں نے اپنے دورِ اقتدار میں بنوایا تھا۔ اور

انگلستان کے ایک بادشاہ کو اس کی دولہن نے جہیز میں دے دیا تھا۔ انگریزوں کے قبضہ میں آنے کے بعد اس میں اضافے کیے گئے۔

گورنر ڈنکن اور دوسرے انگریز

اب میں اپنے معزز انگریز دوستوں کا کچھ ذکر کروں گا۔ اس کے بعد بنگال کے سفر کے حالات لکھوں گا۔ پہلے بمبئی کے گورنر مسٹر ڈنکن کا ذکر کرتا ہے یہ اب سے بارہ سال پہلے شہر بنارس کا حاکم تھا۔ وہاں کے لوگ اس سے بہت خوش تھے۔ اب تک اس کا بنارس میں ذکر ہوتا ہے۔ لارڈ کارنوالس نے اس کو اپنے آخری عہد میں بمبئی کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے یہاں مقیم ہے۔ لیکن اپنے وطن کو بہت یاد کرتا ہے اور وہاں واپس جانے کا آرزومند ہے۔ لیکن ابھی اتنا سرمایہ جمع نہیں کر سکا ہے کہ وہاں جاکر فراغت سے زندگی گذار سکے۔ اس لیے بمبئی میں وقت گذار رہا ہے۔ جس وقت میرا اسٹیمر بمبئی کے ساحل پر پہنچا۔ میں اتر کر اس کے گھر چلا گیا۔ وہ ابھی سو رہا تھا۔ اس کے ملازموں نے جو اپنے آقا کی طرح خوش اخلاق ہیں، ایک مناسب کمرے میں مجھے ٹھہرایا۔ اور کہا کہ گورنر کے بیدار ہوتے ہی آپ کی آمد کی اطلاع کر دیں گے۔ اس وقت آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو حاضر کی جائے گی۔

مسٹر ڈنکن نے بیدار ہونے کے بعد ناشتہ کے لیے دسترخوان پر بیٹھتے ہی مجھے طلب کیا اور اپنے ساتھ ناشتہ میں شریک کیا اور کہا کہ جب اس شہر میں تمہارا قیام ہے میرے مہمان رہو گے۔ چونکہ اس کا سارا مکان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے مکان کے قریب چالیس روپیہ ماہوار پر ایک مکان میرے لیے طے کر دیا۔ روشنی، فرش اور دوسرا ضروری سامان اپنے گھر سے بھیج دیا۔ جب تک میں ناشتہ سے فارغ ہوا میرا یہ مکان ساز و سامان کے درست ہو چکا تھا۔

اسی دن ٹھیک دوپہر کے وقت سید عبداللطیف خان مجھ سے ملنے آیا۔ جس کو دیکھنے کے لیے میں نے بمبئی کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس نے ملنے کے بعد کہا برسوں ہو گئے ہم نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ اب آنے کے بعد اس جگہ تمہارے قیام کا کیا مقصد ہے۔ جب کہ میرے مکان کو وسعت کے لحاظ سے دوسرے مکانات پر فوقیت حاصل ہے تم کو وہاں منتقل ہو جانا چاہیئے۔ اور جب کبھی گورنر سے ملنا چاہو گے۔ یہاں آکر مل لینا ــــ"

اس بزرگ کی صحبت میں رہنے کا شوق اور گورنر ڈنکن کو زحمت سے بچانے کے خیال سے کچھ پس و پیش کے بعد راضی ہو گیا۔ اور سید عبداللطیف کے باغ والے مکان

میں آرام کا بہانہ کرکے گورنر سے اجازت حاصل کرلی اور وہاں منتقل ہوگیا۔ دو تین دن کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ رائے غلط تھی۔ اس جگہ رہ کر شہر جانا اور ضروریات کا سامان حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ چونکہ خود میں نے منتقل ہونے والی تجویز کو پسند کیا تھا۔ اس لیے اب خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن گورنر نے اپنی ذہانت اور نیک دلی کے باعث پہلے ہی اندازہ کرلیا تھا کہ میں میر عبداللطیف والے باغ والے مکان میں نہ رہ سکوں گا۔ اسی خیال سے اس نے میرے لیے جو مکان کرایہ پر لیا تھا اس کو خالی نہیں کیا تھا۔ اور جو سامان بھیجا تھا وہ بھی واپس نہیں منگوایا تھا۔ اس نے دو تین دن بعد یہ پیغام بھیجا کہ تم ابھی چند دن ہوئے انگلستان سے واپس آئے ہو اور فرنگستان کے طور طریقوں کے عادی ہو۔ اس لیے وہاں رہ کر تم کو آرام نہ مل سکے گا۔ اس خیال سے میں نے اس مکان کو خالی نہیں کیا تھا اور جو سامان بھیجا تھا وہ بھی واپس نہیں منگوایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم عبداللطیف کے یہاں مسلمانوں جیسے طور طریقوں پر رہ نہ سکو گے اور آخر کار تمہارا دل وہاں سے اُچاٹ ہو جائے گا۔ اس لیے تم کو اطلاع دے رہا ہوں کہ جب بھی میرے قریب رہنے کی خواہش ہو، اس مکان میں آجانا اور جب شہر سے طبیعت اُچاٹ ہو وہاں چلے جانا۔ میں نے اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ اس مکان میں آگیا۔ لیکن کبھی کبھی عبداللطیف والے مکان میں بھی چلا جاتا۔ جب شہر میں رہتا تو گورنر کے ملازم میری خدمت کرتے تھے اور ناشتہ اور کھانے کے وقت مجھے اطلاع دیتے تھے اور میں جا کر اس کے ساتھ کھاتا تھا۔

ناشتہ اور کھانے کے درمیان دن کا کھانا اس کے رفقاء اپنی اپنی جگہوں پر کھاتے تھے اور میرا کھانا گھر بھیج دیتے تھے۔ کھانے کی مقدار مع شراب اور پھلوں کے بہت زیادہ ہوتی تھی اور کسی طرح بھی پانچ روپیہ یومیہ سے کم قیمت کا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ملازموں کو منع کیا کہ میں دن میں اتنا کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ مگر وہ نہ مانے۔ اسی طرح پینتالیس دن تک یکساں خیال رکھا۔

گورنر نے مجھے اپنے ساتھ رقص و سرود کی محفلوں میں بھی شریک رکھا۔ ہر دوشنبہ کی رات کو اس کے یہاں معزز انگریز مرد اور عورتیں جمع ہوتی تھیں اور رات کا کھانا سب گانے بجانے کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ مجھ کو بھی اس محفل میں شریک کرتے تھے جب بھی میں رخصت کی اجازت چاہتا وہ کہتے تھے کہ تم اتنی جلدی ہماری صحبت سے دل برداشتہ ہوگئے

پھر جب کہ ہم کراچی تمہاری ملاقات سے میری نہیں ہوئی۔ آخری بار جب کمپنی کا جہاز کلکتہ روانہ ہونے والا تھا تو میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ "اگر واقعی تم ہم لوگوں سے اکتا گئے ہو تو اس جہاز میں تمہارے لیے جگہ مقرر کر دوں۔" میں نے جواب دیا کہ آپ کی صحبت سے تو سیری نہیں ہوئی۔ لیکن بچوں کو دیکھنے کا شوق غالب ہے۔ جن کو تین سال سے نہیں دیکھا ہے۔ اب آپ کی مہربانی کی ضرورت ہے۔ گورنر نے اسی وقت جہاز کے کپتان سے میری ملاقات کرائی اور اس بات کی بہت سفارش کی کہ مجھ کو بہت آرام کے ساتھ کلکتہ پہنچا دے۔ اس کی توجہ سے ایسا ہی ہوا۔ میرے لیے دو ہزار روپیہ کرایہ کے خرچ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کی سفارش کی وجہ سے بغیر کرایہ کے نہایت آرام اور آسائش سے کلکتہ پہنچ گیا۔ متفرق اخراجات بھی جہاز کے کپتان نے برداشت کیے۔

جب میں گورنر ڈنکن کے اس برتاؤ کا بصرہ کے سفیر مسٹر منسٹی کے برتاؤ سے مقابلہ کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ جب کہ دونوں ہم قوم ہیں اور ایک ہی طرح کی تعلیم و تربیت پائی ہے لیکن دونوں کے کردار ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔

بمبئی میں میرے دوسرے دوست مسٹر لیہمر Kelimon ہے جو ایک امیر انگریز ہے اور بمبئی میں سفیر ہے۔ نہایت خوش اخلاق اور نیک طبیعت انسان ہے۔ یہ شہر کے باہر ایک عمدہ مکان میں رہتا ہے۔ جو ایک اچھے باغ کے اندر بنا ہوا ہے۔ اس نے مجھ کو کھانے پر مدعو کیا۔ اس کی بیوی مسز لیہمر ایک حسین اور عقلمند عورت ہے۔ اس نے مہمانداری کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے۔ چند گھنٹے اس کی صحبت میں بہت پُرلطف گزرے۔

تیسرے کرنل گارڈن GARDEN جو فوج میں افسر ہے۔ اس کی شخصیت بہت شاندار ہے۔ ایک بار اس نے کھانے پر بلایا اور اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس کی بیوی مسز گارڈن سے مل کر بہت خوشی ہوئی وہ نہایت خوبصورت اور خوش اخلاق خاتون ہے۔ اس کی دلچسپ باتوں سے بہت محظوظ ہوا۔ انگریزوں کا خیال ہے کہ یہ خاتون بمبئی میں سب سے زیادہ حسین ہے۔ لیکن مجھے بمبئی کے بڑے قاضی سلیمان کی لڑکی اور اس کی بہن حسن میں سب سے بلند تر نظر آئیں۔ ان کا مقابلہ لندن کی حسین عورتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ چوتھا دوست مسٹر رچرڈسن ہے۔ یہ کپتان رچرڈسن کا بڑا بھائی ہے۔ جو میرا

پُرانا دوست ہے اور سفرِ فرنگ میں رفیقِ سفر تھا۔ یہ بمبئی میں اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ مذکورہ تعلق کی بنا پر کئی بار اس نے مجھے دن کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس کی بیوی نے مہمانداری کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔

پانچویں مسٹر اسمتھ (SMITH) جو بمبئی میں فارسی زبان کا ترجمان ہے۔ فارسی میں اچھی گفتگو کرتا ہے۔ بوشہر اور شیراز میں کچھ عرصہ رہ چکا ہے۔

چھٹا کرنل بوڈن اس کو میں نے لندن میں دیکھا تھا۔ نہایت سنجیدہ اور خوش اخلاق آدمی ہے۔

ان کے علاوہ مسٹر اسیرن اور مسٹر باری سن وغیرہ جو گورنر ڈنکن کے مصاحب اور شریک صحبت تھے۔ میرا بہت خیال کرتے تھے۔

میر عبداللطیف خاں کا حال

میر عبداللطیف شوستری دلی دوست اور حبیب روحانی ہے۔ اس کے حالاتِ زندگی اس کی کتاب "تحفۃ العالم" میں تفصیل سے درج ہیں۔ یہ کتاب متعدد علوم کے نکات اور لطیف معانی و مطالب پر مشتمل ہے۔ اس میں شوستر کی تاریخ اور وہاں کے تمام سادات کے مختلف طبقوں کا ذکر ہے۔ اسی کے ساتھ تمام ممتاز شخصیتوں کے حالات اور کارنامے بھی درج ہیں۔ مشہور مثل کے مطابق "عیش کا ذکر بھی نصف عیش ہے"۔ موصوف کے اوصافِ جلیلہ کا مختصر حال اپنے اطمینانِ قلب کے خیال سے اپنی کتاب میں اضافہ کر رہا ہوں۔

"میر موصوف سادات کے ایک خاندان نور تیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جو اپنی جلالتِ شان کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے اور اپنے زہد و تقویٰ اور علم و عقل کے باعث اس علاقہ کی شیخ الاسلامی کا منصب مدت دراز تک اس خاندان میں رہا۔ یہ خاندان ہمیشہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تبلیغ کرتا۔ اور شرع محمدی کے قوانین کو رونق بخشتا رہا۔ ان لوگوں کا اصلی وطن سوق الشیوخ اور قرنہ کے درمیان جزیرہ محمورہ میں ہے۔ اب تک میر عبداللطیف کے چچا زاد بھائی قصبہ صباغیہ اور اس کے نواح میں رہتے ہیں۔ ان میں ایک سید نعمت اللہ ہے۔ جس کا مرتبہ علم و فضل میں بہت بلند ہے۔ اس نے دارالعلم شیراز اور اصفہان کے ممتاز علماء سے تعلیم حاصل کی۔ خاص طور پر ایران کے اساتذہ میں آقا حسین

خوانساری، ملاباقر مجلسی جیسے علامہ بھی تھے۔ان سے علوم دینی کی سند حاصل کی۔
وہ کسی سبب سے اپنے وطن کو ترک کرکے شوستر پہنچا۔ شوستر والوں نے اس کے آنے کو
برکت کا سبب خیال کیا۔اور اس سے وہاں سکونت کی درخواست کی۔اور اس کو اپنی
سچی محبت اور دوستی کا یقین دلایا۔تمام لوگ دینی مسائل اور دنیاوی معاملات میں اس
سے رجوع کرتے تھے۔سید عبداللطیف کا سلسلۂ نسب تیرہ واسطوں سے امام موسیٰ کاظمؒ
تک پہنچتا ہے۔سلسلۂ نسب یوں ہے۔

سید عبداللطیف بن سید طالب بن سید نورالدین بن سید نعمت اللہ ان میں
سے ہر ایک سادات کرام میں شمار ہوتا تھا۔ان کے بعد سید عبداللہ بن سید نورالدینؒ
سید مرتضیٰ بن سید نورالدین سید ابوالحسن بن سید عبداللہ، سید عبدالہادی بن سید عبداللہ
علم و تقویٰ میں یگانہ روزگار تھے۔ان علمائے کرام کی بہت سی تصانیف یادگار موجود ہیں۔
سید عبداللہ نے عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کے علوم سیکھے اور مفید معلومات کو
اسلامی کتابوں میں شامل کرکے اضافہ کیا۔

سید عبداللطیف کی ولادت باسعادت ۱۱۷۲ھ میں بمقام شوستر ہوئی۔اس نے
اپنے چچا سید مرتضیٰ اور اس دور کے دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کی۔اور اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ
اس نواح کے شہروں کی سیاحت میں بسر کیا۔خاص طور پر بصرہ، بغداد، حلّہ اور عتبات عالیہ میں
رہے اور کچھ زمانہ عرب و عجم کے دانشوروں کے ساتھ گذارا۔اس کے بعد ہندوستان کا رخ
کیا۔اور فارس اور عمان کی راہ سے سفر کیا۔راستہ میں بوشہر، مسقط اور مچھلی بندر کی سیاحت کرکے
ماہ محرم ۱۲۰۳ھ میں کلکتہ پہنچا۔اس وقت اس کی عمر کے تیس سال گزر چکے تھے۔کچھ عرصہ مرشد آباد میں
گذارا جو بنگال کا دارالسلطنت تھا۔مرشد آباد کی ملکہ منی بیگم اور اس کے ناظر اعتبار
علی خاں اور شہر کے تمام معززین نے اس سے شادی کرنے کے لیے اصرار کیا۔تو اس نے اپنے چچا
کی بیٹی سے عقد کرکے مرشد آباد میں سکونت اختیار کرلی۔جب میر محمد شفیع نے اپنے بھائی کو
مال خریدنے کے لیے بنگال سے بصرہ بھیجا اور اس کی خریداری میں خوب نفع ہوا تو بصرہ کے
تاجروں نے اس کو مال خریدنے کے لیے دوبارہ بلایا اور اس کے لیے خاص رعایتیں بھی کیں
کچھ عرصے میں وہ کافی مالدار ہو گیا۔اس کے بعد اس کے چچا کے بیٹے سید ابوالقاسم عرف میر عالم
بہادر نے جو دکن کے حکمراں آصف جاہ کے دربار میں بارسوخ تھا۔گورنر بنگال کے یہاں

اس کو اپنا وکیل مقرر کرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی عزت اور شہرت بڑھ گئی۔ معاش میں کشادگی پیدا ہو گئی۔ مگر بنگال کی آب و ہوا اس کی صحت کے لیے موافق نہ تھی۔ برابر بیمار رہا کرتا تھا دو بار تبدیلِ آب و ہوا کے لیے لکھنؤ گیا۔ کلکتہ آنے کے ابتدائی زمانے میں مری اس سے ملاقات ہوئی اور آپس میں مخلصانہ دوستی ہو گئی۔ اور روز بروز اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مجھے فرنگستان کا سفر درپیش ہوا۔ باوجودیکہ اس کو میری واپسی کی اُمید نہ تھی۔ مگر سامانِ سفر مہیا کرنے میں میری پوری طرح مدد کی اور روپیہ بھی دیا۔ دو سال کے بعد اس کے قلم گہر رقم کا لکھا ہوا خط مجھے انگلینڈ میں ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ مسلسل بیماری کے باعث ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے اور اب اپنے وطن شوستر جانے کے لیے مع اہل و عیال دکن روانہ ہو رہا ہوں۔ دکن کے کسی ساحل سے وطن روانہ ہو جاؤں گا۔ اس کے اس ارادے کی خبر سے خیال ہوا کہ اب دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے گی۔ دل بے حد غمگین ہوا۔ اور ہندوستان واپس آنے کا شوق اس سے ملاقات کی اُمید نہ ہونے کے باعث ایک فیصد رہ گیا۔

اس کے بعد جب فرنگستان سے میری واپسی بصرہ اور بغداد کے راستے سے ہوئی تو اس بات سے میں بہت خوش تھا کہ ان دو جگہوں میں سے کسی جگہ اس سے ملاقات ہو جائے گی بغداد پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ محترم بزرگ بمبئی میں ہے اور حاجی خلیل کی لاش کے ساتھ بصرہ جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ مجھے اُمید ہو گئی کہ اس کو بصرہ میں دیکھوں گا۔ وہاں پہنچ کر اس سے مفصل حالات معلوم ہوئے کہ حیدرآباد پہنچنے کے بعد مشیر الملک وزیر اعظم آصف جاہ نے میر عالم بہادر کو معزول کر کے قید کر دیا ہے۔ میر عبد اللطیف قرابت داری کے لحاظ سے میر عالم کی رہائی کی کوشش کے لیے وہاں ٹھہر گیا اور بہت عرصہ وہیں مقیم رہا۔ آخر بنگال کے گورنر جنرل اور مسٹر ڈنکن ایران کے سفیر کی مہمانداری کی خاطر اس کو اس مخمصہ سے نکال کر بمبئی لے آئے۔ چونکہ حاجی خلیل قتل ہو چکا تھا۔ اس لیے دوسرے سفیر کے آنے تک میر عبد اللطیف کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ اس خبر سے اندازہ ہوا کہ میر موصوف بمبئی سے اب جلدی نہیں جا سکتا۔ اس لیے اس سے ملاقات کے ارادے میں نے بصرہ سے بمبئی جانے کا پختہ ارادہ کیا۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں اگرچہ اس ارادہ کے باعث مجھے بصرہ کی زحمتیں برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن آخرکار خوش قسمتی سے مری مراد حاصل ہو گئی اور اس کے دیدار پُر انوار سے مالا مال حاصل ہوئی۔ اس بزرگ کی صحبت میں چند دن بہت خوشی کے ساتھ گزارے۔ خدا اس نے

مہانداری کے سارے لوازمات فراہم کیے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس تحریر کے وقت تک میر موصوف صحت و عافیت کے ساتھ بمبئی میں مقیم ہے۔

مہدی علی خاں مشہدی

اس کا مختصر حال یہ ہے کہ سنہ ۱۱۹۹ھ مطابق سنہ ۱۷۸۴ء میں ایران سے براہ دکن لکھنؤ پہنچا۔ کمپنی کے ایک ملازم مسٹر جانسن کی توجہ سے آصف الدولہ، نواب وزیر اودھ کے یہاں ملازم ہو گیا۔ جب تک مسٹر جانسن لکھنؤ میں رہا، اس کا وقت آرام سے گذرا۔ مسٹر جانسن کے لکھنؤ سے چلے جانے کے بعد اگرچہ یہ نواب وزیر کے مصاحبوں کی محفلوں میں روز و شب حاضری دیتا تھا۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اپنی بقایا تنخواہ بھی حاصل نہ کر سکا۔ عاجز آ کر طباعت کا پیشہ اختیار کیا اور بہت تنگی کے ساتھ گذر بسر کرتا رہا۔ آخر کار میرے پاس آیا اور مجھ سے آصف الدولہ کے نائب حیدر بیگ خان کی شکایت کی۔ اور مدد طلب کی چونکہ ان دنوں نائب مذکور کا برتاؤ میرے ساتھ اچھا تھا۔ اس لیے میں کبھی کبھی مہدی علی خان کے لیے کچھ رقم حاصل کر لیتا تھا آخر کار لکھنؤ کے قیام سے تنگ آ کر کسی طرف چلے جانے کا ارادہ کیا۔ مگر سفر کے اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے باہر جانے سے بھی مجبور تھا۔ میں نے حیدر بیگ سے اس کو پندرہ سو روپے دلوا دیئے اور وہ بنارس چلا گیا۔

اتفاق سے انہیں دنوں غازی پور کے ایک دولت مند شخص مرزا مہدی کرگجی نے وفات پائی۔ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ سید محمد خان شیر جنگ حاکم بنارس نے مہدی علی خان کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ مرحوم مرزا مہدی کے متروکہ مال اور جائداد کو ضبط کر کے اس کے ایک گونگے ملازم کے حوالے کر دے جو مرحوم کا خدمت گذار تھا۔ اس نے متوفی کے ترکہ میں سے ایک بڑی رقم شیر جنگ کو اور کچھ رقم کمپنی کے مقرر کردہ حاکم کو خفیہ طور پر پہنچا دی۔ اور ان سے رسم و راہ پیدا کر لی۔ اور باقی رقم پر خود قبضہ کر لیا اور اپنے ہم نام مرحوم کا جانشین بن گیا۔ اور غازی پور میں قیام اختیار کر لیا۔

مسٹر ڈنکن کے زمانہ میں علاقہ کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ چند سال یہ حالت قائم رہی۔ جس کی وجہ سے مہدی علی خان کے پاس دو تین لاکھ روپیہ جمع ہو گیا۔ مسٹر ڈنکن کے بنارس سے چلے جانے کے بعد نواب وزیر کے نائبوں کی آمد و رفت کلکتہ میں بڑھ گئی۔ مہدی علی خان کئی منزلوں تک ان کی مہمان داری کرتا تھا۔ ان لوگوں کی دلفریب گفتگو سنکر

متاثر ہوا اور لکھنؤ جانے کا ارادہ کیا۔ کیوں کہ وہ نائب وزیر کے ظاہری برتاؤ سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اور اس مشہور مثل سے غافل ہو گیا تھا کہ "من جرّب المجرّب، حلت بہ ندامۃ" (جس نے آزمائے ہوئے کو آزمایا، اسے ندامت میں مبتلا ہونا پڑا۔ وہ اپنے مستقل ذریعۂ آمدنی کو چھوڑ کر ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء میں لکھنؤ آ گیا۔ اس زمانے میں خود میں بھی لکھنؤ میں موجود تھا۔ اکثر اس کو مرزا حسن علی خان کے مکان پر دیکھتا تھا۔ کبھی وہ خود مجھ سے ملنے چلا آتا تھا چونکہ اس نے اپنے اخراجات بڑھا رکھے تھے۔ اس لیے ایک دو سال میں غازی پور کا سرمایہ ختم کر دیا۔ اور خالی ہاتھ رہ گیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ مسٹر ڈنکن کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ اس لیے اس کے پاس چلا گیا۔ مسٹر ڈنکن نے ازراہِ مروت اور قدیم تعلقات کے پیشِ نظر اس کو بوشہر (ایران) میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا سفیر مقرر کرا دیا اور ایران روانہ کر دیا۔ مگر گورنر جنرل بنگال نے ڈنکن کی اس تجویز کو پسند نہیں کیا اور اس کا تقرر نامنظور کر دیا۔ کیوں کہ وہ بصرہ میں متعین ملازمین کمپنی کی چغل خوری کے باعث اس کی حرکات سے واقف ہو گیا تھا

مہدی علی خان اس صورتِ حال کے بعد تہران سے کرمان شاہ اور وہاں سے بغداد آیا۔ کچھ دن عتباتِ عالیات میں قیام کیا۔ چند جھاڑ اور فانوس روضۂ نجف کے لیے بطورِ نذر پیش کیے۔ میں نے سنا ہے کہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ روضۂ نجف پر حاضری دیتا تھا۔ ایک ملازم چاندی کا پنکھا دھوپ کی تپش کے بہانے سے روضہ کی غلام گردش میں سر پر لگائے رکھتا تھا۔ اور دروازہ مبارک کے اندر داخل ہو کر گھوڑے سے اترتا تھا۔ چند ماہ بصرہ میں گزار کر دوبارہ بوشہر جا کر بحیثیت سفیر کمپنی کام کرنے لگا۔ اور وہاں اپنے بیٹے کی شادی سلاطینِ زندیہ کے خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ کر دی اور امیروں جیسی شان و شوکت سے رہنے لگا۔ اور اپنے نام کے ساتھ "نواب" کا اضافہ کر لیا۔ بنگال کے گورنر جنرل کو اس کی یہ حرکتیں پسند نہیں آئیں۔ اس نے بوشہر سے اس کی ملازمت ختم کر دی۔ اس کے بعد گورنر ڈنکن کی سفارش سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے آٹھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ تا زندگی مقرر کر دیا کیونکہ اس نے ایران میں کمپنی کے سفیر کی حیثیت خدمات انجام دی تھیں۔ مگر وہ اس فیصلے سے ناراض ہو کر اپنے معاملات درست کرانے کے لیے بوشہر سے بمبئی آیا۔ اس وقت سے وہیں رہتا ہے۔ گورنر ڈنکن کی مدد سے اس کو دولت جمع کرنے کا موقع ملا اور اسی کی کوشش سے کمپنی کی ملازمت ملی اور اب عمر بھر کے لیے آٹھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا۔ لیکن اس

کہ اس سے کوئی خوشی نہیں ملتی ہے۔

پہلے دن جب میں گورنر ڈنکن کے گھر پہنچا اور اس کے انتظار میں مکان کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اس وقت مہدی علی خاں ناشتہ کے لیے وہاں آیا، اور میرے برابر سے ہو کر گذر گیا۔ ایسا ظاہر کیا کہ مجھے پہچانتا ہی نہیں۔ جب گورنر ڈنکن نے مجھ کو ناشتہ کے لیے اندر بلایا تو مجبوراً اٹھ کر مجھ سے ملا، اور معذرت کی کہ میں اسے پہچانا نہ تھا۔ یہ بات اچھی طرح جاننے کے باوجود کہ میں بمبئی میں رہنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ وہ میرے دورانِ قیام اس بات سے بہت پریشان رہا کہ کہیں میں گورنر ڈنکن کی رفاقت اختیار نہ کر لوں۔ ہمیشہ ناگواری کے آثار اس کے چہرے پر نظر آتے تھے۔ دورانِ گفتگو ہمیشہ میری مخالفت میں بولتا تھا اور منہ توڑ جواب سن کر گھر چلا جاتا تھا۔

توانم آنکہ نیازارم اندرونِ کسے؛ حسود راچہ کنم کو زخود برنج درست

(جہاں تک ہوسکتا ہے میں کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتا ہوں، مگر حاسد کو کیا کروں کہ وہ خود ہی غم میں مبتلا ہے)

آقا حسن

یہ بھی میرا ایک ملاقاتی ہے۔ حاجی خلیل مرحوم سفیرِ ایران کا بھتیجا ہے۔ اور ناگہانی خانہ جنگی میں بندوق کی گولی سے زخمی ہوگیا تھا جو حاجی خلیل مرحوم کے رفقار کی حماقت اور خود سری کے باعث اور مسٹر الیسٹر بیجی جیسے ناتجربہ کار شخص کی عدم توجہ سے سفرِ ایران کے دوران پیش آئی تھی۔ آقا حسن کو کو بندوق کی پانچ چھ گولیاں لگی تھیں اور زندگی سے مایوس ہوگیا تھا۔ مگر انگریز ڈاکٹروں نے اپنے فن کی مہارت کو بروئے کار لا کر اس کا کامیاب علاج کیا اور وہ تندرست ہوگیا۔ یہ حاجی خلیل مرحوم کے رفقار کا امیر مقرر ہوا تھا۔ اور اس امید پر بمبئی میں ٹھہرا ہوا تھا کہ شاید ایران کی سفارت پر اس کا تقرر ہوجائے اس کو کمپنی کی طرف سے خرچ کے لیے معقول رقم ملتی ہے۔ آخر کار جب ایران کی سفارت پر آقا نبی سوداگر بصرہ کو مل گئی تو یہ تمام ساتھیوں کے ہمراہ ایران واپس چلا گیا۔ اگرچہ علوم و فنون میں کوئی خاص مہارت نہیں رکھتا ہے۔ مگر بحیثیت انسان بہت اچھا ہے شریفوں جیسے طور طریقے رکھتا ہے۔ دو بار میری دعوت کی اور ہر بار گھر پہنچنے پر مناسب تعظیم کی۔ اس کے ساتھیوں میں سے چند کو شعر و سخن کا بھی ذوق ہے۔ دیر تک وہ لوگ مجھ سے فرنگستان کے حالات پوچھتے رہے۔ خاص طور پر "فرق فری میسن" کے متعلق دریافت

کرتے تھے۔

ان لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر کر چکا ہوں، ایران کے دولت مند تاجر بمبئی میں بہت تھے جن کا مشغلہ نفاق اور ایک دوسرے کی غیبت کے سوا کچھ نہیں۔ ان میں ایک سید تقی ہے۔ جس کے ساتھ دنیا کا کوئی شخص بسر نہیں کر سکتا۔ تعارف ہونے کے بعد بعض وجوہ سے کوئی آدمی اس کے ہاتھوں اور زبان سے نجات نہیں پا سکتا۔ ایسے متعدد لوگوں سے بعض دوستوں کے گھر پر ملاقات ہوئی اور طبیعت مکدر ہو گئی۔ اس لیے اس کا ذکر اتنا ہی کافی ہے۔

سفرِ کلکتہ

بمبئی میں پینتالیس روز قیام کے بعد ۲۶ ربیع الاول ۱۲۱۹ھ مطابق اگست ۱۸۰۴ء دوشنبہ کے دن روانہ ہوا۔ ہوا موافق تھی۔ اسی وقت جہاز نے لنگر اٹھایا اور موافق ہوا کی تلاش میں بحرِ ہند میں شمال کی جانب اتنی دور چلا گیا کہ جب مشرق کی سمت جدھر جانا تھا مڑا تو کلکتہ تک میں نے خشکی کا کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ نہ دکن کے ساحلی مقامات نظر آئے۔

گیارہویں دن خلیج بنگال کے قریب پہنچے۔ یہ جہاز کی تیز رفتاری کی انتہا تھی۔ کیوں کہ اتنی جلدی کوئی جہاز بمبئی سے کلکتہ نہیں پہنچتا ہے۔ کلکتہ کے قریب پہنچ کر کئی دن جہاز اس انتظار میں گردش کرتا رہا کہ کلکتہ کی کھاڑی کا راستہ بتانے والا کوئی شخص مل جائے۔ جب رہنما جس کو پیلوٹ کہتے ہیں مل گیا تو جہاز دو دن کلکتہ کے سمندر میں چلتا رہا اور مشہور لنگر گاہ فلتہ میں لنگر انداز ہوا۔ وہاں سے اسٹیمر پر سوار ہو کر کلکتہ روانہ ہوئے۔ دوسرے دن پندرہ ربیع الثانی ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۰۴ء شام کے وقت شہر کلکتہ پہونچے۔

میرے اس جہاز کا کپتان (ہیز) Hayes بہادر اور شریف انسان ہے کمپنی کی ملازمت کے دوران اس نے بہت اچھے کام کیے ہیں۔ اس کے چہرے پر زخم کا نشان ہے جس کو دیکھ کر آدمی کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ اس کی بہادری کا نشان ہے جہاز کے ملازمین اس سے خوش رہتے ہیں۔ اس کی بیوی آئرش ہے۔ نہایت خوش اخلاق نیک خصلت، مہمان نوازی میں اپنے شوہر سے بھی چند قدم آگے ہے۔ اس کی شیریں گفتاری اور نرم روی کے باعث جہاز پر وقت خوشی سے گذرا۔ جہاز پر شطرنج اور گنجفہ کے شغل

سے باعث سفر کی تکالیف کا مطلق احساس نہ ہوا۔ بلکہ جتنے دن سفر میں گذرے ان کی گنتی بھی یاد نہ رہی۔ کپتان موصوف نے اپنے کیبن کے نزدیک ایک صاف ستھرا کیبن میرے لیے مخصوص کر دیا۔ سارے سفر میں میاں بیوی دونوں میری دلجوئی کرتے رہے، عمدہ اور لذیذ کھانے کھلائے اور قیمتی شراب سے تواضع کی۔ ایک دن میں دو تین بار دستر خوان پر بلاتے تھے۔

لنگر گاہ پر پہنچ کر کپتان نے بیوی کو جہاز پر چھوڑا اور کمپنی کی ڈاک پہنچانے کلکتہ چلا گیا۔ مجھ کو اپنے ساتھ لیا۔ نواح کلکتہ میں پہنچ کر ایک مہمان سرا میں قیام کیا۔ جس کا مالک مسٹر منچ ایک انگریز تھا۔ میرے کھانے کی قیمت اور کرایہ خود ادا کر دیا۔ اور مجھ کو ادا کرنے سے روک دیا۔ کلکتہ میں اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ اس کے گھر میں قیام کروں۔ تاکہ جب تک میرا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو جائے۔ سب خرچ اس کے ذمے رہے۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ میرا مکان کلکتہ میں موجود ہے۔ اور یہاں میرے دوست احباب بہت ہیں۔ اگر روپیہ کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی مل جائے گا۔ اس کے بعد اس سے رخصت ہو کر محمد علی خان کے مکان پر آ گیا۔ کپتان مذکور یہاں بھی مجھ سے ملنے کے لیے برابر آتا رہا اور دن کا کھانا بہت دن تک اپنے ساتھ کھلاتا رہا۔

چونکہ ابھی میں نے کوئی ذریعۂ معاش اختیار نہیں کیا تھا۔ اس لیے سوا بستر اور کپڑوں کے میرے پاس کچھ نہ تھا۔ چالیس دن تک محمد علی خان کے مکان پر رہا۔ اس نے دل کھول کر میری مہمان نوازی کی، صبح سے نصف شب تک میری خبر گیری کرتا تھا۔ میں اس کی محبت اور غم خواری کا بے حد ممنون ہوں۔

اس کے بعد میں نے ایک مکان کرایہ پر حاصل کر لیا اور تھوڑا تھوڑا کر کے ضرورت کا سامان فراہم کیا۔

اشاریہ

مقامات و عمارات وغیرہ

ترتیب حروف تہجی

نوٹ: مصنف نے جو انگریزی نام فارسی رسم الخط میں لکھے ہیں وہ انگریزی تلفظ کے مطابق نہیں ہیں۔ ان کو انگریزی میں لکھ دیا گیا ہے۔

نام، مقامات و عمارات وغیرہ	نام، مقامات و عمارات وغیرہ
اسپا گارڈن۔ باغ	ایزادعلی (قصبہ)
اسٹفرڈ	ارمنہ (شہر)
الہٰ آباد	آذربائیجان (صوبہ)
آکسفورڈ	افریقہ
آبزرویٹری	اسکندریہ
ایسٹ انڈیا کمپنی	بابل
اٹلی	بادریہ (گاؤں)
استنبول	باکلے (مقام)
اٹلانٹک (بحر)	بروک اسٹریٹ (مقام)
انگلینڈ	بیگو (جزیرہ)
اڈنبرا	بلینہم (پارک)
اسپین	بنگازی (شہر)
اٹلینہ (مقام)	برطانیہ
الماسیہ (قصبہ)	بنک آف انگلینڈ
آرمنیہ (گاؤں)	برٹش میوزیم
البرجیر۔ (قلعہ)	بحر اٹلانٹک (سمندر)
البجہ (مقام)	بحر اوقیانوس
اباصوفیہ (مسجد)	بحر مردہ

نام: مقامات وعمارات وغیرہ

باسکوعد (شہر)
بصرہ
بغداد
بحرِ ہند
بحرِ عمان
بحرِ عرب
بوشہر (شہر)
بندھیل کھنڈ (صوبہ)
بوکلاش (گاؤں)
برہ (شہر)
بول ورڈس (مقام)
بوشعیب جزیرہ
بیت المقدس
بلوٹ (چھوٹا جہاز)
پوٹنی (قصبہ)
پلزنمیہ (شہر)
پورٹ والوچ
پروشیا
پلفنہ
پورٹ سمورتھ
پولینڈ
پیراڈائز اسٹریٹ
تولیہ (قصبہ)

نام: مقامات وعمارات وغیرہ

ترغان (قصبہ)
تاروخ (شہر)
ٹیمز دریا
ترم کرم جزیرے
ٹنڈس جزیرہ
ٹیلوری (مقام)
چیسٹر (شہر)
چروک (باغ)
حبش (ملک)
حجاز "
حیدیہ (گاؤں)
حلہ (مقام)
خربوت (مقام)
دوار (شہر)
دردنل (درہ دانیال)
دیاربکر (مقام)
دوزجہ "
دوخلہ "
دجلہ (دریا)
دارالسلام (شہر)
ذات (دریا)
رچمنڈ باغ

نام: مقامات وعمارات وغیرہ

روم (ملک)
رام پور (شہر)
زریّہ گاؤں
راتھوین پیلس
زبیر (قصبہ)

سینٹ پال (گرجا)
سوئٹزرلینڈ
سورز (جزیرہ)
سیلون
سرنگ پٹن
سین دریا

سُردِینہ (جزیرہ)
سسلی (شہر)
سمرنا "
سیواس (مقام)
سامرہ (شہر)
سُرمَن رأی (شہر)
سوق الشیوخ (مقام)
سورت (شہر)
شمس الہدیٰ کالج
شوستر (مقام)
شیراز (شہر)
شیرف (عہدہ)

عمّان (شہر، جزیرہ)
عکّہ (مقام)
عیرہ "
عنکرہ "
عظیم آباد (شہر)
عتوب (مقام)

غازی پور

فتح حصار قلعہ
فرات دریا
فورٹ ولیم کالج
فرانس
فری میسن (نام فرقہ)

قرنہ (مقام)
قلزم (سمندر)
قلاتہ (مقام)
قراطلہ "
قیس جزیرہ

کاوکا (جزیرہ)
کلس (شہر)
کندیہ (مقام)

نام : مقامات وعمارات وغیرہ
کسان (مقام)
کینبرہ "
کردہ "
کرکوک "
کاظمین (شہر)
کربلا
گورکھپور
گنڈال
لیئن (مقام)
لیگھان "
لاہور
مڈگاسکر (جزیرہ)
ماریشس "
مکہ معظمہ (شہر)
مرشدآباد "
ماردین "
مرسوان "
مالطیہ "
مسقط (جزیرہ)
مچھلی بندر (شہر)
محفل (مقام)
مالٹا (جزیرہ)

نام : مقامات وعمارات وغیرہ
مارٹنک (جزیرہ)
مدراس (شہر)
میلبورن "
مین پوری "
میلو (جزیرہ)
مثلیش "
نخع (قبیلہ)
مینارکا (جزیرہ)
نیپلیس (مقام)
نیمیش "
نجف اشرف (شہر)
ویانا (شہر)
وہری (مقام)
وہابی (فرقہ)
وی تال (مقام)
واشس "
واک سال "
وتسرہ "
ویسٹ منسٹر ایبے (مقام)
ہنلی (شہر)
ہالی ہیڈ (جزیرہ)
ہگلی (دریا)
ہمبرگ
ہائڈپارک

نام: مقامات وعمارات وغیرہ	نام: مقامات وعمارات وغیرہ
ہالینڈ	راشٹرپتی بھون (محل)
ہنور (شہر)	———
ہرمز (جزیرہ)	یمن ملک
ہمپاشائر (مقام)	———

ہماری مطبوعات

آندھی میں چراغ (دوسری طباعت)	خواجہ غلام السیدین	73/=
ابوالکلام آزاد۔ شخصیت، سیاست اور پیغام	پروفیسر رشید الدین خاں	21/=
ابوالکلام آزاد۔ ایک ہمہ گیر شخصیت	پروفیسر رشید الدین خاں	58/=
اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی	120/=
ارتقاء کائنات اور انسان و دیگر مضامین	پروفیسر بی شیخ علی	94/=
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (دوسری طباعت)	احتشام حسین	70/=
اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ	پروفیسر محمد حسن	98/=
اردو ڈراموں کا انتخاب	پروفیسر محمد حسن	156/=
اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	200/=
اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد مرزا و میر تک)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	22/=
اردو کے ادبی معرکے (انشاء سے غالب تک) ترمیم و اضافے کے ساتھ (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	30/=
اردو کی کہانی (دوسری طباعت)	احتشام حسین	21/=
اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسعود ہاشمی	30/=
ارنیسٹ ہیمنگوے (حیات و فن کا تنقیدی مطالعہ) (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	8/40
امریکی ادب کا مختصر جائزہ (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	52/=

انتخاب غزلیات میر	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	15/=
انتخاب کلام حسرت	ڈاکٹر فضل امام	9/=
انشاء کا تر کی روزنامچہ	سید محمد نعیم الدین	4/50
انیس کے سلام	علی جواد زیدی	60/=
انیس کے مرثیے اوّل (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	36/=
انیس کے مرثیے دوم (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	40/=
برنارڈشا	عبدالمغنی	35/=
بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	پروفیسر اختر اورینوی	18/=
بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	58/=
پشکن (دوسری طباعت)	ظ۔ انصاری	60/=
پھول بن (دوسری طباعت)	ابن نشاطی	52/=
تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین	70/=
تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	// // // //	170/=
تاریخ ادب اردو (جلد سوم)	// // // //	170/=
تاریخ ادب اردو (جلد چہارم)	// // // //	170/=
تاریخ ادب اردو (جلد پنجم)	// // // //	170/=
تذکرہ علمائے بلخ	صفی الدین واعظ / پروفیسر نذیر احمد	12/=
تالستائے (دوسری طباعت)	ڈاکٹر محمد یٰسین	46/=
تامل ناڈو میں اردو	علیم صبا نویدی	135/=
جنت سنگار	پروفیسر سیدہ جعفر	180/=
جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن (دوسری طباعت)	ظفر محمود	38/=
چکبست	رام لال نابھوی	18/=

شعریات (تیسری طباعت)	ارسطو / شمس الرحمن فاروقی	62/=
شعر شور انگیز (جلد اوّل)	شمس الرحمن فاروقی	150/=
شعر شور انگیز (جلد دوم)	شمس الرحمن فاروقی	130/=
شعر شور انگیز (جلد سوم)	شمس الرحمن فاروقی	150/=
شعر شور انگیز (جلد چہارم)	شمس الرحمن فاروقی	170/=
صحیفۂ خوش نویساں	مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی	12/=
عربی ادب کی تاریخ (اوّل) (تیسری طباعت)	ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی	77/=
عربی ادب کی تاریخ (دوم)	ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی	84/=
عربی ادب کی تاریخ (سوم)	ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی	زیر طبع
غرائب الجمل	شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا / ڈاکٹر حسن الدین احمد	76/=
غزل اور غزل کی تعلیم (دوسری طباعت)	ڈاکٹر اختر انصاری	18/=
فسانۂ آزاد (جلد اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	100/=
فسانۂ آزاد (جلد دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	65/=
فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصۂ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	67/50
فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصۂ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	67/50
فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصۂ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	50/=
فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصۂ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	50/=
فکر و تحقیق (۱) جنوری تا جون 1989	قومی اردو کونسل	15/=
فکر و تحقیق (۲) جولائی تا دسمبر 1989	قومی اردو کونسل	15/=
فکر و تحقیق (۳) جنوری تا جون 1990	قومی اردو کونسل	15/=
فکر و تحقیق (۴) جولائی تا دسمبر 1990	قومی اردو کونسل	15/=
فکر و تحقیق (۵) جنوری تا جون 1992	قومی اردو کونسل	20/=

چے خف (دوسری طباعت)	ظ۔انصاری	10/=
حیات جاوید (چوتھی طباعت)	الطاف حسین حالی	167/=
حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	سید ممتاز مہدی	92/=
خسرو شناسی (دوسری طباعت)	ظ۔انصاری / ابوالفیض سحر	24/=
دانتے	زیڈ۔اے۔عثمانی	8/25
دستنبو	غالب / پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	12/=
درس بلاغت (تیسری طباعت)	قومی اردو کونسل	47/=
قدیم اردو نظم (حصہ اول)	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	40/=
دکن میں اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	42/=
دکنی ہندی اور اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	15/50
دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیدہ جعفر	45/=
دکن میں مرثیہ اور اعزاداری	ڈاکٹر رشید موسوی	17/=
دیوان آبرو	پروفیسر محمد حسن	25/=
دیوان حسرت عظیم آبادی (دوسری طباعت)	ڈاکٹر اسماء سعیدی	100/=
ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا حیات اور کارنامے	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	12/=
ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت اور معمار	مرتبہ: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	70/=
ذوق و جستجو	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	34/=
رہبر اخبار نویسی	سید اقبال قادری	62/=
رباعیات انیس	مرتبہ: علی جواد زیدی	85/=
زندگانی بے نظیر	سید محمد عبدالغفور شہباز / سید محمد حسنین	19/=
سب رس کے حروف (صرفی مطالعہ)	آصفہ بیگم	9/50
سخنوران گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	17/=
سیر کہسار (جلد اوّل)	پنڈت رتن ناتھ سرشار	167/=

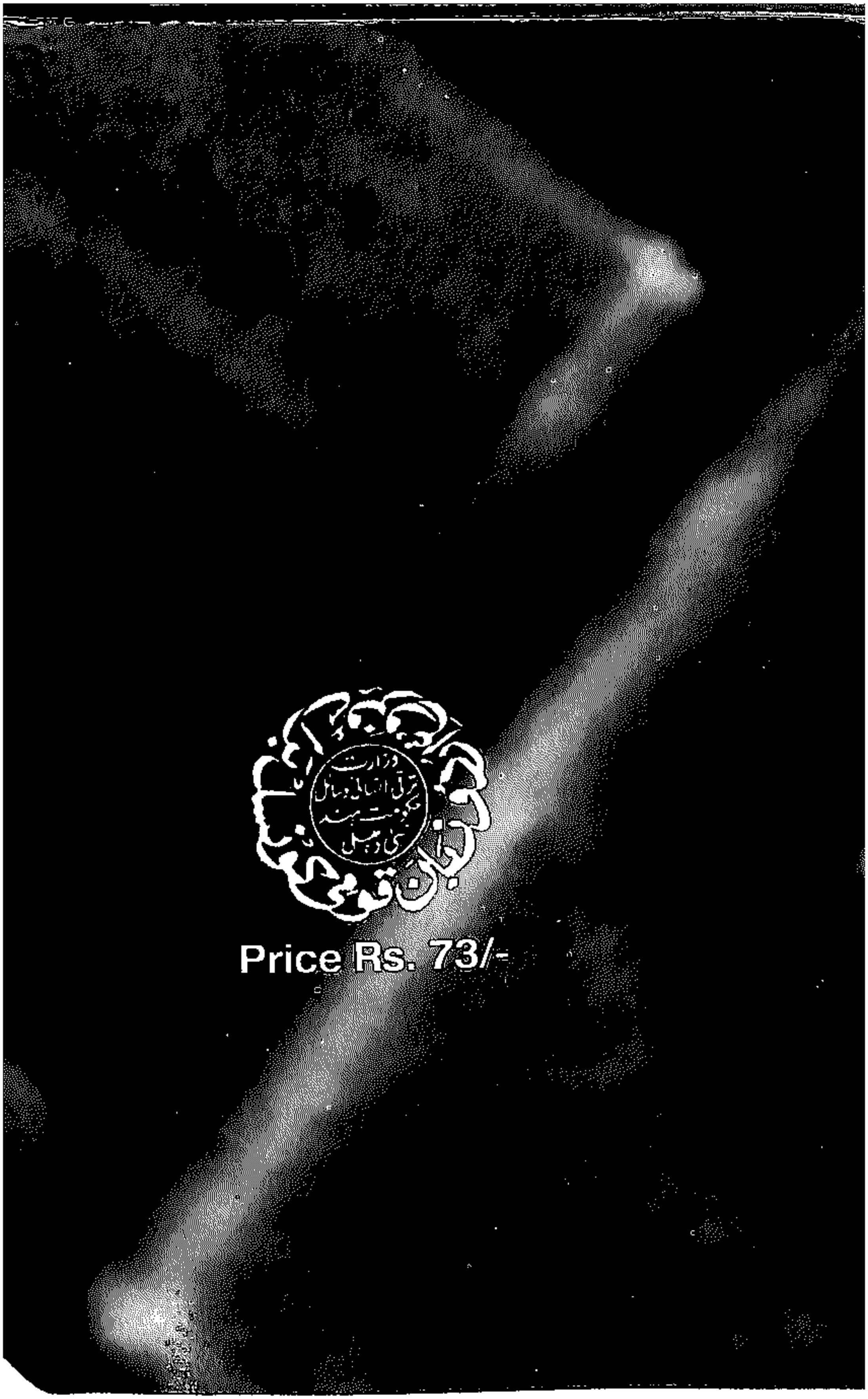

Printed at : **MAKOFF PRINTERS**
2879, Bulbuli Khanna,Turkman Gate, Delhi-6
Phone : 3288967, 3256407

Price Rs. 73/-

Printed at : **MAKOFF PRINTERS**
2879, Bulbuli Khanna, Turkman Gate, Delhi-6
Phone : 3288967, 3256407